یُؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا

# فقہائے ہند

محمد اسحاق بھٹی



4

دار النوادر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# فقہائے ہند

# فقہائے ہند

## گیارھویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بہ اشتراک

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور فون: ۸۸۹۸۶۳۹ ۰۳۰۰

۲۰۱۳ء/۱۴۳۴ھ

نام کتاب: ——— فقہائے ہند

مصنف: ——— محمد اسحاق بھٹی

اہتمام: ——— محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

بہ اشتراک دار النوادر

مطبع: ——— شفیق پریس

حروف خوانی: ——— محمد سعید بھٹی

کمپوزنگ: ——— محمود فرید

صفحات: ——— ۵۰۶

سرورق: ——— ضیاء الرحمٰن

جلد ساز: ——— بنیامین

# ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| ◆ | مقدمہ | ۱۱ |
| ◆ | جلال الدین اکبر | ۱۱ |
| ◆ | ولادت | ۱۱ |
| ◆ | اکبر کی گرفتاری | ۱۲ |
| ◆ | اکبر کی تخت نشینی | ۱۳ |
| ◆ | پانی پت کی دوسری لڑائی | ۱۴ |
| ◆ | دور اکبری کی فتوحات | ۱۶ |
| ◆ | اکبر کا نظام مملکت | ۱۷ |
| ◆ | اکبر کی مذہبی زندگی کا پہلا دور | ۱۹ |
| ◆ | دوسرا دور | ۲۳ |
| ◆ | تیسرا اور آخری دور | ۲۹ |
| ◆ | علمی خدمات | ۳۳ |
| ◆ | وفات | ۳۷ |
| ◆ | گیارھویں صدی ہجری | |
| ◆ | الف | |
| ◆ | ۱۔مفتی آدم بن محمد گوپاموی | ۳۹ |
| ◆ | ۲۔شیخ ابراہیم محدث اکبرآبادی | ۳۹ |
| ◆ | ۳۔قاضی ابراہیم بن محمد کالپوی | ۴۱ |
| ◆ | ۴۔سید ابراہیم غیاث پوری | ۴۱ |
| ◆ | ۵۔قاضی ابراہیم بیجاپوری | ۴۲ |
| ◆ | ۶۔قاضی ابراہیم سندھی | ۴۳ |
| ◆ | ۷۔مفتی ابوالبقا جون پوری | ۴۴ |
| ◆ | ۸۔شیخ ابوبکر شافعی سندھی | ۴۵ |
| ◆ | ۹۔قاضی ابوبکر الٰہ آبادی | ۴۶ |
| ◆ | ۱۰۔شیخ ابوتراب بیجاپوری | ۴۶ |
| ◆ | ۱۱۔شیخ ابوتراب گجراتی | ۴۷ |
| ◆ | ۱۲۔سید ابوالحسن سورتی | ۴۸ |
| ◆ | ۱۳۔شیخ ابوالحسن کشمیری | ۴۸ |
| ◆ | ۱۴۔سید ابوحنیفہ نصیرآبادی بریلوی | ۴۹ |
| ◆ | ۱۵۔شیخ ابوالخیر بن مبارک ناگوری | ۴۹ |
| ◆ | ۱۶۔شیخ ابوالخیر ٹھٹھوی سندھی | ۴۹ |
| ◆ | ۱۷۔شیخ ابوالخیر بھیروی | ۵۰ |
| ◆ | ۱۸۔شیخ ابورضا دہلوی | ۵۰ |
| ◆ | ۱۹۔شیخ ابوسعید گنگوہی | ۵۰ |
| ◆ | ۲۰۔قاضی ابوسعید گجراتی | ۵۱ |
| ◆ | ۲۱۔مولانا ابوسعید امیٹھوی | ۵۱ |
| ◆ | ۲۲۔شیخ ابوالعلا جون پوری | ۵۱ |
| ◆ | ۲۳۔شیخ ابوالفتح ملتانی | ۵۲ |
| ◆ | ۲۴۔قاضی ابوالفتح بلگرامی | ۵۲ |
| ◆ | ۲۵۔قاضی ابوالقاسم کشمیری | ۵۲ |
| ◆ | ۲۶۔مولانا ابوالواعظ ہرگامی | ۵۲ |
| ◆ | ۲۷۔شیخ احمد بن اسحاق نصیرآبادی | ۵۳ |
| ◆ | ۲۸۔شیخ احمد بن حسین نائطی بیجاپوری | ۵۴ |
| ◆ | ۲۹۔شیخ احمد بن رضا حیدرآبادی | ۵۴ |

| | |
|---|---|
| ۳۰۔ قاضی احمد بن سلامہ جزائری | ۵۴ |
| ۳۱۔ مولانا احمد بن سلیمان کردی گجراتی | ۵۵ |
| ۳۲۔ شیخ احمد بن عبداللہ حضرمی | ۵۵ |
| ۳۳۔ شیخ احمد بیجاپوری | ۵۶ |
| ۳۴۔ شیخ احمد بن علوی حضرمی | ۵۶ |
| ۳۵۔ شیخ احمد بن علی بُسکری | ۵۷ |
| ۳۶۔ شیخ احمد بن مجتبیٰ مانک پوری | ۵۷ |
| ۳۷۔ شیخ احمد بن محمد حضرمی | ۵۷ |
| ۳۸۔ مفتی احمد بن محمد بہاری | ۵۹ |
| ۳۹۔ قاضی احمد عسکری بیجاپوری | ۶۰ |
| ۴۰۔ شیخ احمد سرہندی۔ مجدد الف ثانی | ۶۰ |
| سرہند کی تعمیر | ۶۱ |
| ابتدائی حالات | ۶۱ |
| خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں | ۶۲ |
| ورود لاہور | ۶۲ |
| مذہبی حالات | ۶۳ |
| مسند تدریس | ۶۴ |
| منصب تجدید | ۶۴ |
| گھریلو صدمات اور حضرت مجدد کا صبر وضبط | ۶۸ |
| عہد جہاں گیری میں مجدد الف ثانی کی مساعی | ۶۹ |
| ردعمل | ۷۰ |
| جہاں گیر کے دربار میں | ۷۰ |
| قلعہ گوالیار میں | ۷۴ |
| قید سے رہائی | ۷۴ |
| عہد جہاں گیری میں شیخ کی تبلیغ دین اور اس کے اثرات | ۷۶ |
| حضرت مجدد کی تعلیمات | ۷۸ |
| توحید | ۷۸ |
| شرک کی سخت تردید | ۸۰ |
| غیر اللہ سے استمداد | ۸۱ |
| نذر و نیاز کا شرکیہ انداز | ۸۲ |
| نجات کا ذریعہ اتباع شریعت ہے | ۸۲ |
| اعتقادی مداہنت قابل معافی نہیں | ۸۳ |
| ادلہ احکام شرعیہ | ۸۳ |
| اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا فعل شنیع ہے | ۸۴ |
| غیر اللہ کو ”مالک دوجہان“ کہنا کلمہ شرک ہے | ۸۴ |
| زبان سے نماز کی نیت کے لفظ کہنا بدعت ہے | ۸۵ |
| بدعت کو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ میں تقسیم کرنا غلط ہے | ۸۶ |
| فاتحہ خلف الامام کے بارے میں | ۸۶ |
| تصانیف | ۸۷ |
| مکتوبات کی علمی سرگرمیاں | ۹۱ |
| تجدید دین | ۹۱ |
| وفات | ۹۲ |
| ۴۱۔ شیخ اسد اللہ ہرگامی | ۹۳ |
| ۴۲۔ مفتی اسماعیل ہرگامی | ۹۳ |
| ۴۳۔ شیخ اسماعیل بن محمود سندھی | ۹۳ |
| ۴۴۔ شیخ اسماعیل لاہوری | ۹۴ |
| ۴۵۔ شیخ اسماعیل محدث بیجاپوری | ۹۴ |
| ۴۶۔ شیخ افضل محمد اکبر آبادی | ۹۴ |
| ۴۷۔ قاضی اللہ داد بلگرامی | ۹۵ |
| ۴۸۔ مولانا اللہ داد سلطان پوری | ۹۵ |
| ۴۹۔ شیخ امین بن احمد نہروالی | ۹۶ |

ب

۵۰۔ شیخ بابو بن شیخ جیو گجراتی ۹۷
۵۱۔ شیخ بایزید انصاری سہارن پوری ۹۷
۵۲۔ شیخ بایزید بلگرامی ۹۷
۵۳۔ شیخ بدرالدین سرہندی ۹۸
۵۴۔ قاضی بدرالدین صدیقی بدایونی ۹۸
۵۵۔ شیخ برہان الدین برہان پوری ۹۸
۵۶۔ شیخ بلال لاہوری ۱۰۰
۵۷۔ شیخ بہلول دہلوی ۱۰۰

پ

۵۸۔ شیخ پیر محمد سلونی ۱۰۱
۵۹۔ شیخ پیر محمد لکھنوی ۱۰۲
۶۰۔ شیخ پیر محمد جیندی ۱۰۳

ت

۶۱۔ شیخ تاج الدین گجراتی ۱۰۳
۶۲۔ شیخ تاج الدین دہلوی ۱۰۴
۶۳۔ شیخ تاج الدین صدیقی جھونسوی ۱۰۵

ث

۶۴۔ قاضی ثناءاللہ مچھلی شہری ۱۰۶
۶۵۔ قاضی ثناءاللہ جون پوری ۱۰۶

ج

۶۶۔ مولانا جان محمد لاہوری ۱۰۶
۶۷۔ شیخ جعفر بن جلال الدین گجراتی ۱۰۷
۶۸۔ شیخ جعفر بن علی گجراتی ۱۰۸
۶۹۔ شیخ جعفر حسینی پٹنوی ۱۰۹
۷۰۔ شیخ جعفر بن عزیز اللہ جون پوری ۱۱۰
۷۱۔ شیخ جلال الدین گجراتی ۱۱۱
۷۲۔ ملا جمال اولیا کوروی ۱۱۱
۷۳۔ شیخ جمال الدین کشمیری ۱۱۲
۷۴۔ مولانا جمال الدین لاہوری ۱۱۲
۷۵۔ مولانا جمال الدین برہان پوری ۱۱۳
۷۶۔ شیخ جمیل الدین سہارن پوری ۱۱۳
۷۷۔ ملا جوہر نانت کشمیری ۱۱۳
۷۸۔ امیر جوہر احمد نگری ۱۱۵

ح

۷۹۔ مولانا حاجی محمد کشمیری ۱۱۶
۸۰۔ مولانا حبیب اللہ سندھی ۱۱۶
۸۱۔ مفتی حسام الدین دہلوی ۱۱۷
۸۲۔ سید حسن بلگرامی ۱۱۷
۸۳۔ سید حسین بلگرامی ۱۱۷
۸۴۔ شیخ حسین ہروی ۱۱۷
۸۵۔ مولانا حسین خباز کشمیری ۱۱۸
۸۶۔ قاضی حسین سترکھی ۱۱۸
۸۷۔ مولانا حمید الدین سندھی ۱۱۸
۸۸۔ مولانا حیدر کشمیری ۱۱۹

خ

۸۹۔ خواجہ بہاری لاہوری ۱۲۰
۹۰۔ قاضی خلیل الرحمٰن گورکھ پوری ۱۲۰
۹۱۔ قاضی خوب اللہ جون پوری ۱۲۱
۹۲۔ مولانا خوشحال تاشقندی ۱۲۱
۹۳۔ قاضی خوشحال کابلی ۱۲۲

د

۹۴۔ مولانا دانیال جوراسی ۱۲۲

| | |
|---|---|
| ٩٥۔ مولانا داؤد مشکوتی کشمیری | ١٢٢ |
| ٩٦۔ ملا درویزہ پشاوری | ١٢٣ |
| **ر** | |
| ٩٧۔ مولانا رضی الدین بھاگل پوری | ١٢٩ |
| ٩٨۔ سید رفیع الدین بلگرامی | ١٣٠ |
| ٩٩۔ مولانا رفیع الدین انصاری سہارن پوری | ١٣٠ |
| ١٠٠۔ مفتی رکن الدین دہلوی | ١٣١ |
| ١٠١۔ شیخ رکن الدین سنامی گنوری | ١٣١ |
| **ز** | |
| ١٠٢۔ شیخ زین الدین اکبر آبادی | ١٣٢ |
| **س** | |
| ١٠٣۔ حاجی سلطان تھانیسری | ١٣٢ |
| ١٠٤۔ علامہ سلیمان کردی گجراتی | ١٣٣ |
| **ش** | |
| ١٠٥۔ مولانا شاکر محمد دہلوی | ١٣٤ |
| ١٠٦۔ ملا شاہ محمد بدخشی | ١٣٤ |
| ١٠٧۔ مولانا شاہ محمد اخسیکتی | ١٣٥ |
| ١٠٨۔ مفتی شرف الدین لاہوری | ١٣٥ |
| ١٠٩۔ مولانا شمس الدین بروتوی جون پوری | ١٣٦ |
| ١١٠۔ مولانا شہباز بھاگل پوری | ١٣٦ |
| ١١١۔ سید شیخ بن عبداللہ حضرمی | ١٣٧ |
| ١١٢۔ مولانا شیر محمد برہان پوری | ١٣٨ |
| **ص** | |
| ١١٣۔ شیخ صبغۃ اللہ بیجاپوری | ١٣٨ |
| ١١٤۔ مفتی صدر جہان پھانوی کیتھلی | ١٣٩ |
| **ض** | |
| ١١٥۔ مولانا ضیاء الدین جون پوری | ١٤٠ |
| ١١٦۔ شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی | ١٤٠ |
| **ط** | |
| ١١٧۔ علامہ طاہر سندھی برہان پوری | ١٤٤ |
| ١١٨۔ شیخ طیب بلگرامی | ١٤٦ |
| ١١٩۔ شیخ طیب بنارسی | ١٤٦ |
| ١٢٠۔ قاضی طیب عباسی موی | ١٤٧ |
| **ع** | |
| ١٢١۔ شیخ عباس برہان پوری | ١٤٧ |
| ١٢٢۔ شیخ عبدالاحد سرہندی | ١٤٨ |
| ١٢٣۔ علامہ عبدالباقی جون پوری | ١٤٨ |
| ١٢٤۔ مولانا عبدالجلیل جون پوری | ١٤٩ |
| ١٢٥۔ مولانا عبدالجلیل لکھنوی | ١٤٩ |
| ١٢٦۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی | ١٥٠ |
| آغا محمد ترک | ١٥٠ |
| ملک موسیٰ | ١٥١ |
| شیخ فیروز | ١٥٢ |
| شیخ سعد اللہ | ١٥٣ |
| شیخ رزق اللہ | ١٥٤ |
| شیخ سیف الدین | ١٥٥ |
| شیخ عبدالحق دہلوی کی ولادت | ١٥٨ |
| ابتدائی تعلیم وتربیت | ١٥٨ |
| فارغ التحصیل ہونے کے بعد | ١٦١ |
| دہلی سے روانگی | ١٦٤ |
| شیخ محدث مکہ مکرمہ میں | ١٦٤ |
| دیار ہند میں واپسی | ١٦٩ |
| شیخ عبدالحق اور شاہان ہند | ١٧٠ |
| شیخ محدث اور جہاں گیر بادشاہ | ١٧١ |
| جہاں گیر سے ملاقات | ١٧٢ |

| | | |
|---|---|---|
| ◆ | شیخ کا مکان، مدرسہ اور کتب خانہ | ۱۷۵ |
| ◆ | تصانیف وتالیفات | ۱۷۷ |
| ◆ | تفسیر | ۱۷۷ |
| ◆ | تجوید وقرأت | ۱۷۸ |
| ◆ | حدیث | ۱۷۹ |
| ◆ | فقہ | ۱۸۶ |
| ◆ | عقائد | ۱۸۶ |
| ◆ | تصوف | ۱۸۷ |
| ◆ | اخلاق | ۱۸۸ |
| ◆ | وظائف واوراد | ۱۸۹ |
| ◆ | منطق اور فلسفہ | ۱۸۹ |
| ◆ | تاریخ | ۱۹۰ |
| ◆ | سیاست | ۱۹۲ |
| ◆ | تذکرہ وسیرت | ۱۹۲ |
| ◆ | علم نحو | ۱۹۳ |
| ◆ | ذاتی حالات سے متعلق | ۱۹۴ |
| ◆ | خطبات | ۱۹۴ |
| ◆ | مکاتیب | ۱۹۴ |
| ◆ | شعروشاعری | ۱۹۵ |
| ◆ | وفات | ۱۹۷ |
| ◆ | اولاد | ۱۹۷ |
| ◆ | مراجع ومصادر | ۲۰۰ |

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کے فضل خاص اور اس کی نصرت کاملہ سے سلسلہ فقہائے ہند کی چوتھی جلد کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اس جلد میں اپنے محدود علم کے مطابق برصغیر پاک ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے علما و فقہا کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں۔ گیارھویں صدی کا زمانہ علمی اعتبار سے برصغیر کا زرخیز زمانہ ہے۔ اس زمانے میں برصغیر کے مختلف بلاد و امصار میں اہل علم کی بوقلموں خدمات علمی کا دائرہ دور دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے، جس کو ایک جلد میں سمیٹنا مشکل تھا۔ لہٰذا اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

یہ جلد جو معزز قارئین کے پیش نگاہ ہے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے حالات تک ہے اور ایک سو چھبیس علما و فقہا کے علمی، فقہی، تدریسی، تصنیفی کارناموں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس سے اگلے حصہ کا آغاز علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے حالات سے ہوگا۔

دسویں صدی ہجری کا نصف آخر اور گیارھویں صدی کا دور ہندوستان میں مغل حکومت کے عروج کا دور ہے۔ اس دور میں یکے بعد دیگرے دودمان مغلیہ کے تین نامور حکمران تخت ہند پر متمکن ہوئے۔ وہ تھے جلال الدین محمد اکبر، نورالدین محمد سلیم جہاں گیر اور شہاب الدین خرم شاہ جہان۔!

جلال الدین اکبر کے دور کے بہت سے علما و فقہاء کا تذکرہ "فقہائے ہند" کی جلد سوم میں بھی مرقوم ہے اور جلد چہارم میں بھی۔ لیکن خود اکبر کی وفات چونکہ گیارھویں صدی ہجری کے اوائل (۱۰۱۴ھ) میں ہوئی، لہٰذا اس کے وہ حالات، جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں، زیر مطالعہ کتاب (چوتھی جلد) میں تحریر کیے جا رہے ہیں۔ جہاں گیر اور شاہ جہان کے بارے میں ہمارے دائرۂ موضوع سے مناسبت رکھنے والے واقعات پانچویں جلد میں ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

# مقدمہ

# جلال الدین اکبر

فقہائے ہند کی جلد سوم کے مقدمے میں ہندوستان کی مغل حکومت کے معمارِ اول ظہیر الدین بابر اور اس کے بیٹے نصیر الدین ہمایوں کے علمی و دینی پہلو قارئین کے مطالعہ میں آچکے ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ علمائے وقت کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی اور فقہائے عصر سے وہ کس درجہ مودت و موانست کا برتاؤ کرتے تھے۔ اب فقہائے ہند کی جلد چہارم کے مقدمے میں اختصار کے ساتھ اس امر کی وضاحت کرنا مقصود ہے کہ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے عہد حکومت کے لیل و نہار کس قسم کے تھے اور اس میں اہل علم کو کیا حیثیت حاصل تھی۔ نیز دینی و مذہبی اعتبار سے دور اکبری کن کیفیات کا عکاس اور کن رجحانات کا آئینہ دار تھا۔

## ولادت:

اکبر کی ولادت اتوار کے روز ۵ / ربیع الاول ۹۴۹ھ / ۱۹ / جون ۱۵۴۲ء کو علاقہ سندھ میں عمر کوٹ کے مقام پر حمیدہ بانو کے بطن سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس کا باپ ہمایوں، شیر شاہ سوری کے حملے اور بھائیوں کی بے وفائی کی وجہ سے سخت پریشان کن حالات میں گھرا ہوا تھا اور اپنے چند وفادار ساتھیوں کی معیت میں ہندوستان کو خیر باد کہہ کر سندھ کے راستے قندھار جا رہا تھا۔ جب وہ عمر کوٹ سے کوچ کر کے چول کے مقام پر پہنچا تو نومولود بیٹے کو پاس بلوایا اور اسے دیکھ کر خوش ہوا۔

ہمایوں کے لیے یہ انتہائی مصیبت کے دن تھے۔ تا حد نگاہ لق و دق صحرا، دور تک نہ کہیں درخت نہ سایہ، پانی کی قلت، کھانے کی تکلیف، سندھ کے راجوں اور حکمرانوں سے ہر آن حملے کا خطرہ، سواری کے لیے اونٹوں اور گھوڑوں کی کمی۔ یہ سفر نہایت صبر آزما تھا اور ہمایوں کے مختصر لشکر میں سخت انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ لوگ لشکر سے کنارہ کشی اختیار کرتے جا رہے تھے، منعم خاں بھی، جو ہمایوں کا معتمد علیہ سردار تھا، ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ البتہ بیرم خان جو ان دنوں گجرات میں مقیم تھا، لشکر ہمایوں میں آکر شامل ہوا۔ اس زمانے میں مرزا شاہ حسین سندھ کا بادشاہ تھا۔ اسے ہمایوں سے خطرہ تھا اور ہمایوں اس سے خوف زدہ تھا۔ ہمایوں نے اس سے سفر کے لیے کچھ کشتیاں اور اونٹ مانگے، اس نے وہاں سے ہمایوں کے چلا جانے کو غنیمت جانا اور فوراً تیس کشتیوں

اور تین سواونٹوں کا انتظام کر دیا گیا۔ اب ہمایوں دریائے سندھ عبور کر کے حدود ہند سے باہر نکل گیا۔

نوع بنوع مصائب برابر ہمایوں کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے اور سامنے مہیب مشکلات منہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ اب اس کا کاروان حیات ایک اور خطرناک موڑ میں داخل ہوتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اس زمانے میں ہمایوں کے بھائی مرزا کامران نے قندھار کا علاقہ مرزا ہندال سے چھین کر مرزا عسکری کے حوالے کر دیا تھا اور مرزا ہندال کو غزنی کی حکومت دے دی تھی۔ ہمایوں نے قندھار کا قصد کیا تو مرزا کامران نے شاہ حسین کی انگیخت پر مرزا عسکری کو خط لکھا کہ ہمایوں نے قندھار کا رخ کر لیا ہے، جس طرح ممکن ہو، اسے گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ جب ہمایوں اپنے رفقا کے ہمراہ شال شانگ (موجودہ کوئٹہ) کے مقام پر پہنچا تو مرزا عسکری نے اس کا راستہ روکنے کے لیے فوج کو حرکت دی اور چولی بہادر نامی ایک اوزبک کو ہمایوں کے لشکر کی مخبری پر مامور کیا۔ چولی بہادر بجائے ہمایوں کی مخبری کرنے اور مرزا عسکری کو اس کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے، نصف شب کو ہمایوں کے لشکر میں آیا۔ بیرم خاں سے ملا اور اس کو تمام حالات سے مطلع کیا۔ بیرم خاں نے اسی وقت شاہی سراپردہ کے پیچھے پہنچ کر سب باتیں ہمایوں کے گوش گزار کر دیں۔ ہمایوں نے اپنے آگے بھائیوں کی سازش کا وسیع جال بچھا ہوا دیکھا تو قدم روک لیے۔ کابل اور قندھار جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور صرف بائیس آدمیوں کو ساتھ لے کر، جن میں بیرم خاں اور خواجہ معظم بھی شامل تھے، عراق کا عزم کیا۔ بیرم خاں اور خواجہ معظم کو ہمایوں نے اپنی بیوی حمیدہ بانو جسے بادشاہ بیگم بھی کہا جاتا ہے اور بیٹے شہزادہ اکبر کو لانے کی ہدایت کی۔ اس وقت ہمایوں کے پاس مناسب سواری کا انتظام بھی نہ تھا۔ مجبور ہو کر ایک مصاحب تردی بیگ کے آگے ہاتھ پھیلائے اور چند گھوڑے طلب کیے، مگر تردی بیگ نے اس نازک موقعے پر سخت اذیت ناک رویہ اختیار کیا۔ گھوڑے دینے سے بھی انکار کر دیا اور ہمایوں کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔

## اکبر کی گرفتاری:

شہزادہ اکبر کی عمر اس وقت صرف ایک سال تھی۔ ان دنوں شدید گرمی پڑ رہی تھی اور راستے میں پانی میسر نہ آئے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لیے ہمایوں نے شہزادہ کو اپنے ایک امیر کے سپرد کر کے لشکر گاہ میں چھوڑ دیا اور بیوی کو ہمراہ لے کر رخصت ہو گیا۔ ہمایوں کے عازم عراق ہوتے ہی مرزا عسکری نے حملہ کر کے اس کے لشکر کو لوٹ لیا اور بعض امرا کو گرفتار کر لیا۔ شہزادہ اکبر کو بھی اپنے ساتھ قندھار لے گیا اور اسے اپنی بیوی سلطان بیگم کے سپرد کر دیا۔۔۔۔ یہ واقعات جن کی بہت سی تفصیلات چھوڑ دی گئی ہیں ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں پیش آئے۔

اب ہمایوں نے سب طرف سے مایوس ہو کر شاہ طہماسپ کے دروازے پر دستک دی اور اس سے طالب امداد ہوا۔ طہماسپ کی مدد سے ہمایوں نے قندھار بھی فتح کر لیا اور ۱۰ رمضان ۹۵۲ھ/ ۱۵ نومبر ۱۵۴۵ء کو کابل پر بھی فتح حاصل کر لی۔ کابل کی فتح کے بعد اس نے اکبر کو بھائی کی گرفت سے آزاد کرایا اور اسے دیکھ کر

انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔ اس اثنا میں ہمایوں کے بھائی اس سے معافی بھی مانگتے رہے اور ساتھ ہی بے وفائی بھی کرتے رہے۔ لیکن ہمایوں جو نرم خو اور حلیم الطبع حکمران تھا، بار بار فراخ دلی سے ان کی معذرت سنتا اور انھیں ہر مرتبہ معاف کرتا رہا۔

فتح کابل کے بعد ہمایوں نے تسخیر بدخشاں کے ارادے سے اپنے لشکر کو حرکت دی۔ وہاں سلیمان مرزا سے مقابلہ ہوا۔ سلیمان مرزا کچھ عرصے تک لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ لیکن اس اثنا میں ہمایوں پر ایک آفت یہ ٹوٹی کہ مرزا کامران نے کابل کو خالی پا کر، اس پر فوج کشی کر دی اور شہر پر قابض ہو گیا۔ ساتھ ہی ہمایوں کی خواتین اور شہزادہ اکبر کو قید کر لیا۔

ہمایوں نے یہ خبر سنی تو نہایت پریشان ہوا۔ بدخشاں کی فتح کے بعد ہمایوں نے اس کی حکومت پہلے مرزا ہندال کو دے دی تھی، بعد میں اس سے لے کر دوبارہ مرزا سلیمان کے حوالے کر دی اور خود نہایت تیزی سے کابل کی طرف لوٹ گیا۔ مرزا کامران کو اس کی فوجی نقل و حرکت کا پتا چلا تو اس نے شہر سے باہر مورچہ قائم کر لیا۔ لڑائی کا بازار گرم ہوا اور کامران کو میدان جنگ میں بری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی۔ لیکن وہ بھاگنے کی بجائے پسپا ہو کر قلعہ کابل میں محصور ہو گیا۔ باہر ہمایوں لشکر لیے بیٹھا تھا۔ سخت محاصرے کی وجہ سے مرزا کامران کے حالات انتہائی ابتر ہو گئے۔ اس دوران میں مرزا کامران نے بدرجہ غایت سنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کئی مرتبہ دو سال کے شہزادہ اکبر کو قلعے کے اس کنگرے پر بٹھایا، جو توپوں، بندوقوں اور تیروں کی عین زد میں تھا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ بیٹے کی جان کے خوف سے ہمایوں جنگ سے دست بردار ہو جائے۔ یہ منظر ہمایوں اور اس کی فوج کے لیے سخت تکلیف اور ذہنی اذیت کا باعث تھا۔ لیکن اکبر کی جان ہر بار سلامت رہی۔ بالآخر مقابلے کی تاب نہ لا کر کامران قلعے سے فرار ہو گیا اور شہزادہ اکبر صحیح سلامت باپ کو دوبارہ مل گیا۔

سلسلۂ واقعات کی متعدد کڑیاں حذف کر کے یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ اکبر کی زندگی کے ابتدائی حالات قارئین کے سامنے آ سکیں اور وہ یہ معلوم کر سکیں کہ اقتدار کی ہوس اور حکومت کی حرص بسا اوقات انسانیت کا خاتمہ کر دیتی ہے اور اپنے پرائے میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہنے دیتی۔ نہ اس کو خون کے رشتے کا کوئی پاس ہوتا ہے اور نہ چھوٹے پر رحم و شفقت کا کوئی احساس اس میں باقی رہتا ہے۔ ہمایوں کے ساتھ اس کے بھائیوں اور اکبر کے ساتھ اس کے چچاؤں نے جو کچھ کیا، وہ اس کی واضح مثال ہے۔

## اکبر کی تخت نشینی:

جلال الدین محمد اکبر باختلاف روایات ۲ یا ۷ ربیع الثانی ۹۶۳ھ / جنوری ۱۵۵۶ء کو چودہ برس کی عمر میں اپنے باپ نصیر الدین ہمایوں کی وفات کے بعد تخت ہند کا وارث بنا۔ ہمایوں ۷ ربیع الاول ۹۶۳ھ / ۲۰ جنوری ۱۵۵۶ء کو بالا خانے کی سیڑھیوں سے گرا تھا۔ ایک ہفتہ تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد ۱۵ ربیع الاول

۹۶۳ھ ۱۸/ جنوری ۱۵۵۶ء کو فوت ہوا۔ منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کی تاریخ تخت نشینی ۲/ ربیع الاول تحریر کی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ نظام الدین ہروی نے طبقات اکبری میں ایک جگہ ۲/ ربیع الاول اور دوسری جگہ ۶/ ربیع الثانی لکھی ہے۔ مآثر رحیمی میں ملا عبدالباقی نہاوندی نے ۷/ ربیع الثانی رقم کی ہے۔ ظاہر ہے ۲/ ربیع الاول تو کسی طرح قرین صحت نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ ہمایوں ۷/ ربیع الاول کو سیڑھیوں سے گرا اور ۱۵/ ربیع الاول کو فوت ہوا۔ اس صورت میں اس کے جانشین کی تاریخ تخت نشینی ۲/ ربیع الاول کیوں کر صحیح قرار پا سکتی ہے؟ یا تو یہ کتابت کی غلطی ہے یا مصنف سے سہو ہو گیا ہے۔

ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر موجودہ جغرافیائی اعتبار سے قصبہ کلانور ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) میں خانِ خاناں بیرم خان کے پاس مقیم تھا۔ وہیں خان خاناں بیرم خاں کے مشورے اور تائید سے اس نے ہندوستان کا تاج شاہی سر پر رکھا۔

اکبر کی زندگی کا آغاز ہی جدوجہد اور ہنگاموں کے ہجوم میں ہوا تھا۔ تخت نشینی کے بعد بھی اس کو یہی صورت حال پیش آئی۔ مقابلے، محاربے اور جنگ وجدال اس کی زندگی کا ایک لازمی جز بن گئے تھے۔

## پانی پت کی دوسری لڑائی:

اکبر کی پہلی بڑی جنگ ہیموں بقال کے ساتھ پانی پت کے میدان میں ہوئی۔ ہیموں بقال یا ہیموں بنیا، عادل شاہ سوری کا وزیر اور سپہ سالار تھا۔ ریواڑی کا باشندہ تھا اور غرور ونخوت کی آخری حدوں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کی طرف یلغار کرتا ہوا بڑھا اور اس پر قابض ہو گیا۔ دہلی پر قبضے کے بعد اس نے بہت طاقت پیدا کر لی تھی اور اپنا خطاب بکر ماجیت رکھ کر خود مختار حاکم بن بیٹھا تھا۔ اسلامی قوانین منسوخ کر دیے تھے اور انتہائی سرکش ہو گیا تھا۔ اکبر کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس نے فوج اور ضروری اسلحہ کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ مقابلے کے لیے ہیموں بقال بھی دہلی سے روانہ ہوا اور پندرہ سو جنگی ہاتھیوں، توپ خانے، بہت بڑی فوج اور کثیر حربی ساز وسامان کے ساتھ پانی پت کے قریب آ کر پڑاؤ کیا۔ تزک جہاں گیری کی روایت کے مطابق ۲/ محرم ۹۶۴ھ/ ۵/ نومبر ۱۵۵۶ء کو اور منتخب التواریخ کی رو سے ۱۰/ محرم ۹۴۶ھ/ ۱۳/ نومبر ۱۵۵۶ء کو جمعے کے روز دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر اتریں۔ خود اکبر شاہی لشکر کے ساتھ تھا اور فوج کو برابر کمک بھیج رہا تھا۔ تزک جہاں گیری کی روایت کے مطابق اس لڑائی میں ہیموں کے سواروں کی تعداد تیس ہزار اور اکبر کے لشکر کی تعداد چار پانچ ہزار تھی۔ جنگ میں ہیموں کی فوج کو شکست ہوئی۔ اس کے ہزاروں فوجی مارے گئے۔ خود ہیموں کو زخمی حالت میں جب کہ اس پر بے ہوشی طاری تھی، اکبر کے پاس لایا گیا۔ بعض امرا نے اکبر سے عرض کیا کہ یہ حضور کا پہلا جہاد ہے۔ اس کافر پر اپنی تلوار کی دھار آزمائیں۔ اکبر نے جو بڑے دل گردے کا مالک اور بہت متحمل مزاج بادشاہ تھا، جواب دیا:

ایں را کہ حالا حکم مردہ دارد چہ بزنم، اگر در حس و حرکتے می بود تیغ آزمائی کردم ❶۔

یعنی اس پر موت کی کیفیت طاری ہے، اسے کیا قتل کروں، اگر اس میں کچھ جان ہوتی تو تیغ آزمائی کرتا۔

اس سے قبل اکبر کی تخت نشینی کے وقت بھی، جب دربار شاہی کے ایک امیر ابوالمعالی نے، تاج پوشی کی تقریب میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا ایک شخص نے اس کو پکڑ کر جان سے مارنے کی کوشش کی تھی، مگر اکبر نے یہ کہہ کر اس کی جان بچائی کہ

دراول جلوس حیف باشد خون بے گناہے ریختن ❷۔

(تخت حکومت پر بیٹھنے کے پہلے ہی روز کسی بے گناہ کو قتل کر دینا افسوس ناک بات ہے۔)

بہرحال پانی پت کی اس دوسری لڑائی میں اکبری فوج کو پندرہ سو ہاتھی، بے شمار خزانہ اور بہت سامال و اسباب غنیمت میں ملا۔ ہیموں کی بیوی بہت بڑا خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر پہلے ہی بھاگ گئی تھی۔ اس کا تعاقب کرنے والے اکبر کے فوجی دستوں نے اس کو الور سے آگے جا کر گھیر لیا اور وہ خزانہ چھوڑ کر جنگلوں اور کوہستان بجوارہ اور کوا میں چلی گئی۔ اس کا کچھ خزانہ تو جاٹوں نے لوٹ لیا اور کچھ مغل فوج کے ہاتھ آیا، مگر اس کے باوجود وہ اتنا زیادہ تھا کہ اکبر کے سپاہیوں نے ڈھالوں میں بھر بھر کر اس کو آپس میں تقسیم کیا۔ جس راستے سے ہیموں کی بیوی بھاگی تھی، اس میں اشرفیاں اور سونے کی اتنی اینٹیں گری تھیں کہ اس واقعہ کے بہت عرصے بعد تک وہ راہ گیروں کو ملتی رہیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

وخزینہ کہ شیر شاہ و سلیم شاہ وعدلی، سالہا جمع کردہ بودند، بایں گونہ تلف شد ❸۔

(یہ وہ خزانہ تھا جو شیر شاہ سوری، سلیم شاہ سوری اور عادل شاہ اپنے زمانے میں جمع کرتے رہے تھے، وقت کے ہاتھوں وہ اس طرح تباہ و تاراج ہوا۔)

فتح کے دوسرے دن اکبر پانی پت پہنچا۔ وہاں سے کوچ کر کے جاہ و حشم کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا اور منبر پر از سر نو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

اس سے ٹھیک بتیس سال قبل ۸ / رجب ۹۳۲ھ / ۲۰ / اپریل ۱۵۲۶ء کو بروز جمعہ اکبر کے دادا ظہیر الدین بابر نے اسی میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دی تھی۔ تاریخ میں اس جنگ کو پانی پت کی پہلی جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں ابراہیم لودھی کی افواج قاہرہ ایک لاکھ سوار اور ایک ہزار ہاتھیوں پر مشتمل تھیں، جب کہ بابر کے پاس صرف پندرہ ہزار سوار اور پیادے تھے۔

❶ منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۱۶۔ (مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء)

❷ ایضاً

❸ منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۱۷۔ (مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء)

جلوس شاہی کے تیسرے سال ۱۷ محرم ۹۶۵ھ/ ۹ نومبر ۱۵۵۷ء کو اکبر کی شاہانہ سواری آگرہ میں داخل ہوئی۔

## دور اکبری فتوحات:

اکبر سے پہلے اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کئی علاقائی سلطنتیں قائم تھیں اور مرکزی حکومت بھی مسلمانوں ہی کی تھی، تاہم ان کی سیاسی حیثیت زیادہ مستحکم نہ تھی۔ ملک متعدد علاقائی سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سیاسی کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ شمالی ہند میں ہندو راجے اور غیر مسلم حکمران بڑی طاقت کے مالک تھے، جن میں رانا کنبھ، رانا سانگا، مالوہ کا میدنی رائے پنجاب کا جسرت کھوکھر اور ہیموں بقال خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ رانا سانگا کی طاقت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب بابر ہندوستان میں آیا تو دارالسلطنت آگرہ کے تخت پر ابراہیم لودھی متمکن تھا، مگر پورے شمالی ہند میں سب سے زیادہ اقتدار رانا سانگا کو حاصل تھا۔ اس زمانے میں مالوہ، گجرات اور خاندیش وغیرہ کے مسلمان حکمرانوں میں اگرچہ بعض حکمران آگرہ اور دہلی کے مرکز سے زیادہ مضبوط اور رعب و دبدبے کے مالک تھے، لیکن رانا سانگا کی طاقت سے سب لرزتے اور خوف کھاتے تھے۔ ابراہیم لودھی سمیت یہ حکمران کئی مرتبہ رانا سانگا سے شکست کھا چکے تھے۔ اس کا زور بابر نے توڑا۔ میدان جنگ میں اس کو شکست فاش ہوئی اور وہ اسی صدمے میں ۹۳۴ھ/ ۱۵۲۸ء کو میواڑ کے پہاڑوں میں وفات پا گیا، مگر افسوس ہے بابر کو زیادہ عرصہ ہندوستان میں حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دہلی کی فتح پر ابھی چار سال بھی نہ گزرے تھے کہ اس کو موت کا پیغام آ گیا۔ اس کے بعد ہیموں بقال کو جو ایک زبردست اور متمرد ہندو جرنیل تھا، اکبر نے ختم کیا۔

اجمیر، ناگور اور ردولی وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی حالت ابتر تھی اور ان کی مساجد کا تقدس ہندوؤں کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا۔ اسی طرح ہندوؤں کی بھگتی تحریک، گورونانک کے صلح کل رویے اور بعض دیگر عوامل نے مسلمانوں پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ پھر جنوبی ہند میں وجے نگر کی ہندو سلطنت نے جو ایک خودمختار اور وسیع سلطنت تھی، اس نواح میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے راستے میں سخت رکاوٹیں پیدا کیں۔ بلاشبہ بعض مسلمان حکمرانوں نے صورت حال کی اصلاح کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور اس میں بہت حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے، مگر ان کا دور اقتدار و اصلاح بہت کم تھا۔ موت نے ان کو زیادہ تگ و تاز کی مہلت نہ دی۔ ان حکمرانوں میں بابر اور شیر شاہ سوری کے نام لائق تذکرہ ہیں۔

اکبر نے زمام اقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد اس طرف پوری توجہ مبذول کی اور استحکام سلطنت کو سب امور سے مقدم گردانا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ہندوستان کے جو صوبے خودمختاری کا دعویٰ کرنے لگے تھے اور طویل عرصے سے مرکز کی گرفت سے باہر تھے، انھیں پھر سے سلطنت دہلی کے زیر نگین کیا اور وہ ان کے مرکز

گریز رجحانات کو ختم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اکبر کے عہد میں مغلیہ سلطنت کے دائرے میں بڑی وسعت ہوئی اور پورے ہندوستان میں اس کا علم اقتدار لہرانے لگا۔ مالوہ فتح ہوا، گونڈوانہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوا، جے پور کے راجا بہاری مل سے صلح ہوئی، جس کے نتیجے میں راجا مذکور نے اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنے خاندان کی ایک لڑکی اس کے عقد میں دے دی۔ ساتھ ہی راجا کے بیٹے بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو اعلیٰ مناصب عطا ہوئے، میواڑ کے راجا نے اس صلح کی مخالفت کی تو اکبر کے ہاتھوں چتوڑ کا قلعہ فتح ہوا، کالنجر اور رنتھمبور کے مشہور قلعے اکبر کے قبضے میں آئے، جیسلمیر اور بیکانیر کے راجوں کو اپنا اطاعت گزار بنایا۔ گجرات پر فتح حاصل کی اور بنگال پر قبضہ کیا۔

اس کے بعد فتوحات کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں اکبر نے کشمیر اپنے تابع فرمان کیا۔ اس سے قبل کشمیر کو مستقل سلطنت کی حیثیت حاصل تھی اور وہ کبھی شاہان ہند کے زیر فرمان نہ آیا تھا۔ سندھ پر اقتدار کا پرچم لہرایا، اڑیسہ پر تسلط جمایا، بلوچستان فتح کیا اور قندھار اکبری مقبوضات میں شامل ہوا۔

پھر دکن کی طرف عنان توجہ مبذول کی۔ احمد نگر کا مضبوط قلعہ اپنی مملکت میں شامل کیا اور خاندیش کا مستحکم قلعہ اسیر گڑھ مسخر کیا، جس کے نتیجے میں احمد نگر اور خاندیش کے تمام وسیع علاقے مقبوضاتِ مغلیہ میں شامل ہو گئے۔

اس طرح اکبر نے ہندوستان کی علاقائی سلطنتیں تقریباً ختم کر دیں اور مختلف راجاؤں اور حکمرانوں کا زور توڑ دیا اور پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اکبر کی ان مسلسل فتوحات کو تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

## اکبر کا نظام مملکت:

نظام سلطنت کے سلسلے میں اکبر بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ صاحب تدبیر، منتظم، فاتح، جنگ جو اور قابل حکمران تھا۔ اس میں ملک گیری، حکمرانی اور ملک رانی کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس نے اس وسیع ملک میں جس انداز سے حکومت کی اور نظم و نسق کے دائروں کو جس نہج سے وسعت دی، وہ اسی کا حصہ تھا۔ پھر اس نے ایک خاص ملکی نظام مرتب کیا، جو آگے چل کر معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں برقرار رہا اور کئی امور میں برطانوی نظام حکومت کی بنیاد بنا، جس پر ہندوستان اور پاکستان اب بھی عمل پیرا ہیں ❶۔

اکبر کو مغلیہ نظام حکومت کے موسس اول کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے قواعد سلطنت اور قوانین حکومت نہایت مضبوط اور مثالی تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کا درباری مؤرخ منشی محمد کاظم اس ضمن میں اکبر کو زبردست خراج تحسین پیش کرتا ہے اور اسے مغلیہ سلطنت کے آئین کا موجد قرار دیتا ہے:

حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ کہ مجدد آئین جہاں بانی و مشید قوانین ایں

❶ رود کوثر، ص: ۸۰۔

سلطنت جاودانی اند ❶۔

(یعنی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ، سلطنت مغلیہ کے آئین جہاں بانی کا موجد اول اور اس کے مضبوط ومستحکم قوانین کا بانی اولیں تھا۔)

اکبر زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا، لیکن مردم شناس اور جوہر قابل کا قدردان تھا۔ اس نے فرض شناس اور لائق افراد اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے۔ اس کے امرا و ارکان سلطنت اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو سمجھنے اور پورا کرنے کی کامل صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کی بے پناہ فتوحات کا سلسلہ اسی لیے آگے بڑھا اور مختلف مہمات میں اس کی فتح و کامرانی کا دائرہ اسی بنا پر وسیع ہوا کہ اس کے ارکان سلطنت وفادار اور امرائے مملکت اصحاب عقل و دانش تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

حضرت عرش آشیانی کہ نوکرانِ خوب داشتند ، از ہمیں جہت فتوحات متوارہ و مہمات متکاثرہ می فرمودند۔

(یعنی ہمارے جد امجد جلال الدین اکبر نے اسی لیے مسلسل فتوحات اور بہت سی مہمات سر کیں کہ اس کے ارکان حکومت نہایت عمدہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔)

اکبر کا نظام حکومت بڑا مضبوط اور کامیاب تھا۔ برصغیر کا وسیع وعریض خطہ ارض دور دراز صوبوں میں بٹا ہوا تھا، لیکن اس پر مرکز کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ کہیں بغاوت یا نافرمانی کا خطرہ نہ تھا۔ حکومت کے بلند مناصب پر بہترین صلاحیتوں کے مالک افراد متعین تھے اور ایک ایسا منصب داری نظام قائم تھا، جس کے عہدیداروں کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں تبادلے ہوتے رہتے تھے تاکہ ان کی قابلیت سے ہر علاقے کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ بہتر کارکردگی پر انھیں ترقی دی جاتی تھی۔ انگریزی دور کا نظام حکومت، اکبر کے نظام مملکت سے بہت حد تک ہم آہنگ تھا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم پرسیول سپیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

یہ (اکبر کا) مرکزی نظام منصب داری اس امپریل سروس سے اصولی طور پر مختلف نہ تھا، جس کے بل پر انگریزوں نے حکومت کی ❷۔

اکبر کا ایک قابل تعریف کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملک میں بندوبست اراضی کا اہتمام کیا، جس پر تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اب تک عمل کیا جاتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان درحقیقت زرعی ملک ہیں۔ اس سرزمین میں یہ کام بنیادی اہمیت کا حامل تھا اور اکبر نے اس کو شائستہ التفات ٹھہرایا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے اس نے اپنے دو ماہر اور تجربہ کار اہل کاروں، راجا ٹوڈرمل اور امیر فتح اللہ شیرازی کو مامور کیا۔

❶ عالم گیر نامہ، ص ۳۸۷۔

❷ رود کوثر ص ۸۲۔

## اکبر کی مذہبی زندگی کا پہلا دور:

اکبر کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مذہبی زندگی تین ادوار پر محیط ہے۔ پہلا دور ایک اچھے مسلمان کی زندگی کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ چودہ سال کی عمر میں اورنگ ہند پر متمکن ہوتا ہے اور اس سے تقریباً بائیس برس بعد تک ایک باعمل اور پابند شرع مسلمان کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ مذہبی اور دینی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اسی ماحول میں اس نے شعور کی آنکھیں کھولی تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے باپ کی گوناگوں تکلیفوں اور اس کی دشت نوردی کے تمام گوشوں سے خوب آگاہ تھا، جس کے باعث قدرتی طور پر اس کے دل میں نرمی پیدا ہوگئی تھی اور اس پر اللہ کا خوف طاری رہنے لگا تھا۔ جب وہ ماں باپ کے گزشتہ مصائب یاد کرتا اور اس کے مقابلے میں اپنی بادشاہت کا تصور اس کے ذہن میں آتا تو فوراً گردن اللہ کے حضور جھک جاتی اور قلب میں سوز و گداز کی ایک خاص کیفیت کروٹ لینے لگتی۔ تیسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس کے پیش رو یعنی سوری خاندان کے حکمران، شیر شاہ سوری اور سلیم شاہ سوری، مذہب اور دین سے قلبی وابستگی رکھتے تھے۔ اکبر بھی از رۂ مصلحت یا کسی اور وجہ سے ممکن ہے اسی اسلوب حیات کو اختیار کیے رکھنا مناسب سمجھتا ہو۔

بہر کیف وجہ کچھ بھی ہو، اکبر کی زندگی کا یہ عہد تدین و تصوف کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے عصر کے مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، جو فتح پور سیکری میں اقامت گزین تھے۔ اکبر کی ان سے عقیدت خاطر کا یہ عالم تھا کہ ان کی وجہ سے کئی سال فتح پور سیکری کو دارالحکومت کی حیثیت دیے رکھی، تاکہ شیخ کا قرب حاصل رہے اور ان کی دعائیں اس کے شامل حال ہوں۔ اکبر کے کئی لڑکے کم سنی میں فوت ہو گئے تھے۔ شیخ سے بچے کی پیدائش اور زندگی کے لیے دعا کرائی۔ پھر جہاں گیر پیدا ہوا تو حصول برکت کے لیے انہی کے نام پر بیٹے کا نام سلیم رکھا۔ کئی مرتبہ شیخ معین الدین اجمیری کے مرقد پر جانے کے لیے اجمیر کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر اکبر نے بطور ایک نذر کی تکمیل کے فتح پور سیکری یا آگرہ سے پاپیادہ بھی کیا۔ شیخ سلیم کی وفات کے بعد آگرہ سے پاپیادہ ان کے مدفن پر فتح پور سیکری بھی گیا۔

اکبر کے ذوق عبادت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ایک عبادت خانہ تعمیر کرایا۔ جب اس کو بڑی بڑی فتوحات حاصل ہوئیں، حدود مملکت روز بروز وسیع ہونے لگیں، پورے ملک کا نظم و نسق حسب منشا قائم ہوگیا، مکمل امن وامان کی صورت حال پیدا ہوگئی اور کوئی قابل ذکر دشمن اور طاقت ور حریف باقی نہ رہا تو اس کا رجحان پوری طرح عبادت و ریاضت کی طرف ہوگیا۔ ان دنوں اس کی صحبتیں درگاہ اجمیر کے درویشوں اور مجاوروں کے ساتھ رہتیں اور وقت کا زیادہ تر حصہ، اللہ اور رسول ﷺ کی عبادت و اطاعت میں گزرتا۔ علما کی محفلیں، فقہا کی مجلسیں، صوفیا کی صحبتیں اس کی دلچسپی کے مراکز تھیں، جہاں وہ تصوف کی باتیں

کرتا، فقہی مسائل کو سمجھتا، اور علمی مباحث سے محظوظ ہوتا۔ راتوں کو وہ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتا۔ عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق کسی نے اس کو ''یاہو'' یا ''ہادی'' کا وظیفہ بتادیا تھا، وہ عموماً رات کی تاریکی میں یہ وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اکبر کی مجالس تصوف کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وہ صوفیا اور علما کا بڑا ہی معتقد تھا۔ اس کے دل پر اللہ کی عظمت کا بے پناہ اثر تھا۔ اللہ کی عطا کردہ ان بے شمار نعمتوں پر اظہار تشکر کی غرض سے وہ بالعموم ایک قدیم حجرے میں چلا جاتا جو آبادی سے دور اور شاہی محلات سے قریب تھا، بادشاہ اس حجرے کے پتھر کے فرش پر بیٹھ جاتا اور ذکر الٰہی میں مصروف ہو جاتا۔ دیر تک وہاں حالت مراقبہ میں بیٹھا رہتا۔

اکبر بادشاہ ان دنوں حاکم بنگالہ سلیمان سے بھی بہت متاثر تھا۔ اس کے بارے میں اس نے سن رکھا تھا کہ وہ شب کے آخری حصے میں اٹھ کر ڈیڑھ سو علما و مشائخ کے ساتھ تہجد کی نماز باجماعت ادا کرتا ہے۔ بعد ازاں فجر تک علما کی مجلس میں بیٹھتا اور تفسیر و تذکیر میں مصروف رہتا ہے۔ فجر کے بعد ملکی معاملات اور فوج کے بارے میں ضروری مشورے کرتا ہے۔ سلیمان کے ان معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اکبر نے بھی ان دنوں اسی طرح اپنے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ اتفاق سے حاکم بنگالہ سلیمان کی آمد کی خبر بھی مشہور تھی۔ یہ صوفی منش اور صاحب حال بادشاہ تھا۔ صاحب بیعت بھی تھا۔ لوگ اس سے استفاضہ کرتے اور اس کے حلقہ بیعت میں داخل ہوتے تھے۔ اکبر اس کی آمد کی خبر سن کر بہت خوش ہوا اور کچھ معزز مہمان کی تشریف آوری اور کچھ اپنے شوق عبادت کی وجہ سے شیخ عبداللہ نیازی کے حجرے پر ایک بڑی عبادت گاہ تعمیر کرائی۔

اکبر کا معمول تھا کہ جمعے کی نماز کے بعد عبادت خانے میں ایک مجلس منعقد کرتا جس میں علما، مشائخ، امرا ہر طبقے کے لوگ شامل ہوتے۔ اس موقع پر بادشاہ کے قریب بیٹھنے کے لیے حاضرین میں اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا شروع ہو جاتا۔ اس کا علاج اکبر نے یہ کیا کہ سب طبقوں کے لیے الگ الگ نشستوں کا تعین کر دیا۔ فیصلہ کیا کہ امرا مشرقی جانب بیٹھیں اور سادات مغربی جانب۔ علما بجانب جنوب بیٹھا کریں اور مشائخ بجانب شمال۔ اس مجلس میں اکبر کا یہ معمول تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھتا، باری باری ہر طبقے کی نشست گاہ پر جاتا اور ان کی بحثوں میں حصہ لیتا۔

بادشاہ کے دل میں علما و فقہا کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ حسب مدارج ان کی مالی مدد کرتا اور مطالعہ کے لیے ان کو کتابیں بھی عطا کرتا۔ گجرات کی فتح کے موقعے پر اعتماد خاں گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت سی نفیس اور قیمتی کتابیں بطور غنیمت اس کو ملیں تو وہ کتابیں خود بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے اس مجلس میں شریک ہونے والے علما میں تقسیم کیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں، اس موقعے پر بادشاہ نے مجھے بھی کچھ کتابیں دی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب ''انوار المشکوٰۃ'' تھی، جس میں ''مشکوٰۃ الانوار'' کے عنوان سے ایک فصل کا اضافہ بھی

شامل تھا۔ جو کتابیں بچ گئیں، وہ امرا کو دیگر تحائف واشیا کے بدلے میں عطا کیں۔

عبدالقادر بدایونی نے عبادت خانے کی مختلف مجلسوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

''ایک رات اس مجلس میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا اور حاضرین مجلس بلند آواز سے بحث کرنے لگے۔ ان کو خاموش کرانے اور مجلس کا انتظام صحیح رکھنے کے لیے بادشاہ نے مجھے مقرر کیا اور کہا کہ لوگوں کو شور وشغف سے روکو۔ جو شخص ناشائستہ بات کرے، اس کی اطلاع مجھے دو۔ میں اس کو مجلس سے اٹھا دوں گا۔ میں نے آہستہ سے آصف خاں سے کہا، اس طرح تو تقریباً سب کو اٹھا دینا پڑے گا۔ بادشاہ نے پوچھا، کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے جو کچھ کہا تھا، بادشاہ کو بتایا۔ وہ بہت خوش ہوا، اور حاضرین مجلس کو بھی میری یہ بات بتائی[1]۔

اکبر کے اس ابتدائی دور میں علما کو انتہائی قدر ومنزلت حاصل تھی۔ بلاشبہ اس سے قبل شیر شاہ سوری اور سلیم شاہ سوری کے عہد حکومت میں بھی علما کو عزت وتکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن اکبر اس ضمن میں ان سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ اس نے شیخ الاسلام کے اعزاز میں مزید اضافہ کیا۔ مخدوم الملک کو مشیر دربار اور رکن سلطنت بنایا اور صدر الصدور کو وہ اختیارات تفویض کیے جو اس سے پہلے کبھی کسی صدر کے حصے میں نہ آئے تھے۔ اکبر کے عہد میں شیخ عبدالنبی گنگوہی، صدر الصدور کے منصب بلند پر فائز تھے۔ بادشاہ ان کا بے حد عقیدت مند تھا اور بدرجہ غایت احترام سے پیش آتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی سماعت کے لیے کبھی کبھی ان کے گھر بھی جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے جوتے اٹھا کر بھی ان کے سامنے رکھے۔ اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کو باقاعدہ ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل کیا اور اس نے شیخ سے مولانا جامی کی مرتب کردہ چالیس احادیث (چہل احادیث) کا سبقاً سبقاً درس لیا۔ اس زمانے میں اکبر شیخ عبدالنبی کے تقویٰ اور تدین سے بہت متاثر تھا۔ وہ اس کو نیکی کی تلقین کرتے اور مذہب پر راسخ رہنے کی تعلیم دیتے تھے، جس کے باعث اکبر کی یہ کیفیت ہوئی کہ شیخ فرید بھکری کے بیان کے مطابق وہ نماز باجماعت کی پابندی کرنے لگا اور خود اذان دیتا۔ بعض اوقات امامت بھی کراتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔

ایک مرتبہ تو معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اکبر کی جوانی کا زمانہ تھا۔ سال گرہ کی تقریب منعقد ہوئی۔ اکبر زعفرانی لباس زیب تن کر کے محل سرا سے باہر آیا۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی بھی موجود تھے۔ ان کی غیرت دینی جوش میں آئی۔ سر دربار عصا اٹھا کر اس سختی سے اکبر کو ٹوکا کہ عصا کا سرا بادشاہ کے سر کو جا لگا۔ اکبر پاس ادب سے اس وقت تو خاموش رہا، لیکن محل میں جا کر ماں سے شیخ کے طرز عمل کی شکایت کی۔ نیک بخت ماں نے جو حضرت زندہ فیل احمد جام کی اولاد سے تھیں، سعادت مند بیٹے سے کہا: بیٹا یہ خفگی اور شکایت کا مقام نہیں۔ تمھارے لیے ذریعۂ نجات ہے۔ کتابوں میں لکھا جائے گا کہ ایک بوڑھے عالم نے اتنے بڑے صاحب اقتدار

[1] منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۲۰۲۔

بادشاہ کو عصا مارا اور بادشاہ فقط ادب شرعی کی بنا پر صبر کر کے برداشت کر گیا۔ اس سلسلے میں ذخیرۃ الخوانین کے اصل فارسی الفاظ پڑھیے:

دریں اثنا سال گرہ حضرت خلیفہ بود، برلباس خاصہ ایشاں زعفران پاشیدہ بودند۔ شیخ عبدالنبی در غضب آمدہ درروی دیوان عصا بحضرت خلیفہ الٰہی انداخت و بدامن دولت ایشاں رسیدہ پارہ شد کہ چرالباس اہل بدعت و نامشروع پوشیدہ و درآں وقت حضرت عرش آشیانی لباس مسنون می پوشیدند و در جریان امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہایت جدوجہد داشتند، حتی اذان خود فرمودہ امامت می کنانیدند، بلکہ جاروب مسجد رامی دارند، وایں شخص (عبدالنبی) آنحضرت رابسیار تنگ گرفتہ بودند، بادشاہ چوں پیش والدہ خود حضرت مریم مکانے کہ از اولاد حضرت زندہ فیل احمد جام بود، رفتہ، شکایت کردند کہ درروی دیوان عصا بمن زدہ، اگر مدعا امر معروف بود باید درخلوت نصیحت می کردند۔ بیگم گفتند کہ بوتم از وقوع ایں امر در خاطرت گراں نیاید، کہ مقصود شیخ اظہار تجمل خود نہ بود بلکہ اجرائے احکام شرعی می کرد، حق تعالیٰ شمارا از عقوبت اخروی کہ خلائق اولین وآخرین درروز جزا جمع می آیند نگاہ داشتہ، ایں حکایت تادور قیامت باقی می ماند کہ ملائے مفلوک امر معروف با بادشاہ عصر چنیں نمود۔ حضرت خلیفہ الٰہی کہ کوہ وقار بودند بہ شیخ عبدالنبی چیزے نگفتہ ❶۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جن بزرگان دین سے اکبر کو بے پناہ عقیدت تھی، ان میں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر رحمہ اللہ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ وہ ان کے مدفن پر دعا کے لیے حاضر بھی ہوا تھا۔ اکبر سے پہلے شیخ فریدالدین کے مسکن کا نام اجودھن تھا، اکبر نے ازراہ عقیدت اس کو پاک پتن کے نام سے موسوم کیا۔ اس زمانے میں اجودھن کو ایک گاؤں کی حیثیت حاصل تھی اور وہ دریائے ستلج کے کنارے واقع تھا۔

بادشاہ نے بہت سے لوگوں کو اپنے خرچ سے حج بیت اللہ کے لیے بھی بھیجا۔ رجب ۹۸۵ھ/ اکتوبر ۱۵۷۷ء میں حجاج کا ایک قافلہ روانہ کیا، جس کا امیر شاہ ابوتراب کو مقرر کیا، جو شیراز کے مشہور بزرگ اور شاہان گجرات کے مرشد تھے۔ ان کے ساتھ اعتماد خاں گجراتی کو بڑی رقم دے کر مکہ معظمہ بھیجا اور عام منادی کرادی کہ جو شخص چاہے اس قافلے کے ساتھ حج کے لیے جا سکتا ہے۔ یہ قافلہ بادشاہ نے میرٹھ سے ترتیب دیا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ میں نے بھی صدر الصدور شیخ عبدالنبی سے درخواست کی کہ میرے لیے بھی بادشاہ سے حج پر جانے کی اجازت لے دی جائے۔ شیخ نے مجھ سے سوال کیا۔ ''کیا تمھاری والدہ زندہ ہیں''؟ میں نے کہا ''ہاں۔'' انھوں نے کہا ''تمھارا کوئی بھائی یا ایسا عزیز ہے جو تمھارے بعد ان کی خدمت کرتا رہے''؟ میں نے کہا: ''نہیں صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔'' شیخ نے فرمایا: ''اگر تم والدہ سے اجازت حاصل کر لو، تو بہتر ہو گا۔'' اس سے آگے بدایونی کہتے ہیں: ''غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر

❶ ذخیرۃ الخوانین، ج ۱ ص ۶۹۔

حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں۔"

بہر حال اکبر کا پہلا اور ابتدائی دور خالص مذہبی اور دینی دور تھا اور اس کا دربار علما کا مرکز بن گیا تھا۔ اس میں ملک اور بیرون ملک کے بہت سے اہل علم موجود تھے۔ بادشاہ حسب مراتب سب کا احترام کرتا اور ان کے اکرام و احترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ تفصیل کا یہ محل نہیں۔ اس سلسلے کے متعدد واقعات، منتخب التواریخ، طبقات اکبری، ذخیرۃ الخوانین، مآثر رحیمی، عالم گیر نامہ اور دیگر کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔

## دوسرا دور:

سن جلوس کے تیئسویں سال کے آواخر (۹۸۵ھ/ ۱۵۷۷ء) اور چوبیسویں سال کے اوائل (۹۸۶ھ/ ۱۵۸۷ء) میں جب اکبر سینتیس، اڑتیس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کی مذہبی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اب اس کے ذہنی افکار کے قافلے نے ایک نیا موڑ کاٹنا شروع کر دیا ہے اور اس کے قلبی رجحانات کا کارواں نئی منزل کی طرف چل نکلا ہے جو اس کے سفر حیات کی ابتدائی سمتوں سے مختلف ہے۔ یعنی اس نے اپنے آبا و اجداد کے صحیح مذہبی تصورات سے انحراف کی راہیں تلاش کرنے کی ٹھان لی ہے اور دینی و اسلامی روایات کو، جو مغل اسلاف سے اس کو ورثے میں ملی تھیں، ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اکبر کی زندگی کا یہ نیا پہلو، جسے دور ثانی سے تعبیر کرنا چاہیے، صحیح العقیدہ مسلمانوں کے لیے نہایت ذہنی کوفت کا باعث تھا۔ اس زمانے میں بادشاہ بے شمار لوگوں سے متاثر ہوا، اور بہت سے افراد نے اس کے فکر و عمل کے متعینہ خطوط کو بدلنے میں بھرپور حصہ لیا۔ ان میں ایک پرکھوتم برہمن تھا۔ اس کے بعد دیوی برہمن کا نام آتا ہے۔ ان برہمنوں نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے اسرار بت پرستی سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ آتش پرستی، آفتاب پرستی اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے۔ نیز مشرک بادشاہوں اور ہندوؤں کے خیالی دیوتاؤں کی عظمت و تکریم اس کے ذہن نشین کرائی۔ یہ سب باتیں انھوں نے اس انداز سے بادشاہ کے کانوں میں ڈالیں کہ وہ ہندوؤں کے عقیدۂ تناسخ کا قائل ہو گیا۔

انہی دنوں شیخ تاج الدین بن شیخ زکریا اجودھنی دہلوی، بادشاہ سے خلوت میں ملا۔ اسے اکثر صوفیا "تاج العارفین" کہتے تھے اور وہ شیخ امان اللہ پانی پتی کا شاگرد تھا، جن کا اصل نام عبدالملک تھا۔ یہ شخص شرعی پابندیوں کو صحیح نہ سمجھتا تھا اور اس دور کے بعض گمراہ صوفیا کی طرح وحدت الوجود کا سختی سے قائل تھا۔ اکبر معمولی پڑھا لکھا اور خام فکر شخص تھا۔ تاج الدین نے اس کے سامنے دوزخ، جنت، ملائکہ، شیطان وغیرہ کی اس اسلوب سے تاویلیں کیں کہ بادشاہ اس سے متاثر ہو گیا۔ پھر اس نے ابن عربی کے عقیدۂ ترجیح رجا علی الخوف اور فرعون کے قبول ایمان وغیرہ کی اس ڈھنگ سے بادشاہ کے سامنے تشریح کی کہ وہ صوفیا کی ان شطحیات پر یقین کرنے لگا اور عقیدۂ وحدت الوجود سے متاثر ہو گیا۔

شیخ تاج الدین نے ''انسان کامل'' کا تصور بھی بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور پھر اس ''انسان کامل'' کو خلیفہ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر بادشاہ کو اس کا مصداق ٹھہرایا۔ انسان کامل کے بعد اس کو عین واجب یعنی ذات خداوندی کا درجہ دیا۔ پھر اس کے حضور سجدہ ریز اور زمین بوس ہونے کو ضروری قرار دیا اور اس کے اعزاز و احترام کو یہاں تک بڑھایا کہ اسے ''کعبۂ مرادات'' اور ''قبلہ حاجات'' بنا دیا گیا۔

ایک اور بزرگ ملا محمد یزدی بادشاہ کے سامنے اپنے عقیدے کی تبلیغ و اشاعت کرنے لگے۔ انھوں نے خلفائے ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف طنز وطعن کا سلسلہ شروع کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف اور علمائے خلف سب کی تکفیر کی مہم کا آغاز کیا اور بادشاہ کی نظر میں اہل سنت کے علما وعقیدہ کا درجہ ختم کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ سب سے بہتر شیعہ مذہب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ شیعیت سے متاثر ہو گیا۔ یاد رہے یہ وہی ملا محمد یزدی ہیں جنھوں نے بعد میں بادشاہ کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا اور اس کے خلاف خروج و بغاوت کو جائز قرار دے دیا تھا۔

اس زمانے میں عیسائی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ان کے پادریوں نے دربار میں آمد ورفت شروع کی اور اکبر کو اپنے افکار وتصورات سے متاثر کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ انھوں نے بادشاہ کو عقیدۂ تثلیث سے متعارف کرایا اور انجیل کے احکام کی صحت اس کے دل میں ڈالی۔ عبدالقادر بدایونی کے بقول بادشاہ کی نظر التفات نے جو بزعم خود حق پرستی کے لیے دنیا بھر کی گمراہیوں کا خریدار بنا ہوا تھا، عیسائی پادریوں کو بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ ان کے عقیدۂ تثلیث کی تصدیق کی اور عیسائی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ بادشاہ کے حکم سے شہزادہ مراد نے ان دنوں عیسائی پادریوں سے انجیل کے چند سبق پڑھے اور ابوالفضل کو انجیل کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ آہستہ آہستہ ان عیسائی پادریوں کی جسارت یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے دجال ملعون کی عادات قبیحہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ میں نعوذ باللہ مشابہت پیدا کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اکبر کے ارکان سلطنت میں بیربر ایک نہایت خطرناک شخص تھا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے آفتاب کے اوصاف بیان کرنا شروع کیے اور بتایا کہ دنیا کی ہر شئی آفتاب کی رہین منت ہے اور اسی کے نتیجے میں سب کچھ ظہور میں آتا ہے، اس لیے آفتاب پرستی ضروری ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس عقیدے کو بھی پسند فرمایا۔ اور اس ''نیر اعظم'' کی جو ''عطیہ بخش ہمہ عالم'' اور ''مربی بادشاہاں'' ہے، پرستش شروع کر دی۔

انہی دنوں گجرات کے ایک شہر نوساری سے آتش پرستوں کا ایک گروہ اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے دربار میں پہنچا۔ انھوں نے زردشت کے دین کو صحیح دین کی صورت میں اکبر کے سامنے پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت قرار دیا۔ چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ محل میں شب وروز آگ جلتی رہے، کیوں کہ آگ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار کا ایک پرتو ہے۔

اس آتش کدے کا انتظام ابوالفضل کے سپرد کیا گیا۔

پچیسویں سال جلوس کے نوروز کے موقعے پر اکبر نے سب کے سامنے آفتاب اور آتش کو سجدہ کیا۔ قشقہ لگایا اور اسلام کی برسر عام مخالفت کی اور اسے خلاف عقل وفہم ٹھہرایا۔

ملا مبارک ناگوری جو خود بہت بڑا عالم تھا، علما کی سخت مخالفت کرنے لگا۔ اس کے دولڑکے ابوالفضل اور فیضی بھی پوری قوت کے ساتھ میدان میں نکل آئے اور اسلام، دین حق اور علمائے شرع متین کی جس قدر مخالفت کر سکتے تھے، کرنا شروع کر دی۔ ان لوگوں کی مدد اور انگیخت سے اکبر نے ایک خاص کلمہ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ ایجاد کیا، جزیہ منسوخ کر دیا اور احکام شرع کی علانیہ مذمت اور مخالفت ہونے لگی۔ ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء میں اکبر کو امامت ونبوت کا اعزاز بھی دے دیا گیا اور اسے ''صاحب دین حق'' بنا دیا گیا۔ جلوس کے اٹھائیسویں سال تو وہ اس سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اب اسے خدا کا اوتار سمجھا جانے لگا۔ اس عرصے میں جو بے شمار بدعات پھیلیں اور دین اسلام کی جو توہین ہوئی، اس کی تفصیلات عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں بیان کی ہیں۔ ان مختصر سطور میں ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ کتے اور خنزیر کو پاک قرار دے دیا گیا، غسل جنابت کو حرام ٹھہرا دیا گیا۔ مردوں کے لیے سونے کے زیور اور ریشم کا لباس جائز ثابت کر دیا گیا۔ عربی زبان کی مخالفت ہونے لگی۔ مسائل دینی کا تمسخر اڑایا جانے لگا۔ ذبیحہ گاؤ بند کر دیا گیا۔ داڑھی ترشوانے اور منڈھوانے کے جواز کا اعلان کر دیا گیا۔ علما کا ایک محضر طلب کیا گیا، ان میں سے بعض نے برضا ورغبت اور بعض نے بجبر واکراہ اس پر دستخط ثبت کیے۔ اس کے بعد اسلامی احکام کی برسر عام توہین ہونے لگی اور غیر اسلامی رسوم وعوائد کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کر دی گئیں۔ اختصار کے ساتھ یوں سمجھیے کہ جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز کا درجہ دے دیا گیا۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام میں بدل دیا گیا۔ قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر اعتراضات کیے گئے اور اسے مخلوق قرار دیا گیا۔ وحی کو امر محال ٹھہرایا گیا۔ نبوت ورسالت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے گئے۔ معجزات کا انکار کیا گیا اور بعد از موت بقائے ارواح اور عذاب وثواب کو صرف تناسخ پر منحصر کر دیا گیا اور ان غلط افکار وخیالات کی خوب تشہیر کی گئی۔

اس زمانے میں بہت سے امرائے مملکت، علمائے دین اور ارکان حکومت نے بادشاہ کے اس طرز عمل کی مخالفت کی اور نہایت سختی کے ساتھ کی، مگر ان میں سے بعض کو دور دراز علاقوں میں تبدیل کر دیا گیا، بعض کو قید میں ڈال دیا گیا، بعض کو قتل کرا دیا گیا، بعض کو حج کے بہانے حجاز بھیج دیا گیا، بعض کے وظیفے بند کر دیے گئے اور بعض کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی گئی۔ بہر حال اصحاب دین اور ارباب غیرت وحمیت کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش اور بدرجہ غایت ابتلا کا وقت تھا۔ اس کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے:

بادشاہ نے قطب الدین محمد خاں، شہباز خاں کنبوہ اور اس مرتبے کے دیگر امرا کو اسلام کی اطاعت ترک کر دینے اور اپنے نئے ایجاد کردہ دین کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تو ان امرا نے جرأت سے کام لے کر بادشاہ کے اس حکم کو رد کر دیا۔ قطب الدین محمد خاں نے کہا کہ شاہان ولایت خلیفہ روم وغیرہ یہ باتیں سنیں گے تو

کیا کہیں گے۔ وہ تو سب اسی اسلام پر ایمان رکھتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں، جس کی تعلیم اللہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو دی گئی ہے اور ہمیں اسی کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ اکبر نے اس بات پر نہایت خفگی کا اظہار کیا اور کہا تم روم کے فرماں روا کی خاطر ہمارے ساتھ اس قدر درشتی سے بات کر رہے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ اور اسی کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں تمھیں اعزاز و مرتبہ حاصل ہوگا۔

شہباز خاں کنبوہ نے بھی بادشاہ کے فرمان کی سختی سے مخالفت کی اور بیربر کو جو علی الاعلان اسلام پر طعنہ زنی کرتا تھا، سب کے سامنے سخت برا بھلا کہا اور ان الفاظ سے مخاطب کیا:

''اے ملعون کافر، اب تیری بھی زبان نکل آئی کہ ایسی باتیں کرنے لگا۔ ہم تجھے اس کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہیں گے۔''

ائمہ اور علما کے اعزاز یا تو گھٹا دیے گئے یا بالکل ختم کر دیے گئے۔ مسجدیں ویران ہو گئیں، دینی مدرسے اجڑ گئے اور شرفا کو ذلیل کیا گیا۔ اس سلسلے میں حکیم الملک اور ابوالفضل کے درمیان شدید تلخ کلامی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ ابوالفضل کو ''فضلہ'' کے نام سے پکارنے لگے۔ بادشاہ چونکہ ابوالفضل کی بہت عزت کرتا تھا، اس لیے حکیم الملک پر بڑا تشدد کیا گیا اور بالآخر انھیں مکہ معظّمہ کی طرف چلے جانے کا حکم دے دیا۔

ملا محمد یزدی کو جون پور کا قاضی القضاۃ مقرر کر کے بھیج دیا اور محمد معصوم خاں فرنخودی جو جون پور کی حکومت پر متعین تھا، دربار میں طلب ہوا اور دوبارہ اسی عہدے پر واپس بھیج دیا گیا۔ ملا محمد یزدی پہلے بادشاہ کے حامی تھے، اب سخت مخالفت پر اتر آئے تو انھیں جون پور بھیج دیا گیا، انھوں نے جون پور کا منصب قاضی القضاۃ سنبھالنے کے بعد بادشاہ کے خلاف خروج اور بغاوت کا فتویٰ جاری کیا۔ اس فتوے سے متاثر ہو کر محمد معصوم کابلی، محمد معصوم فرنخودی، میر معز الملک، نیابت خاں، عرب بہادر اور دوسرے امیروں نے تلواریں کھینچ لیں اور بادشاہ سے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ اکثر مقامات پر انھوں نے سخت لڑائیاں لڑیں۔ ائمہ مساجد اور بہت سے لوگوں نے ان کا پوری طرح ساتھ دیا۔ بنگال میں قاضی یعقوب نے بھی بادشاہ کی مخالفت کی۔ کچھ روز بعد بادشاہ نے ان میں سے اکثر کو کسی نہ کسی بہانے قتل کرا دیا۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ اس طرح اور بہت سے علما و مشائخ کو شدید اذیتیں پہنچائی گئیں۔ متعدد علما و امرا کو مختلف علاقوں میں منتشر کر دیا گیا۔ لاہور کے علما کو بھی مختلف مقامات پر بھیج دیا، مثلاً قاضی صدرالدین جالندھری لاہوری کو، جن کو مرتبہ علمی مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری سے بھی زیادہ تھا، لاہور سے بدل کر بھڑوچ اور گجرات کے منصب قضا پر متعین کر دیا۔ ملا عبدالشکور گول دار کو جون پور روانہ کر دیا اور ملا محمد معصوم کو بہار کی قضاءت پر مامور کر دیا۔ شیخ منور کو لاہور سے منتقل کر کے صوبہ مالوہ کی صدارت پر فائز کر دیا۔ لاہور میں صرف مولانا معین کے پوتے شیخ معین رہ گئے، جو مشہور واعظ تھے۔ بادشاہ نے کبرسنی کی بنا پر انھیں نظر انداز کر دیا۔ اس عالم دین نے ۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء میں وفات پائی۔

اکبر نے یہ طرز حیات کیوں اختیار کیا اور اس اسلوب زندگی کو کس بنا پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا؟ اس کی کئی وجوہ ہیں۔

ایک یہ کہ اکبر کو حصول علم کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ اپنے آباواجداد کی طرح عالم نہ تھا۔ نہ اس کے باپ کو کہیں جم کر بیٹھنے کی سہولتیں میسر آئیں اور نہ اکبر کو تعلیم کے مواقع حاصل ہوئے۔ وہ ان پڑھ تھا، لیکن مسائل سمجھنے کا شائق اور ذہن کو تلاش وجستجو میں مصروف رکھنے کا عادی تھا۔ مسلمان، ہندو، عیسائی، مجوسی، ہر مذہب کے لوگوں کو آپس میں بحث وتکرار میں الجھا دیتا تھا۔ خود علمی اور تحقیقی معلومات سے کورا تھا۔ مختلف لوگوں کی باتیں سن کر ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا اور اس کی بے علمی سے علمائے سوئے، جن میں ملا مبارک، تاج الدین دہلوی، ابوالفضل اور فیضی خاص طور سے قابل ذکر ہیں خوب فائدہ اٹھایا اور اس کو گمراہ کرنے میں دوسروں کے علاوہ یہ لوگ بھی پیش پیش تھے۔

دوسرے یہ کہ دربار میں مختلف مسائل کو علما اس انداز سے موضوع بحث ٹھہراتے تھے اور عبادت خانے میں اس طرح سلسلہ بحث جاری رہتا تھا کہ بادشاہ ان سے بدظن ہو گیا اور ملا مبارک وغیرہ نے اس کی ذہنیت کو سمجھ کر اسے مزید غلط راہوں پر ڈال دیا۔

تیسرے یہ کہ ہندوستان پر حکومت قائم اور مستحکم رکھنے کے لیے اس نے ضروری سمجھا کہ ہر مذہب کے لوگوں کو خوش رکھا جائے اور فکر وعمل کے لحاظ سے صلح کل رویہ اختیار کیا جائے۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے جو اکبر کا امام نماز اور مشہور عالم تھا، اس سلسلے کی تمام تفصیلات بیان کی ہیں۔

برصغیر کی علمی وفکری تاریخ کے بعض ماہرین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مذہبی سلسلے سے متعلق جو باتیں عبدالقادر بدایونی نے اکبر کی طرف منسوب کی ہیں، وہ بڑی حد تک مبالغہ آمیز ہیں اور اس کے بیان کردہ بہت سے واقعات کے بارے میں باقی معاصر کتب تاریخ خاموش ہیں۔ وہ حضرات دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکبر پر آزاد خیالی کا ایک دور ضرور آیا، لیکن اس کو اکبر کے ترک مذہب اسلام اور نئے دین کی ایجاد واختراع سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مخالفت کے خطرے کے پیش نظر اکبر نے جن امرا و علما کو دور دراز علاقوں اور صوبوں میں بھیج دیا تھا، بدایونی اسے جلاوطنی سے تعبیر کرتا ہے، حالانکہ اس پر جلاوطنی کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پھر اس کا انداز منفی ہے، مثبت نہیں ہے۔ وہ ایسے واقعات کہیں سے ڈھونڈ نکالتا ہے، جو مخالفت اور نفی پر دلالت کناں ہیں۔

اس باب میں ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ صرف یہ عرض کریں گے کہ اکبر ہندوستان کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ عبدالقادر بدایونی اس کا ایک ملازم تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے عصر کا بہت بڑا عالم، مؤرخ اور مترجم تھا۔ طنز وتعریض کا بادشاہ تھا، حاضر جواب اور صاف بیان تھا۔ اکبر اس کے علم وفضل اور تعبیر وترجمہ کی خوبیوں سے بہت متاثر بھی تھا، لیکن یہ کہنا قرین فہم نہیں کہ وہ ایک زبردست اور مطلق العنان بادشاہ کے بارے

میں اور خود اسی کے عہد اور ملک میں اس درجہ بے باک ہو گیا ہو، یا غلط بیانی پر اتر آیا ہو، یا اس قدر مبالغہ آرائی کو اس نے اپنا شیوہ بنا لیا ہو۔

دوسری بات جس کا تعلق امرا و علما کے تبادلے سے ہے اور بدایونی ان انتظامی مصلحتوں کو جلاوطنی قرار دیتا ہے تو اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ وہ علاقے ان کے اصل علاقوں سے طویل مسافت پر واقع تھے اور اس زمانے میں آمد و رفت کے ذرائع نہایت مشکل اور صبر آزما تھے۔ پھر وہاں کا ماحول ان کے لیے بالکل اجنبی تھا، اور یہ تبادلے بطور سزا کیے گئے تھے، لہٰذا بدایونی اس پس منظر میں اگر اس پر جلاوطنی کا لفظ استعمال کرتا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض یا اتنی غلط بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ تو حقیقت ہے کہ اس دور میں جن علما اور امرا کو بادشاہ نے حج پر بھیجا تھا، اس کی تہہ میں ضرور جلاوطنی کا تصور موجود تھا۔

سزا کے طور پر اب بھی مختلف جمہوری حکومتیں مختلف افسروں کے تبادلے کرتی رہتی ہیں اور وہ افسران تبادلوں سے نالاں ہوتے ہیں۔

رہا بدایونی کا منفی انداز بیان، تو اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ وہ ہر مقام پر یہ انداز اختیار نہیں کرتا، اسی مقام پر کرتا ہے، جہاں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

بدایونی کے علاوہ عہد اکبری کے معاصر مؤرخین بخشی نظام الدین (مصنف طبقات اکبری) ابوالفضل (مصنف آئین اکبری و اکبر نامہ)، اسد بیگ (مصنف اکبر نامہ) ہیں۔ یہ بھلا اس قسم کے واقعات کیوں کر ضبط تحریر میں لا سکتے تھے۔ رہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مصنف تاریخ حقی) اور ان کے بیٹے شیخ نور الحق (مصنف زبدۃ التواریخ) انھوں نے اس دور کے حالات سے بحث تو کی ہے، مگر ان کی حیثیت کچھ اور قسم کی ہے۔ بدایونی نے منتخب التواریخ چھپ چھپا کر لکھی اور کسی کو بتائے بغیر واقعات قلم بند کرتے رہے۔ ظاہر ہے ان کا بنیادی مقصد ہر ممکن طریقے سے صحیح حالات کی عکاسی یا (کم از کم) ان کی نشان دہی کرنا تھا، اور وہ اس میں کامیاب ہیں۔

بہرحال بدایونی بے شک طناز مصنف ہے اور سخت مذہبی رجحانات کا حامل ہے، لیکن چوں کہ وہ اکبر کا معاصر، اس کا امام نماز، ملازم اور واقعات کا چشم دید گواہ ہے، لہٰذا اس کی بات کی آسانی سے تغلیط یا تردید نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ ذہن تصدیق ہی کی طرف جاتا ہے۔

حیات اکبر کے دوسرے دور حکمرانی کا اصل المیہ یہ ہے کہ بادشاہ کے زیادہ تر اور مؤثر ترین ارکان سلطنت یا تو غیر مسلم تھے یا وہ ''مسلمان'' جو اپنی خاص مصلحتوں کی بنا پر اسے اسلام سے قطعی دور رکھنا چاہتے تھے۔ واقعات کی رفتار کے تسلسل سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب رہے اور بادشاہ کو اسلام اور اس کے احکام و اوامر سے بہت دور لے گئے۔ بے شبہ اس دور میں بھی اکبر کے دربار میں اور مختلف بلاد و امصار کے اہم مناصب پر اسلام کا صحیح درد رکھنے والے امرا و علما متعین تھے، لیکن ان کی آواز بہت حد تک بے اثر ہو کر رہ گئی تھی۔

## تیسرا اور آخری دور:

اب اکبر کی مذہبی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے، جسے آخری دور کہنا چاہیے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ دربار پر پابند شرع ارکان سلطنت قابض ہیں اور خود بادشاہ کا اسلوب فکر اور طرز حیات بھی بدلا ہوا ہے۔ یا ممکن ہے بادشاہ میں ابھی اتنی ذہنی تبدیلی نہ آئی ہو، لیکن ارکان حکومت یقیناً بدلے ہوئے ہیں۔ پہلے ارکان حکومت اور مشیران بادشاہ یا تو موت سے ہم کنار ہو گئے ہیں یا اپنا اثر و رسوخ کھو چکے ہیں۔

اکبر کے اس آخری عہد میں اس کا رضاعی بھائی خان اعظم مرزا عزیز کوکہ وکیل مطلق اور امیر الامرا تھا۔ دربار کا یہ سب سے بااثر اور صاحب اقتدار امیر تھا۔ بادشاہ کی مہر اسی کی تحویل میں تھی۔ ایک اور رکن سلطنت بخشی الملک نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید تھا جو بڑا معاملہ فہم، دیانت دار اور بہادر تھا۔ اکبر اس پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ دین و مذہب سے وہ انتہائی وابستگی رکھتا تھا۔ لاہور کا گورنر قلیچ خاں بڑا پابند شرع اور متدین امیر تھا۔ اس کی ایک بیٹی اکبر کے بیٹے دانیال کے عقد میں تھی۔ مرزا عبدالرحیم خان خاناں دکن میں تھا۔ یہ کسی قدر آزاد منش امیر تھا۔ لیکن خواجہ باقی باللہ کا مداح تھا اور ذہنی طور پر ان امرائے اکبری سے تعلق رکھتا تھا، جو حالات کا صحیح طور سے جائزہ لینے کے عادی تھے اور معاملات کو اعتدال کے دائرے میں رکھنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں اور بھی بہت سے امرا و علما موجود تھے، جن سے اکبر متاثر ہوا، اور حالات کی رفتار میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

اکبر کی ذہنی تبدیلی کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت ایشاں (المدفون لاہور) بادشاہ کے آخری عہد میں آگرہ گئے۔ ان کے صاحب زادے خواجہ معین الدین کشمیری اپنی تصنیف مرأۃ طیبہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت ایشاں آگرہ پہنچے تو خان اعظم سمیت کئی امرا ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ شاہی خاندان کی متعدد خواتین نے بھی ان کی بیعت کی۔ ان خواتین میں ایک سلیمہ سلطان بیگم تھیں جو اکبر کے حرم میں تھیں۔ دوسری گلرخ بیگم تھیں، جن کی بیٹی سے اکبر نے اپنے بیٹے سلیم کی شادی کر دی تھی۔ گلرخ بیگم نے فرط عقیدت سے حضرت ایشاں کے لیے ایک جامہ اس انداز سے سی کر دیا کہ ایک ایک ٹانکے پر کلمہ شریف پڑھا گیا۔ خواجہ معین الدین بیان کرتے ہیں کہ اکبر نے حضرت ایشاں خواجہ خاوند محمود سے اپنی فلاح کے لیے دعائے خیر (فاتحہ) کی درخواست کی[1]۔

فیضی وفات پا چکا تھا۔ طریقہ اکبری کے مطابق ابوالفضل کو بادشاہ کے خلیفہ اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور دربار میں اکبر کے نزدیک سب سے زیادہ قابل اعتماد شاید ابوالفضل ہی تھا۔ لیکن آخری عہد میں حالات بالکل بدل چکے تھے۔ اکبر اور ابوالفضل میں اس انداز سے باہمی بدگمانیوں نے جنم لیا کہ دونوں ایک دوسرے

---

[1] ،، ،، نوشہ، ص ۱۴۰۔ بحوالہ مرأۃ طیبہ۔

سے دور ہو گئے اور ابوالفضل نے دربار میں جانا بند کر دیا۔ بلکہ اس دوران وہ خودکشی کرنے یا خانہ بدوش ہو جانے کے بارے میں بھی غور کرتا رہا۔ دربار اکبری کے جو ارکان ابوالفضل کے اثر و رسوخ اور طرزِ عمل سے پریشان تھے، انھوں نے جہاں گیر کو بھی واقعات کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا تھا۔ جہاں گیر نے ابوالفضل کے بارے میں بعض ایسی باتیں بادشاہ کے گوش گزار کیں کہ بادشاہ ان سے متاثر ہو گیا اور جہاں گیر کو حق بجانب ٹھہرایا۔ اب ابوالفضل نے دربار میں جانا بالکل بند کر دیا۔ لیکن بعد کو پھر آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان دنوں ابوالفضل کے زیادہ مخالفوں میں خان اعظم اور شیخ فرید شامل تھے۔ خود جہاں گیر بھی اس کا شدید مخالف تھا، اور اس کی مخالفت سب سے زیادہ موثر اور ابوالفضل کے لیے اذیت رساں تھی۔

اس سے دو تین سال بعد دربار کے متشرع ارکان کی مخالفتوں کی بنا پر ابوالفضل کو دکن بھیجا گیا۔ وہاں کچھ عرصے بعد بادشاہ بھی گیا تو دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ محاصرۂ اسیر گڑھ کے موقعے پر بھی ابوالفضل بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اسیر گڑھ کی فتح کے بعد اکبر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو خان خاناں نے جو دکن کی مہم پر مامور تھا، بادشاہ سے درخواست کر کے ابوالفضل کو وہیں روک لیا۔ اکبر تو آگرہ آ گیا، بعد میں خان خاناں نے ابوالفضل کو نہایت پریشان کیا۔ اس پریشانی کا اظہار وہ صاف الفاظ میں اپنے مکتوبات (رقعات ابوالفضل) میں کرتا ہے۔ قیامِ دکن کے دور میں اپنی مختلف ذہنی پریشانیوں کا اظہار، ان مکتوبات میں بھی کرتا ہے جو اس نے شہزادوں، شہزادیوں، بادشاہ کی بیوی اور والدہ کے نام لکھے۔ وہ ان سے درخواست کرتا ہے کہ بادشاہ سے کہو کہ وہ اسے دکن سے واپس بلا لے۔ ایک خط میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ میں کئی درخواستیں بادشاہ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں، لیکن خان خاناں کے وہ حامی جو دربار میں موجود ہیں میری درخواستیں بادشاہ تک نہیں پہنچنے دیتے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ میں بادشاہ کو ہزار تاکید سے لکھتا ہوں کہ سپہ سالار اور سرداروں کے تبادلے کیے جائیں، لیکن بخشی الملک شیخ فرید خاں اس کے خلاف مشورہ دیتا ہے اور اس کا مشورہ مان لیا جاتا ہے۔ میرا مشورہ مسترد کر دیا جاتا ہے۔

اب ابوالفضل ایک سخت مصیبت سے دوچار ہوتا ہے جو اس کی زندگی کی آخری مصیبت ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جہاں گیر کی اپنے باپ اکبر سے مخالفت ہو گئی، جو یہاں تک پہنچی کہ جہاں گیر نے الہ آباد میں بیٹھ کر اپنی بادشاہت کا سامان فراہم کر لیا۔ دربار کے کئی بااثر امرا جو اکبر کے خیالات سے متفق نہ تھے اور جہاں گیر سے ذہنی طور پر ہم آہنگ تھے، ان کی ہمدردیاں ظاہر ہے، جہاں گیر کے ساتھ تھیں۔ ان حالات میں اکبر کو ابوالفضل کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے ابوالفضل کو لکھا کہ اپنا کام اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے سپرد کر کے فوراً آگرے پہنچ جاؤ۔ اکبر کے اس پیغام کی اطلاع کسی نے جہاں گیر کو بھی دے دی۔ اسے خدشہ ہوا کہ اگر ابوالفضل دربار میں چلا گیا تو کئی مشکلات پیدا ہوں گی۔ اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے بندھیلہ کے راجا نرسنگھ دیو کو خط لکھا کہ ابوالفضل دکن سے آگرہ جاتے ہوئے تمھارے علاقے سے گزرے

گا، جس طرح ممکن ہو، اس کو ختم کر دو۔ اس کے بدلے میں تمھیں بڑی مراعات دی جائیں گی۔ چنانچہ اس نے، تین چار ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر ابوالفضل کا راستہ روک لیا۔ ادھر ابوالفضل کے ساتھ بھی ایک مسلح جماعت تھی، مقابلہ ہوا، ابوالفضل مارا گیا اور اس کا سر جہانگیر کے پاس بھیجا گیا اور جسد گوالیار میں دفن کر دیا گیا۔ اس طرح ابوالفضل اپنے انجام کو پہنچا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اکبر کے آخری دور میں اس کے مذہبی افکار میں بتدریج تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ پہلے اکبر کا ذہن تو شاید نہ بدلا ہو لیکن اس کے درباری امرا اور ارکان سلطنت ضرور بدل گئے تھے اور وہ، وہ نہ رہے تھے جو مذہب یا بالفاظ دیگر اسلام سے برگشتہ تھے۔ اس کا اندازہ مسٹر سی، ایچ پین کی تصنیف ''اکبر اینڈ دی جیسوٹس'' کے اس اقتباس سے ہوتا ہے جو ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے درج کیا ہے۔ مسٹر پین کا بیان ہے ''گوا سے اکبر کے دربار میں تین مرتبہ پادری بھیجے گئے۔ دوسری مرتبہ جو مشن یہاں آیا وہ ناکام رہا۔ اس ناکامی کا ذکر اس نے اپنی رپورٹ میں کیا ہے۔'' مسٹر پین اس رپورٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ پادریوں کے متعلق اکبر کا اپنا طرز عمل کچھ بھی ہو، اس کے امراء یقیناً ان کے مخالف تھے۔ بہت ممکن ہے کہ پادریوں نے اس خوش اخلاقی اور تدبر کا ثبوت نہ دیا ہو، جس کی صورت حال متقاضی تھی اور نتیجتاً امرا کی مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ مشن کو جاری رکھنا بے سود ہو گیا ❶۔''

یہی مصنف ایک پرتگیز پادری زیویر کا واقعہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس نے دربار میں تقریر کی تو دربار میں بیٹھے ہوئے مسلمانوں نے اس پر نہایت خفگی کا اظہار کیا، کیوں کہ اکبر کے مذہبی خیالات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس کے آخری عہد میں دربار اور معاملات سلطنت پر باشرع مسلمان امرا حاوی تھے اور وہ اسلامی مفاد کے تحفظ کی پوری کوشش کرتے تھے۔ مسٹر پین کے الفاظ کا خلاصہ شیخ محمد اکرام نے ان الفاظ میں درج کیا ہے:

بہت سے درباری مسلمان جو اس وقت بادشاہ کے ساتھ تھے، پادری کی تقریر پر بہت بگڑے اور ان میں سے ایک نے جو پادری کا دوست تھا، اسے سمجھایا کہ جب وہ شریعت اسلامی کا ذکر کرے تو اسے زیادہ احتیاط اور ادب کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیے۔ اس درباری مسلمان نے کہا، یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں۔ جب تم شریعت اسلامی کی مذمت کرتے ہو تو وہ تمھارے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ میں اگرچہ تمھارا دلی دوست ہوں، مگر جب تم ہمارے نبی ﷺ کی بے ادبی کرتے ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ تمھارے جسم میں خنجر بھونک دوں ❷۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں ذاتی طور پر اکبر بھی

---

❶ رود کوثر، ص ۱۳۸، بحوالہ اکبر اینڈ دی جیسوٹس، ص ۳۱۔

❷ رود کوثر، ص ۱۳۹، بحوالہ اکبر اینڈ دی جیسوٹس، ص ۸۴۔

بالکل بدل گیا تھا اور ذہنی اور قلبی طور پر اسلام سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ جہاں گیر کی چھوٹی تزک ❶ میں مرقوم ہے کہ اکبر نے بوقت موت کلمہ شہادت پڑھا، سورہ یٰس پڑھا کر سنی اور ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے موت کی آغوش میں گیا۔ اس موقعے پر شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ اس اندراج کی صحت مشتبہ ہے، لیکن سفیر انگلستان سر طامس واڈ اس واقعہ کے پندرہ بیس سال بعد ہندوستان آیا تھا۔ اس نے مقامی حالات کے متعلق ایک تفصیلی خط انگلستان کے لاٹ پادری کو لشکر شاہی سے لکھا تھا۔ اس خط میں وہ لکھتا ہے کہ اکبر کی وفات ایک مسلمان کی حیثیت سے ہوئی۔

اسی طرح پرتگیز پادری جو بوٹیلو کے نام سے موسوم تھا، بیجا پور کے عادل شاہی ❷ بادشاہ سے ملا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ اکبر کس مذہب پر مرا؟ تو پادری نے بڑے افسوس سے جواب دیا کہ میری خدا سے التجا تھی کہ ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اکبر ہمیں غلط امیدیں دلاتا رہا اور بالآخر آپ کے دین محمدی پر ہی مرا۔

اکبر کی وفات کے وقت پرتگیز پادری آگرہ میں موجود تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اکبر کو مرتے وقت ہی بپتسمہ دے لیں، اس لیے وہ لحہ لحہ کی خبر منگاتے رہتے تھے مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے ❸۔

ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی کے الحاد و زندقہ پر زور دیں یا اسے جہنمی بنانے پر اصرار کریں۔ ہمارے نزدیک اکبر زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی انتشار اور فکری پراگندگی کا شکار ہو گیا تھا اور اس میں تغیر احوال کے ساتھ ساتھ تغیر افکار بھی ہوتا رہتا تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آخری دنوں میں وہ اسلام کی حقانیت پر ایمان لے آیا تھا اور مسلمان کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوا تو ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ پھر اس کے اسلام کی شہادت، ایک ایسا گروہ دیتا ہے جو نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسلام سے بہرہ مند ہو۔ کسی کی سچائی پر مخالف کی گواہی اپنے اندر ایک خاص وزن رکھتی ہے۔ بہر کیف موت کے بعد اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو گیا۔ وہی نیتوں کا جاننے والا ہے۔

اکبر کے آخری دور کے امرائے سلطنت پکے مسلمان تھے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت ان کا بنیادی مقصد تھا۔ وہ اکبر کا جانشین بھی اسی شخص کو بنانا چاہتے تھے جو ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا خواہاں ہو۔

❶ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں، اس نسخے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے، لیکن چھوٹی تزک ہے بہت پرانی۔ اس کے عہد شاہ جہانی کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ مآثر الامرا اور دربار اکبری کے مصنف نے اس پر بڑا بھروسا کیا ہے۔

❷ عادل شاہی سلطنت کا پایۂ تخت بیجا پور تھا۔ اس کے موسس اعلیٰ کو تاریخ میں یوسف عادل شاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، جس نے ۸۹۰ھ/ ۱۵۸۵ء میں اس کی بنیاد رکھی۔ کم و بیش دو سو سال تک عادل شاہی سلاطین دکن کے بڑے حصے پر قابض رہے۔ ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء میں شاہ جہان نے اس کو دہلی کا باج گزار بنایا۔ ۱۰۹۸ھ/ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر نے اس کو سلطنت مغلیہ میں ضم کر لیا۔

❸ رود کوثر، ص ۱۶۰، بحوالہ اکبر اینڈ دی جیسوٹس۔

چنانچہ یہی وعدہ لے کر انھوں نے جہاں گیر کو تخت حکومت پر متمکن کیا۔

اکبر اینڈ دی جیسوٹس کا مصنف لکھتا ہے:

امرائے مملکت نے بالآخر فیصلہ کیا کہ حکومت اسی کو دینی چاہیے جو اس کا قانونا حق دار ہے۔ چنانچہ ایک برگزیدہ امیر (یعنی شیخ فرید) جسے دوسرے امرا نے اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، شہزادہ جہاں گیر کے پاس آیا اور امرا کی طرف سے اسے کہا کہ ہم سب آپ کی بادشاہت کی حمایت کریں گے، بشرطیکہ آپ اس بات کی قسم اٹھائیں کہ آپ شرع محمدیؐ کا تحفظ کریں گے اور اپنے بیٹے (خسرو) یا اس کے حامیوں کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ شہزادے نے ان شرائط کو پورا کرنے کی قسم کھائی اور بہت سے محافظوں کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو گیا[1]۔

## علمی خدمات:

اکبر کے مذہبی خیالات سے اختلاف کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا دور علم وفن کے اعتبار سے بے حد زرخیز تھا۔ بے شمار علما وفضلا جو مروجہ علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے، دربار میں موجود تھے اور ملک کے مختلف علاقوں اور صوبوں میں بھی اہل علم بہت بڑی تعداد میں علمی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان میں اکثر حضرات کو دربار کی بحثوں اور چپقلشوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں مدارس دینی قائم تھے، جن میں افاضلِ روزگار کا غلغلۂ تدریس زوروں پر تھا۔ مثلاً دہلی، آگرہ، احمد آباد، جون پور لاہور، ملتان، سیالکوٹ، سرہند وغیرہ بلاد وامصار اور قصبات میں مشہور زمانہ حضرات علما نے تشنگان علوم کی علمی تشنگی بجھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس دور کے اصحاب علم، ایک طرف اگر منصب درس وتدریس پر فائز تھے تو دوسری جانب مسند رشد وہدایت پر بھی متمکن تھے، یعنی بیک وقت وہ فکری نشو ونما کا سامان بھی فراہم کرتے تھے اور روحانی اصلاح کا اہتمام بھی فرماتے تھے۔ ان علما وصلحا میں حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، خواجہ باقی باللہ، شیخ نورالحق دہلوی، شیخ میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ ان کے علاوہ صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی، مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری، مولانا حاتم سنبھلی اور دیگر بہت سے علما تھے، جن میں بعض شاہی خدمات پر بھی مامور تھے، اور ساتھ ہی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے مشاغل بھی جاری رکھتے تھے۔

عہد اکبری میں ایک عالم دین مولانا علاء الدین لاری تھے، جنھوں نے شرح عقائد نسفی پر حواشی تحریر کیے۔ پہلے یہ جون پور میں خان زمان کے پاس مصروف تدریس تھے، بعد ازاں آگرہ تشریف لے آئے تھے۔ درس وتدریس کا شوق ان پر اتنا حاوی تھا کہ آگرہ میں ایک چھپر ڈال کر مدرسہ قائم کر لیا تھا اور اسی میں تعلیم وتدریس میں

---

[1] رود کوثر، ص۲۰۴۔

مشغول ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی سفر میں سفر آخرت کو روانہ ہو گئے۔

اس دور میں سرزمین کشمیر کو بھی اصحاب علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور مختلف مقامات پر اہل فضل و کمال نے تصنیفی اور تدریسی مسندیں آراستہ کر رکھی تھیں۔ اس کتاب کے مختلف مقامات پر ان حضرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

عہد اکبری میں بادشاہ کے حکم سے یا خاص دربار سے تعلق رکھنے والے اہل علم کی طرف سے تصنیف و ترجے کی جو خدمات انجام دی گئیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ مہابھارت: یہ ہندوؤں کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا سنسکرت سے فارسی میں رزم نامہ کے نام سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کام ۹۰۰ھ سے ۹۹۵ھ/ ۱۴۹۵ء سے ۱۵۸۷ء تک نقیب خاں، ملا عبدالقادر بدایونی، ملا شیری اور حاجی سلطان تھانیسری نے مکمل کیا۔

۲۔ رامائن: یہ بھی ہندوؤں کی معروف کتاب ہے۔ اسے ۹۹۵ھ سے ۹۹۹ھ/ ۱۵۸۷ء سے ۱۵۹۱ء تک ملا عبدالقادر بدایونی نے سنسکرت سے فارسی زبان میں منتقل کیا۔

۳۔ سنگھاسن بتیسی: ''خردافزا'' کے نام سے عبدالقادر بدایونی نے اس کو ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء میں فارسی کے قالب میں ڈھالا۔

۴۔ حیٰوۃ الحیوان: یہ دمیری کی مشہور کتاب ہے، اور عربی زبان میں ہے۔ ملا مبارک نے ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء کو اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۵۔ اتھربن: یہ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب اور چوتھا وید ہے۔ اس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں۔ دکن کا ایک ہندو پنڈت بھاون، جو لکھا پڑھا اور عاقل و فہیم شخص تھا، مسلمان ہو کر دربار میں آیا تو اس نے بادشاہ کو اس کتاب کے مندرجات سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی فارسی میں ترجمہ کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے عبدالقادر بدایونی، فیضی اور حاجی ابراہیم سرہندی کو اس کام پر مامور کیا۔ یہ ترجمہ ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء میں کیا گیا۔

۶۔ تزک بابری: یہ مغل حکمران ظہیر الدین بابر کی سرگزشت ہے۔ اصل کتاب ترکی زبان میں تھی۔ ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۰ء میں عبدالرحیم خان خاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۷۔ انجیل: ابوالفضل نے ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء میں اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا۔

۸۔ لیلاوتی: ہندوؤں کے فن ریاضی کی کتاب ہے۔ فیضی نے فارسی میں منتقل کی۔

۹۔ ہربنس: کرشن جی کے حالات پر مشتمل ہے۔ مولانا شیری نے اس کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۰۔ معجم البلدان: شہاب الدین عبداللہ یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ/ ۱۲۲۹ء) کی شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ ملا احمد ٹھٹھوی، قاسم بیگ، شیخ منور اور عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۱ء میں اس کا عربی

سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۱۔ تاجک: علوم نجوم کی ایک کتاب ہے۔ مکمل خاں گجراتی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۲۔ تاریخ کشمیر: کشمیر کے حالات میں سنسکرت کی ایک مشہور کتاب راج ترنگنی کے نام سے سلطان زین العابدین کے عہد میں تصنیف کی گئی تھی۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے اس کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ پھر ملا عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ھ میں اسے سلیس فارسی میں منتقل کیا۔

۱۳۔ کلیلہ دمنہ: سنسکرت کا ایک قدیم قصہ ہے۔ ابوالفضل نے ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء میں اس کا ''عیار دانش'' کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۴۔ نل دمن: ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۵ء میں فیضی نے ہندوستان کی یہ مشہور عشقیہ داستان جو چار ہزار دوسو اشعار پر مشتمل مثنوی ہے، خسرو کی ''لیلی مجنوں'' کی بحر میں تصنیف کی۔

۱۵۔ جامع رشیدی: عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء) کو اسے عربی سے فارسی میں منتقل کیا۔

۱۶۔ بحرالاسمار: یہ ہندی افسانے کی کتاب ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء میں اسے فارسی کے قالب میں ڈھالا۔

۱۷۔ تاریخ الحکما: یہ شہرزاری کی تصنیف ہے۔ مقصود علی تبریزی نے ''نزہتہ الارواح'' کے نام سے اس کو لباس فارسی پہنایا۔

۱۸۔ زیج مرزائی: سنسکرت سے فارسی میں اس کا ترجمہ میر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی، گنگا دھر میش مہانند نے کیا۔

۱۹۔ کتاب الاحادیث: یہ کتاب فن تیر اندازی سے متعلق ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے ۹۷۶ھ/۱۵۶۹ء میں لکھی تھی۔ ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

۲۰۔ تاریخ الفی: یہ نقیب خاں، شاہ فتح اللہ، حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، نظام الدین احمد، عبدالقادر بدایونی، ملا احمد ٹھٹھوی، جعفر بیگ اور آصف خاں کی مشترکہ تصنیف ہے۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں اس کی تصنیف کا آغاز ہوا، ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء میں عبدالقادر بدایونی نے نظر ثانی کر کے اسے مکمل کیا۔

۲۱۔ اکبرنامہ: یہ ابوالفضل کی تصنیف ہے۔ اس کی تیسری جلد آئین اکبری کے نام سے موسوم ہے۔

۲۲۔ نجات الرشید: ملا عبدالقادر بدایونی کی فارسی تصنیف۔

۲۳۔ طبقات اکبری: مرزا نظام الدین احمد کی تصنیف۔

۲۴۔ سواطع الالہام: فیضی کی بے نقط تفسیر، جو ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں لکھی گئی۔

۲۵۔ موارد الکلم: فیضی کی بے نقط تصنیف۔

۲۶۔ مرکز ادوار: فیضی کا مجموعہ اشعار۔ مرتبہ ابوالفضل۔

۲۷۔ کشکول: ابوالفضل کی منتخب تحریریں۔

۲۸۔ جوتش: خان خاناں نے جوتش پر مثنوی لکھی تھی، جس کے ہر شعر میں ایک مصرع فارسی کا اور دوسرا سنسکرت کا تھا۔

۲۹۔ ثمرۃ الفلاسفہ: اصل کتاب یونانی زبان میں تھی۔ عبدالستار بن قاسم نے ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء میں یونانی زبان سے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس نے یہ کتاب ایک یونانی پادری سے حاصل کی تھی۔ اس میں روما کی تاریخ اور مشاہیر اہل کمال کا ذکر ہے۔

۳۰۔ خیرالبیان: یہ پٹھانوں کے ایک قبیلے کے پیر تاریک (یعنی روشن پیر) کی تاریخ ہے۔

۳۱۔ ہمایوں نامہ: اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم نے لکھا جو ایک عالمہ وفاضلہ خاتون تھیں۔

ان کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ دور اکبری کے علما کو عربی، فارسی، کشمیری، سنسکرت، یونانی وغیرہ زبانوں پر اس درجہ عبور حاصل تھا کہ وہ نہایت آسانی سے ایک زبان کے مشکل مضامین، پیچیدہ مباحث اور دقیق مسائل کو دوسری زبان میں منتقل کرنے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

اکبر کا معمول تھا کہ وہ عام طور پر رات کو مختلف مضامین پر مشتمل کتابیں اہل علم سے سنتا تھا۔ بعض دفعہ تو پوری پوری رات کتابیں سننے اور پڑھنے میں گزر جاتی تھی۔ پھر انھیں وہ اہتمام کے ساتھ شاہی کتب خانے میں جمع کر لیتا تھا۔ مذکورہ بالا کتابیں بھی اس نے مختلف اہل علم سے جن میں ملا عبدالقادر بدایونی بھی شامل ہیں، باقاعدہ سنی تھیں اور بعد میں ان کو فارسی میں منتقل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے اکبر کی وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ عالم نہ ہونے کے باوصف علمی ذوق کا حامل تھا۔

عہد اکبری کی کتب تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ اکبر کو اپنی کم علمی کا بہت احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے معلومات میں اضافے کے لیے مختلف مضامین سے متعلق کتابوں کی سماعت کا باقاعدہ ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ان کتابوں کی فہرست درج کی ہے، جنھیں اکبر اہل علم سے پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔ ان کتابوں میں تصوف، تاریخ، اخلاق، ادب، مسائل فقہ، حرب وضرب وغیرہ سے متعلق مشہور اہل علم کی ہندی، یونانی، عربی، فارسی، کشمیری اور دیگر زبانوں کی معروف تصانیف شامل ہیں۔ مثلاً کیمیائے سعادت، اخلاق ناصری، گلستان، بوستان، شاہ نامہ، قاموس نامہ، مثنوی مولانا روم، مکتوبات شرف منیری، کلیات امیر خسرو، تالیفاتِ ملا جامی، جام جم، دیوان انوری، خمسۂ شیخ نظامی اور حدیقہ وغیرہ اکبر کے سامنے پڑھی گئیں اور اس نے ان کے مندرجات سے استفادہ کیا:

وہر کتابے را از آغاز تا بانجام شنوند، وہر روز کہ بداں جا رسد بشمارۂ آں ہندسہ بقلم گوہر بار نقش کنند، وبعدد اوراق خوانندہ را نقد از زر سرخ وسفید بخشش شود۔ کم کتابے مشہور بود کہ مذکور محفل ہمایوں نہ گردد[1]۔

[1] آئین اکبری، ج ۱، ص ۷۶۔

(یعنی اکبر بادشاہ ہر کتاب شروع سے آخر تک سنتا، اور روزانہ جس ورق تک سن لیتا اس پر اپنے قلم سے نشان لگا دیتا۔ اوراق کے حساب سے پڑھنے والے کو سونے چاندی کے (مروجہ) سکے عنایت کرتا۔ کوئی کم ہی مشہور کتاب ہوگی جس کا ذکر بادشاہ کی مجلس میں نہ ہوا ہو۔)

دور اکبری میں ترجمہ وتصنیف سے متعلق جو خدمات انجام دی گئیں، سطور بالا میں ایک خاص تعداد کے ذریعے اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اس کے عہد میں اور بھی بہت سی کتابیں معرض تصنیف میں آئیں، جواب بھی موجود ہیں اور اہل علم ان سے مستفید ہوتے ہیں۔

اس کے عہد میں، فتح گجرات کے بعد بے شمار علما ملک کے مختلف حصوں سے گجرات گئے اور وہاں اشاعت علم کی۔ گجرات اگرچہ پہلے سے علم وفضل کا مرکز تھا، مگر اکبر کی فتح کے بعد اس کی علمی رونق میں مزید اضافہ ہوا۔ اسی طرح بہت سے علما گجرات سے خطہ ہند کے دیگر علاقوں میں گئے اور وہاں انھوں نے تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کی مسندیں بچھائیں۔

پھر ان علماء ومصنفین اور مدرسین ومبلغین کی ایک کثیر تعداد ملک کے مختلف علاقوں میں موجود اور مصروف اشاعت دین تھی، جن کا سرکار دربار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان حضرات کا دائرۂ اثر بہت وسیع تھا۔

## وفات:

جلال الدین محمد اکبر، ۲؍ربیع الاول ۹۴۹ھ/ ۱۶؍جون ۱۵۴۲ء کو پیدا ہوا۔ ۲؍یا ۷؍ربیع الثانی ۹۶۳ھ/ ۱۴؍ یا ۱۸؍فروری ۱۵۵۶ء کو ہندوستان کا تاج شاہی سر پر رکھا۔ پچاس سال سے کچھ زائد عرصہ حکومت کر کے ۱۳؍جمادی الاخریٰ ۱۰۱۴ھ/ ۱۵؍اکتوبر ۱۶۰۵ء کو وفات پائی اور اپنے دارالسلطنت آگرہ میں سکندرہ کے مقام پر دفن کیا گیا۔

یہ اکبر کی زندگی کے مختصر حالات تھے، جن کا تعلق ہمارے موضوع سے تھا۔ فقہائے ہند کی جلد پنجم کے مقدمے میں اکبر کے بیٹے جہاں گیر اور جہاں گیر کے بیٹے شاہ جہان کی زندگی کے علمی، دینی اور مذہبی پہلوؤں کی وضاحت کی جائے گی۔

ان شاء اللہ العزیز وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

بندہ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

۱۹؍جون ۲۰۱۲ء

۲۷؍رجب ۱۴۳۳ھ

# گیارھویں صدی ہجری

## ـــــ الف ـــــ

## ۱۔ مفتی آدم بن محمد گوپاموی

مفتی آدم بن محمد بن خواجہ بن شیخ بن آدم شہابی صدیقی گوپاموی، شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی اولاد سے تھے، جو اپنے دور کے مشہور عالم دین اور نامور بزرگ تھے۔ ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء میں ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مردم خیز شہر گوپامئو میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں جون پور کو علم وعلما کے عظیم مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور ایک عرصے سے وہاں درس وتدریس کی مسندیں آراستہ تھیں۔ مفتی موصوف نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو جون پور کا قصد کیا اور شیخ معروف بن عبدالواسع حسینی بخاری جون پوری کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کی۔ ان سے مروجہ علوم درسیہ بھی حاصل کیے اور تصوف وطریقت سے بھی بہرہ یاب ہوئے اور علوم متداولہ میں اس درجہ مہارت پیدا کی کہ اپنے عصر کے مشاہیر فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہونے لگا اور وقت کے بہت بڑے شیخ گردانے گئے، یہاں تک کہ اپنے شہر گوپامئو کے منصب افتا پر فائز ہوئے اور پھر اسی شہر میں عرصے تک درس وتدریس کا ہنگامہ بپا کیے رکھا۔ اس اثنا میں بے شمار اہل علم ان سے مستفید ہوئے اور طلبا کی کثیر تعداد نے کسب فیض کیا۔ تخت ہند پر اس زمانے میں مغل حکمران ظہیر الدین بابر متمکن تھا۔ وہ مفتی آدم بن محمد کا بہت قدر دان تھا۔ اس نے ۹۳۰ھ/۱۵۲۴ء میں ان کو معاشی تکفل کی غرض سے ایک قریہ عطا کیا۔ مفتی ممدوح نے نوے سال عمر پا کر ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں وفات پائی ❶۔

## ۲۔ شیخ ابراہیم محدث اکبر آبادی

شیخ ابراہیم بن داؤد قادری اکبر آبادی کی کنیت ابوالمکارم تھی اور وصالی تخلص کرتے تھے۔ ٹونک پور میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اساتذۂ عصر سے اخذ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عازم

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۲،۳۔

بغداد ہوئے اور وہاں ڈھائی سال قیام پذیر رہے۔ اس اثنا میں علوم تفسیر و حدیث کی تکمیل کی۔ بعد ازاں حرمین شریفین کے لیے رخت سفر باندھا اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ پھر مصر گئے اور قاہرہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ قاہرہ میں شیخ شمس الدین علقمی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے اخذ علم حدیث کیا اور شیخ محمد بن ابوالحسن بکری شافعی سے سند و اجازہ حاصل کیا۔ وہاں سے مکہ مکرمہ کو مراجعت کی اور شیخ عبدالرحمٰن بن فہد مغربی، شیخ مسعود مغربی اور شیخ علی متقی کے حلقۂ تلمذ میں شریک ہوئے اور ان تمام علمائے عظام نے ان کو باقاعدہ سند و اجازہ سے نوازا۔ مکہ معظمہ سے دوسری مرتبہ پھر مصر گئے، اور وہاں خود درس و تدریس کا آغاز کیا۔ سرزمین مصر میں پورے چوبیس سال مسند تدریس پر فائز رہے۔ اس طویل مدت میں بے شمار علما و طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے جنھوں نے ان کی صحبت میں رہ کر اپنی علمی تشنگی بجھانے کا سامان فراہم کیا۔ مصر کے دوران قیام میں ان کا یہ معمول رہا کہ ہر سال موسم حج میں مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے اور سعادت حج سے بہرہ اندوز ہوتے۔ چوبیس سال بعد دل میں جذبۂ حب وطن نے کروٹ لی اور واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔ یہاں آکرا اکبرآباد (آگرہ) کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور درس و افادہ اور وعظ و تذکیر کی مسند آراستہ کی۔ بے شمار لوگ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر علم و ادراک کی دولت بے پایاں سے مالا مال ہوئے۔

شیخ ابراہیم کا زاد بوم اگرچہ مانک پور تھا۔ لیکن دیار عرب سے واپسی کے بعد علمی و تدریسی اعتبار سے اپنی بھرپور زندگی کا آخری دور چوں کہ اکبرآباد (آگرہ) میں گزارا تھا، اور برسوں اس شہر میں تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھی تھیں، اس لیے اکبرآبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ اپنے دور کے بہت بڑے عالم، عظیم محدث، نامور فقیہ اور ماہر علوم عربیہ تھے۔ ارض ہند میں علوم دینیہ بالخصوص علم حدیث کی تدریس میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ علاوہ ازیں بہت نیک، عابد و زاہد اور متقی تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑے تیز تھے۔ غنا و سماع کی مجلسیں منعقد کرنا اور ان میں شامل ہونا اس زمانے کے اہل علم اور اصحاب تصوف میں عام طور پر مروج تھا، مگر شیخ ابراہیم ان سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور دامن علم و اتقا کو اس قسم کے غیر شرعی مراسم و عواطف سے کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔

شیخ ابراہیم کے قیام آگرہ کے زمانے میں جلال الدین اکبر تخت ہند پر متمکن تھا۔ اس کا دارالحکومت بھی آگرہ تھا اور وہ بڑے رعب و دبدبہ اور جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اس کے درباری امرا میں علمائے دین بھی شامل تھے، جو باقاعدہ دربار میں حاضر ہوتے اور بادشاہ کے حضور کورنش بجالاتے تھے۔ لیکن شیخ ابراہیم اس سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور ہر آن خدمت علم میں مصروف رہتے تھے۔ وہ اونچے درجے کے حق گو عالم دین اور صحیح معنوں میں احکام شرع کے مبلغ تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ نے ان کو عبادت خانے میں تشریف لانے کی دعوت دی، شیخ گئے، بادشاہ موجود تھا، مگر اس کو مروجہ درباری سلام نہیں کیا۔ اس مجلس میں بادشاہ کے سامنے ایک خطبہ دیا، جس میں اس کو امور شرع پر کاربند ہونے کی ترغیب دی، غیر شرعی

افعال کے ارتکاب سے روکا۔ اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔

برصغیر کے اس جلیل القدر محدث وفقیہ نے چھیاسی سال عمر پائی اور ۱۹؍ ذی الحجہ ۱۰۰۱ھ/ ۶؍ ستمبر ۱۵۹۳ء کو وفات پائی۔ ان کا مدفن آگرہ ہے ❶۔

## ۳۔ قاضی ابراہیم بن محمد کالپوی

قاضی ابراہیم بن محمد پنواروی کالپوی موضع پنواری کے باشندے تھے جو اعمال کالپی میں واقع تھا۔ انھوں نے اپنے والد (قاضی محمد پنواروی) سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا اور اس عہد کے مشہور مدرس شیخ عبدالملک بن ابراہیم کالپوی سے ہدایہ پڑھا۔ حصول علم کے بعد اپنے قصبہ پنواری کی مسند تدریس پر فائز ہوئے اور پھر عمر بھر درس وتدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے۔ اپنے وقت اور علاقے کے شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ صالح عالم دین، خوش خط اور فصیح البیان تھے۔ انداز گفتگو شیریں اور پُر تاثیر تھا۔ کسی مجلس میں زبان کو حرکت دیتے تو حسن بیان اور تاثر انگیزی میں سب سے سبقت لے جاتے۔ اپنے گوناگوں اوصاف کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت ومحبت مرتسم ہو چکی تھی اور ہر حلقے میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ نسب الانساب کے نام سے فارسی زبان میں ان کی ایک کتاب بھی ہے، جس میں تفصیل کے ساتھ ماں اور باپ کی طرف سے اپنے آباواجداد کے انساب بیان کیے ہیں۔

گیارھویں صدی کے اس ہندی عالم دین اور معروف فقیہ نے ماہ رمضان ۱۰۰۴ھ/ مئی ۱۵۹۶ء میں پنواری میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❷۔

## ۴۔ سید ابراہیم غیاث پوری

سید ابراہیم نوری غیاث پوری، غیاث پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ وقت، عالم دین اور محدث تھے۔ حدیث، فقہ اور تصوف کے نامور علما میں سے تھے۔ فقہ کی تعلیم لاہور میں شیخ اسحاق بن کاکو لاہوری کے مدرسے میں حاصل کی۔ پھر ملتان گئے۔ وہاں شیخ کبیر الدین حسینی بخاری سے بیعت ہوئے، جو ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ملتان سے دہلی کا قصد کیا اور شیخ محمد غوث شطاری گوالیاری کی صحبت ورفاقت اختیار کی اور ان کی تصنیف ''الجواہر الخمسہ'' شیخ مبارک گوالیار سے پڑھی۔ پھر حج بیت اللہ کے ارادے سے دہلی سے نکلے، لاہور اور ملتان آئے۔ وہاں سے شیراز اور پھر بغداد گئے۔ بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے سجادہ نشین شیخ زین

---

❶ اذکار ابرار، ص ۴۲۳۔ منتخب التواریخ، ص ۶۴۱۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴، ۵۔ بوستان اخبار، ص ۳۶ تا ۳۸۔

❷ اذکار ابرار، ص ۲۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۷۔

العابدین حسنی بغدادی سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ وہاں سے بلاد شام اور بیت المقدس ہوتے ہوئے مصر پہنچے۔ مصر میں شیخ محمد بکری شافعی سے علوم تفسیر و حدیث حاصل کیے اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ مصر سے عازم مدینہ منورہ ہوئے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ گئے اور سعادت حج حاصل کی۔ وہاں شیخ علی متقی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور ان سے بعض اہم کتابوں کا درس لیا۔ پورے بارہ سال جبل ثور پر قیام فرما رہے، اس لیے ثوری مشہور ہوئے۔ پھر واپس ہندوستان آئے اور ۹۷۸ھ/ ۱۵۷۰ء کو اوجین شہر میں سکونت اختیار کی۔

شیخ ابراہیم غیاث پوری عابد و زاہد، قانع و متوکل اور صاحب بصیرت بزرگ تھے۔ ان کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چلا اور نہ یہ معلوم ہو سکا ہے کہ انھوں نے کہاں مسند تدریس بچھائی اور کن کن لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ بلاشبہ یہ اپنے عصر کے محدث و فقیہ اور عابد و زاہد عالم تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے، سیر و سیاحت کے زیادہ شائق تھے اور علمائے دین کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان سے استفادہ کرنے کے متمنی رہتے تھے، لہٰذا نہ کوئی کتاب تصنیف کر سکے اور نہ کہیں بیٹھ کر درس و افادہ کے مواقع میسر آئے۔ ان کا سلسلہ نسب سید شاہ اجملی سامانوی ترمذی تک پہنچتا ہے۔ بارہ سال کی عمر میں گھر سے باہر نکلے۔ اس کے بعد تین مرتبہ اپنے وطن غیاث پور گئے۔ ایک دفعہ والدین سے ملنے کے لیے، دوسری مرتبہ والدہ کی وفات کے بعد، اور تیسری دفعہ والد کے انتقال کے بعد۔

گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی مانڈوی نے ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۷ء میں ان کے گھر جا کر ان کے حالات معلوم کیے تھے۔ نہایت خود دار اور متوکل علی اللہ تھے۔ نہ ارباب حکومت اور اصحاب دولت کے پاس جاتے اور نہ ان سے کوئی چیز قبول کرتے۔ معلوم ہوتا ہے، انھوں نے ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء کے بعد وفات پائی ❶۔

## ۵۔ قاضی ابراہیم بیجاپوری

قاضی ابراہیم زبیری بیجاپوری، شیخ وقت، فاضل عصر، معرفت و ادراک میں یگانۂ روزگار، فقیہ، زاہد و متورع، بلند کردار اور عمدہ سیرت بزرگ تھے۔ علم و فضل کی فراوانیوں کے ساتھ ساتھ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا اور یہ علم انھوں نے شیخ جان اللہ سہروردی بیجاپوری سے حاصل کیا تھا۔ طویل عرصے تک بیجاپور کی مسند قضا پر متمکن رہے اور فرائض قضا نہایت حسن و خوبی سے انجام دیے۔

برصغیر کے گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ نے ۱۲ر رجب ۱۰۹۴ھ/ ۲۷ر جون ۱۶۸۳ء کو بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❷۔

❶ اذکار ابرار، ص ۵۵۵ تا ۵۵۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۔

❷ روضۃ الاولیاء۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۔

# ۶۔ قاضی ابراہیم سندھی

قاضی ابراہیم ٹھٹھوی سندھی، شیخ مخدوم فیروز کے پوتے تھے۔ بہت بڑے عالم، شیخ اور فقیہ تھے۔ مغل حکمران شاہ جہان کی طرف سے دہلی کی مسند قضا پر متعین تھے۔ کئی سال اس منصب بلند پر فائز رہے۔ پھر ان کو قاضی عسا کر مقرر کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے قاضی القضاۃ بھی رہے، لیکن ساتھ ہی درس وافادے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

قاضی ابراہیم ٹھٹھوی سندھی اپنے دور کی عجیب وغریب شخصیت تھے۔ منقول ہے کہ کچھ مدت کے لیے ان کو ٹھٹھے کا امین بھی مقرر کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کی حویلی کی تعمیر پر ڈیڑھ لاکھ روپے خرچ کیے گئے تھے، لیکن جب وہ آئے اور حویلی پر نظر ڈالی تو انھیں پسند نہ آئی۔ ٹھٹھہ کا حاکم جو ہفت ہزاری منصب کا مالک امیر تھا، ہفتے میں ایک دن قاضی ابراہیم کے گھر پر آ کر دربار عام منعقد کرتا تھا۔ قاضی ممدوح بھی ہفتے میں ایک روز اس کے گھر جاتے اور دوپہر سے شام تک وہاں قیام کرتے۔

قاضی ابراہیم سندھی سے چند دلچسپ اور تعجب انگیز روایات بھی منقول ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ شیخ میرک کے مکان پر حاضر ہوئے جو بادشاہ دین پناہ شاہ جہان کے آخری ایام حکومت میں صدارت مطلق کے منصب پر سرفراز تھے۔ اس وقت وہاں علما کی مجلس منعقد تھی۔ وہ کہتے ہیں جب میں وہاں جا کر بیٹھا تو اچانک ایک شخص سادہ لباس پہنے اور پیچ دار عمامہ باندھے ہوئے مجلس میں داخل ہوا۔ شیخ میرک نے اس کی آمد پر تمام علما سے زیادہ اس کی تعظیم کی۔ پھر جب وہ جانے لگا تب بھی شیخ اس کی انتہائی تعظیم بجالائے۔ حاضرین مجلس نے شیخ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو جواب دیا کہ یہ شخص علوم نادرہ سے آگاہ ہے اور دنیائے جنات کا مرشد ہے۔ قاضی ابراہیم کہتے ہیں میں شیخ کی یہ بات سن کر تیزی کے ساتھ مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور التجا کی کہ کسی وقت مجھے ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر کا پتا دیا اور چلے گئے۔ تین چار روز کے بعد میں ان کے گھر گیا۔ اطلاع ملنے پر وہ بالا خانے سے جو ان کی خلوت گاہ تھا، نیچے آئے اور حال معلوم کر کے کہا۔ ’’بندہ کو کچھ کام ہے، چند ساعت بالا خانے پر تشریف رکھیے، فارغ ہو کر حاضر خدمت ہونے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔‘‘ میں ابھی دو چار زینے ہی اوپر چڑھا ہوں گا کہ ایک شان دار محفل آراستہ دکھائی دی۔ سب نے میرا استقبال کیا اور مجھے مجلس کے صدر مقام پر بٹھایا۔ ان میں سے تین چار اشخاص نے ہاتھ میں کتابیں پکڑ رکھی تھیں اور درمیان میں ایک شخص مطول کھولے بیٹھا تھا۔ ان دنوں ایک طالب علم نے ملا سعد الدین تفتازانی پر اعتراض کیا تھا۔ اس مجلس میں اس شخص نے مطول کھولی تو وہی مقام سامنے آیا جو زیر بحث تھا۔ اب پڑھنے پڑھانے اور سننے والوں نے اس مقام کو حل کرنے کے لیے آپس میں بحث شروع ... میں نے بھی کچھ دخل دیا۔ ہر علم کی بحث اور دلیل پیش ہوئی۔ یہ مجلس پہر دن تک جاری رہی۔ اچانک

صاحب خانہ نمودار ہوئے اور سب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ میں شوق استفادہ کے جذبے میں سب سے پہلے ان کے سامنے جا پہنچا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''بڑی تکلیف ہوئی آپ کو۔ میرا بڑا انتظار کرنا پڑا۔'' میں نے جواب میں عرض کیا: ''ان عزیزوں کی صحبت سے میں نے بہت استفادہ کیا۔'' فرمایا: ''کن عزیزوں کی صحبت سے؟'' میں نے پلٹ کر پیچھے کو دیکھا تو کوئی بھی نظر نہ آیا۔ فی الفور میرے جسم میں رعشہ طاری ہو گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ شیخ نے پانی دم کر کے میرے منہ پر چھینٹے مارے تو مجھے ہوش آیا۔

قاضی ابراہیم سے یہ بھی منقول ہے، کہتے ہیں جس زمانے میں میں اعلیٰ حضرت جنت مکانی (عالم گیر بادشاہ) کے پوتے کا معلم تھا، ایک روز شیخ ناصر جو اپنے وقت کی عجیب و غریب شخصیت تھے، کتب خانے میں آئے۔ سلطان بھی موجود تھا۔ میں نے سلطان کو ان سے کچھ طلب کرنے کا اشارہ کیا۔ سلطان نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ شیخ سے تبرک کی درخواست کی، اور انھوں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر فرش کے نیچے سے چند کنکریاں اٹھائیں اور ہاتھ میں تین بار گھمائیں۔ میں نے دیکھا کہ اب ان کنکریوں میں سے کچھ تو آب دار عقیق ہیں، کچھ بے بہا لعل ہیں، کچھ مرجان ہیں اور کچھ موتیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ کہ پھر یہ سب انھوں نے داڑھی کے بال کی نوک سے ایک ایک پرو کر سلطان کو دیں۔

قاضی ابراہیم سندھی کے دو بیٹے تھے۔ شیخ امان اللہ جو لاولد فوت ہوئے، اور ایک شیخ عنایت اللہ۔ یہ دونوں بڑے نامور بزرگ تھے، لیکن آبادی سے دور اپنی جاگیر میں اقامت گزیں رہے۔ قاضی ممدوح کے بیٹوں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ البتہ تین نواسے تھے۔ قاضی محمد یحییٰ، قاضی محمد امین اور محمد باقر۔

قاضی ابراہیم کے بھائی محمد کریم تھے۔ یہ بھی اپنی جاگیر میں نیرون کوٹ رہے اور وہیں فوت ہو گئے۔ لیکن قاضی مرحوم کے بھتیجے قاضی محمد اکرم موضع بھتوڑہ کے منصب قضا پر متعین ہوئے۔ ان کے بھائیوں کی اولاد میں سے ایک اور بزرگ قاضی عبدالجلیل تھے، جو پٹنہ کی مسند قضا پر متمکن کیے گئے۔ انھوں نے بہت ہی عزت کی زندگی بسر کی اور پٹنہ ہی میں وفات پائی[1]۔

قاضی ابراہیم کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کتاب کے مصنف نہ تھے، البتہ گیارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے نامور قاضی، عالم دین اور فقیہ تھے۔

## ۷۔ مفتی ابوالبقا جون پوری

مفتی ابوالبقا بن درویش محمد حسینی واسطی جون پوری، جون پور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد (شیخ درویش محمد) اور دیگر علما سے تحصیل کی۔ پھر درس و تدریس کی مسند سنبھالی۔ نہایت ذکی، قوی الحافظہ، سریع الادراک اور عذوبت لسان کے مالک تھے۔ مدت مدید تک اپنے شہر جون پور میں فرائض تدریس انجام دیتے

[1] تحفۃ الکرام، ص ۱۶۱ تا ۱۶۵۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۔

رہے۔ مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور گیارھویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کے بلند پایہ شیخ، عالم دین اور فقیہ تھے۔ بادشاہ ہند شاہ جہان ان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کا بہت قدر دان تھا۔ ایک مرتبہ دہلی گئے تو شاہ جہان انتہائی تکریم سے پیش آیا اور انھیں جون پور کے منصب قضا پر متعین کیا۔

ان کی قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو کتاب ایک مرتبہ مطالعہ میں آ جاتی، اس کا ایک ایک لفظ ذہن میں نقش ہو جاتا اور حافظہ اس کے تمام گوشوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جو بعض تذکروں میں مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ قیصر روم نے ابوالبقا عبداللہ بن حسین العکبری (متوفی ۶۱۶ھ/ ۱۲۱۹ء) کی تصنیف ''اعراب القرآن'' (جو دس جلدوں پر مشتمل ہے) بادشاہ ہند شاہ جہان کی خدمت میں بطور تحفہ ارسال کی۔ بُعدِ مسافت کی وجہ سے اس کتاب کے کچھ اوراق پھٹ گئے تھے۔ شاہ جہان نے یہ کتاب مفتی ابوالبقا کے پاس بھیجی تا کہ وہ اسے درست کر دیں۔ چھ ماہ گزر گئے مگر کتاب واپس شاہی کتب خانے میں نہ پہنچی۔ اب بادشاہ نے مفتی صاحب سے واپسی کا مطالبہ کیا۔ مفتی صاحب ممدوح نے اپنے کتب خانے میں کتاب (اعراب القرآن) تلاش کی تو نہ ملی۔ لیکن جب ان کے پاس کتاب پہنچی تھی، وہ اسے پڑھ چکے تھے اور اس کے مندرجات ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ انھوں نے اللہ کا نام لے کر قلم پکڑا اور اپنی قوت حافظہ سے پوری کتاب لکھ کر بادشاہ کو بھجوا دی۔ دربار میں یہ کتاب گئی تو کوئی اس کے اصل اور نقل میں تمیز نہ کر سکا۔ اصل واقعہ بادشاہ کے علم میں آیا تو اس نے مفتی صاحب کو اس کے صلے میں جاگیر اور انعام عطا کیا۔

مفتی ابوالبقا جون پوری مصنف و مولف بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے شرح جامی، شرح شمسیہ (رازی) اور منطق کی مشہور کتاب قطبی پر حواشی تحریر کیے۔

وہ ملا محمد ماہ دیوگامی کے شاگرد تھے، جن کا شمار اپنے دور کے مشہور اساتذہ اور اجل علما میں ہوتا تھا۔

مفتی ابوالبقا نے جمعہ کے روز ۲۲ر جمادی الاولیٰ ۱۰۴۰ھ/ ۱۷ر دسمبر ۱۶۳۰ء کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔ ان کی قبر جون پور کے مفتی محلہ میں ہے ❶۔

## ۸۔ شیخ ابوبکر شافعی سندھی

شیخ ابوبکر سندھی، شافعی المسلک تھے۔ اپنے عصر کے بہت بڑے فاضل اور علامہ تھے۔ دمشق میں جامع اموی کے مشرقی مینار کے نیچے یہ سندھی عالم دین دس سال خدمت علم انجام دیتے اور علما و طلبا کو مستفید فرماتے رہے۔ یوں تو تمام مروجہ علوم کے ماہر تھے لیکن معقولات میں بالخصوص درک رکھتے تھے۔ ساتھ ہی انتہائی نیک بھی تھے۔ ان کے تدین کا یہ حال تھا کہ اکثر روزے رکھتے اور نماز باجماعت کا التزام کرتے۔ کم گو، متواضع اور عبادت گزار تھے۔ حکام کی مجلسوں اور ان سے ملاقات سے دامن کشاں رہتے۔ اگر کسی حکمران کو ان سے کوئی

❶ تجلّی نور، ص ۶۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۔ تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۲۷، ۲۸۔

کام ہوتا تو خود حاضر خدمت ہو جاتا۔

دنیا اور اس کا مال و متاع انھیں پیش کیا جاتا، مگر وہ اس سے دور بھاگتے۔ خاموشی اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ علما و طلبا کا ایک ہجوم ان کے گرد رہتا اور یہ ان کو معقولات اور دیگر علوم کی تعلیم دیتے۔ طویل عرصے تک شائقین علوم ان کے فیوض عالیہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ان کی وفات طاعون کے مرض سے ہوئی۔ ہفتے کے روز ۳ ربیع الاول ۱۰۱۸ھ/ ۱۹ جون ۱۶۰۹ء کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس دن وہ روزے سے تھے۔ شیخ نجم الدین عزی شافعی نے ان کی وفات پر یہ شعر کہے:

عجبت لطاعون اصابت نباله واربت على الخطى والصارم الهندى

سرطا فی دمشق الشام عاما و اخرا تبسط فی الهندی وما ترك السندی

انھیں باب الفرادیس میں تربت غربا میں دفن کیا گیا❶۔

اس شافعی المسلک سندھی عالم دین کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں پیدا ہوئے۔ سندھ میں کتنا عرصہ قیام پذیر رہے اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں کون کون خوش بخت حضرات شامل تھے۔

## ۹۔ قاضی ابوبکر الہ آبادی

قاضی ابوبکر الہ آبادی گیارھویں صدی ہجری میں دیار ہند کے ممتاز عالم دین اور فقیہ تھے۔ انھوں نے فقہ امام ابوحنیفہ کی روشنی میں فقہ کی ایک کتاب تصنیف کی جو احناف کے معمول بہا مسائل پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر کے مصاحب و ندیم بختاور خاں کے نام معنون کی تھی❷۔

## ۱۰۔ شیخ ابوتراب بیجاپوری

شیخ ابوتراب بن ابوالمعالی بن علم اللہ صالحی امیٹھوی ثم بیجاپوری کی جائے ولادت بیجاپور ہے۔ وہیں نشوونما پائی اور وہیں شیخ علی محمد بن اسد اللہ علوی گجراتی سے تحصیل علم کی اور ان سے مختلف علوم اس درجہ محنت و کوشش کے ساتھ حاصل کیے کہ اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے اور بیجاپور کے اکابر علما میں شمار ہونے لگے۔ پھر خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی اور نصف عمر اس خدمت میں صرف کر دی۔ اپنے عہد کے فاضل بزرگ تھے اور فقہ اور اصول فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ارض ہند میں بیجاپور اس زمانے میں اہل علم کا مرکز تھا اور شیخ ابوتراب کو اس مرکز علم و فضل کے رئیس کی حیثیت حاصل تھی۔

گیارھویں صدی ہجری کے بے شمار چوٹی کے علما نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور ان میں

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲، بحوالہ لطف السمر وقطف الثمر۔

❷ مرآۃ العالم۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۱۳۔

سے بعض اپنی عظیم علمی وفقہی خدمات کی بنا پر شہرت دوام کے مالک ہوئے، ان بلند مرتبت حضرات میں مرتبین فتاویٰ ہندیہ (جو فتاوے عالم گیری کے نام سے مشہور ہے) کے سربراہ شیخ نظام الدین برہان پوری بھی شامل ہیں جو شیخ ابوتراب کے نامور تلمیذ تھے۔ شیخ ابوتراب نے ۲۰ر صفر ۱۰۸۶ھ/ ۶ر مئی ۱۶۷۵ء کو وفات پائی ❶۔

## ۱۱۔ شیخ ابوتراب گجراتی

شیخ ابوتراب بن کمال الدین بن ہبۃ اللہ حسینی گجراتی۔ جانپانیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ ان کے دادا شیخ ہبۃ اللہ کا شمار خطۂ ہند کے کبار علمائے کرام میں ہوتا تھا، ان سے اور اپنے والد مکرم شیخ کمال الدین سے تعلیم پائی اور علم وفضل میں رسوخ حاصل کیا۔ جانپانیر سے گجرات (کاٹھیاوار) کے مشہور شہر احمد آباد منتقل ہو گئے، جو اس زمانے کے اسلامی ہند میں علم وعلما کا مرکز، صوفیا وصلحا کا مسکن، اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ اور سلاطین گجرات کا دارالسلطنت تھا۔ جب مغل حکمران جلال الدین اکبر نے گجرات پر حملہ کر کے اس کو فتح کیا تو شیخ ابوتراب گجراتی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ ان کے علم وفضل سے متاثر ہوا اور انھیں ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں امیر حجاج مقرر کر کے مکہ مکرمہ بھیجا۔ حرمین شریفین کے مستحقین ومساکین میں تقسیم کرنے کے لیے بادشاہ نے ان کو چاندی کے پانچ لاکھ مروجہ سکے دیے اور دس ہزار خلعات فاخرہ عطا کیں۔ شیخ ممدوح سعادت حج سے بہرہ ور ہو کر ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء میں ہندوستان واپس لوٹے۔ منقول ہے کہ واپسی میں ارض حجاز سے ایک پتھر بھی لائے، جس پر رسول اللہ ﷺ کا قدم مبارک ثبت تھا۔ بادشاہ نے اپنے دارالحکومت آگرہ سے چار میل باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔ اس پتھر کو ہاتھ میں پکڑا اور احترام سے آنکھوں پر لگایا اور سر پر رکھا۔ شیخ کو جلوس کی شکل میں آگرہ لایا گیا اور ان کی نہایت تعظیم کی گئی۔

اس سے کچھ عرصہ بعد اکبر نے ان کو گجرات میں منصب جلیلہ پر متعین کیا اور ایک مدت تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔ شیخ ابوتراب گجراتی صاحب تصنیف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب تاریخ گجرات ہے، جو فارسی زبان میں ہے۔ اس جلیل القدر عالم دین نے ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۰۰۳ھ/ ۱۳ر فروری ۱۵۹۵ء کو وفات پائی ❷۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کے پتھر پر نقش قدم اور بالوں وغیرہ کے متعلق جو حکایتیں بعض تذکروں میں منقول ہیں یا لوگوں کی زبانی سننے میں آتی ہیں وہ اصل حقیقت سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ آنحضرت ﷺ فداہ ابی وامی کے بال مبارک اب تک اس دنیا میں موجود ہیں، نہ آپ کا نقش قدم کسی پتھر پر مرتسم ہے اور نہ آپ کی کوئی اور چیز کہیں پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے توہمات سے دامن بچا کر رکھنا

❶ روضۃ الاولیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۔

❷ مآثر الامرا۔ منتخب التواریخ، ص ۴۶۲ بضمن مرزا مظفر حسین کا گجرات پر حملہ (اردو ترجمہ)۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳، ۱۴۔

چاہیے۔ صرف آپ کی تعلیمات، آپ کے ارشادات، آپ کی سنت مطہرہ، اسوۂ حسنہ اور اقوال و افعال کو سامنے رکھنا چاہیے۔ وہی ہمیشہ رہنے والے ہیں، انھی کو دوام حاصل ہے۔ انھی پر ہماری نجات کا دارومدار ہے اور یہی ذریعہ فلاح و کامرانی ہے۔

## ۱۲۔ سید ابوالحسن سورتی

سید ابوالحسن بن جمال الدین بن سید بادشاہ خوارزمی سورتی، مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے۔ اپنے والد (شیخ جمال الدین) سے کتب فقہ کی تحصیل کی اور ان ہی سے اخذ طریقت کیا۔ والد کی وفات کے بعد مسند مشیخت پر فائز ہوئے۔ بے شمار لوگ ان کی تبلیغی مساعی سے راہ حق پر گامزن ہوئے۔ سید ابوالحسن سورتی نے ۹ رصفر ۱۰۵۴ھ/ ۷راپریل ۱۶۴۴ء کو سورت (ہندوستان) میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں سپرد خاک کیے گئے ❶۔

## ۱۳۔ شیخ ابوالحسن کشمیری

شیخ ابوالحسن کشمیری سندھی، فاضل کبیر اور معقولات ومنقولات کے جید علما سے تھے۔ مغل حکمران شاہ جہاں کے عہد میں مسند تدریس پر متعین تھے اور علما وطلبا کو باقاعدہ درس دیتے تھے۔ شاہم بابا کے عرف سے معروف تھے۔ ملا یوسف گنائی ان کے علم وفضل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ تمام علوم مروجہ میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ جب ناظمان خطۂ کشمیر کے کہنے سے علما کے درمیان مباحثہ ہوا تھا تو یہ چوٹی کے علما کی مجلس میں تفسیر بیضاوی اور عصام الدین محشی کی عبارتوں کی عبارتیں اس درجہ تیزی سے پڑھتے تھے، جس طرح حافظ قرآن، قرآن پڑھتا ہے۔ اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی اکثر عبارات وتشریحات کا رد کرتے تھے اور وضاحت کرتے تھے کہ ملا عبدالحکیم نے کہاں کہاں علمی لغزش کھائی ہے۔ انھیں اپنی تحقیق پر اس قدر بھروسا تھا کہ مسلسل اپنی رو میں بولتے چلے جاتے تھے اور مجلس میں حاضر علما کی طرف بالکل التفات نہ کرتے تھے ❷۔

❶ حدیقۂ احمدیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۴۴۔ حدائق الحنفیہ، ص ۵۵۷۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵۔ ص ۱۷۔ تذکرہ علمائے ہند کے صفحہ مذکور پر ابوالحسن نام کے دو بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مولوی ابوالحسن ساکن کاندھلہ کا اور ایک ملا ابوالحسن کشمیری کا۔ ملا ابوالحسن کشمیری کا تذکرہ ایک سطر میں کیا گیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ''ملا ابوالحسن کشمیری مشہور بشاہم بابا، معاصر شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ بود۔'' لیکن دوسرے بزرگ کے بارے میں صرف یہ الفاظ مرقوم ہیں: ''مولوی ابوالحسن ساکن کاندھلہ'' یعنی محض عنوان۔ تذکرہ علمائے ہند کے اردو مترجم محمد ایوب قادری سے یہاں سہو ہو گیا ہے۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت ملا ابوالحسن کشمیری کا متن، مولوی ابوالحسن ساکن کاندھلہ کے عنوان میں درج کر دیا ہے۔ (دیکھیے تذکرہ علمائے ہند، اردو ترجمہ، ص ۵۵۹)

## ۱۴۔ سید ابو حنیفہ نصیر آبادی ثم بریلوی

سید ابو حنیفہ بن علم اللہ حسنی حسینی، نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔ جب ان کے والد مکرم (سید علم اللہ) نصیر آباد کی سکونت ترک کر کے رائے بریلی منتقل ہوئے تو باپ بیٹا دونوں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اس وقت سید ابو حنیفہ کی عمر بارہ سال تھی۔ حج سے واپس آئے تو باپ کے زیر تربیت رہ کر ان سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ طریقت وتصوف کے حصول کا رجحان اس دور کے علما میں عام طور پر پایا جاتا تھا، سید ابو حنیفہ کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے یہ فیض بھی اپنے والد محترم ہی سے حاصل کیا اور اپنی حیات مستعار کے آخری سانس تک انھی سے منسلک رہے۔ سید علم اللہ صلاح وتقویٰ کے حامل اور متبع سنت محمدیہ تھے۔ سید ابو حنیفہ بھی اس معاملے میں باپ کے نقش قدم پر چلے اور فضل وصلاح کے اعتبار سے معروف بزرگوں میں گردانے گئے۔ انھوں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں ماہ ربیع الاول ۱۰۸۸ھ/ مئی ۱۶۷۷ء میں بمقام رائے بریلی وفات پائی ❶۔

## ۱۵۔ شیخ ابوالخیر بن مبارک ناگوری

شیخ ابوالخیر بن شیخ مبارک ناگوری ۲۲ر جمادی الاولیٰ ۹۶۷ھ/ ۱۹ر فروری ۱۵۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد (شیخ مبارک ناگوری) سے جو اس دور کے عالم وفاضل بزرگ تھے، علم حاصل کیا۔ شیخ ابوالخیر مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔ جلال الدین اکبر سے ان کا تعلق پیدا ہوا تو اس نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہو کر اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب ''الارشاد'' کی بسیط ومفصل شرح سپرد قلم کی۔ یہ ابوالفضل اور فیضی کے بھائی تھے۔ اتوار کے روز ۲۵ر جمادی الاولیٰ ۱۰۱۹ھ/ ۱۵ر اگست ۱۶۱۰ء کو فوت ہوئے ❷۔

## ۱۶۔ شیخ ابوالخیر ٹھٹھوی سندھی

شیخ ابوالخیر ٹھٹھوی سندھی، حنفی المسلک عالم وفقیہ تھے۔ شیخ فضل اللہ سندھی کی اولاد سے تھے جو علم وفضل کے زیور سے آراستہ اور تقویٰ وللّٰہیت کی دولت سے مالا مال تھے۔ علم فقہ میں شیخ ابوالخیر کی مہارت کی بنا پر سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو علما کی اس جماعت میں شامل کیا جو فتاویٰ عالم گیری کی تدوین وترتیب کے فرائض انجام دینے پر مامور تھی ❸۔

---

❶ السیرۃ العلمیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۔

❷ آئین اکبری، ج ۳، ص ۳۱۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۱۸۔

❸ تحفۃ الکرام ص ۶۶۱۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۸۔ برصغیر میں علم فقہ، ص ۲۷۹، ۲۸۱۔

## ۱۷۔ شیخ ابوالخیر بھیروی

شیخ ابوالخیر بن ابوسعید بن معروف بن عثمان عمری بھیروی، ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء میں بمقام سلطان پور پیدا ہوئے اور اپنے والد (شیخ ابوسعید) سے علم حاصل کیا۔ پھر مزید تحصیل کی غرض سے دیگر بلاد و امصار کا رخ کیا اور متعدد علمائے عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں عازم حجاز ہوئے اور حج بیت اللہ کیا۔ حج کے بعد واپس ہندوستان آئے اور اپنے گاؤں بھیرہ میں جو اعمال جون پور میں واقع تھا، سکونت اختیار کی۔ بہت نیک عالم دین تھے۔ ۱۱ر شوال ۱۰۵۹ھ/ ۸ر اکتوبر ۱۶۴۹ء کو فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

## ۱۸۔ شیخ ابورضا دہلوی

شیخ ابورضا بن اسماعیل دہلوی، دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نواسے تھے، انہی سے اخذ علم کیا، اور اپنے عصر کے ممتاز علما میں گردانے گئے۔ عمر بھر درس و تدریس کی شمع جلائے رکھی اور بے شمار اہل علم نے ان سے استفادہ کیا، جن میں شیخ مبارک بن فخر الدین بلگرامی بھی شامل ہیں۔ آخر عمر میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور ۱۰۶۳ھ/۱۶۵۳ء کو دہلی میں وفات پائی ❷۔

## ۱۹۔ شیخ ابوسعید گنگوہی

شیخ ابوسعید بن نورالدین بن علی بن عبدالقدوس حنفی گنگوہی، گنگوہ کے مردم خیز شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے دور کے مشہور عالم و فقیہ تھے۔ تصوف و سلوک میں شیخ نظام الدین عمری تھانیسری کے فیض یافتہ تھے۔ گنگوہ کی مسند ارشاد پر فیض رہے اور خلق کثیر نے ان کے حلقۂ ارادت میں شمولیت کی، جن میں صاحب تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی اور شیخ محمد صادق بھی شامل تھے۔

شیخ ابوسعید گنگوہی کے مرید شیخ محب اللہ الہ آبادی نے ایک کتاب انفاس الخواص کے نام سے تصنیف کی جو ابن عربی کی فصوص الحکم کے انداز کی کتاب ہے۔ یہ کتاب اکیاسی (۸۱) حصوں میں منقسم ہے، جن کا نام مصنف نے ''انفاس'' رکھا۔ ہر نفس کسی نبی یا ولی کے نام سے موسوم ہے اور اس نبی یا ولی کی تعلیمات کے باطنی پہلوؤں اور اس کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ یہ انفاس حضرت آدم سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک مختلف انبیائے کرام کے اسمائے گرامی سے معنون ہیں۔ اس کے بعد خلفائے اربعہ سے چار انفاس منسوب ہیں۔ پھر مختلف مقامات کے بعض مشہور اولیا و صوفیا کے انفاس بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلۂ انفاس کا آخری نفس

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۸۔

❷ الاسرایہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۔

مصنف کے مرشد شیخ ابوسعید بن نورالدین گنگوہی کے نام سے منسوب ہے۔ یعنی بالکل فصوص الحکم کے انداز کی تصنیف ہے۔ اس زمانے کے اکثر صوفیا ابن عربی کے افکار سے متاثر اور وحدت الوجود کے قائل تھے جو سراسر قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔

شیخ ابوسعید گنگوہی نے ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء میں بمقام گنگوہ وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے ❶۔

## ۲۰۔ قاضی ابوسعید گجراتی

قاضی ابوسعید گجراتی، اپنے زمانے کے شیخ، عالم اور فقیہ تھے۔ قاضی عبدالوہاب پٹنی گجراتی کے داماد تھے۔ ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء میں اپنے خسر قاضی عبدالوہاب پٹنی گجراتی کی جگہ دہلی کے قاضی مقرر کیے گئے۔ بعدازاں ذی القعدہ ۱۰۹۴ھ/ نومبر ۱۶۸۳ء کو قاضی لشکر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کچھ مدت بعد جمادی الاولیٰ ۱۰۹۵ھ میں اس منصب سے معزول کر دیے گئے اور ۱۰۹۹ھ/ ۱۶۸۸ء کو، اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اس دنیائے فانی سے انتقال کر گئے ❷۔

## ۲۱۔ مولانا ابوسعید امیٹھوی

مولانا ابوسعید بن عبیداللہ بن عبدالرزاق صالحی امیٹھوی، ۴؍ ربیع الاول، ۱۰۰۷ھ/ ۲۵؍ ستمبر ۱۵۹۹ء کو امیٹھی میں پیدا ہوئے اور اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام عمر درس وافادہ کا ہنگامہ بپا کیے رکھا۔ عالم وفاضل، صالح، متورع، عابد وزاہد، کریم النفس اور سخی تھے۔ ۸؍ محرم ۱۰۶۱ھ/ ۲۲؍ دسمبر ۱۶۵۱ء کو اپنے وطن امیٹھی میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❸۔

## ۲۲۔ شیخ ابوالعلا جون پوری

شیخ ابوالعلا بن غلام حسین حنفی صوفی جون پوری، صدر جہاں جون پوری کی اولاد سے تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم وتربیت کی منزلیں طے کیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد، مشہور درسی کتاب رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی سے اخذ طریقت کیا۔ خرقہ تصوف ان کے صاحب زادہ گرامی شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری سے پہنا اور شیخ یٰسین بن احمد صوفی بنارسی سے شرف اجازہ حاصل کیا۔

شیخ ابوالعلا جون پوری عالم وفقیہ اور صاحب استقامت بزرگ تھے۔ ۷؍ شوال ۱۰۹۸ھ/ ۶؍ اگست

❶ خزینۃ الاصفیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۔

❷ مآثر عالم گیری، ص ۲۳۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹، ۲۰۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۰۔

۱۶۸۷ء کو وفات پائی اور اپنے جد امجد قاضی صدر جہاں کے مقبرہ میں، جو بلدۂ جون پور سے باہر قریہ مصطفیٰ آباد میں واقع تھا، مدفون ہوئے❶۔

## ۲۳۔ شیخ ابوالفتح ملتانی

شیخ ابوالفتح ملتانی فاضل روزگار تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے متبحر علما میں سے تھے۔ فنون حکمیہ میں بھی ماہر تھے۔ تدریس و افادۂ طلبا ان کا اصل مشغلہ تھا۔ مغل حکمران شاہ جہاں کے عہد میں ان کا فیضان علم جاری تھا۔ ان کے چشمۂ علم سے بے شمار لوگوں نے اپنی علمی تشنگی بجھائی❷۔

## ۲۴۔ قاضی ابوالفتح بلگرامی

قاضی ابوالفتح بلگرامی، قاضی کمال کے عرف سے معروف تھے اور شاہ ہند جلال الدین اکبر کے عہد میں بلگرام کے منصب قضا پر متعین تھے۔ علوم فقہ میں اس وقت ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ ارض ہند کے اس عالم دین نے چوراسی (۸۴) سال عمر پا کر ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کیا❸۔

## ۲۵۔ قاضی ابوالقاسم کشمیری

قاضی ابوالقاسم بن جمال الدین کشمیری نے اپنے والد شیخ جمال الدین اور عم محترم علامہ کمال الدین سے اخذ علم کیا، یہاں تک کہ فقہ و اصول اور دیگر علوم کے جلیل القدر علما میں سے گردانے گئے۔ علم و فضل کی فراوانی کے ساتھ ساتھ نیکی و صالحیت اور زہد و اتقا کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ کشمیر کے منصب قضا پر متعین تھے۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان کے تلامذہ میں مولانا محمد امین، مولانا عبدالنبی دیوانی اور علما کی بہت بڑی جماعت شامل ہے۔ کشمیر میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

تذکرہ علمائے ہند میں انھیں قاضی ابوالقاسم بن ملا جمال الدین سیالکوٹی لکھا گیا ہے اور مغل حکمران نورالدین جہاں گیر کے ہم عصر قرار دیا گیا ہے❹۔

## ۲۶۔ مولانا ابوالواعظ ہرگامی

مولانا ابوالواعظ بن صدر الدین بن محمد اسماعیل بن قاضی عماد الدین احمد عمری بدایونی، موضع ہرگام

---

❶ تجلی نور۔ نزہۃ الخواطر، ج۵ص۲۲۔
❷ عمل صالح، ج۳، ص۳۹۲۔ نزہۃ الخواطر، ج۵ص۲۴۔
❸ مفتاح التواریخ، ص۱۹۸۔ تذکرہ علمائے ہند ص۶۔
❹ تذکرہ علمائے ہند، ص۲۶۱۔

میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے دور کے مشہور عالم تھے۔ عمر بھر تعلیم و تدریس کا غلغلہ بلند کیے رکھا۔ حلقۂ تدریس وسیع تھا، جس سے تشنگان علوم نے اپنی علمی پیاس بجھانے کا سامان فراہم کیا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ مربی بن عبدالنبی بلگرامی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ تذکرۃ الانساب کی روایت کے مطابق شاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر نے بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ اپنے علم و فضل اور فقہ پر عبور کے باعث فتاوی عالم گیری کے مصنفین میں شامل تھے۔

مولانا ابوالواعظ کے دادا عماد الدین اس خاندان کے پہلے شخص ہیں، جو ہرگام میں جا کر آباد ہوئے۔ وہاں کے قاضی سے علم حاصل کیا اور ان کی بیٹی سے شادی کی۔ پھر وہیں گھر بنالیا اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مشہور عالم دین، شیخ محب اللہ الٰہ آبادی مولانا ابوالواعظ کے چچا زاد بھائی تھے ❶۔

## ۲۷۔ شیخ احمد بن اسحاق نصیر آبادی

شیخ احمد کا سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن اسحاق بن محمد بن محمود بن علاء الشریف الحسنی نصیر آبادی۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ابتدائی کتب درسیہ اور مختصرات اپنے شہر ہی میں پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے عازم الٰہ آباد ہوئے۔ الٰہ آباد میں ان دنوں مشہور عالم دین صاحب التسویہ شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کا سلسلۂ تدریس جاری تھا۔ یہ اس میں شامل ہو گئے اور ان سے اخذ علم کرنے لگے، یہاں تک کہ علوم مروجہ اور اصول و فروع کے مختلف گوشوں میں مہارت پیدا کر لی اور فتویٰ و تدریس کی صلاحیتوں سے بہرہ اندوز ہو گئے۔ پھر اپنے شہر نصیر آباد کو مراجعت کی اور خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ طویل عرصے تک شائقین علوم ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے رہے۔ بعد ازاں میلان طبع تصوف کی طرف ہوا تو عالم طریقت شیخ آدم بن اسماعیل حسنی بنوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ اس زمانے میں گوالیار میں مقیم تھے، ان سے کسب فیض کیا۔ شیخ آدم سفر حج پر روانہ ہوئے تو انھیں اپنا خلیفہ مقرر کر دیا۔ شیخ آدم ناخواندہ تھے اور کسی اہل علم سے کوئی کتاب نہ پڑھی تھی، لیکن نہایت نیک، بہت بڑے بزرگ اور متبع سنت تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے روحانی فیض حاصل کیا۔ ۲۳ر شوال ۱۰۵۳ھ/۴ر جنوری ۱۶۴۳ء کو مدینہ منورہ میں فوت ہوئے۔ شیخ احمد بن اسحاق نصیر آبادی بھی ان سے مستفیض ہوئے اور مرتبۂ خلافت کو پہنچے۔

شیخ احمد عالم دین، متقی، کثیر العبادت، منکسر المزاج اور اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ حرمت غنا کے موضوع پر ایک رسالہ تصنیف فرمایا۔ اس عالم دین نے ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۷ء کو نصیر آباد میں وفات پائی ❷۔

---

❶ مآثر الکرام، ص ۹۴۔ آمد نامہ۔ تذکرۃ الانساب۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۴، ۳۵۔ ماہنامہ ''برہان'' دہلی (جنوری ۱۹۴۹ء) برصغیر میں علم فقہ، ص ۳۰۵۔

❷ ... ت سادات۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۷، ۳۸۔

## ۲۸۔ شیخ احمد بن حسین نائطی بیجاپوری

شیخ احمد کا لقب نظام الدین اور ان کے والد شیخ حسین کا لطف اللہ تھا اور شیخ نظام الدین بن لطف اللہ قاضی بیجاپوری کے نام سے معروف تھے۔ شیخ احمد حدیث اور فقہ کے جید علما میں سے تھے۔ شیخ عوض بن محمد بن شیخ ضعیف سقاف کے شاگرد تھے۔ بیجاپور میں نظارت انشا کے منصب پر متعین تھے۔ کئی سال اس خدمت جلیلہ پر فائز رہے۔ پھر بیجاپور کے حاکم عادل شاہ نے ان کو مغل بادشاہ شاہ جہان کی خدمت میں سفیر بنا کر دہلی بھیج دیا تھا۔ یہ اہم خدمت بھی طویل مدت تک انجام دیتے رہے۔ آخر عمر میں سب امور سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ علم اور پرہیزگاری میں مشہور تھے۔ حدیث پر عبور حاصل تھا اور بے شمار احادیث زبانی یاد تھیں اور ان کی اسناد اور ان میں مختلف ائمہ کے مذاہب و رجحانات سے خوب آگاہ تھے۔ ۱۸؍ ربیع الاول ۱۱۰۰ھ/۱۳؍ دسمبر ۱۶۸۸ء کو راہی ملک بقا ہوئے❶۔

## ۲۹۔ شیخ احمد بن رضا حیدر آبادی

شیخ احمد بن رضا حیدر آبادی مذہباً شیعہ تھے۔ ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں ہندوستان آئے۔ علم رجال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس موضوع سے متعلق ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کو فائق المقال کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب انھوں نے حیدر آباد دکن میں مکمل کی۔ اس میں اپنی نسبت تلمذ حر عاملی کی طرف کرتے ہیں۔ انھیں بارہ ہزار احادیث کے متون بغیر اسناد کے حفظ تھے اور بارہ ہزار احادیث مع متون و اسناد کے زبانی یاد تھیں۔ فائق المقال کے علاوہ منہج القویم اور قرأت سے متعلق بھی ایک رسالہ ان کی تصنیف میں شامل ہے❷۔

## ۳۰۔ قاضی احمد بن سلامہ جزائری

قاضی احمد بن سلامہ جزائری بھی شیعہ تھے اور اپنے دور کے مشاہیر افاضل میں سے تھے۔ ہندوستان آئے اور حیدر آباد (دکن) کے منصب قضا پر متعین ہوئے۔ تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ فاضل، فقیہ اور صالح بزرگ تھے۔ مصنف بھی تھے۔ چنانچہ علامہ حلی کی الارشاد کی شرح سپرد قلم کی۔ کہتے ہیں ان کی بعض اور تصانیف بھی ہیں، لیکن ہمیں ان کا علم نہیں ہو سکا❸۔

---

❶ تاریخ نوائط۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۔

❷ نجوم السما۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۳۹۔

❸ امل الآمل (از حر عاملی)۔ نجوم السما۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹، ۴۰۔

## ۳۱۔ مولانا احمد بن سلیمان کردی گجراتی

مولانا احمد کے والد مولانا سلیمان دراصل علاقہ کردستان کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی سکونت ترک کر کے ارض ہند میں آ گئے تھے اور گجرات میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حدیث وفقہ کے عالم اور شیخ عبدالحق دہلوی کے تلمیذ تھے۔ گجرات ہی میں مولانا احمد کی ولادت ہوئی اور اپنے والد مولانا سلیمان کی گود میں تربیت پائی۔ اکثر کتب درسیہ اس علاقے کے مشہور عالم قاضی محمد شریف گجراتی سے پڑھیں۔ شرح المواقف اور دیگر فنون حکمیہ کی تحصیل مولانا ولی محمد خانو گجراتی سے کی۔ تصوف وطریقت کے لیے شیخ فریدالدین گجراتی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فنون ریاضیہ امیر قباد بدخشی یعنی نواب ریاست خاں سے حاصل کیے۔ علم حدیث اور بعض فنون مروجہ کے لیے اپنے والد مکرم شیخ سلیمان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ ان تمام علوم وفنون پر عبور حاصل کرنے کے بعد خود مسند تدریس بچھائی اور درس وافادہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے فیض علم سے بے شمار علما وطلبا مستفید ہوئے۔ یوں تو یہ تمام علوم پر عبور رکھتے تھے، مگر علوم حکمیہ میں توارضِ گجرات میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ اس نواح میں ان علوم کی نشرو اشاعت کے سلسلے میں سب سے فوقیت لے گئے تھے۔ علم کلام سے متعلق فیض القدس کے نام سے ان کی ایک عمدہ تصنیف ہے۔ اس عالم دین نے ۲۱/ جمادی الاخریٰ ۱۰۹۲ھ/ ۲۸/ جون ۱۶۸۱ء کو احمد آباد (گجرات) میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

تذکرہ علمائے ہند میں تاریخ وفات ۲۱/ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۲ھ (یکم وبست جمادی الثانی سال یازدہ صدودوازدہ ہجری) مرقوم ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے [1]۔

## ۳۲۔ شیخ احمد بن عبداللہ حضرمی

شیخ احمد بن عبداللہ بن احمد بن حسین بن عبداللہ حضرمی حیدر آبادی، فقہی مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے۔ اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ مختلف علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ شیخ عبداللہ بن عمر باغریب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر مختلف علوم وفنون کی بہت سی کتابیں مختلف اکابر اساتذۂ عصر سے پڑھیں۔ حدیث، فقہ اور تصوف کی تعلیم اپنے والد مکرم شیخ عبداللہ سے حاصل کی۔ خرقہ تصوف بھی ان ہی کے دست مبارک سے زیب تن کیا۔ شیخ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب الدین کے سامنے بھی زانوے شاگردی تہ کیا۔ سید زین الدین بن محمد جدیلی، سید محمد بن احمد شاطری اور دیگر علما وفضلا کی بھی مصاحبت وملازمت اختیار کی اور ان سے مستفید ہوئے۔ جب مروجہ علوم کی تحصیل کر چکے تو علمی سیر وسیاحت کی غرض سے مختلف بلاد وامصار کا رخ کیا۔ سب سے پہلے احمد آباد (گجرات) تشریف لائے۔ وہاں ان کے ماموں شیخ جعفر صادق قیام فرما تھے۔ کئی سال ان

[1] مرآت احمدی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۰۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲، ۱۳۔

کی خدمت میں رہے۔ پھر بلاد دکن کو رخت سفر باندھا۔ وہاں بعض امرائے مملکت سے منسلک ہو گئے اور طویل عرصے تک اس علاقے میں سکونت پذیر رہے۔ نہایت کریم، فیاض اور سخی تھے۔ جو بات زبان سے کہتے اس پر عمل کر کے دکھاتے۔ حدیث، فقہ اور ادب کے ماہر تھے۔ فصاحت و بلاغت اور لغت میں یگانۂ روزگار تھے۔ دیگر علوم میں بھی ماہر تھے۔ کتاب وسنت کے عالم اور عامل تھے۔ ان کا سلسلۂ درس وتدریس جاری تھا اور طالبین ومریدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ ارادت مندوں کو مشائخ متقدمین کے انداز سے تصوف وسلوک کی راہوں پر گامزن ہونے کی تلقین کرتے تھے۔

اس رفیع المرتبت شافعی عالم دین نے ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء کو حیدر آباد میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں❶۔

## ۳۳۔ شیخ احمد بیجاپوری

شیخ احمد بیجاپوری، حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ لفظ محدث ان کے نام کا جز ہو گیا تھا اور شیخ احمد محدث بیجاپوری کے نام سے معروف تھے۔ والد کا اسم گرامی عبداللہ تھا۔ قاضی عبداللہ بیجاپوری کے داماد اور بھانجے تھے۔ حدیث اور فقہ کے ممتاز علما میں سے تھے۔ بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ بن طہماسپ شاہ کے دور کے جلیل القدر عالم دین تھے۔ بیجاپور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے❷۔

## ۳۴۔ شیخ احمد بن علوی حضرمی

شیخ احمد کا سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن علوی بن عمر بن عقیل بن محمد بن احمد بن عبداللہ بن محمد جمیل حضرمی۔ شیخ احمد گیارھویں صدی ہجری کے شافعی المسلک عالم وفقیہ تھے۔ ''روغہ'' نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے والد علوی کی گود میں پرورش پائی۔ سب سے پہلے قرآن مجید پڑھا۔ پھر علوم مروجہ کی تحصیل شروع کی۔ حدیث اور فقہ میں عبور حاصل کیا۔ حصول علم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے وطن کو خیر باد کہا اور عازم دیار ہند ہوئے۔ اس نواح میں کئی سال مقیم رہے۔ پھر مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ حج وزیارت کی سعادت حاصل کی اور وہاں کے اساتذہ کی کثیر جماعت سے علمی استفادہ کیا۔ حدیث، فروع اور علوم عربیہ میں مہارت پیدا کی اور پھر دوبارہ وارد ہند ہوئے❸۔

---

❶ محبوب ذی المنن۔ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۵۳، ۵۴۔

❷ روضۃ الاولیا۔ نزہۃ الخواطر، ج۵ ص۵۷۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۵۸۔

# ۳۵۔ شیخ احمد بن علی بُسکری

شیخ شہاب الدین احمد بن علی بن احمد بُسکری، نہایت متقی، مصلح وقت، صالح عالم دین اور فاضل کبیر تھے۔ مسلکاً مالکی تھے۔ شیخ عبدالقادر بن شیخ عیدروس اور دیگر اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا۔ کامل الصفات اور بلند افکار بزرگ تھے۔ یوم آخرت سے بہت ڈرتے تھے۔ متبع کتاب وسنت، مسلک سلف کے پابند، قناعت پسند، عفیف اور نیک شخصیت تھے۔ کسی وقت بے کار نہیں رہتے تھے، جب دیکھو یا تو کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہیں یا کچھ لکھ رہے ہیں۔ یعنی سارا وقت قلم وقرطاس کی صحبت میں گزرتا۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل نابینا ہو گئے تھے۔ بعض اہل علم نے ان کی مدح میں بڑے اچھے شعر کہے۔ شعر کہنے والوں میں اس دور کے ایک مشہور ادیب شیخ عبداللطیف بن محمد دبیر بھی تھے۔

منقول ہے کہ علم وفضل، ذکاوت وفطانت، ادب وفصاحت اور تقویٰ وتدین میں اس وقت کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ دین داری اور احکام خداوندی کے بارے میں نہ جھجک اور خوف محسوس کرتے تھے، نہ کسی کی ملامت کی پروا کرتے تھے۔

اس نامور مالکی عالم دین نے احمد آباد (گجرات) کو اپنا مستقل وطن قرار دے لیا تھا۔ ہفتے کی رات ۲۳ / ربیع الثانی ۱۰۰۹ھ / ۲۲ / اکتوبر ۱۶۰۰ء کو احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

# ۳۶۔ شیخ احمد بن مجتبیٰ مانک پوری

شیخ احمد بن مجتبیٰ بن مبارک بن احمد بن نور بن حامد حسینی رضوی مانک پوری۔ احمد حلیم کے نام سے معروف تھے۔ صالح عالم دین تھے اور مشائخ چشتیہ میں سے تھے۔ مانک پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد گرامی شیخ مجتبیٰ سے علم فقہ حاصل کیا۔ طریقت وتصوف کی منزلیں بھی ان ہی کی صحبت میں طے کیں۔ بعد ازاں خود ارشاد وتلقین کی مسند پر متمکن ہوئے اور خلق کثیر نے ان سے استفاضہ کیا۔ اس عالم دین نے ۲۵ / جمادی الاولیٰ ۱۰۴۰ھ / ۲۰ / دسمبر ۱۶۳۰ء کو شہر مانک پور میں وفات پائی[1]۔

# ۳۷۔ شیخ احمد بن محمد حضرمی

شیخ احمد بن محمد بن عبدالرحیم شہاب حضرمی گجراتی، اپنے عصر کے فاضل اجل اور رفیع المرتبت عالم دین تھے۔ شافعی المسلک تھے اور باجابر الشافعی الحضرمی کے نام سے مشہور تھے۔ فقہ شافعی پر عبور رکھتے تھے۔ اس لیے اہل علم کی محفلوں میں لفظ ''فقیہ'' ان کے نام کے جز کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا۔ علم وفضل میں منفرد اور تقویٰ و

[1] گلشن ارشدی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۵۹، ۶۰۔

تدین میں یگانہ تھے۔ اپنے والد نامدار شیخ محمد حضرمی سے اکثر علوم حاصل کیے اور ان ہی کی آغوش تربیت میں نشوونما پائی۔ پھر دیگر علمائے کرام کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں وارد ہند ہوئے اور شیخ عبدالقادر بن عیدروس وغیرہ اصحاب علم کی خدمت میں حاضری دی۔ بہت بڑے محقق، جودت، فکر میں معروف، دقیق سے دقیق مسائل حل کرنے میں ماہر اور امام وقت تھے۔ حافظہ نہایت تیز پایا تھا اور ذہنی وفکری اعتبار سے بلند مرتبے کے حامل تھے۔ دیگر مروجہ علوم وفنون کے علاوہ کتب ادب، لغت اور دواوین شعر پر گہری نظر تھی اور اس سلسلے کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے حافظے میں محفوظ تھا۔ گوناگوں علمی صلاحیتوں کی بنا پر اس دور کے علما وفضلا کے نزدیک بڑی قدرومنزلت کے مالک تھے۔ متعدد حضرات کی طرف سے انھیں درس وتدریس اور افتا کی اجازت حاصل تھی اور بے شمار واقعات، ادبی لطائف اور اشعار انھیں مستحضر تھے، جچی تلی اور سلجھی ہوئی گفتگو کرتے تھے۔

یہ جلیل القدر عالم دین اور نامور شافعی فقیہ ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء کو حج بیت اللہ سے سعادت اندوز ہوئے۔ وہاں مشائخ حجاز میں سے سید ابوبکر بن ابوالقاسم الشہیر بصائم الدہر، امام کبیر شیخ محمد الخاص، علامہ ابوالقاسم مطیر، ان کے بیٹے امام ابوبکر اور بھائی علامہ امین، شیخ احمد اشخر، علامہ محدث سید طاہر بن حسین اہدل، علامہ عبدالملک بن عبدالسلام دعسی اور سید حاتم بن اہدال وغیرہ سے اخذ علم کیا اور ان کی صحبت میں رہے۔ ان حضرات نے ان کو متعدد کتابوں کے درس وتدریس کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس دوران میں ربیع الاول ۹۹۷ھ سے لے کر جمادی الاولیٰ ۹۹۸ھ تک شیخ عبدالقادر حضرمی کی خدمت میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان سے بڑا استفادہ کیا اور پھر بلاد ہند میں جانے کی اجازت لی۔ وہاں سے برہان پور گئے۔ برہان پور کا حکمران اس زمانے میں سلطان علی عادل شاہ تھا۔ اس نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ وہاں کے علما وفضلا اور رؤسا نے بھی گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان کی تشریف آوری پر خوشی اور مسرت ظاہر کی۔ برہان پور میں ان کو انتہائی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اور شیخ عبداللطیف دبیر نے ان کی آمد پر چند شعر بھی کہے۔

شیخ احمد بن محمد حضرمی کی وفات لاہور میں ہوئی۔ انھیں زہر دے کر مارا گیا۔

بات یہ ہوئی کہ یہ برہان پور پہنچے تو شیخ عبداللطیف دبیر نے اپنا کتب خانہ دکھایا اور تمام کتابوں سے مطلع کیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شیخ عبداللطیف وفات پا گئے اور بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کی طرف سے فیضی کو ایک منصب پر متعین کرکے دکن بھیجا گیا۔ اثنائے سفر میں فیضی کا گزر برہان پور سے ہوا تو والیٔ برہان پور سلطان علی عادل شاہ نے راجہ خان کو بہت سے تحائف دے کر فیضی کے پاس بھیجا۔ فیضی نے سلطان کو کہلا بھیجا کہ مجھے تحائف کی ضرورت نہیں، البتہ فلاں کتاب دی جائے، جو شیخ عبداللطیف کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے اور وہ ذخیرۂ کتب اب سلطان علی عادل شاہ کے قبضے میں ہے۔ سلطان مذکور کو فیضی کے اس سوال سے ذہنی کوفت ہوئی۔ وہ کتاب نہیں دینا چاہتا تھا، مگر مجبوراً بادل نخواستہ کتاب فیضی کو دینا پڑی۔ پھر سلطان نے اپنے طور پر یہ تحقیق کی کہ فیضی کو اس کتاب کے متعلق کس نے اطلاع دی، تو پتا چلا کہ شیخ احمد باجابر فقیہ نے فیضی کو اس کی

اطلاع دی ہے اور شیخ احمد کو خود شیخ عبداللطیف نے اپنی کتاب کے بارے میں معلومات مہیا کی تھیں۔اس سے والیٔ برہان پور کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ شیخ عبداللطیف بہت سے اسرار مملکت اور راز ہائے سلطنت سے آگاہ ہیں، ممکن ہے کسی راز سے شیخ احمد باجابرفقیہ کو بھی مطلع کر دیا ہو اور وہ راز فیضی کے گوش گزار ہو جائے اور پھر فیضی کی معرفت اس کی اطلاع اکبر بادشاہ تک پہنچ جائے ،اور اس طرح والیٔ برہان پور کسی نئی مصیبت میں پھنس جائے۔

اتفاق سے انہی دنوں شیخ احمد باجابرفقیہ فیضی کی معیت میں عازم لاہور ہو رہے تھے۔اس سے سلطان علی عادل شاہ کو اور بھی خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں شیخ اس کو راز کی باتیں نہ بتا دیں اور یہ باتیں اکبر تک پہنچ جائیں اور وہ اس سے بدظن ہو جائے۔اس خوف اور خطرے کے پیش نظر اس نے اپنے چار غلاموں کو شیخ کے ساتھ کر دیا اور ان کو ہدایت کی کہ راستے میں جہاں کہیں ان کا داؤ لگے، زہر دے کر شیخ کو ہلاک کر دیں۔ چنانچہ لاہور کے قریب پہنچے تو ان کو موقع ہاتھ آ گیا اور وہ شیخ احمد باجابرفقیہ کو زہر دینے میں کامیاب ہو گئے، جس سے شیخ کو سخت تکلیف ہوئی اور وہ بدھ کی رات ۱۴؍ شوال ۱۰۰۱ھ/۴؍ جولائی ۱۵۹۳ء کو لاہور میں وفات پا گئے۔

ان کی وفات سے بزم علم سونی ہو گئی، ادب و شعر کی رونقیں ختم ہو گئیں اور فقہ و حدیث کے دقیق مسائل پر بحث و مذاکرے کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔مختلف ہم عصر علما نے اس پر شدید کرب کا اظہار کیا اور ان کی وفات پر دردناک مرثیے کہے۔شیخ شہاب الدین احمد بن علی بسکری نے سو سے زیادہ اشعار پر مشتمل قصیدہ کہا۔

شیخ محمد بن عبداللطیف جامی الشہیر بہ مخدوم زادہ نے بھی ان کی موت پر اشعار میں اظہار افسوس کیا۔

النور السافر فی اخبار القرن العاشر کے فاضل مصنف عبدالقادر حضرمی نے بھی متعدد اشعار میں اظہار حزن و ملال کیا۔غرض متعدد شاعروں نے ان کی موت کو اپنا موضوع بنایا اور دردناک الفاظ میں ان کا ماتم کیا۔بے شک ان کی موت اس وقت علم کی موت تھی اور ان کا سانحہ وفات اس دور کے اہل علم کے لیے بے حد دینی اور فکری اذیت کا باعث تھا۔جس شاعر نے جن الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا اور جس لہجے میں ان کی موت پر اظہار حزن و ملال کیا، وہ بالکل صحیح تھا۔اس قسم کے لوگوں کا اس طرح دنیا سے کوچ کر جانا ہمیشہ عظیم حادثہ قرار دیا گیا ہے۔

## ۳۸۔مفتی احمد بن محمد بہاری

مفتی احمد بن محمد حسینی علوی بہاری، حاجی احمد سعید بن محمد سعید کے نام سے معروف تھے، علاقہ بہار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ان کے والد شیخ محمد بہاری اپنے دور کے صاحب علم وفضل بزرگ تھے۔انھوں نے اپنے اس بیٹے کو خود ہی علوم وفنون کی تعلیم دی اور بہترین انداز سے اس کی تربیت کی۔ یہاں تک کہ یہ منزل فضیلت پر فائز ہوئے، درس وافتا کی مسند کو زینت بخشی، علم فقہ اور دیگر علوم میں مہارت پیدا کی اور دیار ہند کے کبار فقہا میں سے گردانے گئے۔ ہندوستان کے مغل حکمران شاہ جہان نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہو کر انھیں مفتی عسا کر مقرر کر دیا تھا۔طویل عرصے تک اس منصب پر متعین رہے اور حسن وخوبی سے یہ فرائض انجام

دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی احمد بہاری علوم عربیہ، فقہ واصول، معرفت مذاہب، فہم دین اور فراست وزیری میں دیگر علمائے عصر سے منفرد حیثیت کے مالک تھے۔

ان کی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر اپنے آخری ایام حکومت میں شاہ جہان نے ان کو ترکی کی دولت عثمانیہ اور حرمین شریفین میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا اور اس منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔ اس اثنا میں حج بیت اللہ بھی کیا۔ واپس آئے تو شاہ جہان معزول ہو چکا تھا اور تاج شاہی اس کے بیٹے عالم گیر کے سر کی زینت بنا ہوا تھا۔ عالم گیر نے ان کی انتہائی تکریم کی اور بدرجہ غایت عزت واحترام سے پیش آیا۔ ایک ہزاری منصب سے نوازا اور اپنی بہن جہاں آرا بیگم کا دیوان مقرر کیا۔ اس عالم دین نے ۱۰۸۷ھ/ ۱۶۷۶ء میں وفات پائی ❶۔

## ۳۹۔ قاضی احمد عسکری بیجاپوری

قاضی احمد بن ابواحمد حسینی بیجاپوری، گیارھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے معروف شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ بیجاپور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں شہر بیجاپور میں عسکر سلطانی کے قاضی تھے اس لیے قاضی عسکری کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس عہدے پر کئی سال فائز رہے۔ کبار علمائے وقت میں سے تھے۔ منصب قضا کے نازک تقاضوں کو حسن وخوبی سے پورا کیا اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ بہترین خطاط بھی تھے۔ ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۴ء کو بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

## ۴۰۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی

حضرت شیخ احمد سرہندی، جمعے کے روز ۱۴ رشوال ۹۷۱ھ/ ۲۷ رمئی ۱۵۶۴ء کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ نسباً فاروقی تھے۔ سلسلۂ نسب ستائیس واسطوں سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ والد مکرم کا اسم گرامی شیخ عبدالاحد تھا جو بہت بڑے فاضل اور فقہ، اصول فقہ، اور معقولات ومنقولات کے ماہر تھے۔ طریقت وتصوف میں بھی کامل تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحب زادۂ گرامی شیخ رکن الدین گنگوہی سے بیعت تھے اور سلسلہ چشتیہ میں ان سے خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔ طریقہ قادریہ میں شاہ کمال الدین کیتھلی سے مستفیض اور خرقہ خلافت سے بہرہ مند تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ میں بھی منازل سلوک طے کی تھیں۔ شیخ عبدالاحد نے اسی (۸۰) سال عمر پا کر ۱۷ رجب ۱۰۰۷ھ/ ۳ رفروری ۱۵۹۹ء کو سرہند میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

❶ بادشاہ نامہ۔ مراۃ العالم ورق ۴۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۶۸۔

❷ بزم تیموریہ، ص ۲۵۰۔ محبوب ذی المنن۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۶۹، ۷۰۔

## سرہند کی تعمیر:

سرہند ایک مشہور شہر ہے جو ضلع پٹیالہ (مشرقی پنجاب۔ ہندوستان) میں واقع ہے۔ سرہند دراصل سہرند تھا۔ یہ دو الفاظ ''سہ'' اور ''رند'' سے مرکب ہے اور اس کے معنی ہیں شیروں کا جنگل۔ ''سہ'' کے معنی شیر اور ''رند'' کے معنی جنگل کے ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہ علاقہ بہت بڑا جنگل اور شیروں کا مسکن تھا، اس لیے ''سہرند'' کے نام سے مشہور تھا۔ کہتے ہیں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک مرتبہ شاہی خزانہ محافظوں کی نگرانی میں لاہور سے دہلی منتقل کیا جا رہا تھا، جب قافلہ اس مقام پر پہنچا جہاں اب سرہند آباد ہے تو ایک صاحب کشف بزرگ پر جو قافلے کے ہمراہ سفر کر رہے تھے، یہ منکشف ہوا کہ یہاں ایک بہت بڑا ولی پیدا ہوگا۔ یہ خبر بادشاہ کے گوش گزار ہوئی تو اس نے وہاں ایک شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا اور تعمیر کا کام شیخ رفیع الدین کے سپرد کیا۔ شیخ رفیع الدین چھٹی پشت میں شیخ احمد سرہندی کے اجداد میں سے تھے۔ شہر کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد شیخ رفیع الدین وہیں آباد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کثرت استعمال کی وجہ سے یہ شہر ''سہرند'' سے ''سرہند'' میں بدل گیا، اور اب اس کو اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

## ابتدائی حالات:

شیخ احمد سرہندی برصغیر کے ایسے برگزیدہ خاندان کے چشم و چراغ تھے جو ابتدا ہی سے علم وفضل، زہد و ورع اور تدین وتقویٰ کی دولت سے مالا مال تھا۔ ان کے والد محترم شیخ عبدالاحد بھی صاحب علم وصلاح اور متبع کتاب وسنت بزرگ تھے۔ ان کی فیض رسانی کا سلسلہ بہت وسیع تھا اور بے شمار لوگ ان کے حلقہ درس وافادہ میں شامل تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر تفسیر وحدیث اور علوم عقلیہ کی تکمیل کے لیے کبار علمائے کرام سے رجوع کیا۔ سیالکوٹ بھی گئے جہاں اس زمانے کے مشہور محدث وفقیہ مولانا یعقوب صرفی کشمیری اور مولانا کمال الدین کشمیری کا سلسلہ درس جاری تھا۔ شیخ احمد نے مولانا یعقوب سے سند حدیث لی اور معقولات کی بعض انتہائی کتابیں مولانا کمال الدین سے پڑھیں، جو اس دور کے عالم ومحقق اور عابد وزاہد تھے۔ سیالکوٹ میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی شیخ احمد کے ہم سبق وہم مکتب تھے۔ نواب سعد اللہ خاں بھی جو بعد کو مغل حکمران شاہ جہان کے وزیر مقرر ہوئے، اس زمانے میں مولانا کمال الدین کے حلقہ درس میں شامل تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے ذہن اس قدر اخاذ، حافظہ اس درجہ تیز پایا تھا اور حصول علم کا شوق ان پر اتنا غالب تھا کہ سترہ سال (اور ایک روایت کے مطابق اکیس سال) کی عمر میں تمام علوم مروجہ سے فارغ ہو گئے تھے اور سرہند میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

شیخ کی ذہانت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا تھا اور اصحاب علم ان سے بہت متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس

واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں شیخ آگرہ میں تفسیر و حدیث کے مطالعہ میں مشغول تھے، ابوالفضل اور فیضی نے جو اکبر بادشاہ کے دست راست تھے، ان کی ذہانت کی شہرت سن کر انھیں اپنے حلقہ احباب میں شامل کرنے کی سعی کی، مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا، کیوں کہ ان کے دینی و مذہبی عقائد سے شیخ احمد سرہندی کو شدید اختلاف تھا۔ یہ بھی منقول ہے کہ فیضی کی مشہور بے نقط تفسیر سواطع الالہام کا کچھ حصہ شیخ سرہندی نے لکھا تھا❶۔

## خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں:

شیخ احمد سرہندی کے زمانے میں دہلی کی مسند تصوف پر حضرت خواجہ باقی باللہ متمکن تھے۔ حضرت خواجہ کا اصل وطن کابل تھا۔ وہ ترک وطن کر کے وارد ہند ہوئے تھے اور دہلی کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا۔ اپنے عصر کے عظیم المرتبت صوفی اور رفیع القدر بزرگ تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۵/ ذی الحجہ ۹۷۲ھ/۴/ جولائی ۱۵۶۵ء اور تاریخ وفات ۲۵/ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ/ ۲۰/ نومبر ۱۶۰۳ء ہے۔ انھوں نے کل چالیس برس عمر پائی۔ اکبر کے عہد میں وارد ہند ہوئے اور دہلی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے تکمیل علم کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور منازل سلوک طے کیں۔ اس کے بعد دہلی میں خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ باقی باللہ ان کی فراوانی علم، جودت طبع اور زہد و تقویٰ سے نہایت متاثر ہوئے اور بہت ہی قلیل مدت میں انھوں نے حضرت خواجہ سے تمام مراتب سلوک طے کر لیے۔ اس ضمن میں حضرت خواجہ اپنے ایک دوست کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

شیخ احمد مردیست از سرہند، کثیر العلم وقوی العلم، روزے چند فقیر با اونشت و برخاست کرد۔ عجائب بسیار از روزگار اوقات او مشاہدہ نمود، بآں ماند کہ چراغے شود کہ عالمہا از وروشن گردد۔ الحمد للہ تعالیٰ احوال کاملہ اومرا بہ یقین پیوستہ❷۔

یعنی شیخ احمد سرہند کے رہنے والے ہیں۔ کثرت علم اور پختگی علم میں یکتا ہیں۔ چند روز فقیر نے ان کے ساتھ نشست و برخاست کی۔ ان کے کوائف اوقات سے بہت سے عجائب مشاہدہ میں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک چراغ کی طرح چمکیں گے، جس سے دنیا میں روشنی پھیلے گی۔ الحمد للہ، ان کے احوال کاملہ سے مجھے اس بات کا یقین ہو چکا ہے۔

### ورودِ لاہور:

خواجہ باقی باللہ کے حکم سے شیخ احمد سرہندی وارد لاہور ہوئے۔ لاہور میں ان کے علمی فیوض و کمالات

❶ روضۃ القیومیہ رکن اول، ص ۶۱، ۶۲، ۶۳۔ حضرات القدس، ج ۲، ص ۹، ۱۰

❷ مقامات امام ربانی، ص ۱۱۔

نے بڑی شہرت پائی۔ یہاں کے جلیل القدر علما جن میں مولانا جمال الدین تلوی اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان کے حلقۂ بیعت وارادت میں شامل ہوئے اور بہت سے مشائخ نے ان سے فیض حاصل کیا۔ شیخ احمد لاہور ہی میں تھے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کی خبر پہنچی۔ شیخ لاہور سے پا پیادہ دہلی پہنچے اور اپنے مرشد زادوں، ان کے عقیدت مندوں اور دیگر حضرات سے اظہار تعزیت کیا۔ یاد رہے، حضرت خواجہ کے پسماندگان میں دو کم عمر بیٹے تھے، ایک کا نام خواجہ عبیداللہ اور ایک کا خواجہ عبداللہ تھا۔ دو بیوگان تھیں اور یہ دونوں لڑکے ان دونوں کے بطن سے تھے۔

## مذہبی حالات:

شیخ احمد سرہندی کی پیدائش شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر کے عہد میں ہوئی۔ اکبر کا عہد حکومت ۹۶۳ھ سے شروع ہو کر ۱۰۱۴ھ/ ۱۵۶۶ء سے ۱۶۰۵ء تک چلتا ہے اور اکیاون (۵۱) سال کے لیل و نہار میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی حکومت کے ابتدائی عہد کو اسلامی عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن بعد میں اس کی زندگی کا دھارا بالکل بدل گیا تھا اور اسلامی احکام و اوامر کو ترک کر کے اس نے ہندوانہ رسوم و رواج کو خود بھی اپنا لیا تھا اور اپنی حکومت میں بھی یہی رسوم نافذ کر دی تھیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی اکبر کا درباری عالم اور اس کا ہم عصر مؤرخ ہے۔ وہ ایک پُر جوش اور پابند اسلام مؤرخ ہے۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف منتخب التواریخ میں وہ واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں، جو اکبر کے اسلام سے دور ہونے کا باعث بنے۔

ملا بدایونی لکھتا ہے کہ بادشاہ اپنی ہندو رعایا کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اپنا رخ اسلام سے پھیر لیا تھا۔ اس نے علمائے سوء کی بے حد ہمت افزائی کی جو اس سے مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے ہر قدم اٹھانے کو تیار رہتے تھے۔ اس نے اپنے گرد و پیش ایسے لوگوں کو جمع کر لیا تھا جو وحی اور شریعت کے منکر تھے۔ عقیدۂ وحی کے حاملین کو پرانی ذہنیت کے مقلدین قرار دیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے علیٰ رؤس الاشہاد اسلام کی مخالفت کی اور احکام اسلامی کو عارضی اور نامعقول قرار دیا۔ ہندوؤں نے رسول اللہ ﷺ پر زبان طعن دراز کی اور برملا آپ ﷺ پر سب و شتم کیا۔ بادشاہ قرآن کا منکر ہو گیا تھا، حیات بعد الممات اور یوم جزا کا انکار کرتا تھا۔ اس نے پہلے یہ حکم دیا تھا کہ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ بر سر عام پڑھا جائے، لیکن جب اس سے ہنگامہ آرائی کا خطرہ پیدا ہوا تو مصلحتاً اس کلمہ کو حرم سرائے کی چار دیواری تک محدود رکھنے کا حکم دیا گیا۔ سجدہ جسے اسلام نے فقط اللہ کے لیے مخصوص کیا ہے، بادشاہ کے لیے لازم ٹھہرایا گیا۔ شراب نوشی حلال کی گئی، خنزیر کا گوشت جزو خوراک بنایا گیا، جزیہ موقوف کر دیا گیا۔ ذبیحہ گاؤ حرام قرار دے دیا گیا، ملک میں کتے اور سور کے بچوں کی پرورش کو خاص طور پر مروّج کیا گیا، کیوں کہ وہ مظہر الٰہی سمجھے جاتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ اور حج منسوخ کیے گئے۔ تقویم اسلامی کے بجائے الٰہی ماہ

وسال رائج کیے گئے اور کہا گیا کہ اسلام ایک ہزار سال کے بعد ختم ہو گیا ہے۔ عربی کی تعلیم کو بنظر حقارت دیکھا جانے لگا، اذان اور نماز باجماعت جس کی پابندی پانچ وقت دیوان حکومت میں کی جاتی تھی، بند کر دی گئی۔ اس طرح اور بھی بہت سے اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونے سے سختی سے روک دیا گیا تھا۔ جو علمائے کرام اسلام کی کھل کر تبلیغ کرتے یا بادشاہ سے اختلاف کی جرأت کرتے یا ارکان دین پر کاربند ہوتے انھیں یا تو جلاوطن کر دیا جاتا یا دور دراز علاقوں میں بھیج دیا جاتا یا جیل میں محبوس کر دیا جاتا یا موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

اکبر کے بعد ہندوستان کا تخت حکومت جہاں گیر کے سپرد ہوا۔ جہاں گیر عملی اور فکری اعتبار سے اگرچہ باپ سے بہت مختلف تھا، تاہم بعض گمراہیاں اس وقت بھی موجود تھیں۔ یہ وہ حالات تھے جو واقعۃً کسی مصلح اور مجدد کی آمد کے طالب تھے اور متقاضی تھے کہ کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو ازسرنو اسلام کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرے اور کسی خوف اور خطرے کی پروا کیے بغیر، اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے میدان عمل میں نکلے۔

## مسند تدریس:

چنانچہ اس دور میں اللہ نے شیخ احمد سرہندی کے دل میں اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ پیدا کیا اور وہ اس کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے شہر سرہند میں مسند تدریس آراستہ کی اور تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم کلام اور تصوف کا درس دینا شروع کیا۔ ان کے حلقۂ درس میں بے شمار علما و طلبا شریک ہوتے اور شیخ ان کو تفسیر بیضاوی، صحیح بخاری، مشکوٰۃ، ہدایہ، بزدوی، شرح المواقف اور عوارف المعارف وغیرہ کتابوں کا درس دیتے۔ یہ گویا شیخ کا پہلا حلقۂ دعوت وارشاد تھا۔

## منصب تجدید:

اب زمانے نے انگڑائی لی، افق سرہند سے جمال حق کی شعاع پھوٹی اور حجۃ الاسلام، مجدد العصر شیخ احمد سرہندی قدس اللہ سرہ منصب تجدید پر فائز ہوئے۔ وقت آیا کہ بدعات کی شب تاریک میں سنت و ہدایت کی مشعل فروزاں ہو اور رسول عربی ﷺ کے لائے ہوئے دین کو الحاد و زندیقیت کی آلودگیوں سے پاک کر کے اپنے سادہ اور صحیح رنگ میں جلوہ گر کیا جائے۔ اب حضرت مجدد امن و عافیت کی وادی سے باہر نکلے اور دعوت و اصلاح کی امتحان گاہ میں پہنچ گئے۔ وہ نصرت الٰہی پر اس درجہ یقین رکھتے تھے کہ نہ شہنشاہ ہند کا تخت و تاج انھیں مرعوب کر سکا، نہ اس کا جبر و جلال ان کا راستہ روکنے میں کامیاب ہو سکا اور نہ اس کا لشکر جرار ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں میں رکاوٹ پیدا کر سکا۔

شیخ احمد سرہندی بلاشبہ اپنے وقت کے مجدد تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے ان کو مجدد الف ثانی کے لقب سے ملقب کیا، وہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے۔ روضہ قیومیہ کی روایت کے مطابق مولانا عبدالحکیم نے

ایک مکتوب میں ان کو ان الفاظ سے مخاطب فرمایا۔ امام ربانی، محبوب سبحانی، مجدد الف ثانی۔

زمانۂ طالب علمی کے تیس سال بعد ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء میں ان دونوں نامور شخصیتوں کے درمیان ازسرنو تعلقات استوار ہوئے اور اب تعلقات کی نوعیت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس طویل عرصے میں دونوں کی علمی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ مولانا عبدالحکیم کی علوم تفسیر و حدیث میں مہارت، علم کلام اور منطق و فلسفہ اور دیگر علوم میں عبور کی دھوم صرف مسجد کی چار دیواری تک محدود نہ رہی تھی بلکہ امرا و وزرا کے ایوانوں سے بھی آگے بڑھ کر بادشاہ کے فلک بوس محلوں تک جا پہنچی تھی اور شیخ احمد سرہندی کے دل میں بھی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی انتہائی قدر و منزلت جاگزین تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شیخ احمد نے ان کو ''آفتاب پنجاب'' کا خطاب عطا فرمایا۔

دوسری طرف شیخ احمد سرہندی، امام الشریعت، قیوم اول اور مجدد الف ثانی کے پرعظمت القاب سے ملقب ہو چکے تھے اور سرزمین برصغیر میں سرہند کو علم و فضل کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی بایں شکوہِ علم و فضل سرہند گئے اور شیخ کی بیعت سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے ''دلائل التجدید'' کے نام سے ایک رسالہ سپرد قلم فرمایا، جس میں دلائل و براہین سے شیخ کے مجدد ہونے کا ثبوت فراہم کیا اور خود شیخ نے بھی مکتوبات میں کہیں اشارۃً اور کہیں صراحتاً مجدد الف ثانی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ اپنے بیٹے خواجہ محمد صادق کو ضرورت مجدد کا شدید احساس کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

اے فرزند! ایں وقت آں است کہ درامم سابقہ دریں طور وقتے کہ پر از ظلمت است، پیغمبر اولوالعزم مبعوث می گشت و احیائے شریعت جدیدہ می کرد، و دریں امت کہ خیر الامم است، پیغمبر ایشاں خاتم الرسل علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات علما را مرتبۂ انبیائے بنی اسرائیل دادہ اند و بوجود علما از وجود انبیا کفایت فرمودہ اند، لہٰذا برسر ہر مائۃ از علمائے ایں امت مجددے تعین می نمایند کہ احیائے شریعت فرمائند۔ علی الخصوص بعد از مضی الف کہ درامم سابقہ وقت بعثت پیغمبر اولی العزم است و بہ ہر پیغمبرے درآں وقت اکتفا نمودہ اند، دریں طور وقتے عالمے عارفے تام المعرفت درکار است کہ قائم مقام اولوالعزم امم سابقہ باشد[1]۔

یعنی اے عزیز! یہ وہ وقت ہے، جب کہ ایسے ظلمت سے بھرے ہوئے دور میں پہلی امتوں میں اولوالعزم پیغمبر مبعوث ہوتے تھے اور نئی شریعت کا احیا کرتے تھے، اور اس امت (محمدیہ) میں جو خیر الامم ہے اور اس امت کے رسول خاتم الرسل حضرت محمد ﷺ ہیں، اس کے علما کو انبیائے بنی اسرائیل کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور انبیا کے بجائے علما کے وجود کو کافی سمجھا گیا ہے۔ اسی لیے ہر صدی کے آخر میں اس امت کے علما میں سے ایک مجدد متعین کرتے ہیں تاکہ وہ شریعت کا احیا کرے۔ بالخصوص ہزار سال کے بعد جو کہ اولوالعزم پیغمبر کے مبعوث ہونے کا وقت ہے، اور اس وقت ہر پیغمبر پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ پیغمبر اولوالعزم کو مبعوث فرمایا۔ اسی طرح اس زمانے میں ایک ایسے عالم و عارف کی ضرورت ہے جو پوری معرفت رکھتا ہو اور گزشتہ امتوں کے

---

[1] دفتر اول، مکتوب ۲۳۴۔

اولوالعزم پیغمبر کے قائم مقام ہو۔

ایک اور مکتوب میں واضح الفاظ میں اپنے مجدد ہونے کا اعلان فرماتے ہیں۔ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

یہ معارف، احاطہ ولایت سے بالاتر ہیں۔ان کے سمجھنے میں علما ظواہر کی طرح اصحاب ولایت عاجز و قاصر ہیں۔ یہ علوم انوار نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ کی مشکوٰۃ نبوت سے مقتبس ہیں، جو الف ثانی کی تجدید کے عہد تبعیت و وراثت کے طور پر تروتازہ اور ظہور پذیر ہوئے۔ ان علوم و معارف کا حامل اس الف کا مجدد ہے، چنانچہ اس کے علوم و معارف میں جو ذات وصفات اور افعال سے متعلق ہیں، اصحاب نظر وفکر پر یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ان علوم کی تربیت احوال و مواجید اور تجلیات وظہورات سے ہوتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ علوم و معارف علما کے علوم اور اولیا کے معارف سے بہت بلند اور ماورا ہیں۔ بلکہ اولیا وعلما کے علوم ان علوم کے مقابلے میں قشر اور چھلکے کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان معارف کو ان چھلکوں کے اندر مغز کا درجہ حاصل ہے۔اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ہادی ہے۔ جان لینا چاہیے کہ ہر سو سال بعد ایک مجدد ہو گزرا ہے، لیکن سو سال کا مجدد اور ہے اور ہزار سال کا مجدد اور۔ جس قدر سو اور ہزار سال کے درمیان فرق ہے، اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ ان دونوں مجددوں کے درمیان فرق ہے۔اور مجدد وہ ہوتا ہے کہ جو فیض اس مدت میں امتوں کو پہنچتا ہے، اسی کے ذریعے پہنچتا ہے اگرچہ اس زمانے میں اقطاب و اوتاد بھی موجود ہوں اور ابدال و نجبا بھی۔

ایک اور مقام پر اپنے صاحب زادۂ گرامی خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب تحریر فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

اے فرزند! باوجود اس امر کے جو میری آفرینش سے متعلق ہے، ایک بہت بڑا کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔ مجھے پیری مریدی کے لیے اس دنیا میں نہیں لایا گیا اور نہ میرے وجود سے ارشاد وتربیت مقصود ہے۔ معاملہ کچھ اور ہی ہے اور اللہ تعالیٰ مجھ سے کچھ اور ہی کام لینا چاہتا ہے۔ ہاں اس سلسلے میں جس کو مناسب ہو، وہ یہ فیض بھی حاصل کرے۔ جو کام اللہ کو مجھ سے لینا مقصود ہے، اس کے مقابلے میں یہ دعوت وارشاد کا کام بہت ہیچ ہے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت کو ان کے باطنی معاملات سے یہی نسبت تھی۔ اگرچہ منصب نبوت ختم ہو چکا ہے، لیکن نبوت کے کمالات وخصائص سے بطریق تبعیت و وراثت، انبیائے کرام علیہم السلام کے کامل تبعین کو بہرہ حاصل ہے [1]۔

حضرت علامہ نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے بھی اپنی تصنیف تقصار جنود الاحرار میں شیخ احمد سرہندی کے حالات بیان کرتے ہوئے انھیں مجدد، متبحر عالم، عارف کامل، متبع سنت اور شدید مخالف بدعات قرار دیا ہے۔الفاظ یہ ہیں:

عالم، عارف، کامل مکمل بود۔ طریقہ نقشبندیہ را امام عہد است و برائے صوفیا درسالک سلوک مجدد،

[1] دفتر دوم۔مکتوب ٦۔

مکتوباتش درسہ، مجلد است، دلیل واضح اند بر علو علم و کمال تبحر او در معرفت و بلوغ غایت مقامات، ترجمہ شریفہ او رسالہا ساختہ اند۔ ایں موقع مختصر ذکر آں کمالات رانمے تواند گنجد۔ حریص بود بر اتباع سنت و ترک بدعت، وجود امثال شاہ ولی اللہ و میرزا جان جاناں مظہر در اصحاب طریقۂ او کفایت است از برائے دریافت قدر و منزلت وے، رضی اللہ عنہ۔ وبالجملہ امام اہل سنت بود در عہد خود، وطریقہ علیہ وے رحمۃ اللہ علیہ مبنی بر اتباع کتاب وسنت در ظاہر و باطن، ونہ پذیرفتن چیزے کہ مخالف ایں ہر دو اصل محکم باشد۔ وایں مکتوبات اصول عظیمہ است از برائے وصول بمنازل معرفت وقبول، طالب صادق و سالک راغب را در ہیچ وقت از اوقات از مطالعہ آں بے نیازی حاصل نیست ❶۔

یعنی حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ عالم و عارف اور کامل و مکمل تھے۔ اپنے عہد میں طریقہ نقشبندیہ کے امام تھے اور صوفیا کے لیے راہ سلوک کے مجدد۔ معرفت خداوندی اور مقامات سلوک کی انتہا پر پہنچنے میں ان کو جو علو علم اور کمال تبحر حاصل تھا، اس پر ان کے مکتوبات شاہد اور واضح دلیل ہیں، جو تین جلدوں کو محتوی ہیں۔ ان کے مبارک سوانح میں کئی رسالے لکھے گئے ہیں۔ ان مختصر الفاظ میں ان کے کمالات کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔ وہ اتباع سنت اور ترک بدعت میں حریص تھے، شاہ ولی اللہ (محدث دہلوی) اور میرزا مظہر جان جاناں ایسے حضرات کا ان کے سلسلہ طریقت میں داخل ہونا ان کی قدر و منزلت کے ثبوت کے لیے کافی ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ خلاصۂ کلام یہ کہ وہ اپنے زمانے میں امام اہل سنت تھے، اللہ ان پر اپنی رحمت کی بارش کرے۔ ظاہر و باطن میں ان کا طریقہ کتاب وسنت پر مبنی ہے اور جو چیز ان دو محکم اصولوں کے خلاف ہو، وہ ان کے طریقے میں مقبول نہیں۔ معرفت وقبول کی منازل پر پہنچنے کے لیے یہ مکتوبات اصول عظیمہ ہیں۔ طالب صادق اور سالک راغب کو کسی بھی حال میں مکتوبات کے مطالعہ سے بے نیازی و بے اعتنائی نہیں ہوسکتی۔

ریاض المرتاض میں حضرت نواب صاحب ممدوح رقم طراز ہیں:

علو مرتبہ کشف ہائے مجدد الف ثانی رحمہ اللہ دریافت باید کرد کہ از سرچشمہ صحو سرزدہ، وگاہے مخالف شرع نیفتادہ بلکہ بیشتر را شرع موید است وبعضے چناں است کہ شرع ازاں ساکت است ومرتبہ او را در اولیا مثل مرتبہ اولوالعزم است در انبیا ❷۔

یعنی مجدد الف ثانی کے کشوف کے مرتبہ بلند کا اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ چشمہ صحو سے ظہور پذیر ہوئے اور کبھی کوئی کشف خلاف شریعت نہ ہوا، بلکہ اکثر کی شریعت موید ہے، اور بعض کشف ایسے ہیں کہ شریعت ان کے بارے میں ساکت ہے۔ اولیائے کرام میں ان کا مرتبہ ایسا ہے، جیسا انبیاء علیہم السلام میں اولوالعزم نبیوں کا۔

شیخ محسن بن یحییٰ بکری تیمی الیانع الجنی میں ارقام فرماتے ہیں کہ حضرت مجدد نے جس انداز سے

---

❶ تقصار جنود الاحرار، ص ۱۱۱، ۱۱۲۔

❷ ریاض المرتاض، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔

اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور جس اسلوب وطریق سے انھوں نے دین کے نشروذیوع کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرایا، اس میں وہ قطعی حق بجانب تھے اور اس ضمن میں انھوں نے جو قدم اٹھایا، علما کی بہت بھاری اکثریت نے اس میں ان کی تائید کی۔ اگر کسی طرف سے اظہار اختلاف ہوا بھی تو بہت کم مسائل میں۔!

وقل ما تعقب به عليه ورد من قوله والمسائل المعدودات التى شدد بها النكر عليه بعض اهل العلم فالحق انه مصيب فى بعضها وله تاويل سائغ فى البعض الاخر وشاركه فيها من هذا الطائفة ممن لا يحصى كثرة❶۔

(بہت کم مسائل ہیں، جن میں حضرت مجدد کی تعقیب اور تردید کی گئی، اور جن بعض اہل علم نے کچھ مسائل میں ان سے اختلاف کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بعض مسائل میں مجدد صاحب برسرِ حق ہیں، بعض میں ان کی تعبیر درست ہے اور ان میں علما کی بہت بڑی تعداد ان کی موید اور ان سے متفق ہے۔)

بدعات کی تردید اور سنت کی ترویج کے بارے میں مجدد صاحب نے جو موقف اختیار کیا اور جو خدمات عظیم انجام دیں، اس کے متعلق الیانع الجنی کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

ومنها انه حقق الفرق بين البدعة والسنة واقيسة المجتهدين واستحسانات المتأخرين والتعارف عن المشهود لها بالخير وما احدثه الناس فى القرون المتأخرة وتعارفوه فيما بينهم، فرد بذلك مسائل مما استحسنها المتاخرون من فقهاء مذهبه❷۔

(مجدد صاحب نے بدعت وسنت اور مجتہدین کے قیاس اور متاخرین کے استحسان میں فرق واضح کیا اور قرونِ خیر میں اور متاخرین کی ان بدعات میں جن کو انھوں نے مستحسن قرار دے لیا تھا، امتیاز فرمایا اور ان مسائل کا رد کیا، جنھیں فقہائے متاخرین، بدعت حسنہ سے تعبیر کرتے تھے۔)

## گھریلو صدمات اور حضرت مجدد کا صبر وضبط:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ انتہائی بلند حوصلہ اور پیکر تسلیم ورضا تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ١٠٢٥ھ/١٦١٦ء میں طاعون کا مہلک مرض پورے زوروں سے پھوٹا۔ اس میں تین چار روز کے اندر اندر ان کے خاندان کے متعدد افراد لقمۂ اجل ہوگئے۔ ان کے بڑے بیٹے خواجہ محمد صادق (جو چوبیس سال کے جوان رعنا تھے۔ ١٩ر ربیع الاول ١٠٢٥ھ/ ٢٧ر مارچ ١٦١٦ء کو فوت ہوئے) دو کم سن بیٹے (محمد فرخ اور محمد عیسیٰ) ایک صاحب زادی (ام کلثوم) اور خاندان کے کئی افراد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ خواجہ محمد صادق جید عالم، متقی اور بڑے پرہیزگار تھے۔ انتہائی اور مشکل کتب درسیہ طلبا کو پڑھاتے تھے: جن میں مطول مع حاشیہ میر، شرح عقائد مع

❶ الیانع الجنی، ص ٦٦۔

❷ الیانع الجنی، ص ٦٥۔

حاشیہ خیالی اور تحریر اقلیدس خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ کتابیں خود حضرات القدس کے مصنف اور شیخ مجدد کے شاگرد خلیفہ ملا بدرالدین سرہندی نے ان سے پڑھی تھیں۔ خواجہ ممدوح اپنے چھوٹے بھائی محمد عیسیٰ کے جنازے میں گئے اور انھیں دفن کر کے واپس لوٹے تو طاعون کی گلٹی نمودار ہوئی اور دوسرے روز انتقال کر گئے۔ یہ تمام موتیں بالخصوص خواجہ محمد صادق کی موت حضرت مجدد کے لیے انتہائی باعث حزن و ملال تھیں۔ اس کا اندازہ دفتر اول کے آخر اور دفتر دوم کے شروع کے ان مکتوبات سے ہوتا ہے، جو انھوں نے تعزیتی خطوط کے جواب میں لکھے۔ ان میں ایک مکتوب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نام بھی ہے۔

## عہد جہاں گیری میں مجدد الف ثانی کی مساعی:

مجدد الف ثانی کی ولادت شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہوئی۔ اکبر کا عہد حکومت ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے (قمری حساب سے) اکیاون (۵۱) سال سرزمین ہند پر حکومت کی اور ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء کو وفات پائی۔ عہد اکبری کے اختتام کے وقت حضرت مجدد کی عمر تینتالیس (۴۳) سال کی ہو چکی تھی۔ وہ اکبر کے زمانے میں کھل کر میدان جہاد میں نہیں اترے۔ البتہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور مکتوبات کا سلسلہ جاری رہا۔ اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہاں گیر تخت ہند پر متمکن ہوا تو وہ کھل کر اور پورے زور سے میدان عمل و حرکت میں نکل آئے۔

اس زمانے میں جو گوناگوں برائیاں پھیلی ہوئی تھیں اور جن بدعات و منکرات کا زور تھا، ان کو ختم کرنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی نے جو طریق کار اختیار کیا اس کو مختصر الفاظ میں مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کی بہت بڑی تعداد خدمت دین کی انجام دہی کے لیے تیار کی اور انھیں دین صحیح کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مختلف علاقوں اور شہروں میں متعین کیا۔ اور حکم دیا گیا کہ وہ اتباع سنت پر زور دیں اور لوگوں کو دائرۂ شریعت میں واپس لانے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس مہم کو فقط سرزمین برصغیر تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس سے متصل دیگر مسلمان ملکوں میں بھی موثر و منظم طریق سے اس کا آغاز کیا گیا۔

۲۔ شیخ مجدد نے متعدد ملکوں، علاقوں، شہروں کے سرکردہ اور نامور افراد سے بہت بڑے پیمانے پر سلسلہ مراسلات جاری کیا۔ یہ مراسلات و مکتوبات اب بھی موجود ہیں اور کئی بار شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں شیخ کا انداز یہ تھا کہ دینی امور کی وضاحت اور مذہبی مسائل کی تفصیلات بیان کرتے اور ان اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیتے جو اس زمانے میں عام طور پر اسلامی اوامر و احکام پر وارد کیے جاتے تھے اور جو لوگوں کے قلوب و اذہان میں ارکان حکومت کے ایک حلقے کی طرف سے مرتسم کر دیے گئے تھے۔ ان اعتراضات کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کی تشریح کی جاتی اور کتاب و سنت کی اتباع کو نقلی و عقلی دلائل سے ثابت کیا جاتا۔

۳۔ دربار شاہی کے معروف امرا اور موثر شخصیتوں کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل کیا تاکہ ایک طرف یہ

اپنے دائرۂ اثر کے لوگوں میں اسلامی ذہن پیدا کریں اور ان میں دینی انقلاب بپا کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔ دوسری طرف بادشاہ کی ذہنی و قلبی کیفیت کو بدلنے کے لیے اپنا ذاتی اور محکمانہ اثر استعمال کریں۔

۴۔ چوتھی اہم اور عظیم جدوجہد یہ شروع کی کہ لوگوں سے یہ عہد لیا جائے کہ وہ بادشاہ کے ان احکام کی اطاعت نہیں کریں گے جو اسلام کے خلاف ہیں۔ اس سلسلۂ جدوجہد کو رعایا کے عوام سے شروع کر کے شاہی فوج کے اعلیٰ ارکان تک وسعت دی گئی اور ہر شخص کو متاثر کرنے کے لیے اس کی ذہنی و فکری سطح کے مطابق دینی ضوابط اور شرعی ذرائع عمل میں لائے گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں شیخ کو بڑی کامیابی ہوئی۔ ان کی آواز صرف عوام تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ ان کے صدائے حق بادشاہ کے امرا و وزرا کے رفیع الشان محلوں تک جا پہنچی اور پھر ان کی وساطت سے قصرِ شاہی کے بابِ عالی پر دستک دینے لگی، بلکہ اس سے بھی آگے نکل کر خود بادشاہ کے کانوں میں جا گونجی۔ یہ ایک مردِ حق کی ایسی یلغار تھی، جس سے بادشاہ اور شاہی ارکان کے فکر و عمل کی بنیادوں میں لرزہ پیدا ہو گیا۔

## ردِ عمل:

بادشاہ ہند جہاں گیر اور اس کے بعض وزرا پر اس کا شدید ردِ عمل ہوا اور وہ شیخ کی اس ہمہ گیر دینی جدوجہد سے گھبرا اٹھے۔ آصف جاہ، جہاں گیر کا وزیرِ اعظم تھا۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ شیخ احمد کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ یہ نہایت سرکش اور حکومت کا باغی ہے۔ اس کا اثر ہندوستان کی سرحدوں سے بھی آگے بڑھ گیا ہے اور ایران، توران اور بدخشان وغیرہ ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اس نے بادشاہ کو سجدہ کرنے کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے، جب کہ سجدے کی رسم شہنشاہ اکبر کے زمانے سے چلی آ رہی ہے اور علما و فقہا اس کے جواز کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ فوج کے سپاہیوں اور دیگر محکموں کے ارکان کو اس کی اور اس کے مریدین کی مجلسوں میں جانے سے روکا جائے۔ نیز اس موقعے پر یہ بھی ضروری ہے کہ شیخ احمد کو نظر بند کر دیا جائے۔ بادشاہ بلاشبہ شیخ کو نظر بند کرنا چاہتا تھا، مگر یہ آسان کام نہ تھا۔ بڑے بڑے امرا اور مشہور اعیانِ سلطنت ان کا احترام کرتے اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو چکے تھے۔ شیخ کو نظر بند کرنے کی صورت میں بادشاہ کو ان امرا کی طرف سے شدید خطرہ لاحق تھا۔ لیکن بادشاہ نے اس مشکل کا حل یہ تلاش کیا کہ ان امرا کو دور دراز مقامات میں بھیج دیا۔ خان خاناں کو دکن میں، سید صدر جہاں کو مشرقی ممالک میں، خان جہاں لودھی کو مالوہ میں، خان اعظم کو گجرات میں اور مہابت خاں کو کابل میں تبدیل کر دیا۔

## جہاں گیر کے دربار میں:

اس کے بعد بادشاہ نے حضرت مجدد کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے ملاقات کی دعوت دی اور کہا کہ ہم

آپ کی اور آپ کے خلفا کی زیارت کے مشتاق ہیں، تشریف لا کر شکریہ کا موقع دیں۔ اس فرمان کے بعد حضرت مجدد اپنے بعض خلفا کی معیت میں جہاں گیر کے دربار شاہی میں داخل ہوئے۔

بادشاہ تخت پر جلوہ افروز تھا۔ حضرت مجدد تشریف لائے۔ بادشاہ کے حضور پیش ہوئے، مگر اس حالت میں کہ خلاف شرع آداب ورسوم بجالانا تو کجا، سلام تک نہ کیا۔ بادشاہ نے دریافت کیا۔ تم آداب سلطنت کیوں بجانہیں لائے؟ فرمایا دین اسلام کا یہ حکم ہے کہ ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو السلام علیکم کہنا چاہیے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ آپ ہمارے سلام شرعی کا جواب نہیں دیں گے، اس لیے میں نے السلام علیکم بھی نہیں کہا۔

اب بادشاہ مروجہ آداب کے مطابق سجدے کا طالب ہوا۔ لیکن حضرت شیخ نے انکار کر دیا اور فرمایا سجدہ ذات خداوندی کے سوا کسی کو کرنا روا نہیں۔ شیخ کے اس جواب پر مفتی عبدالرحمٰن آگے بڑھے جو دربار جہاں گیری میں شیخ الاسلام کے مرتبے پر فائز تھے۔ انھوں نے کتب فقہ سے سلاطین کے لیے سجدۂ تحیت کا جواز پیش کیا اور کہا میں بحیثیت مفتی فتویٰ دیتا ہوں کہ شہنشاہ کے سامنے سجدۂ تحیت جائز ہے۔ لیکن حضرت مجدد نے ان کے دلائل کو ٹھکرا دیا اور بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوئے۔

حضرت مجدد کے اس جواب سے بادشاہ سخت غضب ناک ہوا اور ان کے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد گوالیار کے قید خانے میں ڈال دیا اور شیخ ایک مدت تک اس قید خانے میں محبوس رہے۔



یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ جہاں گیر کو اپنے باپ کے ''دین الٰہی'' یا اکبری الحاد سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور واقعات کے تسلسل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان حالات کو قائم نہیں رکھنا چاہتا تھا جو اکبر نے علمائے سو کے کہنے سے پیدا کر دیے تھے۔ وہ ابوالفضل کا بھی سخت مخالف تھا۔ بلاشبہ اس کی چہیتی بیوی نور جہاں کا بھائی آصف جاہ اس کا وزیر سلطنت تھا اور یہ دونوں بہن بھائی امور سلطنت میں بڑے دخیل تھے اور شیعہ تھے، لیکن جہاں گیر کو ان کے مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ خلفائے ثلاثہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بے حد احترام کرتا تھا اور جیسا کہ وہ خود تزک جہاں گیری میں لکھتا ہے، حضرت مجدد سے اس کی خفگی کی ایک وجہ دفتر اول کا گیارھواں مکتوب ہے۔ اس مکتوب کے مندرجات سے بعض لوگوں نے جہاں گیر کے دل میں حضرت مجدد کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ وہ خود کو خلفائے ثلاثہ سے بھی افضل قرار دیتے ہیں۔ اس کے متعلقہ حصے کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''دیگر عرض یہ ہے کہ دوسری مرتبہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقامات ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوئے۔ نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس مقام سے اوپر کے مقام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذوالنورین کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ اور یہ مقام بھی تکمیل وارشاد کا مقام ہے، اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے، تکمیل وارشاد کے

مقام ہیں اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا۔ بندہ اس مقام پر بھی پہنچا اور اپنے مشائخ میں سے حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کو اپنے مقام میں اپنے ہمراہ پایا۔ اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، سوائے عبور اور مقام اور مرور اور اثبات کے کچھ فرق نہیں ہے اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابل ایک نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا، ظاہر ہوا، اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا سا بلند تھا، جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے اور وہ مقام رنگین اور منقش تھا۔ اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے رنگین معلوم کیا۔''

اس مکتوب کی وجہ سے کچھ لوگوں نے حضرت مجدد پر اعتراض کیا اور کہا کہ وہ اپنے آپ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل گردانتے ہیں۔ اس کا انھوں نے جواب بھی دیا مگر معترضین کو تسلی نہ ہوئی اور مرزا فتح اللہ گیلانی اور قاضی سنام ایسے بعض مرید اس مسئلے پر ان سے علیحدہ بھی ہو گئے۔ اس پر شیخ نے مرزا فتح اللہ کو ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں واضح کیا کہ میں اپنے آپ کو قطعاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے افضل نہیں سمجھتا۔ شیخ کے چند الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل جانے اس کا حال دو امر سے خالی نہیں ہے، یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل...... وہ شخص جو حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل کہے، وہ اہل سنت والجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال ہے جو اپنے آپ کو افضل جانے؟''

مجدد الف ثانی کے اس مکتوب کا تذکرہ خود جہاں گیر نے بھی اپنے تزک میں کیا ہے۔ وہ چہاردہم (چودھویں) سال جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے:

دریں ایام بعرض رسید کہ شیخ احمد نام...... در سرہند...... خلیفہ نام نہادہ...... خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ، مکتوبات نام کردہ...... ازاں جملہ در مکتوبے نوشتہ کہ در اثنائے سلوک گزرم بمقام ذی النورین رضی اللہ عنہ افتاد، مقامے دیدم بغایت عالی و خوش بصفا۔ ازاں جا در گزشتم بمقام فاروق رضی اللہ عنہ پیوستم واز مقام فاروق بمقام صدیق عبور کردم و ہر کدام را تعریفے در خور آں نوشتہ واز آں جا بمقام محبوبیت واصل شدہ مقامے مشاہدہ افتاد بغایت منور و ملون۔ خود را بانواع انوار و الوان منعکس یافتم۔ یعنی استغفر اللہ از مقام خلفا در گزشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخی ہا کردہ کہ نوشتن آں طولے دارد واز ادب دور است، بنابریں حکم فرمودم کہ بدرگاہ عدالت آئین حاضر سازند۔ حسب الحکم بملازمت پیوست واز ہر چہ پرسیدم جواب معقول نتوانست، سامان نمود و باعدم خرد و دانش بغایت مغرور و خود پسند ظاہر شد۔ صلاح حال او منحصر دریں دیدیم کہ روزے چند در زندان ادب محبوس باشد،

تا شوریدگی مزاج و آشفتگی دماغش قدرے تسکین پذیرد و شورش عوام نیز فرونشیند۔ لاجرم بہ انی رائے سنگھ دلن حوالہ شد کہ در قلعہ گوالیار مقید دارد❶۔

ترجمہ: ''ان ہی دنوں ایک درخواست پہنچی کہ شیخ احمد نامی...... نے سرہند میں...... جو خلیفہ کہلاتا ہے...... ایک خود نوشت کتاب تیار کی ہے جس کو مکتوبات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے...... ان مکتوبات میں ایک مکتوب یہ تحریر کیا ہے کہ میں منازل سلوک طے کرتا ہوا مقام ذی النورین (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) تک پہنچا۔ وہاں ایک نہایت بلند و بالا اور عمدہ و نفیس مقام دیکھا۔ میں اس سے آگے نکل کر مقام فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچا اور مقام فاروق سے مقام صدیق رضی اللہ عنہ کو عبور کر گیا۔ پھر ہر مقام کی تعریف بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ وہاں سے مقام محبوبیت سے واصل ہو گیا۔ وہاں بدرجہ غایت پر انوار اور منقش مقام دیکھا، میں نے اپنے آپ کو بھی اس مقام کے انوار و الوان سے انعکاس پذیر پایا۔ (جہاں گیر لکھتا ہے) یعنی استغفر اللہ! وہ مقام خلفا سے بھی عالی مرتبت ہو گیا۔ اس (مکتوب) میں اور بھی بہت سی گستاخانہ باتیں معرض تحریر میں لائی گئی ہیں، جن کا لکھنا باعث طوالت بھی ہے اور حد ادب سے باہر بھی۔ اس لیے میں نے حکم جاری کیا کہ اسے بارگاہ عدالت میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ حسب حکم اسے پیش کیا گیا، اور پھر میں نے جو سوال کیا، وہ غرور اور عدم خرد و دانش کی وجہ سے اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ معلوم ہوا کہ انتہائی مغرور اور خود پسند شخص ہے۔ اس کے اصلاح احوال کی یہی صورت نظر آئی کہ کچھ دنوں کے لیے زندانِ ادب میں محبوس کر دیا جائے تاکہ اس کی شوریدگی مزاج اور آشفتگی دماغ کی تسکین کا کچھ سامان پیدا ہو جائے، نیز عوام کی شورش بھی دب جائے۔ پھر بلاشبہ اسے انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کر دیا گیا تاکہ وہ اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر دے۔''

''حضرات القدس'' ایک مشہور کتاب ہے جو حضرت مجدد کے سوانح حیات اور اصلاحی کارناموں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مولانا بدرالدین سرہندی کی تصنیف ہے جو مجدد صاحب کے شاگرد اور خلیفہ تھے اور سترہ سال ان کی خدمت میں رہے تھے۔ اس میں بھی جہاں گیر کے دربار میں ان کی حاضری اور دونوں کے درمیان سوال و جواب کا ذکر موجود ہے۔ الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''جب کہ حضرت شیخ قدس سرہ کو اس کلام (مکتوب یازدہم) کے باعث جہاں گیر بادشاہ کے پاس لے گئے تو بادشاہ نے ان سے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے، آپ نے لکھا ہے کہ میرا مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بلند تر ہے۔ آپ نے یہی جواب دیا۔ (یعنی عبور و مرور اور اثبات کے فرق کی وضاحت کی) اور بادشاہ سے ایک مثال بھی بیان کی کہ مثلاً آپ کسی ادنیٰ کو خدمت کے لیے بلائیں اور اس سے از راہ نوازش اسرار کی باتیں کریں تو وہ لامحالہ پنج ہزاری امرا کے مقام کو طے کر کے پیشی تک پہنچے گا اور پھر اپنے مقام پر واپس جا کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتبہ امرائے پنج ہزاری سے زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ جواب سن کر بادشاہ کا عتاب دور ہو گیا۔''

❶ تزک جہاں گیری، ص ۲۷۴، ۲۷۵۔

"اسی اثنا میں ایک شخص نے جو خدا شناسی سے دور تھا، بادشاہ سے کہا کہ اس شیخ کا حال دیکھیے کہ آپ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہیں، اس نے آپ کو سجدہ نہیں کیا، بلکہ معمولی آداب بھی بجا نہیں لایا۔ بادشاہ یہ کلام سن کر خفا ہوا اور گوالیار میں حضرت کو قید کرنے کا حکم دیا۔ اس واقعہ سے پہلے شہزادہ دین پناہ شاہ جہان کہ شیخ سے خلوص کامل رکھتا تھا، علمائے مقامی افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو کتب فقہ کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بھیج چکا تھا کہ سجدۂ تحیت سلاطین کے لیے جائز ہے۔ اگر آپ سجدہ کرلیں تو کوئی گزند بادشاہ سے آپ کو نہیں پہنچے گا۔ میں اس کا ضامن اور ذمہ دار ہوں۔ آپ نے فرمایا: یہ مسئلہ کمزور ہے اور حکم رخصت رکھتا ہے۔ مسئلہ قوی یہ ہے اور عزیمت اسی میں ہے کہ غیراللہ کو کبھی سجدہ نہ کیا جائے[1]۔

## قلعہ گوالیار میں:

حضرت مجدد کے انکار اور طرز عمل سے بادشاہ نہایت خشمگین ہوا اور حضرت مجدد کو انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کر کے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔ ظاہر ہے کہ شیخ کو پہلے سے معلوم تھا کہ بادشاہ ان پر کس درجہ خفگی کا اظہار کرے گا اور اس کا انھیں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ لیکن چوں کہ دربار شاہی کے بڑے بڑے امرا اور فوج کے بعض نامور عہدے دار شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے تھے اور ان سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے، اس لیے ان پر شیخ کی گرفتاری کا شدید ردعمل ہوا۔ اگرچہ بادشاہ نے بغاوت کے خطرے کے پیش نظر انھیں دور دراز علاقوں میں بھیج دیا تھا، تاہم ان کے دل شیخ کے دام عقیدت سے بندھے ہوئے تھے اور وہ کسی صورت میں ان کی اس عظیم ابتلا کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ وہ اس سے متاثر ہوئے اور بادشاہ کے اس انتہائی اقدام کی سخت مذمت کی۔ ان حضرات میں کابل کے گورنر مہابت خاں کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے۔ اسے جب شیخ کی گرفتاری کی اطلاع پہنچی تو بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے خطبے اور سکے سے جہاں گیر کا نام نکال دیا اور اپنی فوج کی ایک خاص تعداد کے ساتھ جو چیدہ چیدہ افراد پر مشتمل تھی، ہندوستان پر حملہ آور بھی ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے دریائے جہلم کے کنارے بادشاہ کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ ممکن ہے وہ اس سے بھی تجاوز کرتا، لیکن حضرت مجدد نے قید خانے سے اس کو پیغام بھجوایا اور ہدایت کی کہ بغاوت سے باز رہے۔ بادشاہ کی اطاعت سے انحراف نہ کرے اور فتنہ وفساد کو روکے۔ شیخ کے اس حکم سے اس نے بادشاہ کو رہا کر دیا[2]۔

## قید سے رہائی:

جہاں گیر بادشاہ، تزک جہاں گیری میں پندرھویں سال جلوس (جشن پانزدہمیں نوروز از جلوس ہمایوں)

---

[1] حضرات القدس، دفتر ۲، ص ۸۹، ۹۰۔

[2] تفصیلات کے لیے دیکھیے روضۃ القیومیہ وغیرہ۔

کے واقعات کے ضمن میں شیخ احمد سرہندی کی رہائی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

دریں تاریخ شیخ احمد سہرندی را کہ...... روزے چند در زندان ادب محبوس بود، بحضور طلب داشتہ، خلاص ساختم، خلعت و ہزار روپیہ خرچ عنایت نمودہ، در رفتن و بودن مختار گردانیدم۔ اواز روئے انصاف معروض داشت کہ ایں تنبیہ و تادیب در حقیقت ہدایتے و کفایت بود[1]۔

(اسی تاریخ شیخ احمد سرہندی کو جو...... چند روز زندان ادب میں محبوس رہے، حضور میں طلب کیا گیا۔ میں نے ان کو رہا کر دیا۔ خلعت اور ہزار روپے خرچ کے لیے عنایت کیے، چلنے پھرنے اور قیام کی آزادی عطا کی۔ انھوں نے از روئے انصاف، اس تنبیہ و تادیب کو اس بات پر محمول کیا کہ یہ در حقیقت ایک ہدایت اور سبق کا ذریعہ تھی۔)

شیخ کی رہائی کا اصل باعث کیا تھا؟ اس کے بارے میں تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ایک رات بادشاہ ہند جہاں گیر نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ایک جگہ کھڑے ہیں اور حیرت و افسوس کے ساتھ دانتوں میں انگلی دبا کر بادشاہ سے فرما رہے ہیں:

''جہاں گیر! تو نے میرے دین کے کتنے بڑے خدمت گار کو قید کر دیا۔''

یہ منظر دیکھ کر جہاں گیر فوراً خواب سے بے دار ہوا۔ قلب و ذہن پر سخت ندامت و پریشانی کے اثرات ظاہر ہوئے اور بلا تاخیر شیخ کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ بعض روایات کے مطابق جہاں گیر نے خود جا کر شیخ کو زنداں سے نکالا۔ اپنی غلطی اور سوئے ادب پر ندامت کا اظہار کیا اور طالب عفو ہوا۔ شیخ نے معاف فرما دیا۔ اس نے شیخ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ انھی کو گواہ بنا کر اللہ کے حضور معاصی و منہیات سے تائب ہوا اور مغفرت کے لیے دعا کی درخواست کی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ عامل کابل مہابت خاں کے حملے کے بعد بادشاہ نے شیخ کو رہا کر دیا اور ان سے ملاقات کی خواہش بھی کی۔ مگر شیخ نے فرمایا، اس وقت تک ملاقات نہیں ہوسکتی، جب تک مندرجہ ذیل شرائط منظور نہ کی جائیں گی۔

۱۔ سجدۂ تعظیمی موقوف کیا جائے۔

۲۔ جو مساجد منہدم کی گئی ہیں، وہ از سر نو تعمیر کی جائیں۔

۳۔ ذبیحہ گاؤ کا امتناعی حکم منسوخ کیا جائے۔

۴۔ احکام شرعی کے نفاذ کے لیے قاضی اور مفتی و محتسب مقرر کیے جائیں۔

۵۔ غیر مسلموں سے جزیہ کی وصولی شروع کی جائے۔

۶۔ بدعات کا سد باب کیا جائے اور احکام شریعت کی تنفیذ کی جائے۔

---

[1] تزک جہاں گیری، ص ۳۱۲۔

۷۔ جو لوگ اس جھگڑے میں محبوس کیے گئے ہیں، انھیں رہا کیا جائے ❶۔

بادشاہ نے یہ شرائط منظور کرلیں تو شیخ احمد نے آگرہ تشریف لا کر ملاقات کی۔ اس نے شیخ کو خلعت اور نذر پیش کی۔ بعد ازاں شیخ نے عمر کے آخری چھ سال بادشاہ کے مشیر خاص کی حیثیت سے بسر کیے ❷۔

شیخ احمد سرہندی اکبر کے عہد (۹۷۱ھ/۱۵۶۵ء) میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق سترہ اور ایک روایت کے مطابق اکیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ پھر عہد اکبری ہی میں اپنے شہر سرہند کو تبلیغی مرکز بنایا۔ وہاں انھوں نے درس و تدریس کا ہنگامہ بھی بپا کیا، تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا اور مختلف سر کردہ لوگوں کو مکاتیب بھی تحریر کیے۔ یعنی انھوں نے ہر اعتبار سے باقاعدہ اپنی تبلیغی مہم کا آغاز فرمایا۔ مگر یہ سب سرگرمیاں نہایت دھیمے پن اور انتہائی محتاط طریقے سے کی گئی تھیں، اس لیے موثر اور ہمہ گیر ہونے کے باوجود اکبر کو اس سے زیادہ خطرہ لاحق نہیں ہوا، نہ انھیں کچھ کہا گیا، نہ گرفتار کیا گیا اور نہ ان پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی گئیں۔ انھیں جہاں گیر کے عہد میں ہدف ابتلا بنایا گیا اور پھر اس کا نتیجہ بہت بڑے اسلامی اور روحانی انقلاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

## عہد جہاں گیری میں شیخ کی تبلیغ دین اور اس کے اثرات:

رہائی کے بعد جہاں گیر شیخ کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوگیا۔ اس نے شیخ کو بالکل آزاد کر دیا تھا اور اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ گھر جانا چاہتے ہیں تو گھر تشریف لے جائیں اور اگر لشکر کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو لشکر میں رہیں اور تبلیغ دین کریں۔ شیخ نے گھر کے بجائے لشکر میں رہنے کو ترجیح دی، لشکر کی نقل و حرکت ہر وقت جاری رہتی تھی اور سارے ملک میں مختلف اوقات میں اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تھا، اس لیے اس سے تبلیغ کے زیادہ مواقع میسر آئے۔ اور لوگ زیادہ حلقہ بگوش ہدایت ہوئے۔ خود بادشاہ سے گفتگو کا طویل سلسلہ جاری رہتا۔ وہ دیر تک ان کی مجلس میں بیٹھتا اور ان سے مستفید ہوتا۔ بادشاہ کی شیخ سے دلچسپی کی وجہ سے امرا و وزرا، ارکان سلطنت اور رعایا کے عام لوگوں میں شیخ کا دائرۂ اثر وسیع ہوا اور دین اسلام سے ان کو مزید لگاؤ پیدا ہوا۔ بادشاہ سے جس انداز کی گفتگو ہوتی، خود شیخ اس سے بہت خوش تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے صاحب زادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب میں شاہی صحبتوں کے بارے میں مطلع کیا۔ اس مکتوب کا اردو ترجمہ یہ ہے۔ فرماتے ہیں:

''اللہ کی حمد اور اس کے برگزیدہ بندوں پر سلام۔ اس طرف کے احوال و کوائف لائق تعریف ہیں۔ عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت خاص ہے کہ ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے روضۃ القیومیہ رکن اول، ص ۱۸۶ تا ۱۹۵۔

❷ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مکتوبات دفتر دوم، مکتوب نمبر ۴۳، ۴۴۔ نیز دیکھیے روضۃ القیومیہ، رکن اول، ص ۱۹۹ تا ۲۰۹۔

اسلامیہ میں کسی قسم کی سستی اور مداہنت راہ نہیں پا سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں بیان ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال ضبط تحریر میں لایا جائے تو دفتر تیار ہو جائے۔ بالخصوص آج ماہ رمضان کی سترھویں شب کی صحبت میں انبیا علیہم السلام کی بعثت، عقل کے عدم استقبال، ایمان بالآخرت، اس کے عذاب وثواب، اثبات رویت باری تعالیٰ، حضرت خاتم النبیین کی ختم نبوت، ہر صدی کے مجدد، اقتدائے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم۔ تراویح کی سنیت، تناسخ کے ابطال، جنات کے احوال اور ان کے عذاب وثواب کے بارے میں بہت کچھ گفتگو ہوئی۔ وہ بہت خوشی اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ اس اثنا میں ضمناً اور بھی بہت سے امور زیر بحث آئے۔ اقطاب و اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیات کا ذکر بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ سب کچھ تسلیم کرتے ہیں اور کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔ ان واقعات اور ملاقاتوں میں شاید اللہ تعالیٰ کی حکمت کے اسرار پنہاں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی بے انتہا حمد ہے جس نے ہم کو نعمت ہدایت عطا فرمائی۔ اگر وہ ہدایت سے نہ نوازتا تو ہم کبھی ہدایت یاب نہ ہو سکتے۔ بلاشبہ ہمارے رب کے رسول سچے ہیں۔

''دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید سورۂ عنکبوت تک ختم کر لیا ہے۔ جب رات کو اس مجلس سے اٹھتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ حفظ قرآن کی یہ دولت عظمی، اس فترت میں جو عین حقیقت ہے، حاصل ہوئی۔ اول وآخر تمام حمد وثنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔''

واقعات کی ترتیب سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ شیخ کو رہا کرنے کے بعد جہاں گیر کو ان سے بہت زیادہ عقیدت ہوگئی تھی اور وہ ان کی مالی اعانت بھی کرنے لگا تھا۔ چنانچہ وہ شیخ کی رہائی سے تین سال بعد اپنی سال گرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

بدستور ہر سال خود را بطلا واجناس وزن فرمودہ در وجہ مستحقان مقرر فرمودم۔ ازاں جملہ شیخ احمد سہرندی دو ہزار روپیہ عنایت شد [1]۔

یعنی میں نے ہر سال کے معمول کے مطابق سونے اور اجناس میں اپنا وزن کرایا اور یہ چیزیں مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ ان میں سے شیخ احمد سرہندی کو دو ہزار روپے عنایت کیے گئے۔

علاوہ ازیں بادشاہ نے شراب نوشی ترک کر دی تھی، خلاف اسلام رسوم اور منہیات سے تائب ہو گیا تھا، شیخ کی صحبت میں باقاعدہ بیٹھتا اور ان سے مستفید ہوتا تھا۔ قلعہ گوالیار سے رہائی کے بعد شیخ تین سال تک شاہی لشکر میں رہے۔ اس اثنا میں ان سے خود بادشاہ نے بھی استفاضہ کیا۔ امرا و وزرا بھی ان کی تبلیغ سے اثر پذیر ہوئے اور شیخ نے مختلف حضرات کے نام بہت سے مکتوبات بھی تحریر کیے جو دفتر سوم میں مرقوم ہیں۔ یہ دور شیخ کی تبلیغ دین، اشاعت توحید اور دعوت اسلام کا دور تھا۔ آگے چل کر اس کے بہت ہی اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

---

[1] تزک جہاں گیری، ص ۳۷۹۔

## حضرت مجدد کی تعلیمات:

اب ہم اختصار کے ساتھ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی تعلیمات، ان کے افکار و تصورات اور اسلوب رشد و ہدایت کی ایک جھلک پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کی عظیم شخصیت کی فکری و عملی تصویر سامنے آئے گی اور پتا چلے گا کہ مختلف مسائل دینیہ کے بارے میں ان کا کیا نقطۂ نظر تھا۔ نیز معلوم ہوگا کہ ان کے دور میں ان مسائل کی وضاحت کس درجہ ضروری تھی۔

## توحید:

اس ضمن میں ہم سب سے پہلے چند سطور میں مجدد صاحب کے تصور توحید کی وضاحت ان ہی کے الفاظ میں کریں گے۔ وہ ایک مکتوب میں توحید کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

توحید عبارت از تخلیص قلب است از توجہ مادون او سبحانہ وتعالیٰ تاز ماینکہ دل را گرفتاری بما سوی محقق، اگر چہ اقل قلیل باشد، از ارباب توحید نیست۔ بے تحصیل ایں دولت واحد گفتن و واحد دانستن نزوار باب اصول از فضول است ❶۔

(توحید کی تعریف یہ ہے کہ دل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف توجہ کے سوا ہر شے سے خالی ہو جائے۔ جب تک دل ماسوی اللہ میں گرفتار ہے، اگر چہ بہت ہی قلیل طور پر ہو، اصحاب توحید میں سے نہیں ہے۔ اس جذبے کے حصول کے بغیر توحید کا دعویٰ کرنا اور توحید کا دم بھرنا ارباب اصول کے نزدیک بے معنی اور بے مقصد ہے۔)

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور دنیا میں تشریف آوری کا مقصد محض یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کی عبادت سے دور رہے اور فقط اللہ سے وابستگی اختیار کرے۔ ان کی فارسی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

ہمارے انبیا پر صلوٰۃ وسلام ہو جو تعداد میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب ہو گزرے ہیں۔ سب نے مخلوق کو خالق کی عبادت کی تبلیغ فرمائی اور غیر اللہ کی عبادت سے منع کیا۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے بندے اور عاجز انسان جانا اور ہمیشہ اللہ کی عظمت و ہیبت سے لرزاں و ترساں رہے ❷۔

ایک مکتوب میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اصحاب توحید کی پہچان کیا ہے اور وہ کن اوصاف سے متصف ہوتے ہیں؟ حضرت مجدد الف ثانی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

کامل توحید والے لوگ ان ہی امور کو مرکز توجہ ٹھہراتے ہیں جو اللہ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہوں، ناپسندیدہ اور غلط امور کی طرف وہ بالکل ملتفت نہیں ہوتے۔ وہ اپنے ایمان کو چند شیریں لقموں کے عوض

---

❶ مکتوبات دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۱۱۔

❷ مکتوبات دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۶۷۔

فروخت نہیں کرتے۔ وہ خوش نما لباس اور اعلیٰ پارچات کی خاطر غلامی کی زندگی اختیار نہیں کرتے۔ وہ تخت شاہی سے تعلقات استوار کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ وہ اللہ کی بادشاہی میں لات وعزیٰ کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ وہ بارگاہ خداوندی میں صرف دین خالص کے طالب ہیں۔ خبردار ہو جاؤ! خالص اطاعت وعبادت کا مستحق فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ الا للہ الدین الخالص۔

اللہ کا فرمان ہے کہ اے پیغمبر ﷺ، اگر تو نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مانا تو تیرے اعمال اکارت جائیں گے لئن اشرکت لیحبطن عملك۔

ایک ساعت کے لیے اپنے حال پر غور کرو۔ اگر یہ خالص دین تجھے میسر آ گیا تو تمھارے لیے بہت بڑی خوش خبری کا باعث ہوگا❶۔

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور سے قلب کو وابستہ کرنا باطنی امراض کی جڑ ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

باطنی امراض کی سردار اور اندرونی بیماریوں کی رئیس بیماری یہ ہے کہ دل کا پیوند اللہ کے سوا کسی اور کے ساتھ ہو۔ جب تک اس بیماری سے نجات حاصل نہ ہو جائے ایمان کی سلامتی محال ہے۔ کیوں کہ شرک کو بارگاہ رب العزت میں ہرگز دخل نہیں ہے۔ خبردار! دین خالص صرف اللہ ہی کا حق ہے۔ الا للہ الدین الخالص۔ پس جب شریک کو محبت الٰہی کے مقابلے میں غالب کر لیا جائے تو ایمان کا کیا حال ہوگا۔ یہ کس درجہ غلط بات ہے کہ غیر کی محبت کو اس انداز سے غالب کر لیا جائے کہ حق تعالیٰ کی محبت اس کے مقابلے میں مغلوب یا معدوم ہو جائے❷۔

ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں کہ تمام انبیا صرف اللہ تعالیٰ ہی کو بندگی کے لائق قرار دیتے تھے اور اپنے آپ کو اس کے عاجز بندے اور بشر قرار دیتے تھے۔ اس بات کو ان کی دعوت الی اللہ کے جز کی حیثیت حاصل تھی۔ فرماتے ہیں:

دوسرا دعوتی کلمہ جو انبیا علیہم السلام کا مخصوص کلمہ ہے، یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دیگر بنی نوع انسان کی طرح بشر جانتے ہیں اور عبادت وبندگی کے لائق صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو گردانتے ہیں۔ بنی نوع انسان کو اسی کی اطاعت وبندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں اور خداوند تعالیٰ کو حلول واتحاد سے پاک ومنزہ ٹھہراتے ہیں❸۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی اس علوشان اور عظمت کے باوجود بشر اور اللہ کے عبادت گزار بندے تھے۔ الفاظ یہ ہیں:

❶ مکتوبات، دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۷۴۔

❷ مکتوب دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۰۹۔

❸ [مکتو]ب دفتر اول، مکتوب نمبر ۶۳۔

اے برادر! محمد رسول اللہ ﷺ باآں علوشان بشر بود، وبداغِ حدوث وامکان متسم۔ بشر از خالق بشر جل سلطانہ، چہ دریابد وممکن از واجب تعالیٰ شانہ، چہ فرا گیرد، وحادث قدیم را جلت عظمتہ، چہ طور احاطہ نماید❶۔

یعنی اے برادر! حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ باوجود اس علوشان کے بشر تھے اور حدوث وامکان کے وصف سے متسم۔ بھلا بشر، خالق بشر کی حقیقت کو کس طرح پا سکتا ہے؟ اور ممکن، واجب کا احاطہ کیوں کر کر سکتا ہے؟ اور حادث قدیم کو اپنے دائرۂ ادراک ومعرفت میں کیسے لا سکتا ہے؟

## شرک کی سخت تردید:

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

انبیا علیہم السلام کے متفقہ کلمات دعوت یہ ہیں کہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اور اللہ بلند وپاک کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ بعض مخلوق بعض مخلوق کو ارباب من دون اللہ نہ بنائے❷۔

ایک اور مکتوب میں خالص علمی زبان میں شرک کی سخت تردید کرتے ہیں۔ ان کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

ممکن کو واجب ثابت کرنا اور واجب کے خیر وکمال کو ممکن سے وابستہ کر دینا، درحقیقت ممکن کو حق جل سلطانہ کی بادشاہت اور اس کے اختیارات میں شریک بنانا ہے۔ اسی طرح ممکن کو واجب تعالیٰ شانہ کا عین کہنا اور ممکن کے صفات وافعال کو واجب تعالیٰ کے صفات وافعال کا عین جاننا، واجب تعالیٰ کی جناب میں سوئے ادب اور اس کے اسما وصفات میں الحاد ہے❸۔

ایک مکتوب میں رسول اللہ ﷺ کے وجود بابرکت کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ دائرۂ امکان میں ہے، دائرۂ وجوب میں نہیں ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:

آنحضرت ﷺ باعلوشان وباآں جاہ وجلال ہمیشہ ممکن است، وہرگز از امکان نخواہد برآمد وبوجوب نخواہد پیوست، مستلزم تحقیق است بالوہیت۔ تعالی اللہ ان یکون لہ ند و شریک، دع ما ادعتہ النصاریٰ فی نبیھم❹۔

---

❶ ایضاً مکتوب نمبر ۱۷۳۔

❷ مکتوب دفتر اول، مکتوب نمبر ۱۷۳۔

❸ مکتوبات دفتر دوم، مکتوب اول۔

❹ مکتوبات دفتر سوم، مکتوب نمبر ۱۲۲۔

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ باوصف اس قدر اونچی شان اور جاہ و جلال کے ہمیشہ ممکن ہی ہیں اور ہرگز دائرۂ امکان سے نکل کر وجوب کے ساتھ پیوست نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ یہ امر وجوب کے ساتھ متحقق ہونے کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سروشریک سے برتر واعلیٰ ہے۔ جو دعویٰ نصاریٰ نے اپنے نبی کے متعلق کیا ہے، وہ اہل اسلام کو چھوڑ دینا چاہیے۔

## غیر اللہ سے استمداد:

غیر اللہ سے استمداد، دفع امراض و اسقام کی غرض سے اللہ کے سوا دوسروں سے مدد مانگنے اور طلب حاجات کے لیے ان کے دروازے پر دستک دینے کو حضرت مجدد الف ثانی شرک سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

استمداد از اصنام و طاغوت در دفع امراض و اسقام کہ در جہلائے اہل اسلام شائع گشتہ است، عین شرک و ضلال است وطلب حوائج از سنگہائے تراشیدہ و ناتراشیدہ نفس کفر و انکار از واجب الوجود تعالیٰ و تقدس قال اللہ تبارک وتعالیٰ شکایتاً عن حال بعض اہل الکتاب۔ یریدون ان یتحا کموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطن ان یضلھم ضلالاً بعیداً ❶۔

اکثر زنان بواسطہ کمال جہل کہ دارند بایں استمداد ممنوع مبتلا اند وطلب رفع بلیہ ازیں اسمائے بے مسمیٰ می نمایند و بآدائے مراسم شرک واہل شرک گرفتار اند ❷۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ امراض و اسقام کو رفع کرنے کی غرض سے بتوں سے اور طاغوت سے استمداد کرنا، جس کا جاہل مسلمانوں میں عام رواج ہو گیا ہے، عین شرک و گمراہی ہے۔ تراشیدہ و ناتراشیدہ پتھروں سے اپنی ضرورتیں اور حاجتیں طلب کرنا اللہ تعالیٰ کا صاف اور عین کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض گمراہوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنا معاملہ طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس سے انکار کر دیں اور شیطان ان کو ضلالت میں مبتلا کر کے سیدھی راہ سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ زیادہ تر عورتیں کمال جہالت کی وجہ سے استمداد کے اس ممنوع عمل میں مبتلا ہیں اور رفع بلیات کے لیے مراسم شرک اور عمل اہل شرک میں گرفتار ہیں۔

---

❶ یہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۶۰ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: وہ چاہتے ہیں کہ اپنے جھگڑے قضیے سرکش اور شریر (طاقتوں) کے آگے لے جائیں، حالانکہ انھیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس سے انکار کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے، انھیں اس طرح گمراہ کر دے کہ سیدھی راہ سے بہت دور جا پڑیں۔

❷ مکتوبات دفتر سوم مکتوب نمبر ۴۱۔

## نذر و نیاز کا شرکیہ انداز:

مشائخ اور بزرگان دین کے ناموں کی نذریں ماننا اور ان کی قبروں پر جانور ذبح کرنا اعمال شرکیہ میں داخل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

حیوانات را کہ نذر مشائخ می کنند، بر سر قبرہائے ایشاں رفتہ، آں حیوانات را ذبح می کنند، در روایات فقہیہ ایں عمل را نیز داخل شرک ساختہ اند، دریں باب مبالغہ نمودہ، و ایں ذبح را از جنس ذبائح جن انگاشتہ اند کہ ممنوع شرعیست و داخل دائرۂ شرک۔ ازیں عمل نیز اجتناب باید نمود کہ شائبہ شرک دارد۔ و وجوہ نذر بسیار است۔ چہ در کار است کہ نذر ذبح حیوانے کنند و ارتکاب ذبح آں نمائندہ بذبائح جن ملحق سازند و تشبیہ بعبدہ جن پیدا کنند [1]۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

حیوانات اور جانوروں کو کہ مشائخ اور بزرگوں کے لیے ان کی نذر مانتے ہیں اور ان کی قبروں پر لے جا کر ان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں، فقہی روایات میں اس عمل کو شرک میں شمار کیا گیا ہے اور اس میں فقہا نے بڑا سخت رویہ اختیار کیا ہے۔ ایسے جانوروں کے ذبح کرنے کو بھی ان ہی ذبیحوں میں گردانا گیا ہے جو جنات کے نام پر اور ان سے طمع و خوف کی بنا پر مشرکین ذبح کیا کرتے تھے۔ یہ سب شرعاً ممنوع ہے اور شرک کی ذیل میں آتا ہے۔ اس عمل سے بھی اجتناب ضروری ہے، کیوں کہ اس میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ نذر کی جائز اور مشروع صورتیں بہت ہیں۔ کیا ضرور ہے کہ جانور کے ذبح کرنے ہی کی نذر مانی جائے اور اس عمل کے ارتکاب سے جنات کے نام کے ذبیحوں میں شمولیت کر کے جنات کی پوجا کرنے والوں سے مشابہت پیدا کی جائے۔

## نجات کا ذریعہ اتباع شریعت ہے:

نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ اور انسان کس طرح فلاح و بہبود سے ہم کنار ہو سکتا ہے؟

حضرت مجدد نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور مختلف مکاتیب میں اس مسئلے کو واضح کیا ہے۔ صاف لفظوں میں لکھتے ہیں کہ نجات صرف حضرت محمد ﷺ کی اتباع ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ نجات کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اس ضمن میں ایک مکتوب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

طریق نجات و راہ رستگاری ہمیں متابعت شریعت است، علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام، در اعتقاد و عمل۔ استاد و پیر برائے آں غرض می گیرند کہ دلالت بشریعت نمایند و ببرکت ایشاں یُسر و سہولت در اعتقاد و عمل شریعت پیدا شود، نہ آں کہ مریداں ہرچہ دانند کنند، و ہرچہ خواہند خورند، و پیران سپر ایشاں گردند و از عذاب

[1] مکتوبات دفتر سوم، مکتوب نمبر ۴۱۔

نگہدارند کہ ایں معنی تمنائے محض است، آں جا بے اذن کسے شفاعت نتواند کرد، تا عمل مرتضٰی نبود، شفاعت او نہ کند، و مرتضٰی وقتے شود کہ بمقتضائے شریعت عامل شود ❶۔

اب ذیل میں ان الفاظ کا ترجمہ پڑھیے:

نجات کا ذریعہ اور فلاح و کامرانی کا راستہ فقط یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر صاحب شریعت (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ) کی اتباع کی جائے۔ استاد اور مرشد اس واسطے بنائے جاتے ہیں کہ وہ شریعت کی طرف رہنمائی کریں اور ان کی برکت سے شریعت کے مطابق عقیدہ اور عمل کی استواری میں آسانی وسہولت پیدا ہو۔ نہ یہ کہ مرید جو کچھ چاہیں کریں اور جو چاہیں کھائیں، اور پیران کو عذاب سے بچانے کی ڈھال بن جائیں۔ یاد رہے، یہ خیال ایک غلط اور بے ہودہ آرزو ہے۔ وہاں اذن کے بغیر کوئی شفاعت نہ کر سکے گا، اور جب تک عمل پسندیدہ نہ ہوں گے، کوئی سفارش نہ کرے گا، اور عمل پسندیدہ تبھی ہوں گے، جب شریعت کے مطابق چلا جائے گا۔

## اعتقادی مداہنت قابل معافی نہیں:

عمل وعقیدہ کے بارے میں حضرت مجدد کا وہی نقطۂ نظر ہے، جو سلف صالحین کا ہے۔ ان کے نزدیک عمل میں مداہنت بارگاہ الٰہی میں قابل عفو ہو سکتی ہے لیکن عقیدے کی مداہنت معاف نہیں ہو سکتی۔ عقیدے کی مداہنت ان کے نزدیک شرک کے مترادف ہے۔

مداہنت ومساہلت در عمل امید مغفرت دارد۔ اما مداہنت اعتقادی گنجائش مغفرت ندارد۔ ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر مادون ذلك لمن يشاء ❷۔

یعنی عمل میں مداہنت وغفلت کا ارتکاب ہو جائے تو مغفرت وعفو کی امید ہے۔ لیکن عقیدے کی مداہنت میں مغفرت کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ کا فرمان ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا جائے تو وہ نہیں بخشے گا، اس کے سوا جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

## ادلہ احکام شرعیہ:

ادلہ احکام شرعیہ کے بارے میں مجدد صاحب رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ صرف قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ ہیں، ان کے بعد قیاس اور اجماع امت کو بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

احکام شرعیہ کے اثبات میں صرف کتاب وسنت ہی معتبر ومستند ہیں۔ پھر قیاس اور اجماع امت بھی

---

❶ مکتوبات دفتر سوم، مکتوب نمبر ۴۱۔

❷ مکتوبات دفتر دوم، مکتوب نمبر ۶۷۔

مثبت احکام ہیں۔ ان چار ادلہ شرعیہ کے بعد کوئی ایسی دلیل نہیں، جس سے احکام شرعیہ کا اثبات ہو سکے۔ اولیائے کرام کے الہام سے کسی چیز کی حلت اور حرمت ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ارباب باطن کا کشف کسی چیز کو فرض یا سنت ثابت کر سکتا ہے ❶۔

ایک مکتوب میں فرماتے ہیں صرف قرآن و سنت سے استدلال کرنا چاہیے۔ جو شخص قرآن و سنت کو نظر انداز کر دے، اس سے کسی قسم کی گفتگو اور جھگڑا نہ کیا جائے ❷۔

## اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا فعل شنیع ہے:

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا فعل شنیع ہے اور اس سے روکنا ضروری ہے:

بعضے از خلفا را مریدان ایشاں سجدہ می کنند...... شناعت ایں فعل اظہر من الشمس است، منع شاں بکنید وتاکید در منع نماید ❸۔

بعض خلیفوں کو ان کے مرید سجدہ کرتے ہیں...... اس فعل کی شناعت و مکروہیت سورج سے زیادہ روشن ہے۔ انھیں روکنا چاہیے اور پوری سختی اور تاکید سے منع کرنا چاہیے۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں، ترجمہ:

اے برادر! سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے کا نام ہے۔ یہ عمل انتہائی تذلل، پستی، انکسار، عاجزی اور فروتنی کو متضمن ہے۔ تواضع کی یہ قسم صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، شریعت نے غیر اللہ کے لیے اسے جائز نہیں ٹھہرایا ❹۔

## غیر اللہ کو ''مالک دو جہان'' کہنا کلمہ شرک ہے

ایک شخص نے اپنے مکتوب میں حضرت مجدد رحمہ اللہ کو ''خدیونشأ تین'' سے مخاطب کیا۔ ''خدیونشأ تین'' کے معنی مالک دو جہان کے ہیں۔ حضرت مجدد کو اپنے لیے یہ کلمہ سخت ناگوار گزرا اور اسے کلمہ شرکیہ سے تعبیر فرمایا اور جوابی مکتوب میں تنبیہ فرمائی کہ یہ لفظ فقط اللہ کے لیے مخصوص ہے، غیر اللہ کے لیے اسے ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہیے، اگرچہ وہ کتنی بھی بڑی شخصیت ہو۔ بندہ بہر حال مملوک ہے، اس کے لیے کسی صورت میں بھی شرعی

❶ مکتوبات دفتر دوم، مکتوب نمبر ۵۵۔
❷ مکتوبات دفتر سوم، مکتوب نمبر ۴۴۔
❸ مکتوبات دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۹۔
❹ مکتوبات دفتر دوم، مکتوب نمبر ۹۲۔

اعتبار ہے اس لفظ کے استعمال کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ انداز بیان کس درجہ زور دار، منطقیانہ اور مدلل ہے۔

مجدد صاحب کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:

سعادت آثار! فقرہ درصحیفۂ گرامی اندراج یافت بود کہ ''خدیونشاً تین''۔ ایں نعتیست کہ مخصوص بحضرت واجب الوجود است جل سلطانہٗ۔ مملوك لا يقدر على شيء، راچہ رسد کہ بوجہ از وجوہ بخداوند خود جل سلطانہٗ مشارکت جوید و در راہ خداوندی پوید علی الخصوص درنشأ خردیہ کہ مالکیت و ملکیت چہ بطریق حقیقت و چہ بطریق مجاز مخصوص بحضرت مالك يوم الدين است۔ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ درروز قیامت ندا دہد لمن الملك اليوم وخودرا درجواب آں فرماید۔ لله الواحد القهار عبادرا دراں روز غیر از ہول ودہشت متحقق نیست وجز حسرت وندامت متصور نہ ❶۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

اے سعادت مند عزیز! آپ کے مکتوب گرامی کے ایک فقرے میں ''خدیونشاً تین'' مرقوم تھا (جس کے معنی دونوں جہان کے بادشاہ کے ہیں) یہ وہ نعت اور تعریف ہے جو صرف حضرت واجب الوجود اللہ جل شانہ کے لیے مخصوص ہے۔ بندۂ مملوک کو جو کسی شے پر قادر نہیں، کیا لائق ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے اور اختیارات خداوندی میں دخل انداز ہو۔ بالخصوص عالم آخرت میں کہ مالکیت وملکیت کیا حقیقی اور کیا مجازی حضرت مالک یوم الدین کے لیے مخصوص ہے۔ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ قیامت کے دن پکارے گا۔ لمن الملك اليوم (آج کس کی بادشاہی ہے) اللہ تعالیٰ خود ہی اس کے جواب میں ارشاد فرمائے گا۔ لله الواحد القهار (صرف اللہ واحد قہار کے لیے بادشاہی ہے) اس روز بندوں پر خوف ودہشت کے سوا اور کسی چیز کا غلبہ نہ ہوگا اور حسرت وندامت کے علاوہ اور کوئی شے تصور میں نہ آئے گی۔

## زبان سے نماز کی نیت کے لفظ کہنا بدعت ہے:

بعض لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت زبان سے نیت کے الفاظ کہتے ہیں۔ حضرت مجدد اس کی سخت نکیر کرتے اور اسے بدعت قرار دیتے ہیں۔ یہ بدعت عوام میں تو رائج ہے ہی، بعض علما بھی اسے مستحسن گردانتے ہیں۔ حضرت مجدد ایک مکتوب میں اس کو بدعت سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک ارادۂ قلب ہی اصل شے ہے۔ زبان سے الفاظ ادا کرنا قطعاً خلاف سنت ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

وہم چنیں است آنچہ علما درنیت نماز مستحسن داشتہ اند کہ باوجود ارادۂ قلب بزبان نیز باید گفت۔ وحال آں کہ ازاں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ ثابت نہ شدہ است، نہ بروایت صحیح ونہ بروایت ضعیف، ونہ از اصحاب

❶ مکتوبات دفتر اول، مکتوب نمبر ۴۷۔

کرام وتابعین عظام کہ بزبان نیت کردہ باشند بلکہ چوں اقامت می گفتند تکبیر تحریمہ می فرمودند۔ پس نیت بزبان بدعت باشد وایں بدعت را حسنہ گفتہ اند، وایں فقیر می داند کہ ایں بدعت چہ جائے رفع سنت کہ رفع فرض می نماید، چہ در تجویز آں اکثر مردم بزبان اکتفامی نمایند واز غفلت قلبی باک ندارند۔ پس دریں ضمن فرضے از فرائض نماز کہ نیت قلبی باشد متروک می گردد و بفساد نماز می رساند ❶۔

اب ذیل میں ان الفاظ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اسی طرح وہ امر ہے جسے علمانے نماز کی نیت کے بارے میں مستحسن سمجھا ہے کہ باوجود ارادۂ قلبی کے زبان سے نیت کے الفاظ کہنا چاہیے۔ حالانکہ یہ رسول اللہ ﷺ سے کسی صحیح یا ضعیف روایت سے ثابت نہیں، نہ صحابہ کرام اور تابعین عظام سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے زبان سے نیت کی ہو۔ بلکہ جب وہ اقامت (قد قامت الصلوٰۃ) کہتے تھے تو صرف تکبیر تحریمہ ہی کہتے تھے۔ سو زبان سے نیت کرنا بدعت ہے۔ بعض لوگ اس کو بدعت حسنہ کہتے ہیں، یہ فقیر جانتا ہے کہ یہ وہ بدعت ہے جو رفع سنت تو رہا ایک طرف سرے سے فرض ہی کو رفع کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس میں اکثر لوگ محض زبانی الفاظ پر اکتفا کرتے ہیں اور دل کی غفلت کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے فرائض نماز میں سے ایک فرض جو نیت قلب ہے، متروک ہو جاتا ہے اور یہ معاملے کو نماز کے فاسد ہونے تک پہنچا دیتا ہے۔

## بدعت کو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ میں تقسیم کرنا غلط ہے:

حضرت مجدد رحمہ اللہ نے بدعت کی شدید مخالفت کی ہے اور وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ بدعت دو اقسام پر منقسم ہے۔ ایک بدعت حسنہ ہے اور ایک بدعت سیئہ۔ ان کے نزدیک بدعت کی ایک ہی تعریف اور ایک ہی قسم ہے اور وہ یہ ہے کہ دین کی ان حدود میں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے متعین کر دی ہیں اور ان احکام میں جو کتاب وسنت میں منقول ہیں، کسی ایسی نئی چیز کو داخل کر لینا، جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ بدعت کو بس بدعت ہی کہنا چاہیے۔ اس کو بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کے خانوں میں تقسیم کرنا قطعی طور سے غلط ہے۔ یہ بات انھوں نے متعدد مقامات پر نہایت تفصیل سے بیان کی ہے ❷۔

## فاتحہ خلف الامام کے بارے میں:

حضرت مجدد کے طریق عمل اور اسلوب کلام سے عیاں ہے کہ وہ ظاہراً اور باطناً ہر لحاظ سے کتاب و سنت پر عامل تھے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہ کرتے تھے۔ مختلف فیہ مسائل میں وہ تشدد کے قائل نہ تھے،

❶ مکتوبات، دفتر اول مکتوب، ۱۸۶۔

❷ اس کے لیے دیکھیے مکتوبات دفتر دوم مکتوب ۲۳، ۵۴۔ دفتر اول، مکتوب ۱۸۴، ۲۶۰۔

لیکن ان کا عمل ہمیشہ حدیث وسنت کے مطابق رہا۔ فاتحہ خلف الامام کے بھی قائل تھے۔ ''زبدۃ المقامات'' ان کے حالات میں اولیں تذکرہ ہے اور مستند ہے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی اس کے مصنف ہیں جو ان کے مشہور خلیفہ تھے۔ اس کتاب کے بارے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ مجدد صاحب کی وفات کے تین سال بعد ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں فاتحہ خلف الامام سے متعلق مجدد صاحب کے مسلک کی خواجہ محمد ہاشم کشمی ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں:

ایں حقیر چوں می دید کہ دائم حضرت ایشاں بنفس نفیس امامت می کردند۔ روزے در خاطر گزشت کہ آیا لِمَ آں چہ باشد؟ بدیں خاطر بملازمت مشرف شد، تقریب جمع مذاہب درمیان آوردہ۔ فرمودند شافعیہ و مالکیہ رحمہم اللہ برآنند کہ جز بقرأت فاتحہ نماز درست نیست لہٰذا خلف امام فاتحہ می خوانند واحادیث صحیحہ نیز دلالت بریں نماید۔ اما امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فاتحہ امام را فاتحہ ماموم گفتہ، ماموم را فاتحہ خلف امام تجویز نمی نماید و جمہور فقہائے حنفیہ بریںند۔ مگر بعضے روایات مرجوحہ از حنفیہ بر جواز فاتحہ خلف امام آمدہ۔ چوں ما مہما امکن بر جمع مذاہب می کوشم، دریں صورت جمع را دراں دیدہ ایم کہ خود امامت کنم ❶۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

اس حقیر نے جب یہ دیکھا کہ حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ فرائض امامت خود انجام دیتے ہیں تو ایک روز دل میں خیال گزرا کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سوال پوچھا۔ جواب میں فرمایا، شافعیہ اور مالکیہ رحمہم اللہ کے نزدیک سورہ فاتحہ کے بغیر نماز درست نہیں ہے لہٰذا وہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں اور صحیح احادیث بھی اس پر دلالت کناں ہیں لیکن ہمارے امام، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام کی فاتحہ کو مقتدی کی فاتحہ قرار دیتے ہیں اور امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے اور جمہور فقہائے حنفیہ بھی اسی پر عامل ہیں۔ مگر احناف سے بعض مرجوحہ روایات فاتحہ خلف الامام کے جواز کے متعلق بھی موجود ہیں۔ تاہم جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم ممکن حد تک، تمام مذاہب فقہیہ میں عملی تطابق کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے اس معاملے میں ہمارے نزدیک جمع وتطابق کی یہی صورت ہے کہ خود فریضہ امامت انجام دیں۔

حضرت مجدد صاحب کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اختلافی مسائل میں قولاً وعملاً تشدد کے روادار نہ تھے اور مسئلے کے اسی پہلو کو ترجیح دیتے تھے جو کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہو۔

## تصانیف:

حضرت مجدد الف ثانی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ذیل میں ان کی تصانیف کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا جاتا ہے:

❶ زبدۃ المقامات، ص ۱۹۷، ۱۹۸۔

۱۔ اثبات النبوۃ: معلوم ہوتا ہے یہ ان کی سب سے قدیم تصنیف ہے، جسے ایک علمی رسالے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ رسالہ مسئلہ نبوت سے متعلق ابوالفضل سے ایک بحث کے نتیجے میں معرض تحریر میں لایا گیا تھا۔ تمہید کے علاوہ یہ رسالہ دو بحثوں پر محیط ہے۔ ایک بحث میں نبوت کے معنی و مطلب کی تحقیق کی گئی ہے اور دوسری میں معجزے کے بارے میں ضروری امور ضبط کتابت میں لائے گئے ہیں۔ بعد ازاں ایک مقالے میں بعثت، حقیقت نبوت، خاتم النبیین اور اثبات نبوت کا بیان ہے اور اس ضمن میں فلاسفہ کے نقطۂ فکر کی تردید ہے۔ کتاب کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ اکبر کے عہد میں مذہبی حالت کیا رخ اختیار کر گئی تھی اور اس باب میں وہ حد اعتدال سے کتنا آگے بڑھ گیا تھا۔

۲۔ رسالہ رد روافض: یہ رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شیعہ کی تردید و مخالفت میں ہے۔ اس کی وجہ تصنیف کے بارے میں شیخ محمد اکرام مرحوم لکھتے ہیں:

غالباً سفر لاہور کی یادگار ہے۔ یہ رسالہ اصل میں اس رسالے کا جواب ہے، جو علمائے شیعہ نے علمائے ماوراء النہر کو اس وقت بھیجا، جب عبداللہ خاں ازبک نے ۹۹۷ھ، (۱۵۸۹ء) میں مشہد کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ لیکن اس کی تصنیف کی فوری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں کئی شیعہ علمائے مشہد کے مضامین دہراتے اور امراو سلاطین کی مجلسوں میں انھیں بڑے فخر سے بیان کرتے۔

حضرت مجدد ان کی تردید کرتے، لیکن انھیں خیال ہوا کہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ سپرد قلم ہونا چاہیے تاکہ عوام الناس میں بھی غلط فہمیوں کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ وہ اس رسالے کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں:

بعضے از طلبہ شیعہ کہ متردد ایں حدود بودند، بایں مقدمات افتخار و مباہات می نمودند و در مجالس امرا و سلاطین ایں مغالطات شہرت می دارند و ایں حقیر در ہر مجلس و معرکہ مشافہہ بمقدمات معقولہ و منقولہ رد آنہا می کرد، وغلطیہائے صریحہ ایشاں را اطلاع می داد۔ اما حمیت اسلام ورگِ فاروقیم بایں قدر رد و الزام کفایت نمی کرد و شورش سینۂ بے کینہ تشفی نیافت و بخاطر فاتر قرار یافت کہ اظہار مفاسد ایشاں تا زمانے کہ در قید کتابت نہ آید...... نفع عام نہ بخشد۔

اس رسالے میں شیعوں کی نسبت وہی نقطۂ نظر ہے، جس سے مکتوبات امام ربانی اور مکتوبات خواجہ محمد معصوم کے پڑھنے والے واقف ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ کافر ہیں اور واجب القتل۔ یہ رسالہ (اثبات النبوۃ اور رسالہ تہلیلیہ کے برعکس جو عربی زبان میں ہیں) فارسی میں لکھا گیا، لیکن اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں کثرت سے روایات و احادیث دی ہیں جو عربی میں ہیں ❶۔

۳۔ رسالہ تہلیلیہ: یہ بیس بائیس صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے، جس کا تاریخی نام ''معارف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' ہے۔ اس میں کلمہ طیبہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ بحث کا آغاز لا سے کیا ہے۔ اس کے

❶ رود کوثر ص ۲۴۳، ۲۴۴۔

بعد لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کے اشتقاق نحوی کے متعلق علما و مفسرین کے اقوال کی روشنی میں بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ اللہ کے لطائف، وحدانیت الٰہی کے دلائل اور کلمہ طیبہ کے فضائل بیان کیے ہیں۔ اس رسالے میں تصوف کا انداز نمایاں ہے۔

۴۔ رسالہ معارف لدنیہ: اس میں حضرت مجدد نے ثابت کیا ہے کہ شریعت اور طریقت میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ پھر ان صوفیا کی مخالفت و مذمت کی گئی ہے جو شریعت کے خلاف باتیں کرتے اور احکام شرعی کو غلط انداز سے ہدف تاویل ٹھہراتے ہیں۔ اس قسم کے ناقص علم اور خام فکر صوفیا پر اظہار تعجب اور تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وعجب است از بعضے درویشاں خام ناتمام کہ کشف خیالی خود را اعتبار نمودہ بانکار و مخالفت ایں شریعت باہرہ اقدام می نمایند۔ وحال آنکہ موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام بایں کلیمی وقرب اگر زندہ می بود، غیر از متابعت ایں شریعت امر دگر نمی مود۔

یعنی بعض خام علم اور ناقص فکر صوفیا پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالی کشف کو قابل اعتبار گردانتے اور شریعت مقدسہ محمدیہ ﷺ سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت محمدی کی صداقت کا یہ عالم ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے قرب کے باوصف اور کلیم اللہ ہونے کے باوجود شریعت محمدی کے اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ پاتے۔

۵۔ رسالہ مبدا و معاد: یہ رسالہ بعض صوفیانہ مسائل اور عبارات پر مشتمل ہے جو حضرت مجدد کے خلیفہ خواجہ محمد صدیق بدخشی نے ان کی بیاض سے جمع کیے۔ بعض مندرجات حضرت مجدد کی روحانی زندگی سے متعلق ہیں۔

۶۔ تعلیقات بر شرح رباعیات خواجہ باقی باللہ: یہ رسالہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی رباعیات کی خود نوشت شرح پر مجدد صاحب کے اضافوں کو محتوی ہے۔ یہ رباعیات وجود باری تعالیٰ اور قدم باری تعالیٰ ایسے دقیق مسئلے سے متعلق ہیں۔ مجدد صاحب نے حضرت خواجہ کے نقطۂ نظر کی روشنی میں اپنے اسلوب خاص میں اس کی وضاحت کی ہے۔

۷۔ تعلیقات عوارف: یہ کتاب ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

۸۔ ارشاد المریدین: یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی۔

۹۔ مکتوبات امام ربانی: حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات جو مکتوب امام ربانی کے نام سے موسوم ہیں، بہت شہرت کے حامل ہیں۔ سرزمین برصغیر میں جو قدر و منزلت اہل علم میں ان مکتوبات کو حاصل ہوئی، وہ تصوف کی اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ ان کی ہمہ گیر مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ حضرت مجدد کی زندگی ہی میں ان کی نقلیں مرتب و مدوّن ہو کر ہندوستان کے مختلف شہروں اور اس سے باہر دیگر ممالک میں پھیل گئی تھیں۔ ان مکتوبات کی تین جلدیں ہیں اور ہر جلد دفتر کے نام سے موسوم ہے۔

دفتر اول: یہ دفتر درّ المعرفت کے نام سے موسوم ہے اور ۳۱۳ مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ ان کو حضرت مجدد کے مرید خاص خواجہ یار محمد بدخشی نے جمع کیا۔ یہ دفتر حضرت کی زندگی ہی میں مرتب ہو گیا تھا۔ حضرت مجدد کو جب ان مکتوبات کی تعداد بتائی گئی تو فرمایا: حضرات صحابہ بدر رضی اللہ عنہم کی تعداد بھی ۳۱۳ ہے۔ لہٰذا تبرکاً و تمیناً اس دفتر کو اسی مبارک عدد پر ختم کر دیا جائے۔ یہ دفتر ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں یعنی قلعہ گوالیار میں محبوس ہونے سے تین سال پہلے جمع ہوا، اور سب مکتوبات سے مفصل ہے۔ اس میں بیس خطوط وہ ہیں جو انھوں نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھے۔ کئی خطوط شیخ فرید اور جہاں گیر بادشاہ کے دوسرے امرا کے نام ہیں، جن میں ان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ نئے بادشاہ (جہاں گیر) کے عہد میں ترویج دین کی کوشش کریں۔ کچھ خطوط مختلف سوالوں کے جواب میں ہیں یا بعض علمی اور دینی مسائل کے بارے میں ہیں۔

دفتر دوم: اس دفتر کا نام نور الخلائق ہے اور یہ تاریخی نام ہے جو ۱۰۲۸ھ بنتا ہے اور یہی اس کی جمع و تدوین کا سال ہے۔ اس میں ۹۹ مکتوبات ہیں۔ حضرت مجدد کے مرید خواجہ عبدالحی ابن خواجہ چاکر حصاری نے خواجہ محمد معصوم کے ایما سے جمع کیا۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی تعداد بھی ۹۹ ہے، لہٰذا اس دفتر کو تبرکاً اسی عدد پر ختم کیا گیا۔ ان خطوط میں بعض بڑے مفصل اور طویل ہیں۔ ایک خط جو خواجہ محمد تقی کے نام ہے، بیس سے زیادہ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں اہل سنت اور شیعہ مسلک سے متعلق مدلل بحث اور اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایک خط خان جہاں کے نام ہے، جس میں عقائد اسلام تفصیل سے معرض تحریر میں لائے گئے۔

دفتر سوم: اس دفتر کا نام معرفت الحقائق ہے۔ پہلے یہ ۱۱۴ مکتوبات کا مجموعہ تھا۔ ان مکتوبات کے جامع حضرت مجدد کے مرید خواجہ محمد ہاشم کشمی برہان پوری ہیں۔ یہ مکتوبات ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء میں حضرت مجدد کی وفات سے تین سال پیشتر جمع کیے گئے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی نسبت سے یہ ۱۱۴ مکتوبات ہیں۔ پھر دفتر چہارم شروع ہوا، لیکن اس میں چودہ مکاتیب لکھے گئے تھے کہ حضرت کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا ان چودہ مکاتیب کو بھی شامل دفتر کیا گیا۔ اس حساب سے یہ ۱۲۸ مکتوبات ہونا چاہئیں تھے، مگر مطبوعہ نسخوں میں ۱۲۴ مکتوبات ہیں۔ چار مکتوب اس میں شامل نہیں۔ یہ اس زمانے کے مکتوب ہیں جب حضرت مجدد قلعہ گوالیار میں محبوس تھے یا لشکر شاہی کے ہمراہ تھے۔ ان میں ایک مکتوب بادشاہ جہاں گیر کے نام ہے، اس میں دعا کے اسرار اور علما و صلحا کی تعریف کی گئی ہے۔ ایک مکتوب ایک نیک خاتون کے نام ہے۔ اس میں وہ شرائط بیان کی گئی ہیں جو عورتوں کی بیعت کے سلسلے میں اسلام نے مقرر کی ہیں اور مروجہ بدعات کی تفصیلات بتائی گئی ہیں، جن میں ہندوستان کی بہت سی عورتیں مبتلا تھیں اور یہ وہ بدعات ہیں جو اب بھی مسلمان معاشرے میں موجود ہیں۔ مثلاً مرض چیچک اور بعض دیگر امراض کی صورت میں سیتلا دیوی کی منت ماننا، بزرگوں کی قبروں پر جانا، وہاں نذر و نیاز دینا اور جانور ذبح کرنا، پیروں کے نام کے روزے رکھنا، مختلف چیزوں کے شگون لینا، جادو ٹونا وغیرہ کو صحیح سمجھنا اور قابل عمل گردانا، ان بدعات کا دائرہ شرک تک پھیلا ہوا ہے۔ حضرت مجدد ان کے شدید مخالف تھے۔

## مکتوبات کی علمی ہمہ گیری:

مکتوبات امام ربانی کو علم وفضل کے دلآویز مجموعے کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں تحقیقی، فقہی، تبلیغی ہر قسم کا مواد موجود ہے۔ اسلوب نگارش بڑا زوردار، موثر اور خطیبانہ ہے۔ حضرت مجدد باطل کی تردید اور اعلائے کلمۃ اللہ میں نہایت جری ہیں۔ خلاف شرع امور کی پورے زور اور جوش سے تردید کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ایک مکتوب کی چند سطور سے ہوسکتا ہے جو انھوں نے ملا حسن کشمیری کے نام تحریر فرمایا۔ لکھتے ہیں:

نوشتہ بودند کہ شیخ عبدالکبیر یمنی گفتہ است کہ حق سبحانہ وتعالیٰ عالم الغیب نیست۔ بے اختیار رگ فاروقیم درحرکت می آید وفرصت تاویل وتوجیہ نمی دہد۔ قائل ایں سخنان شیخ کبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر شامی، کلام محمد علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام درکار است، نہ کلام محی الدین ابن عربی وصدر الدین قونیوی وعبدالرزاق کاشی۔ مارا بہ نص کار است، نہ بہ فص۔ مارا فتوحات مدنیہ از فتوحات مکیہ مستغنی ساختہ است۔

یعنی لکھا گیا ہے کہ شیخ عبدالکبیر یمنی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہیں ہے۔ اس بات سے میری رگ فاروقی بے اختیار حرکت میں آ گئی اور اس نے تعبیر وتوجیہ کا کوئی موقع باقی نہ رہنے دیا۔ اس قسم کی باتیں کہنے والا شیخ کبیر یمنی ہو یا شیخ اکبر شامی، ہمارے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہمیں صرف حضرت محمد ﷺ کے کلام سے تعلق ہے۔ محی الدین عربی، صدر الدین قونیوی اور عبدالرزاق کاشی کے کلام کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہمیں نص سے غرض ہے، نہ کہ فص (فصوص الحکم) سے۔ ہم کو فتوحات مدنیہ (حدیث) نے فتوحات مکیہ (ابن عربی کی کتاب) سے قطعی بے نیاز کر دیا ہے۔

اندازہ کیجیے یہ الفاظ حقیقت وصداقت، جذبہ وجوش اور تاثیر وخطابت کے لحاظ سے کتنے زوردار ہیں۔

## تجدید دین:

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تجدید دین کا کیا مطلب ہے اور اسلام میں مجدد کا تصور کیا ہے؟ ابوداود میں ایک حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ رأس کل مائۃ من یجدد لھا امر دینھا[1]۔

(اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی میں ایسا شخص پیدا کرے گا جو دین کی تجدید کرے گا۔)

یعنی امت محمدیہ میں اللہ تعالیٰ ہر صدی میں ایسا شخص پیدا کرتا رہے گا جو لوگوں کو مختلف برائیوں کے ارتکاب سے روکنے، بدعات ومحدثات سے دامن کشاں رہنے اور نیکی کے پھیلانے کی تلقین کرے گا۔ کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل اکابر دین اپنے اپنے زمانے کے مجدد و مصلح تھے:

---

[1] ابوداود، آخر کتاب المھدی اول کتاب الملاحم۔ باب مایذکر فی قرن المائۃ۔

عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ھ) پہلی صدی ہجری کے، امام شافعی یعنی محمد بن ادریس (۲۰۴ھ) دوسری صدی ہجری کے، ابن شریح (۳۰۶ھ) تیسری صدی ہجری کے، امام باقلانی احمد بن طیب (۴۰۳ھ) یا امام اسفرائنی احمد بن محمد (۴۰۶ھ) چوتھی صدی کے، امام غزالی (۵۰۵ھ)، پانچویں صدی ہجری کے، امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) چھٹی صدی ہجری کے، ابن دقیق العید (۷۰۲ھ) ساتویں صدی ہجری کے، امام بلقینی سراج الدین (۸۰۵ھ) آٹھویں صدی ہجری کے، جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نویں صدی ہجری کے مجدد تھے۔ شیخ احمد سرہندی فاروقی کو دسویں صدی ہجری کے مجدد (مجدد الف ثانی) کہا جاتا ہے۔

تجدید دین کے بارے میں علمائے کرام نے مختلف کتابوں میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ زمانے کے حالات کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر دور، ہر ملک اور ہر علاقے میں ایسے مصلحین پیدا کرتا ہے جو اس دور کی گمراہیوں کی نشان دہی کرتے اور لوگوں کو ان سے روکتے ہیں۔ ان کی تعداد ایک یا ایک سے زائد ہو سکتی ہے اور ان کا نہج تبلیغ اور طریق تجدید وقت و ماحول کے مطابق الگ الگ ہوتا ہے۔ یہ مجدد دین اور مصلحین صدی کے شروع یا آخر ہی میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ جب گمراہیوں کا زور بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے حالات کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔ اس قسم کے اونچے کردار کے حامل حضرات صدی کے شروع میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور صدی کے وسط میں بھی۔ یعنی جب وقت کا تقاضا انھیں آواز دیتا ہے، وہ میدان عمل میں اتر آتے اور فرائض تبلیغ انجام دینے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں [1]۔

## وفات:

حضرت مجدد الف ثانی نے تریسٹھ سال عمر پا کر بروز سہ شنبہ ۲۸ر صفر ۱۰۳۴ھ/ ۳۰ر نومبر ۱۶۲۴ء کو سرہند میں وفات پائی۔ نماز جنازہ ان کے صاحب زادۂ گرامی خواجہ محمد سعید نے پڑھائی، جو زبدۃ المقامات کے مصنف خواجہ محمد ہاشم کشمی کے بقول ''افقہ فقہائے وقت'' تھے۔ زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے کہ خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی، جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:

حضرت مخدوم زادۂ بزرگ خواجہ محمد سعید دامت برکاتہ نماز جنازہ پیر و پدر بزرگ وار خود رضی اللہ عنہ نمودند و بعد از نماز برائے دعا توقف نفرمودند کہ مقتضی سنت چنیں نیست و در کتب فقہ معتبرہ مرقوم است کہ بعد از نماز جنازہ ایستادہ دعا کردن مکروہ است، ہر چند کہ عمل بعضے امام دریں ایام چنیں است [2]۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

---

1. تفصیل کے لیے دیکھیے عون المعبود شرح ابوداؤد، ج ۴، ص ۱۷۸ تا ۱۸۲۔
2. زبدۃ المقامات، ص ۲۹۴۔

حضرت مخدوم زادہ خواجہ محمد سعید رحمہ اللہ نے اپنے مرشد و پدر بزرگ وار رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ پڑھائی اور نماز کے بعد دعا کے لیے نہیں ٹھہرے، کیوں کہ یہ دعا خلاف سنت ہے اور فقہ کی مستند کتابوں میں لکھا ہے کہ نماز جنازہ کے بعد کھڑے ہو کر دعا کرنا مکروہ ہے۔ تاہم بعض ائمہ مساجد ان دنوں بھی اس (خلاف سنت) فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔

## ۴۱۔ شیخ اسد اللہ ہرگامی

شیخ اسد اللہ بن اسماعیل بن خضر علوی حسینی ہرگامی، ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۶ء کو ہرگام میں پیدا ہوئے جو اعمال خیر آباد میں ایک خاصا بڑا گاؤں تھا۔ ان کے والد مولانا مفتی اسماعیل ہرگامی مشہور عالم تھے، ان ہی سے تعلیم پائی۔ علم فقہ بھی ان ہی سے حاصل کیا۔ حنفی المسلک تھے۔ اس دور کے علمائے صالحین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ تمام عمر درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں صرف کر دی۔ ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء کو ہرگام میں فوت ہوئے اور جلالی پور نامی ایک قریہ میں دفن کیے گئے [1]۔

## ۴۲۔ مفتی اسماعیل ہرگامی

مفتی اسماعیل بن خضر علوی حسینی ہرگامی، ۹۴۵ھ/ ۱۵۳۸ء کو ہرگام میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشوونما پائی اور اپنے والد شیخ خضر ہرگامی سے علم حاصل کیا، جو اس عہد کے علمائے دین میں سے تھے۔ دیگر اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حتیٰ کہ دیار ہند کے بہت بڑے عالم، شیخ، فقیہ، اصولی اور علوم عربیہ کے ماہر گردانے گئے۔ ان کے بیٹے شیخ اسد اللہ ہرگامی نے شیخ عبدالسمیع بن عبدالرحمٰن عباسی لاہرپوری سے اخذ طریقت کیا۔ مفتی اسماعیل ہرگامی بھی شیخ عبدالسمیع سے مستفیض ہوئے۔ شیخ عبدالسمیع ان کے بھانجے ہوتے تھے اور اس زمانے کے معروف صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کے علاوہ شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جون پوری سے بھی استفادہ کیا۔ عمر بھر اپنے گاؤں ہرگام کی مسند افتا پر فائز رہے اور درس و افادہ اور ذکر الٰہی میں زندگی بسر کر دی۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۰۳۰ھ/ ۱۶۲۱ء میں وفات پائی اور اس نواح کے ایک قریہ اسمعیل پور میں دفن کیے گئے [2]۔

## ۴۳۔ شیخ اسماعیل بن محمود سندھی

شیخ اسماعیل بن محمود سندھی کی کنیت ابوالفرج اور لقب سراج الدین تھا۔ ابوالفرج سراج الدین برہان

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۷۱۔

[2] ... طر، ج۵، ص۷۱۔

پوری کے نام سے معروف تھے۔ بہت بڑے صوفی، صالح عالم دین اور فقیہ نام دار تھے۔ صغر سنی ہی میں مشہور صاحب طریقت وتصوف شیخ عیسیٰ بن قاسم سے لزوم اختیار کر لیا تھا اور اس میں کامل دلچسپی رکھتے تھے۔ شیخ اسماعیل نے ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء کو برہان پور میں فارسی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام مخزن الدعوات رکھا۔ یہ کتاب اس مواد پر مشتمل ہے جو انھیں اپنے شیخ سے حاصل ہوا۔ کتاب دعوتی انداز کی ہے ❶۔

## ۴۴۔ شیخ اسماعیل لاہوری

شیخ اسماعیل بن فتح اللہ بن عبداللہ بن فیروز لاہوری، جلال الدین اکبر کے عہد میں پیدا ہوئے۔ کھوکھر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو مرض طاعون میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے والد فتح اللہ نے اسی حالت میں ان کو شیخ عبدالکریم لاہوری کے سپرد کر دیا۔ بڑے ہوئے تو حصول علم میں لگ گئے اور تمام درسی کتابیں مکمل کر لیں۔ یہاں تک کہ عالم کبیر اور محدث وقت مانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور سے دس میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے ایک گاؤں کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا اور وہاں درس وافادہ میں مشغول ہو گئے تھے۔ طویل مدت تک وہاں مقیم رہے۔ پھر لاہور منتقل ہو گئے۔

لاہور کے اس عالم دین کا حلقہ درس بڑا وسیع تھا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ عبدالحمید لاہوری، شیخ تیمور لاہوری، شیخ جان محمد لاہوری اور خلق کثیر شامل ہے۔ ۵/شوال ۱۰۸۵ھ/ ۲۳/دسمبر ۱۶۷۴ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

## ۴۵۔ اسماعیل محدث بیجاپوری

شیخ اسماعیل محدث بیجاپوری، شیخ شمس الدین محمد ملتانی بدری کی اولاد سے تھے اور اپنے عہد کے عالم کبیر تھے۔ حدیث اور فقہ میں شہرت رکھتے تھے۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ کے دور حکومت کے بزرگ تھے اور اس کے زمانے میں بیجاپور کے منصب درس وتدریس پر فائز تھے۔ ان کی وفات بھی بیجاپور میں ہوئی اور دفن بھی اسی شہر میں کیے گئے ❸۔

## ۴۶۔ شیخ افضل محمد اکبرآبادی

شیخ افضل محمد بن یوسف بن عبداللہ تمیمی انصاری اکبرآبادی، فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج۵،ص۲۷۔

❷ خزینۃ الاصفیا۔ نزہۃ الخواطر، ج۵،ص۲۷۔

❸ روضۃ الاولیا۔ نزہۃ الخواطر، ج۵،ص۲۷۔

سے تھے۔ ان کے والد شیخ یوسف بھی نامور عالم تھے۔ شیخ افضل محمد نے کتب فقہ اپنے والد سے پڑھیں اور علم طریقت بھی ان ہی سے حاصل کیا۔ بعض کتب درسیہ اپنے عم محترم جلال الدین سے پڑھیں۔ ان کی وفات کے بعد مفتی ابوالفتح عبدالغفور تھانیسری، قاضی جلال الدین ملتانی اور ملا مبارک ناگوری کی خدمت میں گئے اور ان سے حصول علم کیا۔ قاضی عیاض کی شفا، شیخ جعفر حسینی سے پڑھی۔ بعدازاں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ نہایت قانع، عفیف و متوکل علی اللہ اور مستغنی المزاج عالم دین تھے۔ ۲۱ ر صفر ۱۰۰۳ھ/ ۲۶ ر اکتوبر ۱۵۹۴ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں انتقال کیا اور وہیں تدفین ہوئی ❶۔

## ۴۷۔ قاضی اللہ داد ❷ بلگرامی

قاضی اللہ داد حنفی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ قاسم ❸ بن محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو حصول علم کے لیے مختلف اساتذہ کی خدمت میں گئے۔ کتب درسیہ شیخ عبدالرحمٰن عباسی لاہر پوری سے پڑھیں۔ جب فقہ اور اصول وغیرہ میں مہارت پیدا ہو گئی، تو واپس بلگرام تشریف لے گئے اور مسند تدریس کو زینت بخشی۔ ان کا شمار معروف فقہائے وقت اور مشہور فضلائے عصر میں ہوتا تھا۔ شیوخ فرشوریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ فرشوری خاندان بلگرام اور اس کے گرد و نواح میں پھیلا ہوا تھا اور اس کے افراد عہد قدیم سے مختلف مناصب شرعیہ اور عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ اپنی علمی برتری اور تدین و تقویٰ کی وجہ سے شہر بلگرام اور دیگر علاقوں میں دودمان فرشوری کو نہایت احترام و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بلگرام میں یہ حضرات محلّہ سید دائرہ میں سکونت پذیر تھے۔ ان میں قاضی اللہ داد بلگرامی معقولات و منقولات میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے یہ عالم و فقیہ بلگرام کی مسند تدریس پر بھی فائز تھے اور عدل و قضا اور افتا کا منصب بھی ان کے پاس تھا۔ تہذیب المنطق پر ان کی تعلیقات و حواشی ہیں ❹۔

## ۴۸۔ مولانا اللہ داد سلطان پوری

مولانا اللہ داد سلطان پوری، درحقیقت علاقہ سندھ کے ایک قریہ "نبودہ" سے تعلق رکھتے تھے۔ مشرق

❶ اذکار ابرار، ص ۴۲۵، ۴۲۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۳، ۴۷۔

❷ عربی اور فارسی تذکرہ نگاروں نے اسے الہداد لکھا ہے۔ لیکن ہم اللہ داد لکھیں گے، کیوں کہ اصل لفظ اللہ داد ہی معلوم ہوتا ہے۔

❸ حضرت قاسم رحمہ اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔ مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں سے تھے اور مشہور تابعی تھے۔ ۱۰۷ھ میں فوت ہوئے۔

❹ مآثر الکرام ص ۲۱۸، ۲۱۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۲، ۸۳۔

پنجاب کی سابق ریاست کپورتھلہ کے ایک مقام سلطان پور میں پیدا ہوئے اور وہاں کے مشہور عالم دین مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری سے تحصیل علم کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سلطان پور ہی میں درس و افتا کی مسند آراستہ کی۔ منقول ہے کہ تصنیف و تالیف کا بھی شوق رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے فقیہ، شیخ اور عالم دین تھے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں کافی عرصہ پنجاب کی مسند صدارت پر متمکن رہے۔ بعدازاں الہ آباد میں قاضی مقرر کر دیے گئے تھے۔

مولانا اللہ داد سلطان پوری ملا عبدالقادر بدایونی کے معاصر تھے۔ وہ منتخب التواریخ میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شرافت اور حسب ونسب میں نہایت ممتاز اور سربرآوردہ ہیں۔ ابتدا میں علم کے غرور اور جوانی کی ترنگ میں انتہائی متکبر و مغرور تھے، لیکن اب دنیا کا کافی تجربہ ہو چکا ہے اور غرور و تکبر، فقر و انکسار میں بدل گیا ہے۔ کچھ عرصہ پنجاب کی صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔ اب کافی عرصے سے الہ آباد کے نئے شہر کی قضاءت کے منصب پر مامور ہیں، لیکن بادشاہ کی خدمت ہی میں رہتے ہیں۔ الہ آباد میں جو معمولی سی معاش ملی ہے، اس پر قانع ہیں۔ دنیاداروں کے دروازوں پر دستک نہیں دیتے۔ بڑے نیک اور عبادت گزار ہیں۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے لیکن ان کی تصنیفات میں سے نام صرف کشف الغمہ ومنہاج الدین کا لکھا ہے۔ ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۸ء میں فوت ہوئے ❶۔

## ۴۹۔ شیخ امین بن احمد نہروالی

شیخ امین بن احمد نہروالی گجراتی رفیع القدر عالم اور جلیل القدر محدث تھے۔ وسعت علم و فضل میں یگانہ روزگار تھے۔ صاحب مجمع البحار شیخ محمد بن طاہر پٹنی کے شاگرد تھے۔ اخذ حدیث ان ہی سے کیا تھا۔ گلزار ابرار کے مصنف شیخ محمد غوثی مانڈوی لکھتے ہیں کہ ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء میں مانڈو گئے، وہاں ایک سال قیام پذیر رہے۔ بعدازاں اجین تشریف لے گئے۔ وہاں مختلف شیوخ سے ملے، اجین میں ان کا قیام علمی اعتبار سے بہت مفید رہا۔ اس شہر میں انھوں نے درس و افادہ کا سلسلہ جاری کیا اور نہایت قناعت و عفاف اور زہد و عبادت کے ساتھ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان سے تشنگان علوم کی بہت بڑی تعداد نے استفادہ کیا۔ اجین سے قاضی عبدالعزیز بن عبدالکریم بن راجی محمد اجینی گجراتی سے ملاقات کے لیے برہان پور گئے۔ وہیں یکم ربیع الاول ۱۰۱۷ھ/ ۵/جون ۱۶۰۸ء کو وفات پائی۔ تدفین بھی وہیں ہوئی ❷۔

❶ منتخب التواریخ۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۶۔

❷ اذکار ابرار، ص ۲۸۳، ۲۸۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۳۔

ــــ ب ــــ

## ۵۰۔ شیخ بابو بن شیخ جیو گجراتی

شیخ بابو بن شیخ جیو حسینی بخاری پٹنی گجراتی، ارض گجرات کے مشہور شہر پٹن میں پیدا ہوئے اور اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا۔ فراغت کے بعد درس وافادہ میں مصروف ہو گئے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ عالم وفقیہ، زاہد وعابد، صاحب فضل وکمال اور علاقہ گجرات کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ ان کے درس و تدریس کا غلغلہ عرصے تک سرزمین گجرات میں بلند ہوتا رہا اور تشنگان علوم ان کے چشمہ علم سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ انھوں نے ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۸ء میں وفات پائی❶۔

## ۵۱۔ شیخ بایزید انصاری سہارن پوری

شیخ بایزید بن بدیع الدین بن رفیع الدین انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ وہیں اپنے والد شیخ بدیع الدین کی خدمت میں تعلیم وتربیت کی منزلیں طے کیں۔ پھر عازم سرہند ہوئے، وہاں شیخ محمد معصوم سرہندی سے اخذ طریقت بھی کیا اور دیگر علوم کی بھی تحصیل کی۔ طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے تا آنکہ مختلف علوم ظاہری اور معرفت وسلوک میں حصہ وافر حاصل کیا۔ شیخ محمد معصوم نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا تھا۔ سرہند سے واپس سہارن پور گئے اور دعوت وارشاد اور درس وتدریس کو مشغلہ قرار دے لیا۔ جلیل القدر عالم، فقیہ، متدین، عفیف النفس، متوکل علی اللہ، کامیاب مدرس، صحیح الفکر مصلح وقت تھے۔ ان سے بہت سے نامور علما نے استفادہ کیا۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ کس مہینے کی کس تاریخ کو وفات پائی۔ البتہ تذکروں میں مذکور ہے کہ سوموار کے دن ۱۱۰۰ھ/ ۱۶۸۹ء میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ جائے وفات سہارن پور ہے❷۔

## ۵۲۔ شیخ بایزید بلگرامی

شیخ بایزید بن کمال الدین بن عبدالدائم عثمانی بلگرامی حنفی المسلک تھے۔ جید عالم دین، فقہ اور اصول فقہ کے ماہر تھے۔ اصول بزدوی پر چوں کہ گہری نظر رکھتے تھے، لہٰذا بزدوی دان (یعنی عالم بزدوی) کے عرف

---

❶ اذکار ابرار، ص ۴۴۱، ۴۴۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۷، ۸۸۔

❷ مولوی رحمان علی نے تذکرۂ علمائے ہند میں انھیں شیخ بایزید برہان پوری لکھا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: ''شیخ بایزید برہان پوری عالم متورع وفاضل متشرع بود۔ خرقہ خلافت از شیخ محمد معصوم سرہندی قدس سرہ داشت'' (ص ۲۶۲)۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ... ۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۷۱۔

سے معروف تھے۔ تمام عمر درس و افادہ میں صرف کر دی۔ ان کے عصر اور شہر میں ان کے پایہ کا کوئی عالم نہ تھا۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، البتہ ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء کے بعد زندہ تھے ❶۔

## ۵۳۔ شیخ بدرالدین سرہندی

شیخ بدرالدین بن ابراہیم سرہندی مسلکاً حنفی تھے۔ مشرقی پنجاب کے مشہور شہر سرہند میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور ان کے فرزند گرامی شیخ محمد صادق سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی قابل ذکر تصنیف حضرات القدس ہے۔ اس میں اپنی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں نے شرح المواقف، تفسیر بیضاوی، عضدیہ مع حاشیہ سید شریف جرجانی مجدد الف ثانی سے پڑھیں اور شرح عقائد مع حاشیہ خیالی، تحریر اقلیدس اور شرح المطالع مع سید شریف شیخ محمد صادق سے پڑھیں۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں سترہ سال شیخ محمد سرہندی مجدد الف ثانی کی خدمت میں رہا۔ اس اثنا میں ان سے اخذ طریقت کیا اور بہت سے فیوض حاصل کیے۔

شیخ بدرالدین کی تصنیف حضرات القدس دو جلدوں میں ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں ایک سنوات الاتقیا ہے، جو مشائخ کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔ ایک الروائح ہے جو اصطلاحات صوفیہ کی شرح اور بزرگان نقشبندیہ قادریہ کے اشغال و اذکار سے متعلق ہے۔ دوسری تصانیف یہ ہیں: کرامات الاولیا، مجمع الاولیا، ترجمہ فتوح الغیب از شیخ عبدالقادر جیلانی، ترجمہ بہجۃ الاسرار ترجمہ روضۃ النواظر فی ترجمہ شیخ عبدالقادر۔ یہ ترجمہ انھوں نے دارشکوہ کے کہنے سے کیا۔ ترجمہ عرائس البیان، تفسیر روز بیان العقلی ❷۔

## ۵۴۔ قاضی بدرالدین صدیقی بدایونی

قاضی بدرالدین صدیقی بدایونی، شیخ وقت اور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار علوم عربیہ اور فقہ و اصول فقہ کے جید علما میں ہوتا تھا۔ شاہ جہان کے عہد میں بدایوں کی مسند قضا پر فائز ہوئے اور عمر بھر اس پر فائز رہے۔ تبحر علمی میں ضرب المثل تھے۔ ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء کو وفات پائی۔ قاضی علی محمد بدایونی نے ''قد خسف بدری'' سے تاریخ وفات نکالی ❸۔

## ۵۵۔ شیخ برہان الدین برہان پوری

شیخ برہان الدین برہان پوری علاقہ خاندیس کے ایک قریہ میں پیدا ہوئے، جس کا نام ''معمولی'' تھا۔ پرورش بھی برہان پور میں ہوئی۔ والد کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی طرف سے حضرت

❶ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۸۸، ۸۹ بحوالہ شرائف عثمانی۔

❷ حضرات القدس۔ تذکرہ علمائے ہند، ص۲۶۲۔ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۹۰۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۹۰۔

حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ والدہ کا اسم گرامی فاطمہ تھا۔ نیکی اور تدین وتقویٰ کے ماحول میں تربیت پائی، کھانے پینے اور لباس کے معاملے میں اعتدال واقتصاد کا عمدہ نمونہ تھے۔ اس دور کے بزرگ شیخ عیسیٰ بن قاسم شطاری کے زاویہ میں فروکش تھے اور فقرا اور اہل اللہ کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ علم وفضل کی مختلف شاخوں پر عبور رکھتے تھے، لیکن تصوف وطریقت اور ارشاد وتلقین کو شب و روز کا معمول قرار دے لیا تھا۔ امرا وسلاطین سے میل جول اور تعلقات قائم کرنے سے گریزاں رہتے، بلکہ اہل دولت اور ارباب حکومت میں سے کوئی ان کے پاس آتا تو عام طور پر ملنے سے انکار کر دیتے۔

خافی خاں منتخب اللباب میں لکھتا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر جب اپنے بڑے بھائی داراشکوہ سے لڑائی کے لیے آگرہ کی طرف روانہ ہوا تو ہیئت بدل کر اچانک شیخ برہان الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کو ہیئت بدلنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ شیخ ملوک وسلاطین سے ملنا پسند نہ کرتے تھے۔ شیخ نے پوچھا ''آپ کا نام کیا ہے؟'' کہا: ''اورنگ زیب!''۔ شیخ خاموش ہو گئے، اور بادشاہ کی طرف بالکل عنان توجہ مبذول نہ فرمائی۔ بادشاہ نے اپنی طرف سے شیخ کا یہ عدم التفات دیکھا تو اٹھ کر چلا گیا۔ دوسرے روز پھر آیا، شیخ نے فرمایا۔ ''اگر تمھیں یہ خانقاہ پسند آ گئی ہے تو میں اسے تیرے لیے خالی کر دیتا ہوں اور اپنے لیے کوئی اور جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔''

شیخ کی یہ بات سن کر اورنگ زیب باہر نکل گیا اور ایک خادم جس کو شیخ اچھا سمجھتے تھے، بادشاہ کے پیچھے گیا اور اسے اشارے سے سمجھایا کہ ''جب شیخ نماز کے لیے اپنے حجرے سے باہر نکلیں تو حاضر خدمت ہو کر یہ عرض کرو کہ میں دعا کے لیے حاضر ہوا ہوں اور فاتحہ رخصت کا طالب ہوں۔'' چنانچہ نماز کے وقت بادشاہ حاضر ہوا اور عرض گزار ہوا کہ ''میرا بھائی داراشکوہ احکام شریعت اور دین اسلام سے روگرداں ہو گیا ہے اور میں اس سے لڑائی کی غرض سے نکلا ہوں اور دعائے خیر اور فاتحہ رخصت کا طلب گار ہوں۔''

بادشاہ کی یہ عرض سن کر شیخ نے فرمایا:

از فاتحہ ما فقیران کم اعتبار چہ می شود؟ شما کہ بادشاہ ہید بنیت عدالت ورعیت پروری فاتحہ بخوانید، ما ہم دست برمیدارم۔

یعنی ہم ادنیٰ درجے کے فقیر لوگ ہیں، ہمارے فاتحہ پڑھنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ بادشاہ ہیں جو عدل و انصاف اور رعیت پروری کی غرض سے نکلے ہیں۔ آپ فاتحہ پڑھیں، ہم بھی آپ کے پیچھے ہاتھ اٹھائیں گے۔

نظام الدین برہان پوری نے شیخ کے اس فرمان کو عالم گیر کے لیے کامیابی کی خوش خبری سے تعبیر کیا اور کہا یہ آپ کے لیے فتح کی نوید ہے۔

عاقل خاں رازی (مؤلف واقعات عالم گیری) شیخ کے معتقد ومرید تھے، انھوں نے ان کے ملفوظات ثمرات الحیات کے نام سے جمع کیے ہیں۔ ایک اور بزرگ نے ان کے ملفوظات وارشادات کا مجموعہ

مرتب کیا ہے، جس کا نام روائح الانفاس ہے
شیخ برہان الدن برہان پوری تصنیفی ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں شرح اسماء اللہ الحسنی اور شرح امنت باللہ شامل ہیں۔ اس عالم وفقیہ نے ۸۰ سال سے زائد عمر پا کر ۱۰ رشعبان ۱۰۸۳ھ/۲۱ رنومبر ۱۶۷۲ء کو برہان پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

منتخب الباب کے منصف خافی خان کے بقول شیخ برہان الدین کا انتقال عالم گیر کے تیسویں سال جلوس میں ہوا۔ اس حساب سے سن ہجری ۱۰۸۹ھ/ ۱۶۷۸ء بنتا ہے۔

## ۵۶۔ شیخ بلال لاہوری

شیخ بلال بن عبداللہ حنفی قادری لاہوری، اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ معروف فقیہ اور زاہد وعابد بزرگ تھے۔ تصوف وطریقت میں شیخ شمس الدین لاہوری سے فیض یافتہ تھے۔ ارشاد وتلقین کی مسند پر فائز تھے۔ ان کی نیکی اور عبادت وزہد کی اثر پذیری کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ ہندشاہ جہان ایک سے زیادہ مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لاہور کے اس فقیہ نام دار نے ستر برس عمر پا کر ۲۸ رشعبان ۱۰۴۶ھ/ ۱۵ رجنوری ۱۶۳۶ء کولاہور میں انتقال کیا ❷۔

## ۵۷۔ شیخ بہلول دہلوی

شیخ بہلول دہلوی دراصل شکار پور کے رہنے والے تھے، وہاں سے دہلی آئے اور مفتی جمال الدین دہلوی سے اخذ علم کیا۔ پھر گجرات گئے، وہاں کے مشہور اساتذہ شیخ عبداللہ بن سعد اللہ اور شیخ رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ سے علم حدیث کی تحصیل کی اور طویل عرصہ ان کی صحبت میں رہے۔ گجرات سے پھر عازم دہلی ہوئے اور شیخ قمیص بن ابوالحیات سادھوروی سے کسب فیض کیا اور بعد ازاں درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ عالم کبیر، محدث وقت اور مشہور فقیہ تھے۔ تفسیر اور حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے۔ زہد وتعبد اور صلاح عمل میں ضرب المثل تھے۔

منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کے علم وفضل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علم حدیث میں بہت اشتغال اور مہارت رکھتے تھے، درس وافادہ میں مصروف رہتے تھے، ذوق معرفت وطریقت

---

❶ منتخب اللباب، ج ۲، ص ۵۵۳ تا ۵۵۵۔ مرآۃ العالم (قلمی) ورق ۳۵۴ ب۔ تاریخ برہان پور، ص ۱۴۰ تا ۱۴۲۔ مآثر الامرا، ج ۲۔ ''معارف'' (اعظم گڑھ) مئی 1951۔ احوال و آثار عبداللہ خویشگی، ص ۴۹، ۵۰۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۴۳ تا ۴۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۱، ۹۲۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۳۔ عمل صالح، ج ۳، ص ۳۶۶، ۳۶۷۔

میں بے مثل تھے اور دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز تھے۔ چوں کہ مستقل طور پر دہلی کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا، لہٰذا دہلوی مشہور ہوئے۔

اس عالم دین اور گیارھویں صدی ہجری کے ہندی فقیہ نے ۱۴ رجب ۱۰۰۷ھ/ ۳۱ جنوری ۱۵۹۹ء کو دہلی میں وفات پائی❶۔

## ـــــ پ ـــــ

# ۵۸۔ شیخ پیر محمد سلونی

شیخ پیر محمد کا سلسلہ نسب یہ ہے: پیر محمد بن عبدالغنی بن ابوالفتح بن اللہ داد بن من اللہ بن بہاء الدین عمری جون پوری سلونی۔ شیخ پیر محمد سلونی مشہور مشائخ ہند میں سے تھے۔ ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء کو سلون میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کی غرض سے مانک پور کا سفر کیا اور اس کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کر دیں، یہاں تک کہ بحث و اشتغال میں اونچے درجے کو پہنچے۔ قیام مانک پور کے زمانے میں ایک روز اپنے مدرسے کو جا رہے تھے کہ راستے میں شیخ عبدالکریم بن سلطان مانک پوری سے ملاقات ہوئی۔ شیخ عبدالکریم نے پوچھا: ''کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟'' کہا: ''ہدایۃ الفقہ اور تفسیر بیضاوی۔'' شیخ نے فرمایا: ''میرے پاس آ جاؤ، جو چاہو گے میں تمھیں پڑھاؤں گا۔'' لیکن پیر محمد سلونی چونکہ شیخ عبدالکریم کے مرتبہ علم اور مذہب و مشرب سے واقف نہ تھے، لہٰذا ان کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور سیدھے مدرسے چلے گئے۔ استاذ کی خدمت میں پہنچے اور درس کے لیے ان کے حضور دو زانو ہو کر بیٹھے تو نہ شاگرد پڑھنے پر قادر ہو سکا اور نہ استاذ پڑھانے پر۔ استاذ کو اس غیر متوقع صورت حال سے بڑا تعجب ہوا اور شاگرد سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے وہ واقعہ بیان کیا جو ان کے اور شیخ عبدالکریم کے درمیان پیش آیا تھا۔ اب استاد نے شاگرد کو ساتھ لیا، شیخ عبدالکریم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے معذرت و عفو کی درخواست کی۔ بعد ازاں پیر محمد سلونی، چھ مہینے شیخ عبدالکریم سے وابستہ رہے۔ ان سے باقاعدہ ہدایہ اور بیضاوی کا درس لیا اور طریقت و سلوک سے بھی متمتع ہوئے۔ تصوف و طریقت کی منزلیں طے کر چکے تو شیخ نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے واپس سلون بھیج دیا۔

شیخ پیر محمد اس زمانے کی نہایت مؤثر شخصیت تھے اور دعوت و ارشاد میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے وعظ و نصیحت اور توجہ خاص سے بے شمار غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اس دور میں ہندوؤں کا ایک گروہ، جو سناسیوں کے نام سے مشہور تھا، ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوم رہا تھا۔ دوران سفر شیخ پیر محمد سے بھی ان کی گفتگو ہوئی۔ شیخ نے ان سے کہا: ''تم کس کی عبادت کرتے ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہم بتوں کی پوجا

❶ - منتخب التواریخ۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۳، ۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۴۔

کرتے اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔'' یہ سن کر شیخ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور اس کی اچھائیاں بیان کیں، جس سے متاثر ہو کر وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

شیخ پیر محمد سلونی نے تمام عمر تلقین و ارشاد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا اور سید علاء الدین سندھیلوی اور سید بدر الدین بریلوی ایسے بہت سے مشائخ نے ان سے استفادہ کیا۔

بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر کو ان کی نیکی اور صالحیت کا علم ہوا، تو اس نے دو گاؤں بطور جاگیر عطا کیے جو بطور وراثت ان کی اولاد و اعقاب میں منتقل ہوتے رہے۔

اس عالم دین نے ۲۲ رمحرم ۱۰۹۹ھ/ ۱۸ رنومبر ۱۶۸۷ء کو سلون میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❶۔

## ۵۹۔ شیخ پیر محمد لکھنوی

شیخ پیر محمد بن اولیا جون پوری، ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، جس کا نام اثاواں تھا اور اعمال منڈیا ہوں میں جون پور کے قریب ایک پر رونق اور بڑا گاؤں تھا۔ شیخ پیر محمد کی تاریخ ولادت ۲۶ر رمضان ۱۰۲۷ھ/ ۶ر ستمبر ۱۶۱۸ء ہے۔ شیخ کم سنی ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد چچا کی گود میں تربیت پائی۔ بچپن کی حدود سے باہر قدم رکھا تو حصول علم کے لیے مانک پور کا قصد کیا اور وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ وہیں شیخ عبداللہ سیاح دکنی سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ پھر لکھنؤ چلے گئے اور کتب درسیہ قاضی عبدالقادر عمری لکھنوی سے پڑھیں۔ بعد ازاں شیخ عبداللہ سیاح دکنی سے ملاقات ہوئی، انھوں نے تاکید کی اور حکم دیا کہ طریقت و سلوک کی راہوں پر گامزن ہونے سے پہلے تکمیل علم اور فنی کتابوں پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ شیخ پیر محمد مزید تعلیم کے لیے دہلی گئے اور علامہ حیدر کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر باقاعدہ تمام مروجہ کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ علاوہ ازیں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، قنوج اور اجمیر کے اساتذہ کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا۔ دہلی میں شیخ عبداللہ سیاح سے پھر ملاقات ہوئی تو انھوں نے تمام طرق تصوف اور سلاسل طریقت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

شیخ پیر محمد لکھنوی سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ اپنے دور میں درس و تدریس کے ماہر اور سر برآوردہ بزرگ تھے۔

شیخ پیر محمد لکھنوی، صاحب قلم بھی تھے اور تصنیف و تالیف میں ایک خاص مقام کے مالک تھے۔ ان کی تصانیف جلیلہ میں صدر الدین شیرازی کی شرح الہدایہ پر سراج الحکمۃ کے نام سے حاشیہ اور ہدایۃ الفقہ پر حواشی شامل ہیں۔ نیز فقہی مسائل سے متعلق فتاویٰ بھی ان کے سلسلہ تصانیف کی ایک کڑی ہیں۔ سلوک و تصوف اور احکام طریقت کے بارے میں بھی ان کی کتابوں کا پتا چلتا ہے۔

---

❶ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۴۸۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۵، ۹۶۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۸۱۔

دیار ہند کے اس عالم وفقیہ نے ۱۴؍جمادی الاخریٰ ۱۰۸۵ھ/ ۵؍ستمبر ۱۶۷۵ء کو لکھنؤ میں وفات پائی اور دریائے گومتی کے کنارے دفن کیے گئے۔ بعض مؤرخین نے ان کی تاریخ وفات قرآن مجید کے الفاظ **لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** سے نکالی ہے❶۔

## ۶۰۔ شیخ پیر محمد جیندی

شیخ پیر محمد جیندی، مشرقی پنجاب کی ایک سابق ریاست جیند کے باشندے تھے۔ عالم وفقیہ اور متدین بزرگ تھے۔ دیوبند کے ایک صاحب علم بزرگ کے شاگرد تھے۔ عرصے تک ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل کیا اور علم ومعرفت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ درس وتدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ سلطان اورنگ زیب عالم گیر ان کی بہت تکریم کرتا تھا اور ان کے علم وفضل پر اس کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ تصحیح وتحقیق کی غرض سے اپنے ہاتھ سے کتابیں لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجتا❷۔

## ـــــ ت ـــــ

## ۶۱۔ شیخ تاج الدین گجراتی

شیخ تاج الدین کا نسب نامہ یہ ہے: تاج الدین بن اسماعیل بن محمود بن ابراہیم بن اسماعیل بن یعقوب بن شہاب الدین قادری بہاری ثم پٹنی گجراتی۔ قاضی ابوصالح نصر بن عبدالرزاق بن شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے تھے۔ اپنے والد شیخ اسماعیل سے اخذ طریقت کیا اور گجرات کو روانہ ہوئے۔ وہاں مستقل طور سے پٹن شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لہٰذا پٹنی گجراتی کہلائے۔ نامور عالم اور محدث تھے۔ حدیث اور فقہ میں عبور رکھتے تھے۔ کتب حدیث پر عبور کا یہ عالم تھا کہ صحاح ستہ کے حافظ تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ جمال، احمد، اسحاق اور ابراہیم۔ سب سے چھوٹے ابراہیم پٹنی تھے۔ وہی علم وفضل کے اعتبار سے باپ کے قائم مقام ہوئے۔

شیخ تاج الدین گجراتی پٹنی نے ۱۱؍جمادی الاولیٰ ۱۰۰۷ھ/ ۳۰؍نومبر ۱۵۹۸ء کو پٹن میں وفات پائی❸۔

---

❶ مخزن برکت (سوانح حیات شیخ پیر محمد لکھنوی)۔ خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص ۴۸۲، ۴۸۳۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۳۴، ۳۵۔ مرأۃ العالم، ورق ۳۵۹ ب۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۶، ۹۷۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۷۲ تا ۷۵۔ احوال و آثار عبداللہ خویشگی، ص ۳۹ تا ۴۱۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۷، ۹۸۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۸۶۔

❸ [illegible] ص ۴۴۲۔ مرآۃ احمدی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۸۔

# ۶۲۔ شیخ تاج الدین دہلوی

شیخ تاج الدین بن زکریا بن عیسیٰ دہلوی حنفی المسلک تھے اور صوفی کے عرف سے معروف تھے۔ منطق، فلسفہ اور تصوف کے فاضل و ماہر تھے۔ اپنے والد شیخ زکریا اور شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی کے شاگرد تھے۔ عرصے تک شیخ عبدالملک کی خدمت میں رہے، جن کا لقب امان اللہ تھا، یہاں تک کہ علوم و معارف سے پوری طرح بہرہ مند ہو گئے۔ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے دربار میں آئے تو اس نے ان کو اپنے خاص مشیروں اور ندیموں میں شامل کر لیا۔

منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ اکبر کے دل میں الحاد و زندقہ کی تخم ریزی شیخ تاج الدین نے بھی کی۔ یہ تاج العارفین کے لقب سے معروف تھے۔ توحید اور تصوف کے سلسلے میں ابن عربی سے بہت متاثر تھے۔ ابن عربی کی تصانیف سے زیادہ تر ایسی باتیں بیان کرتے، جن سے آزاد خیالی کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ قرآن کی آیات اور احادیث نبوی کی ایسی ایسی تاویلات کیں کہ بادشاہ حیران رہ گیا۔ بادشاہ کے حضور انھوں نے سجدہ ریز ہونے کی تجویز پیش کی۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ تاج الدین رات رات بھر اہل تصوف کے شطحیات اور مزعومات بادشاہ کے سامنے بیان کرتا رہتا۔ وہ شرعی پابندیوں کا قائل نہیں تھا اور گمراہ صوفیا کی طرح وحدت الوجود کا پکا حامی تھا۔ اس کی باتوں کا نتیجہ بجز الحاد اور اباحت کے کچھ نہ تھا۔ اس نے وحدۃ الوجود کے غیر اسلامی نظریے اور ابن عربی کی فصوص الحکم کے اس طرح کے دیگر مسائل اچھی طرح بادشاہ کے ذہن نشین کر دیے۔ مثلاً ”ترجیح رجاء الخوف“ اور ”ایمان فرعون۔“ اکبر کے ذہنی فتور اور احکام شریعت سے اس کی بے زاری میں تصوف کے ان نظریات کو بہت دخل ہے۔ تاج الدین کی باتوں کے نتیجے میں اکبر کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ کافر دوزخ کی آگ میں ڈالے تو ضرور جائیں گے مگر یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں عارضی ہو گا۔ تاج الدین نے یہ مسئلہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کی تاویلیں کر کے اچھی طرح بادشاہ کے ذہن میں بٹھا دیا تھا۔ اور جب اس نے بادشاہ کو تصوف کے اس چکر میں بری طرح ڈال دیا تو اپنی تعلیم و تلقین کا آخری اور اہم نکتہ جو سب سے زیادہ خطرناک اور ضرر رساں تھا، بیان کیا، اور وہ تھا ”انسان کامل“ کا تصور۔

شیخ تاج الدین دہلوی نے اکبر کے سامنے ”انسان کامل“ کا ایک تصور پیش کیا، اور پھر اس انسان کامل کو خلیفۂ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دیا۔ انسان کامل کے بعد عین واجب (ذات خداوندی) کا درجہ باقی تھا۔ اب شیخ کی کمند تحقیق، انسان کامل کی منزل کو عبور کر کے عین واجب تک جا پہنچی۔ حوالی موالی نے بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر باتیں کیں اور خرافات و اختراعات کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام ”زمین بوس“ رکھا گیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا گیا کہ اسے

فرض عین اور چہرہ شاہی کو "کعبہ مرادات وقبلہ حاجات" قرار دیا گیا۔ کسی نے زبان ہلائی تو جواب میں ہندوستان کے بعض مشائخ کے حضور، ان کے بعض مریدوں کے طرز عمل کو پیش کر کے، اس کا منہ بند کر دیا گیا۔

شیخ تاج الدین دہلوی کا نام ان اولین لوگوں میں شامل ہے، جنھوں نے اکبر کو الحاد کی راہ پر لگایا اور اسے اسلام سے برگشتہ کر کے بے دینی اور زندیقیت کی خطرناک وادی میں ڈالنے کے لیے اہم کردار ادا کیا لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے تاج الدین کی طرف سے نظر کرم پھیر لی، اور توجہ ہٹالی تھی اور اس کے نزدیک یہ مطرود و مقہور قرار پا گئے تھے۔ ان کی تصانیف میں سے شرح اللوائح اور نزہۃ الارواح کی شرح شامل ہیں ❶۔

## ۶۳۔ شیخ تاج الدین صدیقی جھونسوی

شیخ تاج الدین بن منہاج الدین صدیقی جھونسوی الٰہ آبادی، عالم و فاضل، علم نحو کے ماہر اور مشہور فقیہ تھے۔ ان کے اسلاف درحقیقت دہلی کے رہنے والے تھے، وہاں سے شیخ پورہ منتقل ہو گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ تاج الدین نے بعض ابتدائی کتابیں اپنے عم محترم شیخ نصیر الدین جھونسوی سے پڑھیں۔ پھر جون پور گئے، وہاں شیخ نور اللہ بن طٰہٰ انصاری جون پوری کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے۔ ان سے منار الاصول تک کتب درسیہ پڑھیں۔ حصول طب کی طرف رجحان ہوا تو حاجی محمد مداری سے طب کی کتابیں پڑھیں اور اس میں اس درجہ مہارت پیدا کی کہ اس موضوع میں صاحب تصنیف ہوئے۔ علم حیوانات و نباتات سے متعلق کچھ رسائل لکھے اور اس ضمن میں ایک بہترین و مفید کتاب تاج المجربات کے نام سے تالیف کی، جو سو اجزا پر مشتمل ہے۔ وہ اونچے درجے کے معالج اور طبیب تھے۔

منقول ہے کہ اگرچہ وہ کتب درسیہ کی تکمیل نہ کر پائے، لیکن اللہ نے ان کو ہر علم اور ہر مروجہ فن میں ملکۂ راسخہ عطا فرمایا تھا۔ نہایت ذہین، تیز فکر، نقاد اور صاحب مطالعہ تھے۔ مسلسل مطالعہ سے مشکل علوم ان کے لیے آسان ہو گئے تھے اور پیچیدہ مسائل کو سلجھانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر علمی میدان میں ان کی تگ و تاز کے نقوش نمایاں نظر آتے ہیں اور فقہ، سلوک، تصوف، طب اور نحو میں ان کی تصانیف کا پتا چلتا ہے۔ علم نحو میں انھیں بالخصوص درک حاصل تھا اور اس موضوع سے متعلق وہ مرجع اہل علم تھے۔ شیخ تاج الدین صدیقی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ مختلف سلاسل سلوک سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلۂ سہروردیہ اور سلسلۂ چشتیہ کا حصول اس دور کے مشہور مشائخ سے کیا تھا۔ اشغال و اذکار سے بہرہ ور تھے اور ارشاد و تلقین کی مسند پر فائز تھے۔ مگر سماع وغیرہ سے گریز کرتے اور ان چیزوں کو سلوک و تصوف کے خلاف قرار دیتے تھے۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم دین نے جمعرات کے روز ۱۵؍ ذی الحجہ ۱۰۳۰ھ/ ۲۱؍ اکتوبر ۱۶۲۱ء کو وفات پائی ❷۔

❶ منتخب التواریخ، ص ۳۱۹۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۳۵، ۲۶۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۸، ۹۹۔ رود کوثر، ص ۹۲۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۲، ۱۰۳ بحوالہ گنج ارشدی۔

## ــــ ث ــــ

## ۶۴۔ قاضی ثناء الدین مچھلی شہری

قاضی ثناء الدین جعفری مچھلی شہری، شیخ عصر اور فقیہ وقت تھے۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ مچھلی شہر میں ان کی وفات کے بعد کثیر تعداد میں ان کے اعقاب و اخلاف نمایاں حیثیت سے ابھرے اور اس خاندان میں بڑی وسعت پیدا ہوئی [1]۔

## ۶۵۔ قاضی ثناء اللہ جون پوری

قاضی ثناء اللہ جون پوری کا سلسلہ نسب یہ ہے: ثناء اللہ بن ہدایت اللہ بن محمد منعم بن ابوالحسن بن محمد بن قاضی خواجگی عمری جون پوری۔ جون پور میں پیدا ہوئے، اور وہیں پرورش پائی۔ شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے فقہائے ہند میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ شہر جون پور کے منصب قضا پر متعین تھے۔ ۷/ شوال ۱۰۷۳ھ/ ۵/ مئی ۱۶۶۳ء کو جون پور میں وفات پائی [2]۔

## ــــ ج ــــ

## ۶۶۔ مولانا جان محمد لاہوری

مولانا جان محمد صوفی لاہوری، شیخ اسماعیل مدرس لاہوری کے شاگرد تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ شیخ صالح اور جید عالم تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ مسجد قصاب میں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، جو اس زمانے میں شہر سے باہر واقع تھی۔ پرہیز گاری کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے، کسی کی احتیاج سے سخت گریزاں تھے۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۰۸۲ھ/ ۱۶۷۱ء کو لاہور میں وفات پائی اور اسی شہر میں دفن ہوئے [3]۔

---

1. نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۴۔
2. تجلی نور، ج ۲، ص ۱۰۴۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۵۲۷۔ ''تاریخ شیراز ہند جون پور میں قاضی ثناء اللہ جون پوری کی تاریخ وفات تو ۷/ شوال ہی مرقوم ہے، مگر سن وفات ۱۱۷۳ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ ان کا سن وفات ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۳ء ہے۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۰۴۔
3. نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۵۔

# ۶۷۔ شیخ جعفر بن جلال الدین گجراتی

شیخ جعفر بن جلال الدین بن محمد حسینی بخاری احمد آبادی گجراتی کو بدر عالم کہا جاتا ہے۔ ۱۲/شعبان ۱۰۲۳ھ/۷/ستمبر ۱۶۱۴ء کو پیدا ہوئے اور علم و طریقت کی گود میں پرورش پائی۔ اپنے والد شیخ جلال الدین بخاری گجراتی (متوفی ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء) اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا۔ بلاشبہ ان کے والد (شیخ جلال الدین) بھی جید عالم دین تھے، لیکن شیخ جعفر، تفسیر، حدیث، تصوف اور دیگر علوم و فنون میں والد سے زیادہ عالم اور صاحب فضل تھے۔ اپنے دادا (شیخ محمد) کی وفات کے بعد والد کی زندگی ہی میں مسند ارشاد و تدریس پر متمکن ہو گئے تھے۔ شیخ جلال الدین گجراتی، شاہ جہان کے عہد میں منصب صدارت پر فائز تھے۔ ان کی وفات کے بعد بادشاہ نے اس منصب کے لیے ان کے اس بیٹے (شیخ جعفر) سے درخواست کی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

کتابت میں اتنے تیز تھے کہ پورے قرآن مجید کی کتابت فلکی گھڑی کے حساب سے ۵۴ ساعت میں کر لیتے تھے۔ خط نستعلیق اور نسخ کے ماہر تھے۔

ان کی تصانیف میں سے ایک کتاب روضات ہے جو سادات کے حالات پر مشتمل ہے اور چوبیس جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں تفسیر اور حدیث کے موضوع سے متعلق بھی رسائل موجود ہیں۔ ایک دیوان ہے جو ان کے کلام پر محیط ہے۔

شیخ جعفر گجراتی علوم و معارف، احوال و سوانح، مشائخ و اسلاف کی اصطلاحات اور فنون متعارفہ میں اپنے والد سے بہت آگے تھے۔ درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں ان کی مساعی ہمیشہ جاری رہیں۔ اچھے شاعر بھی تھے اور صفا تخلص کرتے تھے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں:

رازِ مادر زمانہ افتاد است     بزمہارا فسانہ افتاد است
می کند یار آنچہ می خواہد     دور گردوں بہانہ افتاد است
اے صفا میان ماہ وخاں     شاہد ما یگانہ افتاد است

---

جز من کہ گرفتہ ام دو زلفش     کس در شب تار مار نہ گرفت

بادشاہ کے حضور آئے، گونا گوں شاہی عنایات، نقد انعام، خلعت اور ہاتھی سے سرفراز ہوئے۔

یہ ہندی عالم دین ۹/ذی الحجہ ۱۰۸۵ھ/۲۴/فروری ۱۶۷۵ء کو اس عالم فانی سے راہی ملک بقا ہوئے۔ احمد آباد میں مدفون ہیں❶۔

---

❶ مرآۃ احمدی۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۶۰، ۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۶۔ تذکرۂ مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۴۔

# ۶۸۔ شیخ جعفر بن علی گجراتی

شیخ جعفر کا سلسلہ نسب یہ ہے: جعفر بن علی بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس شافعی حضرمی ثم ہندی گجراتی۔ شیخ جعفر بن علی فقہی مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے اور جعفر صادق کے نام سے مشہور تھے۔ ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء کو شہر تریم میں پیدا ہوئے۔ ان کے تمام آباواجداد ذی علم بزرگ تھے لہٰذا کہنا چاہیے کہ شیخ جعفر نے علم وفضل کی گود اور نیکی اور تقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی۔ عرصے تک والد گرامی شیخ علی کی صحبت میں رہے اور ان سے مختلف فنون پر مشتمل کتابوں کی تکمیل کی۔ ان سے تجوید کے ساتھ قرآن مجید بھی حفظ کیا اور تبلیغ وارشاد کے میدان میں اترنے کے لیے جن منزلوں سے گزرنا ضروری ہے، وہ بھی ان ہی کی خدمت میں طے کیں۔ بعدازاں شیخ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب الدین، شیخ زین الدین بن حسین بافضل، ابوبکر شلی باعلوی اور اپنے چچا زاد بھائی شیخ عبدالرحمٰن سقاف بن محمد عیدروس سے کسب علم کیا اور تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، علوم عربیہ، حساب وریاضی، فرائض ومیراث اور ہیئت وفلکیات میں مہارت حاصل کی۔ شان دار زندگی بسر کرتے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے، مرفہ الحال اور خوش پوش عالم دین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی فہم وفراست اور خوب صورتی کی نعمت سے نوازا تھا۔ بلند اخلاق اور عمدہ کردار کے عالم تھے۔ عوام وخواص میں مقبول اور علم وفضل میں مشہور تھے۔ نظم ونثر میں کامل اور انشا پردازی میں فصاحت وبلاغت کا بہترین نمونہ تھے۔ حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے اور حرمین شریفین کے علمائے کرام سے اخذ علم کیا۔ واپسی میں اپنے آبائی شہر تریم کا قصد کیا تو شہرت کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ اثنائے سفر میں جس شہر اور قریے سے گزر ہوتا، لوگ انتہائی عزت وتکریم سے پیش آتے۔ تریم کے قریب پہنچے تو انسانوں کا ایک ہجوم خیر مقدم اور استقبال کے لیے امڈ آیا تھا۔

عرصے تک تریم میں قیام پذیر رہے۔ پھر دل میں علوم عقلیہ اور علم تصوف کے حصول کا جذبہ موج زن ہوا تو ہندوستان کے لیے رخت سفر باندھا، اس لیے کہ ہندی علما جہاں علوم نقلیہ یعنی تفسیر وحدیث اور فقہ کے سلسلے میں عالم اسلام کے حلقہ اہل علم میں شہرت رکھتے تھے، وہاں علوم عقلیہ اور تصوف وغیرہ میں بھی درجہ کمال پر فائز تھے۔ دیار ہند میں وارد ہوئے تو سب سے پہلے سورت کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ وہاں ان کے چچا شریف محمد سکونت پذیر تھے۔ اور اس نواح میں ان کے علم وفضل کا شہرہ اور درس وتدریس کا غلغلہ بلند تھا۔ ان کے چشمۂ علم سے خوب سیراب ہوئے۔ پھر سرزمین دکن کا قصد کیا۔ وہاں کے حکمران عنبر سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کے علم وفضل کی فراوانی سے بہت متاثر ہوا اور انھیں اپنے ندیموں اور مشیروں میں شامل کر لیا۔ دربار دکن سے بہت سے علما وفضلا منسلک تھے۔ ان میں علمی بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بعض مسائل میں بادشاہ کے سامنے شیخ جعفر سے بھی ان علما کی بحث ہوئی تو شیخ کا پلہ بھاری رہا اور سب نے ان کی فراست اور علمی فوقیت کو تسلیم کیا۔ بادشاہ نے شیخ کو دکن کی مسند تدریس پر متمکن کر دیا۔ لیکن ہندوستان کے اصحاب علم میں اس زمانے میں فارسی کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور شیخ اس سے ناآشنا تھے، چنانچہ شیخ نے اس کمی کو محسوس کیا اور فارسی سیکھنے کی طرف

عنان توجہ مرتکز فرمائی، تھوڑی ہی مدت میں اس میں مہارت حاصل کر لی۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ شیخ جعفر نے فارسی میں بھی واقفیت بہم پہنچا لی ہے تو بعض حضرات نے ان سے فرمائش کی کہ اپنے جد امجد شیخ عبداللہ کی کتاب، العقد النبوی کا فارسی میں ترجمہ کر دیں۔ شیخ نے ان کی فرمائش قبول کی اور بہترین انداز سے کتاب کو فارسی کے قالب میں ڈھال دیا۔

علاقہ دکن میں شیخ جعفر کو اپنے علم و فضل کی وجہ سے بہت ہی احترام و اکرام کا مستحق سمجھا جاتا اور وہاں کے حکمران عنبر کی وفات تک ان کو بے حد لائق تعظیم گردانا جاتا تھا۔ عنبر کے بعد اس کے بیٹے فتح خاں نے زمام اقتدار ہاتھ میں لی تو اس نے شیخ کے اجلال و توقیر میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک دکن کی یہ حکومت قائم رہی اور اس سرزمین پر ان کا پرچم اقتدار لہراتا رہا، شیخ کے عظمت و وقار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، لیکن جب یہ حکومت ختم ہوگئی اور اس کے ارباب بست و کشاد منتشر ہو گئے تو شیخ اپنے عم محترم شیخ محمد عیدروس کے پاس سورت منتقل ہو گئے۔ سورت میں ان کے علم و فضل کی شہرت پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور اہل علم ان سے بہت متاثر تھے۔ وہاں گئے تو ہر حلقے میں ان کی پذیرائی ہوئی اور مال و دولت سے بھی سرفراز کیے گئے۔ سورت میں انھوں نے مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی۔

شیخ جعفر کو تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ کہتے ہیں مختلف فنون میں ان کی تصانیف بھی تھیں اور ایک دیوان بھی تھا، جو ان کے مجموعہ اشعار پر مشتمل تھا۔

ان کی ملاقات مغل حکمران شاہ جہان سے ہوئی تو اس پر ان کی گوناگوں صلاحیتوں اور علمی قابلیت کا بہت اثر ہوا۔ سرزمین گجرات کے علاقے بھڑوچ میں اس نے ان کو کئی گاؤں بھی عطا کیے۔ شیخ جعفر نے شاہ جہان کے بیٹے داراشکوہ کے کہنے پر اس کی کتاب سفینۃ الاولیا کا، جو فارسی زبان میں ہے، عربی میں ترجمہ کیا۔

اس شافعی المسلک عالم و فقیہ نے ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں وفات پائی ❶۔

## ۶۹۔ شیخ جعفر حسینی پٹنوی

شیخ جعفر پٹنوی کا سلسلہ نسب یہ ہے: جعفر بن ابوالحسن بن باقی بن مبارز بن ابراہیم حسینی پٹنوی۔ اصلاً پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ سلوک و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی جون پوری سے استفاضہ کیا۔ طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ کہولت کی منزل سے بھی آگے نکل گئے۔ اس عمر میں شیخ محمد رشید ممدوح نے انھیں نکاح کرنے کا حکم دیا اور اپنے شہر (پٹنہ) لوٹ جانے کو کہا۔ نیز فرمایا کہ عبادات و معاملات میں اتباع سنت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ چنانچہ واپس پٹنہ چلے گئے اور عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے۔

---

❶ نشر خ الروی از شلی۔ حدیقہ احمدیہ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۰۷، ۱۰۸۔

اس عالم دین اور نامور فقیہ نے جمعرات ۳ر رمضان المبارک ۱۰۷۵ھ/ ۱۰ر مارچ ۱۶۶۵ء کو وفات پائی اور پٹنہ کے قریب، شریعت آباد میں دفن کیے گئے ❶۔

## ۷۰۔ شیخ جعفر بن عزیز اللہ جون پوری

شیخ جعفر بن عزیز اللہ جون پوری کا لقب نور الدین تھا۔ سہ شنبہ کے روز ۸ر رجب ۱۰۲۴ھ/ ۲۴ر جولائی ۱۶۱۵ء کو جون پور میں پیدا ہوئے۔ اکثر کتب درسیہ شیخ محمد رشید جون پوری (صاحب رشیدیہ) سے پڑھیں۔ دیگر علما و شیوخ سے بھی اخذ علم کیا۔ تصوف و سلوک میں بھی مہارت پیدا کی۔ اس ضمن میں اپنے عم محترم شیخ نور محمد مداری سے فیض حاصل کیا اور تصوف کے سلسلۂ مداریہ سے منسلک ہو گئے۔ درس و تدریس کی مسند بھی آراستہ کی اور ان کے چشمۂ علم سے شیخ محمد افضل عباسی الہ آبادی، شیخ محمد کاظم عباسی سید پوری، شیخ محمد ماہ دیوگامی اور علما و فضلا کی بہت بڑی جماعت نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

شیخ جعفر جون پوری، زاہد و عابد، عفیف و قانع، حلیم و متواضع اور عالم باعمل تھے۔ کھانے پینے اور لباس میں کسی قسم کے تکلف اور تصنع کے عادی نہ تھے۔ دنیا اور دنیا داروں سے انھیں کوئی رغبت اور لگاؤ نہ تھا۔ ارباب اقتدار اور اصحاب مال و دولت کے دروازے پر کبھی دستک نہ دی۔ شب و روز درس و تدریس اور وظائف و اوراد میں مصروف رہتے۔ پورے بتیس (۳۲) سال ہنگامۂ تدریس بپا کیے رکھا۔ تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالباقی صدیقی جون پوری (متوفی قریباً ۱۰۸۲ھ/۱۶۷۱ء) نے فن مناظرہ کی کتاب شریفیہ پر دو شرحیں سپرد قلم کیں۔ ایک آداب الباقیہ شرح الشریفیہ اور دوسری ابحاث الباقیہ شرح الشریفیہ۔ ابحاث الباقیہ انھوں نے اپنے استاد شیخ محمود جون پوری کے حکم سے سپرد قلم کی تھی اور شیخ جعفر کے استاد شیخ محمد رشید جون پوری (متوفی ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) کی کتاب رشیدیہ کے جواب میں لکھی تھی۔ رشیدیہ فن مناظرہ کی مشہور کتاب ہے۔ شیخ جعفر نور الدین جون پوری نے شیخ عبدالباقی جون پوری کی ابحاث الباقیہ کے جواب میں نور الانوار کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، اس کتاب میں انھوں نے اپنے استاذ کی تصنیف رشیدیہ کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کے علم و فضل کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

شیخ جعفر جون پوری ملقب بہ نور الدین نے سہ شنبہ ۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۰۹۳ھ/ ۱۵ر مئی ۱۶۸۲ء کو نماز ظہر کے بعد جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ بعض مورخین نے ان کی تاریخ وفات ''بہار علم گزشت'' سے نکالی ہے اور بعض نے ''صد حیف ملاذ علم رفت'' سے ❷۔

❶ تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۶۵۱، ۶۵۲۔ اس کتاب میں ان کی تاریخ وفات ۳ر رمضان ۱۱۰۵ھ/ ۱۹ر اپریل ۱۶۹۴ء مرقوم ہے، جو صحیح نہیں۔ ان کی تاریخ وفات ۳ر رمضان ۱۰۷۵ھ/۱۰ر مارچ ۱۶۶۵ء ہے۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۹، ۱۱۰، بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۹، ۱۱۰۔ تاریخ شیراز ہند جون پور (ص ۲۴، ۷۵، ۷۶) میں بھی حضرت ''نور الدین مداری'' کے عنوان کے تحت (شگرف دائم، ص ۶۱ کے حوالے سے) شیخ جعفر کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاریخ ہائے ولادت و وفات صحیح درج نہیں کی گئیں۔

# ۷۱۔ شیخ جلال الدین گجراتی

شیخ جلال الدین بن محمد بن جلال الدین حسینی بخاری گجراتی، مقصود عالم کے نام سے معروف تھے۔ ۱۵؍جمادی الاخریٰ ۱۰۰۳ھ/ ۱۵؍فروری ۱۵۹۵ء کو علاقہ گجرات میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور مولانا حسین بستانی سے حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں شیخ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، جو ان کے والد کے شاگردوں میں سے تھے۔ پھر اپنے والد گرامی شیخ محمد بن جلال الدین گجراتی سے طریقت و سلوک کی تعلیم حاصل کی۔ جب علوم ظاہری اور تصوف و طریقت کی منزلیں طے کر چکے تو شاہ جہان بادشاہ نے انھیں اکبر آباد (آگرہ) میں بلایا، اور ۱۷؍شعبان ۱۰۵۲ھ/ ۳۱؍اکتوبر ۱۶۴۲ء کو صدارت کا عہدہ عطا کیا۔ شاہ جہان ایک دین پرور بادشاہ تھا اور ان کی فضیلت علمی کا بہت معترف تھا۔ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا کہ اس دور میں شیخ جلال الدین گجراتی کا وجود انتہائی غنیمت ہے۔ اس نے ان کو آٹھ ہزاری منصب سے سرفراز کیا جو اس دور کا بہت بڑا سرکاری اعزاز تھا۔

شیخ جلال الدین گجراتی نے ۲۰؍ربیع الثانی ۱۰۵۷ھ/ ۱۵؍مئی ۱۶۴۶ء کو لاہور میں وفات پائی اور ان کی میت احمد آباد لے جائی گئی۔ وہاں اپنے والد شیخ محمد بن جلال الدین حسینی گجراتی کے قریب دفن کیے گئے ❶۔

# ۷۲۔ علامہ جمال اولیا کوروی

علامہ جمال اولیا بن مخدوم جہانیاں بن بہاء الدین بن سالار عالم کوروی ۹۷۳ھ/ ۱۵۶۶ء کو شہر کورہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علم فقہ کی تعلیم اپنے والد گرامی شیخ مخدوم سے حاصل کی۔ بعد ازاں اودھ گئے۔ وہاں قاضی ضیاء الدین عثمانی نیوتی سے اخذ علم کیا اور تصوف کے مختلف سلسلوں میں ان سے مستفیض ہوئے۔ پھر اپنے شہر کورہ آ کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ شیخ وقت اور عالم کبیر تھے۔ صوفی المشرب تھے۔ فقہ، اصول فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے کسب علم کیا۔ سید محمد بن ابو سعید کالپوی (متوفی ۲۶؍شعبان ۱۰۷۱ھ/ ۱۶؍اپریل ۱۶۶۱ء) بھی ان کے تلامذہ میں سے ہیں، سید محمد کالپوی نے ان سے متعدد کتب درسیہ پڑھیں، جن میں مطول اور بیضاوی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مشہور مدرس شیخ لطف اللہ کوروی، صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری، شیخ یٰسین بنارسی اور خلق کثیر نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مدت تک ہنگامہ تدریس بپا کیے رکھا۔

شیخ جمال اولیا ان حضرات میں سے ہیں جنھوں نے وسیع حلقہ درس قائم رکھنے کے باوجود زہد و عبادت اور خدمت خلق کو اپنا معمول ٹھہرایا۔ برصغیر کے اس نامور عالم و فقیہ نے چوہتر (۷۴) سال عمر پا کر ۲۸ یا ۲۹؍رمضان ۱۰۴۷ھ/ ۳ یا ۴؍فروری ۱۶۳۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا ❷۔

---

❶ مرآۃ احمدی۔ خزینۃ الاصفیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۱۱، ۱۱۲۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۱۶۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۱۲، ۱۱۳۔

## ۷۳۔ شیخ جمال الدین کشمیری

شیخ جمال الدین بن موسیٰ شہید کشمیری، سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور شیخ فتح اللہ حقانی کشمیری کی صحبت اختیار کی۔ سالہا سال ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے فضل خاص سے ان کا شمار علمائے ربانیین اور فضلائے عصر میں ہونے لگا۔ پختہ ذہن اور راسخ فکر علما میں سے تھے اور اللہ نے ان پر علم ومعرفت کے دروازے وا کر دیے تھے۔ متقی، منکسر المزاج اور متواضع بزرگ تھے۔ لباس وطعام میں کسی قسم کے تکلف کے عادی نہ تھے۔ بوریا نشین اور سادہ مزاج عالم دین تھے۔ صدر مجلس بننے اور آگے بڑھنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ پوری زندگی درس و تدریس، رشد و ہدایت، لوگوں کو اسلام کی سیدھی راہ پر لگانے اور شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین میں صرف کر دی۔ مشہور عالم و مدرس شیخ کمال الدین کشمیری کے بھائی تھے اور یہ دونوں بھائی علم وفضل کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ ان کے اوصاف حمیدہ سے متاثر ہو کر شیخ فتح اللہ حقانی کشمیری نے اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں (جمال الدین اور کمال الدین) کے عقد میں دے دی تھیں۔ شیخ جمال الدین کشمیری سے بے شمار علما نے اخذ علم اور کسب فیض کیا[1]۔

سرزمین کشمیر کے گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم دین کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

## ۷۴۔ مولانا جمال الدین لاہوری

مولانا جمال الدین لاہوری قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد شیخ اسماعیل بن ابدال شریف حسنی اوچی، شیخ اسحاق بن کاکو لاہوری اور شیخ سعد اللہ کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ عہد اکبری کے عالم کبیر، اور اپنے علاقے کے مشہور مدرس تھے۔ لاہور کے محلّہ تلا میں فروکش تھے۔ ان کے درس وافادہ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ تدریس میں اس عہد کا کوئی عالم ان کا حریف اور مد مقابل نہ تھا۔ تمام مروجہ علوم وفنون میں یگانہ روزگار تھے۔ آدھی عمر نشر علوم میں صرف ہوئی۔ مختلف علاقوں اور شہروں سے تشنگان علوم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی علمی تشنگی کا سامان فراہم کرتے۔ خوش گفتار اور بلند اخلاق بزرگ تھے۔ انداز گفتگو اور حسن بیان میں بے مثال اور ظرافت و ملاحت میں عدیم النظیر تھے۔ عوام وخواص میں بڑی عزت وتکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ فیضی نے سواطع الالہام کے نام سے بے نقط تفسیر لکھی تو ان سے بہت مدد لی۔ انھوں نے اس تفسیر کی بڑی اصلاح کی اور اس کی عبارتوں کو مربوط بنایا[2]۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۳۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۴۔ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔

[2] منتخب التواریخ (اردو ترجمہ) ص ۶۲۰۔ مرآۃ العالم۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۴۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۶۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۰۸۔

## ۷۵۔ مولانا جمال الدین برہان پوری

مولانا جمال الدین برہان پوری، جلیل القدر عالم اور اپنے دور کے محدث تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہے۔ برہان پور میں شیخ ابراہیم کی مسجد میں ان کا سلسلۂ درس و تدریس جاری تھا۔

شیخ طاہر بن یوسف سندھی (متوفی ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء) برہان پور تشریف لائے تو ان سے حدیث کا درس لیا۔ پوری صحیح بخاری ان ہی سے پڑھی۔ برہان پور میں وفات پائی اور ابراہیم بن عمر سندھی کے قبرستان میں دفن ہوئے ❶۔

## ۷۶۔ شیخ جمیل الدین سہارن پوری

شیخ جمیل الدین بن رفیع الدین بن عبدالستار انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے برادر کبیر شیخ بدیع الدین سہارن پوری مرید و تلمیذ مجدد الف ثانی سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ سلسلہ نقشبندیہ میں اخذ طریقت ان ہی سے کیا اور مدت تک ان کی صحبت میں رہے یہاں تک کہ درجہ کمال کو پہنچے۔

ان کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے اصحابِ فضل و صلاح ہندی علما میں ہوتا تھا۔ ۱۰۵۵ھ/ ۱۶۴۵ء میں وفات پائی ❷۔

## ۷۷۔ ملا جوہر نانت کشمیری

ملا جوہر کنائی، کشمیر کی نانت برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ سلطان قطب الدین کشمیری کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حج کی توفیق عطا فرمائی۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد حجاز کے علمائے کرام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور محشی مشکوٰۃ ملا علی قاری حنفی ہروی مکی اور شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی شافعی مکی سے کتب حدیث کا درس لیا اور بطریق معنعن سند و اجازۂ حدیث سے سرفراز ہوئے۔ دیار حرمین سے مراجعت کے بعد علیحدگی کی زندگی اختیار کر لی اور ہمہ تن اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ رزق حلال کی غرض سے اون کاتنے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا اور دوشالے تیار کر کے فروخت کرتے تھے۔ اس طریقے سے جو آمدنی ہوتی، وہی گزر و اوقات کا اصل ذریعہ تھی۔ ساتھ ہی علوم دینیہ کے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس عالم دین نے کشمیر کے علاقے میں علوم اسلامیہ کی بڑی ترویج کی اور ان کے حلقہ درس سے متعدد علمائے کرام نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ حیدر بن فیروز چرخی، شیخ محمد

❶ اذکار ابرار، ص ۳۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۶، ۱۱۷۔

❷ مرآۃ جہاں نما۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۸۔

ٹوپی گر محشی شرح جامی اور بہت سے حضرات شامل ہیں۔

ملا جوہر نانت دیار کشمیر کے متوکل علی اللہ، عابد و زاہد اور مشہور عالم تھے۔ ۱۰۲۶ھ/ ۱۶۱۷ء کو کشمیر میں وفات پائی اور مقبرہ شیخ حسین خباز کے مشرقی جانب دفن کیے گئے۔

تذکرۂ علمائے ہند فارسی (ص ۴۴) اور اس کے تتبع میں اردو ترجمہ (ص ۱۵۴) میں انھیں (غالباً ہندو سمجھ کر) جوہر ناتھ لکھا ہے جو صحیح نہیں۔ حدائق الحنفیہ (ص ۴۰۳) میں جوہر نات مرقوم ہے، جو غلط ہے۔

دراصل یہ لفظ ''نانت'' ہے، جو کشمیر کی ایک برادری ہے۔ چنانچہ تاریخ کشمیر اعظمی میں درج ذیل الفاظ میں ان کے حالات مندرج ہیں:

ملا جوہر کنائی از نجبائے ایں شہر بود۔ دراصل از قوم نانت است۔ اکثر عمر صرف تحصیل علم نمودہ۔ شاگرد و مدرس مدرسہ سلطان قطب الدین کہ متصل مسجد صراف کدل بر کنار شرقی جوئے مار بود۔ اواخر عمر راہ حرمین محترمین گرفت، بعد ادائے حج اسلام، تحصیل سند و اجازت حدیث از فحول و اکابر علما و محدثین مکہ معظمہ کردہ و خدمت مولانا علی قاری را دریافت بلکہ بصحبت حضرت شیخ ابن حجر مکی ہم رسید، و اجازت بسند معنعن حاصل ساخت۔ چوں بہ کشمیر معاودت فرمودہ گوشہ انزوا اختیار کرد و بعبادت و عزلت اشتغال نمود، وبجہت قوت حلال کسب پشم پیشہ گرفت، وبسیار بہ قناعت می گزرانید و توکل وانزوا را بدرجہ اکمل رسانید، و درس علوم دینیہ ہم می گفت، در واقعہ وبائے عامہ در سال ہزار و بیست و شش رحلت فرمود، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔ بعض اولاد امجادش بکمالات صوری و معنوی فائز شدند۔ مزار ایشاں طرف شرقی مقبرہ حضرت اخوند ملا حسین خباز بہ کمال بے تکلفی واقعست [1]۔

اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

ملا جوہر کنائی، اس شہر (کشمیر) کے شرفا و نجبا میں سے تھے۔ دراصل نانت برادری کے فرد تھے۔ عمر کا زیادہ تر حصہ تحصیل علم میں گزرا۔ مدرسہ سلطان قطب الدین کے، جو کہ مسجد صراف کدل کے متصل، دریائے مار کے مشرقی کنارے واقع تھا، شاگرد اور مدرس تھے۔ آخر عمر میں حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد مکہ معظمہ کے فحول اور اکابر علما و محدثین سے سند و اجازۂ حدیث حاصل کیا اور ملا علی قاری سے ملے، بلکہ شیخ ابن حجر مکی کی خدمت میں بھی حاضری دی اور بہ سند معنعن اجازہ حاصل کیا۔ واپس کشمیر تشریف لائے تو گوشہ علیحدگی اختیار کر لیا اور عبادت و عزلت نشینی کو شعار ٹھہرایا۔ رزق حلال کے لیے پشم کاتنے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ نہایت قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے، گوشہ نشینی اور توکل علی اللہ میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی علوم دینیہ کے درس و تدریس کا سلسلہ بھی باقاعدہ جاری تھا۔ ۱۰۲۶ھ/ ۱۶۱۷ء کو رحلت فرمائی، جب کہ پورے علاقے میں عام وبا پھیلی ہوئی تھی، رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کی اولاد میں سے بعض حضرات صوری و معنوی اعتبار سے مرتبہ بلند پر فائز ہیں۔ ملا جوہر نانت قبرستان ملا حسین خباز کے مشرقی جانب

[1] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

مدفون ہیں۔ ان کی قبر سادگی اور بے تکلفی کا نمونہ ہے۔

سرزمین کشمیر میں جن علمائے عظام نے اسلام کی تبلیغ اور دین کی ترویج کے لیے زندگیاں وقف کر دیں، ان میں ملا جوہر ناتت کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ انھوں نے بے شمار لوگوں کو دین کی تعلیم دی اور مدت تک درس و تدریس کے ذریعے قال اللہ و قال الرسول کی دل نواز صدا بلند کرتے رہے ❶۔

## ۷۸۔ امیر جوہر احمد نگری

جوہر دکنی احمد نگری، دیار ہند کے مشاہیر اور کبار امرا میں سے تھے۔ شافعی المسلک تھے اور حسن سیرت کا اعلیٰ نمونہ۔ بہت ہی نیچے درجے سے ترقی کر کے امارت کے بلند منصب تک پہنچے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ جوہر چھوٹی عمر ہی میں سرزمین ہند میں آ گئے تھے۔ ان کو اور ان کے بھائی کو دکن کے حکمران برہان نظام شاہ نے خرید لیا تھا۔ اس نے جوہر میں قابلیت و حشامت کے آثار دیکھے تو قرآن مجید کے ایک معلم کے سپرد کر دیا، جس سے انھوں نے قرآن پڑھا اور حفظ کیا۔ بعد ازاں شہسواری، تیر اندازی اور شمشیر زنی وغیرہ میں مہارت پیدا کی۔ ملک عنبر نے ان کی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر انھیں اپنی بیٹی کی ملکیت میں دے دیا تھا۔ اب انھوں نے ارتقا کی منزلیں طے کرنا شروع کیں اور رفتہ رفتہ دو سو اسپ سواروں کے امیر مقرر ہو گئے۔

اس شافعی المسلک امیر نے اہل علم کی ایک جماعت سے سماع علم کیا۔ بہت سی درسی و دینی کتابیں پڑھیں۔ متعدد مشائخ کی مصاحبت اختیار کی۔ امام شیخ عبداللہ عیدروس سے منسلک رہے اور ان سے خرقہ طریقت و تصوف زیب تن کیا۔ ان کے علم و فضل کی وسعت پذیری کا اندازہ شلی کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ جب امیر جوہر سفر ہند پر روانہ ہوئے، میں ان کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت بڑے فاضل ہیں اور علم کے مختلف گوشوں پر انھیں عبور حاصل ہے۔ انھوں نے مجھ سے حدیث، فقہ اور نحو کی کتابیں پڑھیں۔ وہ گلستانِ علم کے ہر گوشے سے آشنا تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ، عبادت میں بھی بہت آگے نکلے ہوئے تھے۔ ہر وقت تلاوت قرآن، ذکر الٰہی اور وظائف و اوراد پڑھنے میں مصروف رہتے۔ دقیق اور مشکل موضوع پر مشتمل کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ ملوک و سلاطین کی تاریخ اور سیرت خلفا پر دسترس حاصل تھی۔ راسخ العقیدہ، مصلح، خوش مزاج، شجاع، با اثر اور عمدہ کردار کے حامل تھے۔ سیاست دان، ذی فہم، رعایا کے مسائل سے آگاہ، جنگ جو اور مجاہد تھے۔ اہل کفر کے ساتھ انھوں نے باقاعدہ جنگیں لڑیں۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی اور وقت میں انقلاب و تغیر کی ایسی لہر چلی کہ وہ مملکت کے معاملات سے دور ہو گئے اور بیجاپور چلے گئے۔ اس مجاہد عالم و فقیہ نے بیجاپور ہی میں ۱۰۵۶/ ۱۶۴۶ء کو وفات پائی ❷۔



❶ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۰۳، ۱۰۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۹۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۳۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۴۴۔ ادبی دنیا کشمیر نمبر

❷ خلاصۃ الاثر۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

## ح

# ۷۹۔ مولانا حاجی محمد کشمیری

مولانا حاجی محمد کشمیری اصلاً ہمدان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسلاف میں سے کوئی بزرگ شیخ علی ہمدانی (متوفی ۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ/ ۱۹ جنوری ۱۳۸۵ء) کے ساتھ ہمدان سے کشمیر آئے، اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ حاجی محمد کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو دل میں طلب علم کا جذبہ موجزن ہوا۔ حصول علم کی غرض سے عازم دہلی ہوئے اور وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ طبیعت تصوف وطریقت کی طرف مائل ہوئی تو اس دور کے شیخ کبیر خواجہ باقی باللہ دہلوی (متوفی ۱۴ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۴ھ/ ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ء) کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ جب حدیث، فقہ اور طریقت میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے تو دہلی سے واپس کشمیر تشریف لے گئے۔ وہاں درس وافادہ کی مسند آراستہ کی اور قال اللہ اور قال الرسول کا روح پرور غلغلہ بلند کیا۔

مولانا حاجی محمد کشمیری اس درجہ پاک باز بزرگ تھے کہ کبھی دنیا داروں کے دروازے پر دستک نہیں دی اور اپنا دامن دنیا طلبی کے میل سے آلودہ نہیں کیا۔

مولانا حاجی محمد کشمیری درس وتدریس اور تصوف وطریقت کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں سے شرح حصن حصین، شرح شمائل ترمذی، فضائل قرآن کے موضوع پر ایک کتاب، مصباح الشریعۃ اور شرح الاوراد قابل ذکر ہیں۔

سرزمین کشمیر کے اس جید عالم وفقیہ اور نامور صاحب سلوک بزرگ نے جمعرات کے روز ۲۹ صفر ۱۰۰۶ھ کو وفات پائی۔ ''نوزدہم بود زشہر صفر'' مادۂ تاریخ وفات ہے [1]۔

# ۸۰۔ مولانا حبیب اللہ سندھی

مولانا حبیب اللہ سندھی اپنے عہد کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے اور اپنے دور کے فحول علمائے احناف میں گردانے جاتے تھے۔ اعمال بھکر میں ہنکورنام کا ایک قریہ تھا۔ اس قریہ میں شیخ عباس بن جلال سندھی کا ایک مشہور مدرسہ تھا۔ مولانا حبیب اللہ سندھی اس مدرسے کی مسند تدریس پر فائز تھے۔ خاصی مدت اس مدرسے میں ان کا سلسلہ درس جاری رہا اور بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ مولانا حبیب اللہ سندھی گیارھویں صدی ہجری کے سراپا خلوص، عبادت گزار، علوم وفنون میں ماہر اور اپنے اقران ومعاصرین میں برگزیدہ شخص تھے [2]۔

---

1. تذکرۂ علمائے ہند، ص ۶۴۔ محبوب الالباب۔ تاریخ کشمیر اعظمی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۵، ۱۲۶۔
2. اذکار ابرار، ص ۳۰۶، بضمن یاد مخدوم عباس۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۸۔

## ۸۱۔ مفتی حسام الدین دہلوی

مفتی حسام الدین کا سلسلہ نسب یہ ہے: حسام الدین بن سلطان بن ہاشم بن رکن الدین بن مفتی جمال الدین حنفی دہلوی۔ معروف عالم اور اپنے دور کے مشہور فقہا میں سے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کے عہد میں، دہلی کے منصب افتا پر متعین تھے۔ اپنے علم و فضل کی وجہ سے عوام و خواص میں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ❶۔

## ۸۲۔ سید حسن بلگرامی

سید حسن بن نوح بن محمود حسینی واسطی بلگرامی، شیخ وقت، نامور عالم اور معروف فقیہ تھے۔ فقہ کی ایک درسی کتاب قدوری پر حاشیہ سپرد قلم کیا۔ ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء تک زندہ تھے۔ ان کی وفات ۹ رشعبان کو ہوئی۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس سن میں ہوئی ❷۔

## ۸۳۔ سید حسین بلگرامی

سید حسین بلگرامی بھی سید نوح بن محمود حسینی واسطی کے بیٹے تھے۔ سید حسن بلگرامی کے بھائی تھے۔ جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے نامور فقہا میں ہوتا تھا۔ بغیر کسی معقول وجہ کے گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلتے۔ اصل مشغلہ کتابت اور عبادت تھا اور اس میں بہت مشہور تھے۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء تک زندہ تھے ❸۔

## ۸۴۔ شیخ حسین ہروی

شیخ حسین بن باقر گیارھویں صدی ہجری کے فاضل ہندی عالم تھے اور حدیث و سیرت میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے شمائل ترمذی کی دو شرحیں جلال الدین اکبر کے دو بیٹوں کے لیے قلم بند کیں۔ پہلی شرح فارسی نثر کی صورت میں شہزادہ سلیم کے لیے لکھی۔ دوسری شرح بصورت نظم شہزادہ مراد کے لیے تصنیف کی۔ دونوں نہایت عمدہ اور بہترین شرحیں ہیں ❹۔

---

❶ شمس التواریخ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۸۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۲۔ شمس التواریخ۔

❸ مآثر الکرام، ص ۲۱۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۴۔

❹ منتخب التواریخ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۴۔

## ۸۵۔ مولانا حسین خباز کشمیری

مولانا حسین خباز کشمیری، سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ شیخ محمد قادری سے اخذ علم کیا اور کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہنے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر دہلی کا عزم کیا اور شیخ عبدالشہید احراری سے مستفیض ہوئے اور ایک مدت تک ان کی مصاحبت اختیار کیے رکھی۔ بعدازاں شیخ باقی باللہ کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے استفاضہ کیا اور طویل عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ پھر مراجعت فرمائے کشمیر ہوئے اور بقیہ عمر عبادت الٰہی اور علما وطلبا کے افادے میں صرف کردی۔

مولانا حسین خباز ارض کشمیر کے نامور شیخ، اونچے درجے کے عالم دین، معروف فقیہ اور صاحب فضل و صلاح بزرگ تھے۔ بعض کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء کو کشمیر میں فوت ہوئے [1]۔

## ۸۶۔ قاضی حسین سترکھی

قاضی حسین بن ابوالحسن سترکھی معقولات ومنقولات کے ماہر تھے اور شیخ عبدالرزاق بن خاصۃ الصالح امیٹھوی (متوفی ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۷ء) کے شاگرد تھے۔ ان سے طویل عرصے تک فیض حاصل کرتے رہے۔ شیخ عبدالرزاق نے ان کے علم وفضل اور صالحیت سے متاثر ہوکر اپنی ایک بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی۔ قاضی حسین سترکھی سے شیخ جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی (متوفی ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۶ء) نے علم حاصل کیا [2]۔

## ۸۷۔ مولانا حمید الدین سندھی

مولانا حمید الدین بن عبداللہ بن ابراہیم عمری سندھی۔ سندھ کے ایک مشہور شہر بدربیلہ میں پیدا ہوئے اور عمر کا کچھ حصہ وہیں گزارا۔ تحصیل علم بھی اسی شہر اور اسی نواح کے علمائے کرام سے کی۔ پھر ہجرت کرکے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور اسی ارض مقدس میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ حرمین شریفین میں وہاں کے جید اور مشہور اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا، جن میں شیخ ابوالحسن شافعی بکری، شیخ احمد بن حجر تیمی مکی، مدینہ منورہ کے خطیب شیخ نورالدین علی بن عراق، شیخ نجم الدین محمد بن احمد غیطی مصری، شیخ محمد سالم طبلاوی، شیخ محمد علقی شافعی مصری اور شیخ عبدالقادر حنفی مصری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مولانا حمید الدین اپنے دور کے شیخ، امام، عالم کبیر اور محدث تھے۔ انھوں نے مکہ مکرمہ میں مسند علم و فضل آراستہ کی اور بے شمار علما وطلبا نے ان کے چشمۂ علم سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ ان کے درس وتدریس کا حلقہ

---

[1] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۳۲، ۱۳۳۔ خزینۃ الاصفیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۵، ۱۳۶۔

[2] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۶، ۱۳۷۔

بہت وسیع تھا، جس میں عرب وعجم کے مشہور اصحاب علم مستفید ہوئے۔ ان حضرات علمائے عظام میں شیخ محمد بن احمد عجل ابوالوفا یمنی، شیخ عبدالرحمٰن بن عیسیٰ عمری مرشدی مفتی حرم مکہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اسمائے گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہیں۔

عبدالقادر حضرمی نے النور السافر فی اخبار القرن العاشر میں ان کے بھائی شیخ رحمت اللہ سندھی مہاجر مکی کے حالات کے ضمن میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ رحمت اللہ سندھی کے ایک بھائی حمید اللہ سندھی تھے، جو علم وصلاح سے متصف، حسن اخلاق کے حامل، متواضع، ذی فضل، عقل وخرد سے مالا مال، فہم وفراست کے مالک، نجابت وشرافت کے پیکر اور جلیل القدر انسان تھے۔ اللہ نے ان کو بے حد عزت و جاہ اور عظمت و وجاہت سے نوازا تھا۔ وہ نو سال مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر رہے اور بالآخر ۹۰ سال عمر پا کر ۱۰۰۹ھ/ ۱۶۰۱ء کو اسی ارض مقدس میں وفات پائی اور اپنے عظیم القدر بھائی شیخ رحمت اللہ کے قریب قبرستان معلیٰ میں دفن ہوئے۔

خلاصۃ الاثر میں محمد بن فضل اللہ محبی رقم طراز ہیں کہ شیخ حمید اللہ سندھی، صاحب معارف وفنون تھے۔ اصلاً اقلیم سندھ کے باشندے تھے اور وہیں وقار وعظمت کے جلو میں نشو ونما پائی۔ رفیع المنزلت عالم دین تھے۔ بعد کو حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے۔ وہاں بہت سے علما وافاضل کی صحبت میں رہنے کی سعادت حاصل کی، جن میں خود ان کے بھائی شیخ رحمت اللہ سندھی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد شیخ عبدالرحمٰن ابوالفضل زین الدین شامل ہیں۔

شیخ حمید الدین بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ مکہ مکرمہ میں بڑی تکریم واحترام کے حامل تھے۔ متقی، خوش اخلاق، حسن سیرت سے بہرہ ور، خوف خدا رکھنے والے اور بلند مرتبہ عالم دین تھے۔ نو سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہنے کے بعد ۱۰۰۹ھ/ ۱۶۰۱ء میں اسی پاک سرزمین میں سفر آخرت کو روانہ ہوئے [1]۔

## ۸۸۔ مولانا حیدر کشمیری

مولانا حیدر کشمیری، خواجہ فیروز کشمیری کے فرزند تھے۔ بے حد ذہین، سریع الفہم اور قوی الحفظ۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ابتدائی کتابیں معروف کشمیری عالم شیخ نصیب الدین سے پڑھیں۔ پھر مولانا جوہر نانت محدث کشمیری کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا اور ان سے علوم مروجہ کی بہت سی کتابوں کی تحصیل کی اور علم وفضل کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ جب ارض کشمیر کے مشاہیر علما سے فیض یاب ہو چکے تو دہلی کا قصد کیا۔ وہاں محدث شہیر شیخ عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ کا سلسلہ تدریس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور شیخ ممدوح سے اخذ علم کیا۔ بعد ازاں اپنے وطن کشمیر کو معاودت فرمائی اور دلجمعی اور مستقل مزاجی سے تدریس وافادہ میں

---

[1] النور السافر، بضمن شیخ رحمت اللہ سندھی۔ خلاصۃ الاثر۔ تاریخ معصومی، ص ۲۷۹۔ تحفۃ الکرام، ص ۴۴۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۷، ۱۳۸۔

مشغول ہو گئے۔ ان کا حلقہ درس بڑا وسیع تھا۔ اپنے دور کے نامور مدرس، محدث اور فقیہ تھے۔ تمام علوم پر گہری نظر رکھتے تھے اور طلبا سے لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے۔ لوگوں سے منقطع اور علیحدہ ہو کر صرف تدریس کو اصل مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ بعض فرماں روایان کشمیر نے مولانا حیدر سے کئی مرتبہ عہدۂ قضا قبول کرنے کی درخواست کی مگر انھوں نے اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس پر درس و افادہ کو ترجیح دی۔ جب ایک حکمران کی طرف سے قبول منصب کا اصرار زیادہ بڑھا تو رات کی تاریکی میں شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر جب پتا چلا کہ دوسرے عالم کو قاضی مقرر کر دیا گیا ہے تو واپس آ گئے۔

غرض مولانا حیدر سرزمین کشمیر کے وہ عالم و مدرس تھے جنھوں نے تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی اور بے شمار علما و طلبا کو دولت علم سے مالا مال کیا۔ ۱۰۵۷ھ/ ۱۶۴۷ء کو رحلت فرمائی [1]۔

## ـــــ خ ـــــ

## ۸۹۔ خواجہ بہاری لاہوری

خواجہ بہاری لاہوری، اپنے دور کے مفسر، محدث، فقیہ اور متقی بزرگ تھے۔ ابتدا میں تحصیل علم کی نیت سے اپنے وطن حاجی پور سے گودہ پور گئے جو اس زمانے میں ایک قصبہ تھا۔ وہاں شیخ جمال الاولیا کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے کچھ علوم حاصل کیے۔ اس کے بعد عازم لاہور ہوئے۔ لاہور اس عہد میں مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری (متوفی ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء) کے غلغلہ تدریس سے گونج رہا تھا، خواجہ بہاری بھی ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ ان ہی سے دستار فضیلت حاصل کی اور ان ہی کے گھر میں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد حضرت میاں میر کے زمرۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور ان کے خلیفہ مقرر ہوئے۔

خواجہ بہاری لاہوری نے ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے [2]۔

## ۹۰۔ قاضی خلیل الرحمٰن گورکھ پوری

قاضی خلیل الرحمٰن گورکھ پوری حنفی المسلک تھے۔ اپنے عصر کے افاضل اور کبار علما میں سے تھے۔ صالح، عفیف اور اونچے کردار کے مالک تھے۔ منصب قضا پر فائز تھے اور اس سلسلے میں انتہائی دیانت دار اور بہتر شہرت کے مالک تھے۔ گورکھ پور کے والی فدائی خاں کے ہاں ان کو خاص قربت حاصل تھی اور اس نے ان کی گوناگوں صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو اپنا ندیم و مشیر مقرر کر لیا تھا۔ پھر سلطان ہند اورنگ زیب عالم گیر سے

[1] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۴۳، ۱۴۴۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۸، ۴۰۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۳۹

[2] تذکرۂ علمائے ہند، ص ۵۸۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۱۲۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۱۶۸، ۱۶۹۔ عمل صالح، ج ۳، ص ۳۷۶۔

ان کا ذکر کیا اور خاص طور پر ان کی سفارش کی۔ اورنگ زیب ان سے انتہائی تکریم سے پیش آیا اور اپنی قبولیت اور عنایات سے سرفراز کیا، حتیٰ کہ انھیں گورکھ پور کا والی مقرر کر دیا❶۔

## ۹۱۔ قاضی خوب اللہ جون پوری

قاضی خوب اللہ جون پوری، شیخ محمد حفیظ حسینی جون پوری کے نواسے تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے عصر کے جید اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ فاضل اور شیخ وقت تھے۔ علوم عربیہ اور علم نحو میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ علم حدیث میں بالخصوص درک رکھتے تھے۔ اٹھارہ سو مرفوع احادیث زبانی یاد تھیں۔ الٰہ آباد میں عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ تمبا کو نوشی کے بارے میں ان کے دو شعر قابل ملاحظہ ہیں:

تنبا کو گرچہ ہست زیاں کار بے زو فائدہ ہیچ گہ ندید است کسے
آخر بہ ازیں چہ خوب باشد ترا خاموش کند زہرزہ گفتن نفسے

قاضی خوب اللہ جون پوری نے ۱۴ر شعبان ۱۱۰۰ھ/۲۴ر مئی ۱۶۸۹ء کو وفات پائی❷۔

## ۹۲۔ مولانا خوشحال تاشقندی

مولانا خوشحال بن قاسم بن مسکین تاشقندی، شیخ اور فاضل کبیر تھے۔ اپنے عہد کے کبار فقہا میں سے تھے۔ ہندوستان آئے اور شیخ وجیہ الدین گجراتی علوی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ ان سے تفسیر وفقہ، منطق وحکمت اور فلسفہ وغیرہ کی تحصیل کی۔ پھر شیخ وجیہ الدین گجراتی کے فاضل تلمیذ مرزا جان شیرازی سے شرح ہدایۃ الحکمۃ، حکمۃ العین، شرح التجرید اور حاشیہ قدیمہ، شرح چغمینی اور تحریر اقلیدس وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ تحصیل علم کے بعد احمد آباد کی مسند تدریس پر فائز ہوئے اور تیئس (۲۳) سال علما و طلبا کو درس دینے میں مصروف رہے۔ ان کے حلقہ درس سے بے شمار اہل علم نے استفادہ کیا۔ جب ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء کو بیرم خاں کا لڑکا عبدالرحیم خاں خاناں گجرات کا والی مقرر ہوا تو اس نے مولانا خوش حال تاشقندی کو ان کے علم وفضل اور فہم وفراست کی وجہ سے اپنے ندما میں شامل کر لیا اور بہت سے مال ومنال اور عطایا سے نوازا❸۔

---

❶ مرأۃ جہاں نما۔ ان کا اصل نام عبدالرحمٰن تھا۔ ملاحظہ ہو فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

❷ تجلی نور، ج ۲، ص ۱۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۱، ۱۴۲۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۳۳، ۲۳۴۔

❸ مآثر رحیمی، ج ۳، ص ۳۲ تا ۳۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۲۔

# ۹۳۔ قاضی خوشحال کابلی

قاضی خوشحال کابلی حنفی علامہ وقت اور فاضل دوراں تھے۔ اپنے عنفوان شباب میں لاہور آئے۔ اس زمانے میں شیخ محمد یحییٰ کا سلسلہ درس جاری تھا، ان سے علوم عربیہ اور علم نحو کی تحصیل کی۔ پھر عازم بخارا ہوئے اور وہاں کے شہرۂ آفاق عالم شیخ یوسف قراباغی سے فنون حکمیہ کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۲ء کو واپس ہندوستان آئے۔ "ہندوستان سے حجاز تشریف لے گئے اور حج وزیارت کی نعمت سے متمتع ہوئے۔ پھر ہندوستان آ گئے اور اکبر آباد (آگرہ) گئے۔ دہلی کی مسند قضا پر متعین ہوئے۔ جب شاہ جہان نے قاضی محمد اسلم ہروی کو فوج کے منصب قضا سے معزول کر دیا تو قاضی خوشحال کابلی کو ان کی جگہ یہ عہدہ دیا گیا۔ پھر اورنگ زیب عالم گیر مسند آرائے سریر مملکت ہوا تو اس نے ان کو لاہور کا قاضی مقرر کر دیا، جس پر یہ عمر بھر متمکن رہے۔ ان کے حسن سلوک اور دیانت داری سے عوام وخواص خوش تھے۔ جب موت کا پیغام آیا تو آواز آئی:

يَآيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ❶

اور ان کی روح عالم علوی کو پرواز کر گئی ❷۔

د

# ۹۴۔ مولانا دانیال جوراسی

مولانا دانیال حنفی عمری جوراسی، شیخ زین الدین کی نسل سے تھے، جو شیخ نصیر الدین محمود اودھی دہلوی کے بھانجے ہوتے تھے۔ علاقہ اودھ میں پیدا ہوئے۔ وہیں تربیت پائی اور عبدالسلام اعظمی دیوی سے تحصیل کی۔ یہاں تک کہ علوم میں مہارت پیدا کر لی اور افتاوتدریس کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو گئے۔ اس کے بعد طریقت و تصوف کی منزلیں طے کیں۔ عالم کبیر اور شیخ عصر تھے۔ درس وافادہ میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں شیخ قطب الدین محمد سہالوی اور بہت سے علمائے کرام شامل ہیں ❸۔

# ۹۵۔ مولانا داؤد مشکوٰتی کشمیری

مولانا داؤد مشکوٰتی کشمیری بن ملک مسعود غوری، گیارھویں صدی ہجری کے نامدار کشمیری علما میں سے

---

❶ یہ سورۂ فجر کی آیات نمبر ۲۷، ۲۸ ہیں۔ ترجمہ یہ ہے:
اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل، اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔

❷ مرآۃ العالم۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۲۰۷، ۲۰۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۲۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۴، بحوالہ بحر زخار۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۵۔

تھے اور تفسیر، حدیث، فقہ اور علوم حکمیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مشکوٰۃ کے حافظ تھے، اس لیے خواجہ حیدر چرخی کشمیری نے انھیں داؤد مشکوٰتی کا لقب دے دیا تھا۔ خواجہ حیدر بن فیروز چرخی کے شاگرد تھے، اور علوم دینیہ ان ہی سے حاصل کیے تھے۔ طریقت و تصوف میں وادیٔ کشمیر کے مشہور صوفیا بابا ابوالفقرا نصیب الدین اور خواجہ خاوند محمود بخاری سے مستفیض تھے۔ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور علم و معرفت میں ان سے استفاضہ کیا۔ تصوف و طریقت کے سلسلے کی متعدد عربی اور فارسی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک کتاب اسرار الابرار ہے، جو کشمیری مشائخ و علما اور سادات و فقرا کے حالات کو محتوی ہے۔ ایک کتاب کا نام اثمار الاشجار ہے۔ ایک اور کتاب منطق الطیر ہے۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۶ء کو کشمیر میں وفات پائی [1]۔

## ۹۶۔ ملا درویزہ پشاوری

ملا درویزہ پشاوری جنھیں اخوند بابا درویزہ پشاور کہا جاتا ہے، صالح عالم دین تھے۔ فقہ واصول اور علم کلام کے ماہر تھے۔ طریقت و تصوف سے بھی لگاؤ تھا اور اس ضمن میں سید علی ترمذی غواص سے مستفیض تھے، جو شیخ نظام الدین بن عبدالشکور تھانیسری (متوفی ۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء) کے تلامذہ میں سے تھے۔

ملا درویزہ پشاوری، احکام اسلام کے سخت متبع تھے اور اس ضمن میں مجادلہ و مناظرہ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ زنادقہ و ملاحدہ کے شدید مخالف تھے۔ شیعہ سے بھی ان کے مباحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بالخصوص عیسیٰ ملامتی اور بایزید ملحد سے (جو پیر روشن کے نام سے موسوم تھا) ان کے اکثر مباحثے ہوتے۔ دین کے درد اور اسلام کی محبت سے ان کا دل معمور تھا۔ پشاور اور اس کے گردونواح میں بہت مشہور تھے اور درس و تدریس کا وسیع حلقہ قائم تھا۔ تمام عمر علما و طلبا کو علمی فائدہ پہنچانے اور ان کی ذہنی و عملی تربیت میں کوشاں رہے۔

ملا درویزہ تصنیف و تالیف کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ مخزن الاسلام ان کی مشہور کتاب ہے جو پشتو زبان میں ہے۔ اس میں اسلام کے حقائق و معارف اور احکام شرع وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ کتاب وہ اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے۔ اس کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولانا عبدالکریم (متوفی ۱۰۷۲ھ/ ۱۶۶۲ء) نے کی۔ انھوں نے مخزن الاسلام کی شرح بھی سپرد قلم فرمائی، جسے کلمات باقیات کے نام سے موسوم کیا۔ خواجہ معین الدین خویشگی نے بھی اس کی شرح لکھی۔ اس شرح کا نام الکلمات الوافیات ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات علما و مشائخ نے افغانوں میں تبلیغ دین کی طرح ڈالی، ان کے علاقے میں رشد و ہدایت کی بساط بچھائی اور انھیں اسلامی تعلیم سے آشنا کیا، ان میں سید علی غواص ترمذی المعروف حضرت پیر بابا اور ان کے مرید و شاگرد اخوند درویزہ پشاوری کے اسمائے گرامی خاص طور سے

[1] تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۷۶، ۱۷۷۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱، ص ۶۴۵، ۶۴۶۔ تذکرہ علما ہند، ص ۶۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۵۰، ۲۵۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۳، ۴۲۴۔

قابل ذکر ہیں۔ سید علی غواص سادات ترمذ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا مولد ومنشا قندس تھا۔ ان کے والد مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں کی فوج میں ایک منصب پر فائز تھے اور اسی کے ساتھ وارد ہند ہوئے تھے۔ لیکن سید علی غواص پر فقر و درویشی کا رنگ غالب رہا۔ وہ مشائخ وصوفیا سے استفاضہ کے لیے پانی پت اور اجمیر وغیرہ بھی گئے۔ خرقہ خلافت، طریقہ چشتیہ میں اجمیر کے سید سالار سے حاصل ہوا، اور مرشد نے کوہستان کو مرکز تبلیغ ٹھہرانے کی ہدایت کی۔ ان کی دو گیلانی عقیدت مندوں نے انھیں علاقہ افغان میں اقامت گزین ہونے پر آمادہ کیا۔ اس وقت اس علاقے کی جو مذہبی حالت تھی، وہ اخوند درویزہ نے اپنے مرشد سید علی غواص کی زبانی بیان کی ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس علاقے کے لوگوں کو میں نے انتہائی سادہ دل، ہر آن دین کی طلب وتلاش میں ساعی اور خدا رسیدہ پایا۔ دین کے معاملے میں جوان بوڑھوں سے آگے نکلے ہوئے، عورتیں مردوں سے بڑھ کر دین پر کاربند، بچے عالم طفولیت ہی میں نیکی وتدین کے متلاشی، اور ان کے کارندے بھی احکام شریعت پر عامل۔ ان لوگوں میں قبول حق کی صلاحیت تو موجود تھی مگر پورے علاقے میں نہ کوئی درس کا سلسلہ تھا، نہ کوئی مکتب و مدرسہ۔ نہ کہیں علم تھا اور نہ علما و اتقیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت سے بے بہرہ مشائخ اور دین سے تہی دامن پیروں نے ان لوگوں کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر ان کو غلط راہوں پر ڈال دیا۔''

افغانوں کی یہ حالت دیکھ کر سید علی خواص ترمذی نے ان کے علاقے میں قیام پذیر ہونے اور ان کی اصلاح وتربیت کا تہیہ کر لیا۔ نیت چوں کہ نیک تھی، اس لیے اللہ نے کامیابی سے ہم کنار کیا اور اس نواح میں بڑی قبولیت حاصل کی۔ جہاں کہیں کسی بے علم اور شریعت سے بے بہرہ پیر کی اطلاع پاتے، وہاں پہنچتے اور اس سے باقاعدہ مباحثہ ومجادلہ کرتے۔ تذکرۃ الابرار والاشرار میں ایسے متعدد مدعیان مذہب کے نام مرقوم ہیں، جن سے سید علی غواص کے مقابلے ہوئے۔ ان کے سب سے اہم اور زوردار معرکے فرقہ روشنیہ کے پیر روشن سے ہوئے۔ پیر روشن کا اصل نام بایزید تھا۔ ان معرکوں میں اللہ تعالیٰ نے سید علی غواص کو کامیابی عطا فرمائی۔

غرض سید علی غواص نے پورے جوش وخروش اور بے حد محنت سے افغان علاقوں میں صحیح اسلام کی اشاعت کا آغاز کیا، جس کے نتیجے میں خلق کثیر ان سے فیض یاب ہوئی۔ ان کی مساعی تبلیغ کا سب سے نمایاں اور اہم پہلو یہ ہے کہ اخوند درویزہ پشاوری اور ان کے لڑکے شیخ عبدالکریم ان کے حلقہ ارادت وعقیدت میں شامل ہو گئے۔ اخوند درویزہ نے اپنی کتاب مخزن الاسلام میں سید علی غواص کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کی ان مساعی کو بہت سراہا ہے جو انھوں نے ملاحدہ اور زنادقہ کے خلاف انجام دیں۔ سید علی غواص نے ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء کو وفات پائی اور یوسف زئی علاقے میں بونیر اور سوات کی سرحد پر دفن کیے گئے۔

ملا اخوند درویزہ پشاوری اس نواح کے وہ بزرگ ہیں جو سید علی غواص ترمذی کے سب سے نامور عالم

دین مرید اور شاگرد تھے۔ افغانوں میں یہ اپنی زیرکی وعلمیت کی بنا پر خاص شہرت اور احترام کے مالک ہیں اور اس نواح میں اخوند بابا یا اخون بابا کے عرف سے معروف ہیں۔ وہ علوم ظاہری میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ولی اللہ بزرگ تھے، اور بحر تصوف کے شناور! لیکن اپنی ولایت کو پردۂ تعلیم وتدریس اور ملائیت میں مستور کر رکھا تھا۔ خزینۃ الاصفیا میں ان کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''جمال ولایت خود را در پردۂ تدریس وتعلیم وملائی پوشیدہ می داشت۔''

اخوند درویزہ کے بزرگ اصلاً علاقہ ننگر ہار کے رہنے والے تھے، جسے اب جلال آباد کہا جاتا ہے اور مشرقی افغانستان میں واقع ہے۔ مغلوں اور یوسف زئی قبائل کی کش مکش میں ان کے دادا وفات پا گئے تو یہ خاندان مہمندوں کے علاقے میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہیں اخوند کی پرورش ہوئی۔ ابتدا میں انھیں زہد وریاضت سے دلچسپی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی علوم ظاہری کی تکمیل بھی کی اور مروجہ علوم انہماک اور توجہ سے پڑھے۔ اخوند کے والد گرامی بھی صاحب علم بزرگ تھے۔ ''ادبیات سرحد'' میں ان کا نام اخون گدا لکھا ہے، لیکن اخوند صاحب کے بیٹے مولانا عبدالکریم تو علمی اعتبار سے اپنے دادا اخوند گدا سے بہت آگے نکل گئے تھے۔

برصغیر کی دینی اور علمی تاریخ میں اخوند درویزہ کے تعلیمی اور تبلیغی کارناموں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور ان کی مساعی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ فرقہ روشنیہ کے خلاف محاذ آرائی ہے۔ اس میں وہ کامیاب رہے اور ہر میدان میں اس کے قائد پیر روشن کو شکست دی۔ جس رفتار سے اس فرقے کے اثرات پھیل رہے تھے اس کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اخوند درویزہ اس کے خلاف نبرد آزما نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ تمام افغانوں یا کم از کم ان کے مشرقی قبائل کو یہ غلط مذہبی نظام اپنی لپیٹ میں لے لیتا اور ان کی مذہبی حمیت اور دینی غیرت اس سے سخت مجروح ہوتی۔ اخوند درویزہ اور ان کے خاندان کے اہل علم اور ان کے عقیدت مند میدان عمل میں اترے اور انھوں نے علوم اسلامی کی ترویج واشاعت کے لیے پشتو زبان میں کتابیں لکھیں اور ساتھ ہی ساتھ طریقہ روشنیہ کی تقریروں، مباحثوں اور مناظروں کے ذریعے بھرپور مخالفت کی۔ بایزید کو اس کے معتقدین ''پیر روشن'' کے نام سے پکارتے تھے، لیکن اخوند درویزہ نے اس کو ''پیر تاریک'' کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے مریدوں کے ساتھ مناظرے کیے۔ اس ضمن میں خزینۃ الاصفیا میں صاف لفظوں میں مسطور ہے:

''در رفع زنادقہ وملاحدہ ورفض بسیاری کوشید وہر جا کہ ملحدے یا رافضی شنیدے نزد او رسیدے وبا او مذاکرہ کردے واو را ملزم ساختے۔''

اخوند درویزہ کے مرشد، سید علی غواص ترمذی بھی زنادقہ وملاحدہ کے سخت مخالف تھے۔ اب مرید نے بھی ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور اس میں اس درجہ شدت اختیار کی کہ جہاں جہاں بایزید جاتا، یہ بھی اس کے تعاقب میں وہاں پہنچتے، اس سے مباحثہ کرتے، یہاں تک کہ اس کو لاجواب کر دیتے۔ وہ مارے خجالت و شرمندگی کے خاموش ہو جاتا اور تاب سخن نہ پاتا۔ اس سلسلے میں اپنے مرشد کے ساتھ بھی جاتے اور تنہا بھی۔ اپنی

تصنیف مخزن الاسلام میں وہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

چوں حضرت پیر دست گیر ایں فقیر، شیخ المشائخ و اولیاء، سیف السنّت۔ سید علی ترمذی درمیانان افغانان یوسف زئی در موضع بونیر بودہ، از بایزید خبر یافتہ، دفع دعویٰ او را بر خود فرض دید...... پس ایں فقیر ہم ہمراہ برفتم، او را دعوای خجل و شرمسار ساختم کہ سخن گفتن و دم زدن در حضور نتوانست، تالقب او را پیر تاریک کردم، وہذا بکرات و مرات گاہے با حضرت پیر و باحیلہ گاہی وگاہے بہ تنہائی خود حاضر می شدم و ایں ملحد را خجل ساختم۔

لیکن پیر روشن اور اس کے فرقے کے ملحدانہ افکار کی مخالفت میں اخوند درویزہ کو وہ کامیابی نہ حاصل ہوتی تھی، جس کی وہ توقع کرتے تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس علاقے میں کوئی ایسی اسلامی حکومت قائم نہ تھی جو رفع شر اور ترویج خیر کا مناسب انتظام کرتی۔ دوسرے اس نواح میں علوم اسلامی کی اشاعت کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ اخوند ممدوح فرماتے ہیں کہ افغان دین سے محبت رکھتے ہیں اور اس کے طالب و متلاشی ہیں، لیکن دینی علم سے تہی دامن ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میں اگر جاہل افغانوں میں سے کسی ایک شخص کو روکتا تو دوسرا بایزید کے پاس جا پہنچتا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر اخوند نے فیصلہ کیا کہ مسئلے کا اصل حل علوم دینی کی نشر و اشاعت ہے، چنانچہ انھوں نے پشتو اور فارسی زبان میں کئی کتابیں مرتب کیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

افغاناں چوں در طلب مولیٰ محبت تمام دارند و دین را جویان اند، اما بہ سبب نادانی و جاہلی کہ از علوم دینی محروم اند، حق را از باطل نمی دانند...... پس ایں فقیر می خواہد کہ متن عقائد بہ لفظ افغانی بیارد تا ہر کہ آں را در یابد و باور دار ہرگز گمراہ نہ کرد۔

اس موضوع سے متعلق ان کی مشہور تصنیف مخزن الاسلام ہے، جو پشتو زبان میں ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے عقائد و عبادات سے متعلق اہم اور بنیادی مسائل عربی اور فارسی کتابوں سے اخذ کر کے تحریر کیے ہیں اور اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ جو شخص سنت نبوی پر عامل نہ ہو اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے علوم سے آگاہ نہ ہو، اسے ہرگز پیر یا پیشوا نہیں بنانا چاہیے۔

مخزن الاسلام کا بیشتر حصہ اخوند درویزہ کا اپنا تحریر کردہ ہے اور احکام شریعت کا تمام مواد ان ہی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ ان کے صاحب زادے مولانا عبدالکریم پشاوری نے دو ابواب کا اضافہ کیا ہے، جو حقائق و معارف کے بارے ہیں۔

اخوند درویزہ کو اس امر کا پورا پورا احساس تھا کہ بایزید کی بے راہ روی اس بات کا نتیجہ ہے کہ وہ طریقت کی غلط ترجمانی کرتا ہے اور شریعت پر طریقت کو ترجیح دیتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

''دریں ایام ہر کہ افغاناں در بلائے درآمدہ است، از پیری و مریدی درآمدہ است۔''

یعنی اس دور میں افغانوں میں جو برائیاں آئی ہیں وہ پیری مریدی کی وجہ سے آئی ہیں۔

مخزنِ اسلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مروجہ پیری مریدی اور طریق تصوف میں اصلاح کی بے

حد کوشش فرمائی۔ اس ضمن میں ان کی جامع اور مشہور تصنیف ارشاد الطالبین ہے، جو فارسی زبان میں ہے۔ اس کے آغاز میں وہ صاف الفاظ میں رقم طراز ہیں کہ اس دور کے مشائخ وصوفیا کے احوال واقوال، قرآن وحدیث کے صریح احکام سے متصادم ہیں۔ مختلف قسم کے الحاد وزندقہ نے لوگوں کے ذہن وفکر پر تسلط جمالیا ہے۔ سنت کے عالم اور عامل ان دیار میں اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں اور صوفیائے عصر آئمہ دین کی روایات سے ہٹے ہوئے اور روگرداں ہیں۔ اس باب میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

اما بعد یکے از مریدانِ کمترینہ حضرت شیخ الاسلام والمسلمین، وارث علوم انبیا والمرسلین، شیخ علی ترمذی، یعنی اضعف عباد اللہ الباری ہمی گوید کہ...... چوں انواع اہل الحاد تغلب نمودہ اند، پس...... معتقدان ومعتمدان مذہب سنت وجماعت، بل عالمان وعاملان مشرب شریعت راغریب الغربا دیدم...... از شدت تعصب دینی روز بروز درسوز وگداز درآمدم۔ اما از روئے تحقیق نظر کردم کہ سبب تفرق امت بہ ہفتاد وسہ گروہ چہ می باشد؟ جز امر شیخوخت مردودۂ مبتدعہ چیزے دیگر نیافتم زیرا کہ تمام افعال واقوال واحوال شیوخ ایں ایام را مخالف قرآن و حدیث ومخالف روایات آئمہ ومخالف حالات شیوخ سلف دیدم۔

اخوند درویزہ کے نزدیک امت کے اختلافات اور عوام کی گمراہی کا اصلی سبب یہی ”شیخوخت مردودۂ مبتدعہ“ یعنی مشائخ واکابر کے غلط دعوے اور مبنی بر بدعت طور طریقے ہیں اور ان کا علاج قرآن و حدیث کی اتباع اور ائمہ وشیوخ سلف کی پیروی ہے۔ انھوں نے روحانی مطلق العنانی اور خلاف شرع تصوف کی سخت الفاظ میں تردید کی ہے۔ ان کی تصانیف میں یہ شعر جو بایزید۔ پیر روشن۔ پر بظاہر صادق نظر آتا ہے، بار بار درج ہوا ہے۔

خیالاتِ نادانِ خلوت گزیں    بہم برزند عاقبت کفرو دیں

بہرحال اخوند ممدوح نے جب محسوس کیا کہ افغان اگرچہ دین ومذہب کے دلدادہ ہیں، مگر قلت علم کی بنا پر ان کی اکثریت کو جاہل صوفیا نے صراط مستقیم سے دور کر رکھا ہے تو انھوں نے ان میں توسیع علم کی کوشش کی اور بڑی جدوجہد کے بعد اس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے ان لوگوں کو خاص طور پر ہدف تنقید ٹھہرایا، جو علم کو ”حجاب اکبر“ سے تعبیر کرتے تھے اور کہا کہ اگر علم فی الواقع حجاب اکبر ہے تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو کیوں رب زدنی علما کی دعا کا حکم دیا۔

اخوند درویزہ کی تصانیف میں سے چار کتابوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک مخزن الاسلام، دوسری ارشاد الطالبین، تیسری تلقین المریدین اور چوتھی تذکرۃ الابرار والاشرار۔ یہ کتابیں مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ وہ پشتو کے شاعر بھی تھے۔ میر احمد شاہ رضوانی مرحوم نے اپنی کتاب بہارستان میں فضیلت صبر کے بارے میں ان کی ایک مثنوی درج کی ہے۔

اخوند مرحوم اونچے درجے کے مصنف، شاعر، مصلح اور مبلغ اسلام تھے۔ انھوں نے صرف بایزید (یعنی

پیر روشن) کا مقابلہ ہی نہیں کیا بلکہ جس جماعت اور گروہ کو بھی اسلام کے بنیادی ارکان اور عقائد دینیہ کے مخالف پاتے اس کے خلاف محاذ قائم کر لیتے۔ ان میں ''فدایان'' کا گروہ بھی تھا، جو اسماعیلیوں سے تعلق رکھتا تھا اور اس گروہ سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ اب بھی نواح چترال میں موجود ہیں۔ اس گروہ کی اخوند مرحوم نے شدید مخالفت کی۔ ایک روایت کے مطابق اخوند کی موت کا باعث بھی یہی گروہ ہوا تھا۔ اس کے سردار نے ان کو تربوز کھلا دیا تھا، جس میں زہر ڈالا گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے اخوند کی موت واقع ہوگئی۔

اخوند درویزہ کے جوش اصلاح اور حمیت دینی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیرو مرشد شیخ علی غواص ترمذی کو بھی جن کا ان کے دل میں بے حد احترام تھا، غیر شرعی امور کے ارتکاب سے بلا جھجک ٹوک دیا تھا۔ شیخ علی غواص سلسلۂ چشتیہ سے منسلک تھے اور اس سلسلے کے رواج کے مطابق سماع کے قائل تھے۔ اخوند اس پر معترض ہوئے۔ سماع کو خلاف شرع قرار دیا اور مرشد کو اس سے منع فرمایا۔ شیخ علی نے کہا میں کبھی کبھی سماع کرتا ہوں اور اس لیے کرتا ہوں کہ اس سے مجھ پر بعض اسرار منکشف ہوتے ہیں، لیکن معترضوں کے پاس خاطر سے اسے ترک کرنے کو تیار ہوں، چنانچہ اخبار الاولیا میں مذکور ہے کہ اس کے بعد شیخ علی نے کبھی سماع نہیں کیا۔

اخوند عالم دین اور پابند شرع بزرگ تھے۔ بعض اوقات وہ اس درجہ یاد خدا میں مستغرق ہو جاتے اور ذکر الٰہی میں ڈوب جاتے کہ کسی چیز کا انھیں کچھ پتا نہ چلتا۔ اس قسم کا ایک واقعہ ''رود کوثر'' میں اخبار الاخیار کے حوالے سے مندرج ہے کہ ایک روز ایک خاتون سر پر تیل کا بھرا ہوا مٹکا اٹھائے جا رہی تھی۔ اخوند کو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ خاتون سے کہا، بیٹی! پانی پلاؤ تو ثواب ملے گا۔ خاتون حیا اور ادب کے جذبات سے اس قدر مرعوب ہوئی کہ کچھ نہ کہہ سکی اور مٹکا اخوند کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے پینا شروع کیا تو مٹکا خالی کر دیا۔ بعد کو منہ کا ذائقہ بدلا تو پتا چلا کہ یہ پانی نہ تھا، تیل تھا۔

اخوند درویزہ نے عہد شاہ جہانی میں ۱۰۴۸ھ/۱۶۳۸ء میں وفات پائی اور پشاور میں موضع ہزار خانی کے قریب مدفون ہیں

اخوند درویزہ کے صاحب زادے کا نام مولانا عبدالکریم تھا۔ یہ بھی عالم وفقیہ اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ انھیں ''محقق افغانستان'' کا خطاب حاصل تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ اشعار میں یہ خود کو اخوند کریمہ کہتے ہیں۔

اخوند کریمہ نے ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کو انتقال کیا اور علاقہ یوسف زئی میں دفن کیے گئے۔

اخوند درویزہ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ لوگوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ پیروی شریعت، اتباع سنت اور بدعات وخلاف شرع امور کی مخالفت اور بیخ کنی میں یہ حضرات اپنے استاذ و مرشد کے نقش قدم پر چلے۔ ان کی مساعی سے علاقہ سرحد میں علم وفضل کی شمع روشن ہوئی اور احکام شریعت پر عمل کی دیواریں استوار کرنے کے

اسباب پیدا ہوئے۔ ان حضرات میں مولانا چالاک شاہ میانہ وشیخو شاہ شاہ جہان پوری وشیخ علی وغیرہ شامل ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ "ہر کہ بہ صحبت او پیوست، فضیلتے از علوم دینی یافت۔" ان کی زبان پشتو تھی، لیکن فارسی اشعار بھی کہتے تھے اور ہندوستانی زبان میں بھی گفتگو کرتے تھے۔ ان کا سال وفات ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۳ء ہے اور مدفن پشاور!

اخوند درویزہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے افغانوں میں فرقہ روشنیہ اور اس کے بانی پیر روشن کا (جو میاں بایزید کے نام سے موسوم تھا) زور ختم کیا اور روشنی کے نام سے، وہ جو تاریکی پھیلا رہا تھا، اس کے اثرات دور کیے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ پیر روشن کے پوتے مرزا خان انصاری جو پشتو کے صاحب دیوان شاعر تھے، کسی زمانے میں کہا کرتے تھے کہ میرے اشعار کی شیرینی پیر روشن خان (پیر روشن) کی برکت سے ہے، لیکن اخوند درویزہ کی تبلیغ دین سے متاثر ہو کر مرزا خان انصاری نے فرقہ روشنیہ کو ترک کر دیا تھا اور ان تمام باتوں سے تائب ہو گئے تھے جو انھوں نے خلاف شرع کہی تھیں یا جن پر عمل کیا تھا۔ پشتو زبان میں علوم اسلامی کے متعلق جو کتابیں بصورت نثر یا نظم لکھی گئیں وہ سب اخوند درویزہ کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ ہیں۔

## ۹۷۔ مولانا رضی الدین بھاگل پوری

مولانا رضی الدین بھاگل پوری، حنفی المسلک تھے اور گیارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر علمائے ہند میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ عالم وفقیہ اور شیخ وقت تھے۔ علوم مروجہ میں درجہ ممتاز پر فائز تھے۔ علمائے عصر میں مشہور اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کے زمانے میں فتاویٰ ہندیہ، جو فتاویٰ عالم گیری کے نام سے معروف ہے، اورنگ زیب عالم گیر کی سعی وکوشش سے زیر ترتیب تھا اور مشاہیر علمائے ہند کی ایک بڑی جماعت اس اہم خدمت فقہی پر مامور تھی۔ اورنگ زیب کے کانوں میں مولانا رضی لدین بھاگل پوری کی شہرتِ علمی پہنچی تو اس نے ان کو بھی اس خدمت پر متعین کر دیا۔ قاضی محمد حسین محتسب اور مشہور مؤرخ بختاور خاں کی سفارش اور تعارف سے ان کو فتاویٰ عالم گیری کے مدونین کی جماعت میں رکھا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس خدمت کے صلے میں ان کا تین روپے یومیہ وظیفہ مقرر کیا۔

مولانا رضی الدین بھاگل پوری، عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ فنون حرب میں بھی مہارت رکھتے تھے اور سیاست کی پیچیدہ گرہوں کی عقدہ کشائی میں ان کو خاص درک حاصل تھا۔ ان اوصاف کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء میں یک صدی منصب سے نوازا اور اپنے خاص مشیروں میں شامل کیا۔ پھر

۱۰۹۰ھ/ ۱۶۷۹ء میں ان کو "خان" کے لقب سے سرفراز کیا اور اودے پور کے شاہی لشکر میں شامل فرمایا، چنانچہ انھوں نے کفار ہند کے خلاف جنگیں لڑیں اور اپنی شجاعت و بسالت اور مجاہدانہ تگ و تاز کا ثبوت دیا۔ بعد ازاں بادشاہ کی طرف سے انھیں اقطاع برار کا والی مقرر کیا گیا، جہاں یہ امیر حسن علی خان کی جگہ کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ مولانا رضی الدین بھاگل پوری نے ۱۰۹۶ھ/ ۱۶۸۵ء میں سرزمین برار میں وفات پائی ❶۔

## ۹۸۔ سید رفیع الدین بلگرامی

سید رفیع الدین بن بدرالدین بن تاج الدین حسینی واسطی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ حصول علم کے لیے مختلف مقامات میں گئے اور اپنے دور کے اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت علمی میں ممتاز ٹھہرے اور فتویٰ و تدریس کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوئے۔ پھر بلگرام واپس آئے اور بلند مرتبہ علما میں گردانے گئے۔ فاضل عصر اور شیخ وقت تھے۔ بلگرام کی مسند درس پر فائز اور منصب افتا پر متعین تھے۔ نہایت خوش خط تھے اور مختلف کتابوں پر بہترین حاشیے بنا کر خوب صورتی سے لکھتے تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مطول اور تلویح وغیرہ کتابیں دیکھیں، جن پر ان کے حواشی تحریر تھے۔ تلویح کے خاتمے پر یہ الفاظ مرقوم تھے:

قد وقع الفراغ من تسويد هذه النسخة الشريفة المسماة بالتلويح فى شرح التوضيح بمدرسة استاذى العلامة النافع للخاصة والعامة، اعلم العلماء اكمل الاتقياء، حامى اهل الشرح والايمان، ماحى آثار الظلم والطغيان، الحضرة العلية الشيخ حسين بن الشيخ داؤد متع الله الطالبين بطول بقائه فى افضل الايام يوم الجمعة الثا من عشر من شهر ربيع الال وسنة خمس و تسعين و تسعمائة، مالكه وكتابه رفيع الدين بن بدر الدين بن تاج الدين بن الحسين الحسينى والما مول من القارئين لهذه الكتاب والمستفيدين به أن يذكروا الكاتب المذنب فى اوقاتهم الشريفة بدعاء الخير وسلامة الايمان والله سبحانه هو المستعان ❷۔

## ۹۹۔ مولانا رفیع الدین انصاری سہارن پوری

مولانا رفیع الدین بن عبدالستار بن عبدالکریم انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور شیخ رکن الدین گنگوہی سے تحصیل علم کی۔ تصوف سے دلچسپی ہوئی تو ان

❶ مآثر عالم گیری ص ۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۹۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۲۸۱، ۲۸۲۔

❷ مآثر الکرام، ص ۲۱۶، ۲۱۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۴۹، ۱۵۰۔

ہی سے اخذ طریقت کیا اور خرقہ تصوف زیب تن فرمایا۔ بعد ازاں عازم برہان پور ہوئے۔ وہاں شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی کی بساط تدریس و سلوک بچھی ہوئی تھی، ان سے علم حدیث حاصل کیا۔ بعض دیگر علوم بھی پڑھے۔ اس کے بعد اپنے شہر سہارن پور کو مراجعت فرمائی اور مجلس ارشاد و اصلاح کو رونق بخشی۔ تمام سلاسل تصوف سے منقطع ہو کر رشد و ہدایت کی سیدھی اور مستقیم راہ کے مطابق لوگوں کو فیض پہنچانے لگے۔

مولانا رفیع الدین انصاری سہارن پوری، اپنے دور کے نام ور محدث اور فقیہ تھے اور تمام علوم عربیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے اور بے شمار علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔ برصغیر کے اس عالم و فقیہ نے ۱۸/ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ/ ۲۶/ مارچ ۱۶۱۶ء کو انتقال کیا❶۔

## ۱۰۰۔ مفتی رکن الدین دہلوی

مفتی رکن الدین بن جمال الدین بن نصیر الدین بن سماء الدین دہلوی کی جائے ولادت دہلی ہے۔ اسی شہر میں تربیت پائی اور والد مکرم شیخ جمال الدین اور قاضی نور اللہ تستری لاہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مسلکاً حنفی تھے اور فقہ و اصول کے ماہر علما میں گردانے جاتے تھے۔ ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۶ء میں اپنے والد کی جگہ مسند افتا پر فائز ہوئے اور تمام عمر اس منصب بلند پر متعین رہے❷۔

## ۱۰۱۔ شیخ رکن الدین سنامی گنوری

شیخ رکن الدین سنامی گنوری، شیخ مجد الدین طاہر محمد سنامی کی اولاد سے تھے۔ مولد و منشا گنور ہے۔ حصول علم کی غرض سے مختلف مقامات کی خاک چھانی اور طویل سفر کیے۔ بہت سے علمائے وقت اور مشائخ عصر سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ بعد ازاں اپنے وطن واپس تشریف لے گئے اور درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ تمام عمر ہنگامۂ درس بپا کیے رکھا اور لاتعداد علما و طلبا کو دولت علم سے مستفید فرمایا۔

شیخ رکن الدین سنامی گنوری، بے حد نیک، متدین، عبادت گزار اور قائم اللیل بزرگ تھے۔ اشراق تک مصروف عبادت رہتے، پھر درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے۔ زہد و عالی ظرفی میں بھی بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی کثیر الدرس اور کثیر الافادہ بھی تھے۔ اس ہندی عالم دین نے ۱۰۲۷ھ/ ۱۶۱۸ء کو رحلت فرمائی❸۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۰ بحوالہ مراۃ جہان نما۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۱، بحوالہ اسراریہ۔

## ـــــــ ز ـــــــ

# ۱۰۲۔ شیخ زین الدین اکبر آبادی

شیخ زین الدین اکبر آبادی کا سلسلہ نسب یہ ہے: زین الدین بن منور بن نور اللہ بن معز الدین بن اللہ داد بن قاضی محمد شرعی اکبر آبادی۔ شیخ زین الدین کی جائے ولادت و تربیت اکبر آباد (آگرہ) ہے۔ علم و فضل کی گود میں نشوونما پائی۔ بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اکثر کتب درسیہ قاضی جلال الدین ملتانی سے اور بعض ملا مقیم سے پڑھیں۔ حصول علم کے بعد طبیعت ترک و تجرید اور علیحدگی و انزوا کی طرف مائل ہو گئی اور قناعت و عفت اور صلاح و تقویٰ کی زندگی بسر کرنے لگے۔ رؤسا و اغنیا سے حتی الامکان دور رہتے اور ان کے ساتھ ملاقات سے جہاں تک ہو سکتا گریز کرتے۔ اپنے دور کے جید عالم اور نامور فقیہ تھے۔

شیخ زین الدین اکبر آبادی نے ۱۷؍ رمضان ۱۰۰۵ھ/ ۲۴؍ اپریل ۱۵۹۷ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں وفات پائی اور اسی شہر میں اپنے زاویہ میں دفن کیے گئے [1]۔

## ـــــــ س ـــــــ

# ۱۰۳۔ حاجی سلطان تھانیسری

حاجی سلطان تھانیسری مشرقی پنجاب کے شہر تھانیسر میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور اپنے عصر کے اساتذہ سے حصول علم کیا، یہاں تک کہ فقہ و اصول اور عربی کے علوم مروجہ کے فاضل اور ماہر گردانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور سعادت حج سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر وارد ہند ہوئے تو ہندوستان کے بادشاہ جلال الدین اکبر سے تعارف و تقرب حاصل ہوا۔ اس نے ان کی علمی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے درباری علما میں شامل کر لیا۔ شیخ سلطان تھانیسری جس طرح علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے، اسی طرح سنسکرت میں بھی عبور حاصل تھا۔ جب اکبر کو ان کے اوصاف علمی کا پتا چلا تو انھیں مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔

مہابھارت سنسکرت زبان میں ہے جو ایک ضخیم کتاب ہے اور ہندوؤں کے نزدیک مذہبی نقطہ نظر سے اسے مقدس اور مستند کتاب سمجھا جاتا ہے۔ حاجی سلطان نے چار سال میں اس کو فارسی زبان میں منتقل کر دیا۔ حاجی سلطان کا اس زمانے کا یہ لطیفہ منتخب التواریخ میں مرقوم ہے کہ جب یہ مہابھارت کا ترجمہ کر رہے تھے تو

---

[1] اذکار ابرار، ص ۴۱۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۳۔

ایک شخص نے ان سے پوچھا:

ایں چیست کہ می نویسید۔؟

یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

کہا:

حرف دہ ہزار سالہ را بزبانِ حال موافق می سازم۔

دس ہزار سال پہلے کی باتوں کو موجودہ زبان کے قالب میں ڈھال رہا ہوں۔

ایک دور ایسا آیا کہ ہندوؤں نے ان پر ذبیحہ گاؤ کا الزام عائد کیا، جسے اکبر نے ہندوؤں کے پاس خاطر سے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ کو یہ شکایت پہنچی تو وہ نہایت خشمگیں ہوا۔ اکبر آباد (آگرہ) سے نکل جانے کا حکم صادر کیا اور جلا وطن کر کے سندھ کے شہر بھکر بھیج دیا۔ بھکر کی زمام ولایت بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر تھا اور ان کی دل سے قدر کرتا تھا۔ بھکر میں وہ ان سے نہایت احترام سے پیش آیا اور ان کی طرف خصوصیت سے عنان توجہ مبذول کی۔ جب اس نے اسیر گڑھ کا قلعہ فتح کر لیا تو بادشاہ سے ان کی جلا وطنی ختم کرنے اور واپس بلانے کی سفارش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے انھیں اپنے شہر تھانیسر میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت دے دی اور تھانیسر اور کرنال کا منصب کروڑ گیری عطا کیا۔ یعنی ان شہروں کے خراج کا تحصیل دار مقرر کیا۔ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء میں وہ اس منصب پر فائز تھے [1]۔

یہ پتا نہیں چل سکا کہ وہ اس منصب پر کتنا عرصہ متعین رہے۔ ان کی تاریخ وفات کا علم بھی نہیں ہو سکا۔

## ۱۰۴۔ علامہ سلیمان کردی گجراتی

علامہ سلیمان ابو احمد کردی گجراتی ایک فاضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ کردستان سے ہندوستان آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دہلی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی بساط تدریس بچھی ہوئی تھی اور علما و طلبا ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ سلیمان کردی بھی ان کے حلقہ درس میں داخل ہو گئے۔ ان سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھیں اور ان میں عبور حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علاقہ گجرات کو اپنا مسکن قرار دیا اور وہاں درس و تدریس کی مسند آراستہ کی جس سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا [2]۔

---

1. منتخب التواریخ۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۸، ۱۵۹۔
2. مرآۃ احمدی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۹۔

## ـــــ ش ـــــ

# ۱۰۵۔ مولانا شاکر محمد دہلوی

مولانا شاکر محمد بن وجیہ الدین (یا وجہ الدین) دہلوی گیارھویں صدی ہجری کے کبار علمائے حنفیہ میں سے تھے۔ شیخ عبدالعزیز حسن چشتی کی نسل سے تھے۔ مولد و منشا دہلی تھا اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے تلمیذ تھے۔ علم و معرفت میں درجہ کمال کو پہنچے۔ پھر دہلی میں درس و تدریس کی مسند پر متمکن ہوئے۔ اس زمانے میں شہر دہلی میں علم و فضل اور تدریس و افادے میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ شاہ جہان بادشاہ ان کی انتہائی تکریم کرتا تھا اور ان سے بے حد تعظیم سے پیش آتا تھا۔

اس ہندی عالم دین نے آخر شعبان ۱۰۶۳ھ/ ۱۵ر جولائی ۱۶۵۳ء کو وفات پائی ❶۔

# ۱۰۶۔ ملا شاہ محمد بدخشی

ملا شاہ محمد بن ملا عبدی صوفی بدخشی سرزمین بدخشاں میں علاقہ روستاق کے ایک مقام ارکسال میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے، اس لیے ملا کے عرف سے معروف تھے۔ یعنی لفظ ''ملا''، علم و فضل میں کمال کی وجہ سے ان کے نام کا جز بن گیا تھا۔ ۱۰۲۳ھ میں لاہور آئے۔ ان دنوں شیخ محمد میر لاہوری (یعنی میاں میر رحمہ اللہ) کا شہرۂ طریقت و تصوف عروج پر تھا۔ ملا شاہ محمد لاہور آ کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلوک کی منزلیں طے کیں۔ جب تک میاں میر زندہ رہے، ملا شاہ محمد بدخشی نے ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ ان کی وفات کے بعد عازم کشمیر ہو گئے اور کوہ سلیمان پر مسجد اور خانقاہ تعمیر کی۔ باغیچہ بھی وہاں لگایا۔ اس میں اقامت گزیں ہو گئے اور اپنے آپ کو وظائف و اوراد کے سپرد کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق اپنے شیخ میاں میر کی زندگی ہی میں کشمیر چلے گئے تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ گرمیوں میں کشمیر رہیں گے اور سردیوں میں واپس لاہور آ جائیں گے۔

کتب تاریخ میں مرقوم ہے کہ ہندوستان کا مغل حکمران شاہ جہان کشمیر جاتا تو بار بار ملا شاہ محمد بدخشی کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کے ملفوظات و اقوال سے استفادہ کرتا۔ شاہ جہان کا بیٹا دارا شکوہ بھی ان کے حلقہ ارادت میں داخل تھا اور اس کی بیٹی جہاں آرا بیگم بھی ان کی عقیدت مند تھی۔ بالفاظ دیگر ہندوستان کا حکمران خاندان، ان سے کامل عقیدت رکھتا تھا اور ملک کے بعض اکابر و مشاہیر ان سے باقاعدہ استفاضہ کرتے تھے۔

ملا شاہ محمد بدخشی عارف باللہ اور صاحب حال بزرگ تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی جو

❶ اسراریہ (کمال محمد سنبھلی)۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۲۔

نکات تصوف پر مشتمل ہے اور نامکمل ہے۔اس تفسیر کی بعض تعبیرات بڑی عجیب وغریب نوعیت کی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید کی آیت: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ❶ کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ اولیا سے متعلق ہے، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اولیا کے دلوں پر مہر لگا دی ہے کہ ان میں وساوس شیطانیہ اور افکار شیطانیہ داخل نہ ہوسکیں۔ ان کے کانوں پر بھی مہر ثبت کر دی ہے تاکہ غلط اور بے ہودہ باتیں ان میں راہ نہ پاسکیں۔ان کی آنکھوں پر اپنی عظمت و کبریائی کے حسین وجمیل پردے لٹکا دیے ہیں اور ان کے لیے بہت ہی میٹھی اور پُر حلاوت شراب مہیا کی گئی ہے۔

اس سالک وصوفی فقیہ اور عالم نے ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کو سفر آخرت اختیار کیا❷۔

## ۱۰۷۔ مولانا شاہ محمد اخسیکتی

مولانا شاہ محمد اخسیکتی، عالم کبیر اور مشہور بزرگ تھے۔ اپنے عصر کے علمائے عرب وعجم سے تحصیل کی اور اساتذہ کی زندگی ہی میں ان کا شمار نامور علما میں ہونے لگا۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد داخل ہند ہوئے اور گجرات (کاٹھیاواڑ) میں عرصے تک درس وتدریس کی شمع روشن کیے رکھی۔ پھر مختلف بلاد ہند کی سیر وسیاحت کے لیے روانہ ہوئے۔اس اثنا میں مانڈو بھی گئے۔ وہاں قاضی جمال الدین ترکستانی کی صاحب زادی سے عقد کیا اور سات سال علما وطلبا کو درس دیتے رہے۔ اس دوران میں ان سے محمد بن حسن مانڈوی نے اصول فقہ کی کتابیں، الکشف، المنار اور تلویح پڑھیں۔ ان کے علاوہ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا❸۔

## ۱۰۸۔ مفتی شرف الدین لاہوری

مفتی شرف الدین لاہوری حنفی المسلک تھے اور اپنے وقت کے عالم وفقیہ تھے۔ شیریں کلام، فصیح البیان اور حسن اخلاق کے مالک۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں لاہور کی مسند افتا پر فائز تھے جس پر پوری زندگی فائز رہے۔ ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء کو بعہد عالم گیری وفات پائی❹۔

---

❶ یہ سورۂ بقرہ کی ساتویں آیت ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے: ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

❷ شاہ جہان نامہ، ج ۳، ص ۳۶۴، ۳۶۵۔ تذکرۂ شعرائے کشمیر، ج ۱، ص ۴۲۶، ۴۵۹۔ تحقیقات چشتی، ص ۲۲۴، ۲۲۵۔ مفتاح التواریخ، ص ۲۶۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۴، ۱۶۵۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۴۸۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۵۔

❹ [illegible] صفیا۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۵۔ فرحت الناظرین (شخصیات)۔ ص ۲۰۵۔

## ۱۰۹۔ مولانا شمس الدین بروتوی جون پوری

مولانا شمس الدین کا سلسلہ نسب یہ ہے: شمس الدین بن نورالدین بن عبدالقادر بن زین الدین بن نظام الدین بن خیر الدین بن احمد بن جمال الدین بن تقی الدین صدیقی اودھی ثم بروتوی جون پوری۔ ان کا مولد ومنشا بروتہ ہے جو اس زمانے میں اعمال جون پور میں ایک قریہ تھا۔ مولانا شمس الدین نے علما کی ایک جماعت سے تحصیل کی، اور اپنے دور کے بہت بڑے عالم و فاضل ہوئے۔ ان کی شہرت علمی سے متاثر ہو کر بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے ان کو اپنے ایک بیٹے پرویز کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔ مدت تک الہ آباد میں سکونت پذیر رہے۔ پھر جون پور کے منصب قضا پر مامور کر دیے گئے۔ لہٰذا اپنے شہر جون پور واپس آ گئے۔ وہاں قضا کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ صاحب شمس البازغہ شیخ محمود جون پوری نے بھی ان سے بعض کتابیں پڑھیں۔ ان کے بھانجے شیخ محمد رشید جون پوری نے جو رشیدیہ کے مصنف تھے، ان سے شرح جامی، حاشیہ کافیہ مع شرح شیخ اللہ داد جون پوری مرفوعات کی بحث تک، قصیدہ بردہ، کچھ حصہ آداب الحنفیہ کا، کچھ حصہ حسامی کا، شرح وقایہ، ہدایہ اور تلویح وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ اس دور کے ایک بزرگ شیخ رکن الدین نے ان سے تمام کتب درسیہ کی تحصیل کی۔

مولانا شمس الدین بروتوی جون پوری نے ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء میں وفات پائی اور جون پور میں اپنے مدرسے کے احاطے میں دفن کیے گئے ❶۔

## ۱۱۰۔ مولانا شہباز بھاگل پوری

مولانا شہباز بھاگل پوری کا سلسلہ نسب یہ ہے: شہباز بن محمد بن خیر الدین بن علی بن اسمٰعیل بن اسحاق بن سعدی بن یعقوب بن محمد بن مسعود بن احمد حسینی لاہور ثم بھاگل پوری۔ شیخ کمال الدین حسینی ترمذی کی اولاد سے تھے۔ ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۰ء کو دیورہ میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں اعمال بہار میں ایک قریہ تھا۔ اپنے سسر شیخ محمد ماہ دیوری سے علم حاصل کیا۔ پھر طبیعت مائل بہ تصوف ہوئی تو شیخ یٰسین سلمانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے اخذ طریقت کیا۔ تیس سال کی عمر کو پہنچے تو دیوہ سے بھاگل پور منتقل ہو گئے۔ وہاں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار فرمایا۔ یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور مولانا شہباز بھاگل پوری کے نام سے شہرت پائی۔ بہت بڑے عالم و فاضل، فقیہ و شیخ اور عابد و زاہد تھے۔ کثیر الفوائد عالم دین تھے۔ درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے ہنگامۂ اشاعت علم نے ایک دنیا کو متاثر کیا۔ مرض الموت میں بھی مصروف تدریس رہے۔ طلبا

---

❶ تجلی نور، ج ۲، ص ۸۴، ۸۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۸، ۱۶۹۔ تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۲۳۸، ۲۳۹۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷۔

اردگرد بیٹھے مشکوٰۃ پڑھ رہے تھے اور آپ حالت مرض میں نہایت انہماک و توجہ سے درس دے رہے تھے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر مشکوٰۃ کے درس سے فارغ ہوئے اور ادھر روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ یہ جمعرات ۱۶/ صفر ۱۰۵۰ھ/ ۲۸/ مئی ۱۶۴۰ء کا واقعہ ہے۔ ایک روایت کے مطابق ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء کو وفات پائی۔ لیکن پہلی تاریخ وفات زیادہ قرین صحت اور لائق اعتنا ہے (1)۔

## ۱۱۱۔ سید شیخ بن عبداللہ حضرمی

سید شیخ کا نسب نامہ یہ ہے: شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس یمنی حضرمی۔ استاذ وقت، عالم کبیر، محدث عصر، فقیہ نامدار اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء کو موضع تریم میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور بعض دیگر علوم پڑھے۔ اپنے والد مکرم علامہ عبداللہ حضرمی کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے اور ان سے بہت سے علوم حاصل کیے۔ پھر دیگر علما سے استفادہ کرنے لگے۔ مشہور فقہائے عصر سے فقہ کی تحصیل کی۔ اخذ علم کے لیے یمن، شحر، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عدن وغیرہ مختلف بلاد و امصار کے مشاہیر اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ کسب طریقت کے لیے بھی بعض مشائخ وصوفیا کے دروازے پر دستک دی۔ ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء میں داخل ہند ہوئے اور بعض علما و شیوخ سے کسب علم اور اخذ فیض کیا۔ پھر عازم دکن ہوئے۔ وہاں وزیر ملک عنبر اور سلطان دکن نظام شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کی علمی قابلیت اور فضل و کمال سے بہت متاثر ہوئے۔ وزیر اور سلطان مذکور نے انھیں بڑی عزت و تکریم سے نوازا۔ دکن میں تشنگان علوم کی بہت بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا اور پورے ملک میں احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ لیکن بعض حاسدوں کو اس سے بڑا دکھ پہنچا اور انھوں نے وزیر اور سلطان کے پاس جا جا کر شیخ کے بارے میں ایسی باتیں کہیں کہ شیخ وہاں سے نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔

اب انھوں نے دکن سے رخت سفر باندھا اور بیجاپور چلے گئے۔ بیجاپور میں سلطان ابراہیم عادل شاہ دادِ حکمرانی دیتا تھا۔ وہ شیخ کی گفتگو اور علم و فضل سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے ان کی بے حد عزت افزائی کی اور انتہائی تعظیم سے پیش آیا۔ اپنے حدودِ مملکت میں ہر جگہ ان کے لیے قدر و منزلت کی فضا پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہاں گئے، تکریم و اکرام کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ سلطان ان کی اصابت رائے کا اس درجہ قائل تھا کہ ہر معاملے میں ان سے مشورہ لیتا اور ان کی رائے کے بغیر کوئی اہم قدم نہ اٹھاتا۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ کے نزدیک شیخ کے زیادہ اکرام و اقبال کی وجہ سے ان کی ایک کرامت تھی اور وہ کرامت یہ تھی کہ سلطان کی مقعد میں ایک زخم تھا جس کی بنا پر اس کا آرام و راحت ختم ہو گیا تھا اور اٹھنے بیٹھنے میں سخت دشواری ہوتی تھی۔ اس کے علاج سے اطبا عاجز آ گئے تھے۔ سید علی بن اسد اللہ گجراتی بیجاپوری

(1) درمنثور۔ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص۱۶۹۔

المعروف بہ محمد علی (متوفی ۵؍ ذی القعدہ ۱۰۷۰ھ/ ۳؍ جولائی ۱۶۶۰ء) نے کسی وجہ سے بددعا کی تھی کہ اس کا زخم درست نہ ہو۔ مگر جب سید شیخ بن عبداللہ حضرمی بیجاپور آئے اور انھوں نے سلطان کو اس حالت میں دیکھا تو سیدھا بیٹھنے کا حکم دیا۔ سلطان اسی وقت بیٹھ گیا اور بالکل تندرست ہو گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلطان ابراہیم شیعی المسلک تھا۔ شیخ اس کو تبلیغ کرتے رہے، حتیٰ کہ اس نے مسلک اہل سنت اختیار کر لیا۔ جب باشندگان ملک نے یہ دیکھا کہ سلطان کو شیخ سے عقیدت پیدا ہو گئی ہے تو وہ ان سے حسد کرنے لگے اور ان کے درپے آزار ہو گئے۔

شیخ موصوف نے بڑی عمدہ کتابیں جمع کی تھیں اور بے شمار مال و دولت اکٹھا کیا تھا۔ وہ اس مال سے حضر موت میں بلند و بالا عمارت تعمیر کرنا، باغات لگانا اور متعدد اوقاف قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ مگر وقت نے ان کو مہلت نہ دی اور اس کے لیے جو رقم انھوں نے ارسال کی تھی، وہ سمندر میں غرق ہو گئی۔

شیخ موصوف سلطان ابراہیم عادل شاہ کی زندگی میں اسی کے پاس مقیم رہے۔ اس کی وفات کے بعد دولت آباد تشریف لے گئے۔ وہاں کے وزیر فتح خان بن ملک عنبر نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اپنے مقربین کی جماعت میں شامل کیا۔ وہ تادم وفات یعنی ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۲ء تک نہایت احترام و اعزاز سے وہیں مقیم رہے۔ ان کی قبر دولت آباد کے قرب و جوار میں ہے ❶۔

## ۱۱۲۔ مولانا شیر محمد برہان پوری

مولانا شیر محمد حسنی حسینی قادری برہان پوری معروف عالم و فقیہ تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے ایام ولایت میں جب وہ ولایت دکن کے منصب پر فائز تھے، اس سے منسلک ہوئے اور سفر و حضر میں کبھی اس سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ آخر عمر میں برہان پور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی اولاد سے تھے۔ ایک روایت کے مطابق یکم محرم ۱۰۹۰ھ/ ۳؍ فروری ۱۶۷۹ء کو اور ایک کے مطابق ۱۰۸۲ھ/ ۱۶۷۱ء کو وفات پائی۔ قبر برہان پور میں ہے ❷۔

## ص

## ۱۱۳۔ شیخ صبغۃ اللہ بیجاپوری

شیخ صبغۃ اللہ بن حبیب اللہ بن احمد بن خلیل بیجاپوری۔ بیجاپور ان کا مولد و منشا تھا۔ اپنے والد گرامی شیخ

❶ النور السافر۔ المشروع الروی۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۱، ۱۷۲۔

❷ شاہ جہان نامہ، ج ۳، ص ۳۷۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۲۔ تاریخ برہان پور، ص ۱۴۳، ۱۴۲۔

حبیب اللہ بیجاپوری سے اخذ علم کیا اور اس دور کے عالم وفقیہ گردانے گئے۔ بعد ازاں طریقت سے لگاؤ پیدا ہوا تو کسب طریقت بھی والد ہی سے کیا اور مرتبہ کمال کو پہنچے۔ ۱۰۴۱ھ/۱۶۳۱ء میں والد نے وفات پائی تو ان کی جگہ مسند مشیخت پر متمکن ہوئے اور عظمت وقبولیت سے نوازے گئے۔ شیخ صبغۃ اللہ نے ۲۰ رجب ۱۰۷۰ھ/۲۲ مارچ ۱۶۶۰ء کو بیجاپور میں انتقال کیا❶۔

## ۱۱۴۔ مفتی صدر جہان پھانوی کیتھلی

مفتی صدر جہان کا سلسلہ نسب یہ ہے: صدر جہان بن عبدالمقتدر بن شاہین بن محمد بن سراج الدین بن تاج الدین بن علیم الدین بن کمال الدین حسینی ترمذی کیتھلی ثم پھانوی۔ موضع پھانی میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں قنوج کے قریب ایک گاؤں تھا۔ نشوونما بھی وہیں ہوئی۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے گھر سے نکلے۔ شیخ نظام الدین حسینی خیر آبادی اور دیگر علمائے عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ پھر شیخ عبدالنبی گنگوہی کے حلقہ درس میں داخل ہوئے اور ان سے سند حدیث لی۔ ان ہی کی سعی وسفارش سے لشکر شاہی میں مسند افتا پر فائز ہوئے۔ پھر انھیں اکبری عہد ۹۹۴ھ/۱۵۷۶ء میں حاکم توران کے پاس بھیجا گیا اور ہندوستان واپس آئے تو عہدۂ صدارت پر متمکن کیے گئے۔ دیار ہند کے معروف فقیہ اور عالم دین تھے۔

بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے انھیں جہاں گیر کا اتالیق مقرر کیا اور جہاں گیر نے ان سے چالیس حدیثیں حفظ کیں۔ جب وہ خود سریر آرائے مملکت ہوا تو ان کے منصب میں اضافہ کر دیا۔ یہاں تک کہ چار ہزاری منصب کو پہنچے۔ قنوج کے نواح میں جہاں گیر نے انھیں جاگیر بھی عطا کی اور اپنے عہد صدارت میں صرف پانچ سال کے عرصے میں اس درجہ انعام واکرام سے نوازے گئے کہ ان سے پہلے پچاس سال کے عرصے میں کسی صدر کو یہ مقام نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک سو بیس سال تک زندہ رہے لیکن ہوش وحواس اور قوائے جسمانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بالکل صحیح سلامت تھے۔

خوش مزاج، بامذاق اور حسن طبع کے مالک عالم دین تھے۔ شاعر بھی تھے لیکن بہت کم شعر کہتے تھے۔

جس زمانے میں اکبر بادشاہ دین حق سے منحرف اور علمائے حق سے ذہنی وفکری اعتبار سے دور ہو گیا تھا اور علما کو حجاز اور دور دراز علاقوں میں چلے جانے کے احکام صادر کر رہا تھا، اس دور میں ایک روز صدر جہان نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کسی دن مجھے بھی جلا وطن کر دیا جائے گا اور میرا شمار بھی ان لوگوں میں ہونے لگے گا، جنھیں ملک بدر یا علاقہ بدر کیا جا رہا ہے۔

اس وقت نظام الدین ہروی بھی موجود تھے، انھوں نے صدر جہان کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو کہا آپ نے بادشاہ کے حضور کبھی کلمہ حق نہیں کہا۔ آپ کو بھلا کیوں جلا وطن کیا جائے گا۔

---

❶ [illegible] ب ذی المعن۔ نزہۃ الخواطر، ج۵، ص ۱۷۷، ۱۷۸ء

صدر جہاں کے اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے:

ہر تار زلفِ یار الٰہی بلا شود   وانگہ بہر بلا دل ما مبتلا شود

انھوں نے ایک سو بیس سال عمر پائی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں ایک روایت کے مطابق ۱۲۰۷ھ/ ۱۶۱۸ء میں فوت ہوئے۔ قبر موضع پھانی میں ہے❶۔

## ـــ ض ـــ

## ۱۱۵۔ مولانا ضیاء الدین جون پوری

مولانا ضیاء الدین پھول پوری جون پوری تفسیر، حدیث اور دیگر علوم کے ماہر اور شیخ وقت تھے۔ صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری (متوفی ۹ر رمضان ۱۰۸۳ھ/۱۹ر دسمبر ۱۶۷۲ء) کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ دیگر علمائے عصر سے بھی تحصیل کی تھی۔ بعد کو سنبھل چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شادی بھی وہیں کی اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ غالباً ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء کے بعد فوت ہوئے۲۔

## ۱۱۶۔ شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی

شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی شیخ محمد غوث شطاری گوالیاری کے بیٹے تھے۔ صغرسنی ہی میں گجرات چلے گئے تھے۔ وہاں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء) کی مسند تدریس آراستہ تھی، ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ شیخ محمد بن طاہر پٹنی گجراتی (متوفی ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء) کا سلسلہ درس بھی جاری تھا، ان سے علم حدیث کی تحصیل کی اور دس سال ان کی خدمت میں رہے۔ وہیں ان کے والد شیخ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ/ ۱۵۶۳ء) نے ان کو خرقہ خلافت بھیجا۔ والد کی وفات کے بعد (۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء ہی) میں گوالیار کو مراجعت کی اور خاصا عرصہ وہاں مقیم رہے۔ پھر اکبر آباد (آگرہ) منتقل ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے پینتیس سال علم و معرفت کے نشر و ذیوع میں صرف کیے۔

منتخب التواریخ کے مصنف ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی سے ملاقات کی تھی اور اپنی کتاب (منتخب التواریخ) میں بڑے دلچسپ انداز سے اس ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کا تعارف بھی کرایا ہے۔ لکھتے ہیں:

شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں۔ تصوف میں ان کا ایک خاص انداز بیان ہے جو

❶ سرور آزاد۔ منتخب التواریخ، ص ۶۲، ۴۶۳۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۹۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۸، ۱۷۹۔

❷ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۴۹۷، بحوالہ شگرف۔ ج ۲، ص ۹۹۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۸۲، ۱۸۳۔

صوفیا میں کم ہی کسی دوسرے کا ہوگا۔ ان کی مجلس میں ہمیشہ معرفت و حقیقت کے موضوع پر سلسلہ گفتگو جاری رہتا اور مسئلہ توحید سے متعلق باتیں ہوتیں۔ ان کے باطن کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کون سا جذبہ اور داعیہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے۔ پہلے پہل جب ان کے کمالات و فضائل کی شہرت پھیلی تو معلوم ہوا کہ اپنے باپ شیخ محمد غوث کی مسند فقر و ارشاد کے جانشین ہو گئے ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے تو باپ پر فضیلت رکھتے ہیں۔ شیخ ممدوح قرآن مجید کے حافظ تھے اور اس کی تفسیر و تشریح میں کسی تفسیر سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء میں ان سے ملاقات کے لیے میں آگرہ گیا تو ان کے کسی واقف یا تعلق والے کو ذریعہ بنائے بغیر بے تکلفی سے جس کا میں مدت سے عادی تھا، ان کے پاس پہنچ گیا اور السلام علیکم کہہ کر مصافحہ کیا۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ بزرگوں سے ملاقات کے لیے دنیوی تکلفات برتے جائیں تو حصول مقصد میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن ادھر حال یہ تھا کہ شیخ کی محفل میں تعظیم و تکریم کے خاص آداب و مراسم تھے جن کو ملحوظ رکھا جاتا تھا، لہٰذا ان کو میری یہ بے تکلفی اور سادگی پسند نہ آئی۔ یہ دیکھ کر اہل محفل نے مجھ سے پوچھا:

''تم کہاں سے آئے ہو؟''

میں نے جواب دیا: ''سہسوان سے!''

پھر سوال کیا: ''کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟''

عرض کیا: ''کچھ عرصہ ہوا، ہر فن کی کچھ نہ کچھ تحصیل کی تھی۔''

اس کے بعد ملا عبدالقادر لکھتے ہیں:

سہسوان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس زمانے میں شیخ ضیاء اللہ کے والد (شیخ محمد غوث) کا مرید قلیج چوگان بیگ جاگیردار وہاں مقیم تھا، اس لیے شیخ نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور طنز و استہزا کرنے لگے۔ ایک مسخرے کو اشارہ کیا کہ باتوں باتوں میں مجھے ذہنی طور سے پریشان کر کے مجلس سے نکال دیا جائے۔ لیکن میں مشائخ کی اس قسم کی اداؤں کو خوب جانتا تھا اور بارہا ایسے مواقع پیش آ چکے تھے لہٰذا میں ان کی اس نوع کی حرکتوں سے بظاہر انجان بنا رہا اور بدستور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اب وہ مسخرہ زیادہ مذاق اور ہزل پر اتر آیا اور بولا۔

''کہیں سے عطر کی مہک آ رہی ہے، جس سے میرا دماغ ابلنے اور جوش کھانے لگا ہے۔ اہل محفل ہوشیار رہیں، کسی کو میرے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔''

اس کے بعد وہ منہ سے جھاگ نکالنے لگا۔ یہ دیکھ کر شیخ کا ایک صوفی نما مصاحب مجھ سے مخاطب ہوا اور پوچھا:

''یہ اتنا عمدہ عطر کیا تم نے لگا رکھا ہے؟''

میں نے کہا: ''ہاں! میں نے لگا رکھا ہے، لیکن بات کیا ہے؟''

اس نے کہا:

''یہ جو باؤلا شخص ہے، اس کو کسی زمانے میں کتے نے کاٹ کھایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب خوشبو سونگھ لیتا ہے تو اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے اور کتے کی طرح بھونکتے ہوئے لوگوں کو کاٹنے کو دوڑتا ہے، آپ ذرا ہوشیار رہیے۔''

اس سے حاضرین مجلس کچھ پریشان سے ہوگئے۔ شیخ بھی مجھے خوف زدہ کرنے کی غرض سے جان بوجھ کر کچھ دور ہٹ گئے اور اس طرح ان انسان نما شیطانوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ یہ حرکت دیکھ کر میں نے کہا:

''بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ اس بارگاہ عالی پر لوگ دور دراز سے اپنی حاجت برآری کے لیے آتے ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ ایک سگ گزیدہ دیوانے کا علاج نہیں ہوسکتا۔''

انھوں نے کہا: ''کیا تم اس کا علاج جانتے ہو؟''

میں نے کہا: ''ہاں! جانتا ہوں۔''

پوچھا: ''کیا علاج ہے؟''

میں نے جواب دیا: ''اس کے سر پر ڈھیلے اور جوتے مارے جائیں تو یہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے: ''سگ دیوانہ را دارو کلوخ است۔'' (باؤلے کتے کا علاج ڈھیلا ہے) پھر میں نے کہا۔ کلوخ ایک بوٹی کا نام بھی ہے، جو سگ گزیدہ کی ایک مؤثر دوا ہے۔''

شیخ نے جب یہ دیکھا کہ یہ حیلہ کارگر ثابت نہیں ہوا تو کہا: ''آؤ اللہ اور اس کے رسول کے ذکر میں مشغول ہو جائیں۔''

اب انھوں نے قرآن مجید کھولا اور سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی تفسیر شروع کر دی اور ایسی باتیں کرنے لگے کہ جن کا اس آیت کے اصل مفہوم سے کوئی تعلق نہ تھا، مگر ان کے جاہل شاگرد ہر الٹی سیدھی بات پر امنا و صدقنا کے نعرے لگا رہے تھے۔ میرا دل تو ان کی طرف سے پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر شیخ کو ٹوک دیا اور پوچھا:

''یہ مطلب جو آپ بیان کر رہے ہیں، قرآن کی کسی تفسیر میں بھی مرقوم ہے؟''

بولے: ''میں تو یہ تاویل و اشارہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ مضمون بہت وسیع ہے۔''

میں نے کہا: ''اچھا تو پھر بتایئے کہ یہ مطلب حقیقی ہے یا مجازی؟''

کہا: ''مجازی۔''

میں نے پھر سوال کیا: ''ان دو (حقیقی اور مجازی) مطلبوں میں کون سا علاقہ ہے؟''

اس سوال سے میں نے ان کو علم بیان کی بحث میں الجھا دیا۔ اب وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے۔ جب میں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو اپنی جگہ سے اکھڑ گئے۔ قرآن مجید رکھ دیا اور بولے:

"میں نے علم مجادلہ نہیں پڑھا ہے۔"

میں نے کہا: "آپ قرآن مجید کا ایسا مطلب بیان کر رہے ہیں، جو کسی تفسیر میں منقول نہیں ہے۔ لامحالہ آپ سے حقیقی اور مجازی مطالب کا باہمی ربط و علاقہ دریافت کیا جائے گا۔"

جب شیخ نے دیکھا کہ کسی طرح بات بنانا مشکل ہے تو گفتگو کا رخ بدلا اور میرا حال احوال پوچھنا شروع کر دیا۔ میں نے ان ہی دنوں قصیدہ بردہ کی شرح لکھی تھی۔ اس کا ایک باب ان کے سامنے رکھ دیا اور قصیدہ کے مطلع کے سلسلے میں جو نکات میرے ذہن میں محفوظ تھے، بیان کیے۔ شیخ نے بڑی تعریف کی اور خود بھی اس کے متعلق چند نکتے بتائے:

اس سے آگے ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ شیخ ضیاء اللہ اکبرآبادی سے پہلی ملاقات کا انداز تو یہ تھا۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی، جب میں اکبر بادشاہ کے حلقہ ملازمت میں داخل تھا اور شیخ موصوف بادشاہ کی دعوت پر تنہا عبادت خانہ شاہی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور حیران و پریشان تھے۔ ملا عبدالقادر بدایوانی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

جمعے کا دن تھا، بادشاہ دو آدمیوں کے ساتھ عبادت خانے میں گیا۔ اس نے میرزا غیاث الدین، علی اخوند، میرزا اخوند اور میرزا علی آصف خاں کو پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ شیخ ضیاء اللہ کو بحث و تمحیص میں الجھا کر تصوف کے بارے میں کچھ باتیں دریافت کریں اور دیکھیں کہ شیخ علمی لحاظ سے کتنے پانی میں ہیں۔ چنانچہ میرزا علی آصف خان نے گفتگو کا آغاز کیا اور مولانا جامی کی لوائح کی یہ رباعی پیش کی:

گر در دل تو گل گزر دو گل باشی     در بلبل بے قرار بلبل باشی
تو جزئی و حق کل است اگر روزی چند     اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اور پوچھا:

"اللہ تعالیٰ کو "کل" کس طرح کہا جا سکتا ہے، جب کہ وہ "جز" اور "کل" ہونے سے بالا و برتر ہے۔"

شیخ تباہ حالی اور پریشانی کے بعد دربار شاہی میں آئے تھے۔ ان کا غرور و پندار خاک میں مل چکا تھا اور بڑی مصیبتیں جھیل چکے تھے۔ نہایت عجز اور ندامت کی کیفیت طاری تھی، اس لیے دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کیں جو کسی کو سمجھ میں نہ آئیں۔

ملا بدایوانی لکھتے ہیں:

یہ صورت حال دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور جرأت کر کے کہا کہ مولانا جامی رحمہ اللہ نے اس رباعی میں اگرچہ اللہ تعالیٰ پر "کل" ہونے ہی کا اطلاق کیا ہے لیکن ایک اور رباعی میں جزئیت بھی بیان کی ہے:

ایں عشق کہ ہست جز لاینفک ما     حاشا کہ شود بہ عقل ما مدرک ما
خوش آنکہ دمد پرتوی از نور یقین     مارا برہاند از ظلام شک ما

لیکن اس "کل" اور "جز" کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جز ہو یا کل (ہمہ اوست) سب کچھ وہی

ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی وجود، حقیقت میں نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کی اصل حقیقت کو عبارت اور الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اس کی تعبیر کبھی کل سے کی جاتی ہے اور کبھی جز سے کی جاتی ہے۔

اس سے آگے بدایوانی لکھتے ہیں کہ پھر میں نے وحدت الوجود کو ثابت کرنے کے لیے مزید چند مسائل، جن پر میں نے ان دنوں عبور حاصل کیا تھا، شیخ کی طرف سے تائیداً بیان کیے۔ میری اس تقریر سے بادشاہ بھی بہت خوش ہوا اور شیخ بھی بڑے محظوظ ہوئے۔

بہر حال شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی ایک باوقار اور بارعب عالم تھے۔ اسلوب زندگی درویشانہ تھا، تفسیر، حدیث، تصوف اور اقوال صوفیا اپنے خاص انداز میں بیان کرتے تھے، جس کا بعض دفعہ اصل الفاظ سے زیادہ تعلق نہ ہوتا۔ آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں ان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور عوام و خواص میں قبولیت حاصل تھی۔ ۳ رمضان ۱۰۰۵ھ/ ۱۰ اپریل ۱۵۹۷ء کو فوت ہوئے [1]۔

## ط

# ۱۱۷۔ علامہ طاہر سندھی برہان پوری

علامہ طاہر بن یوسف بن رکن الدین بن معروف بن شہاب الدین سندھی، شیخ وقت اور عالم کبیر تھے۔ حدیث اور فقہ کے جید عالم تھے۔ دسویں صدی ہجری کی دوسری دہائی کے کسی سال سندھ کے ایک قریہ پاتری میں پیدا ہوئے، جو انہی کے جد بزرگ وار کا آباد کردہ تھا۔ صغر سنی ہی میں اپنے والد (شیخ یوسف) اور بڑے بھائیوں (طیب اور قاسم) کے ہمراہ سفر کا اتفاق ہوا، اور شیخ شہاب الدین سندھی کی خدمت میں حاضری دی۔ شیخ نے منطق کی معروف کتاب شرح شمسیہ پڑھنا چاہی مگر شیخ شہاب الدین نے اس کتاب کو اپنی طبیعت کے مطابق حال نہ سمجھ کر پڑھانے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے امام غزالی کی منہاج العابدین پڑھانے لگے۔ پھر ۹۵۰ھ/ ۱۵۴۳ء میں عازم گجرات ہوئے اور شیخ عبدالاول بن علی حسینی جون پوری دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل کی اور سند حدیث لی۔ طریقت و تصوف میں شیخ محمد غوث گوالیاری سے استفاضہ کیا۔ بعد ازاں احمد آباد اور بلاد دکن کا عزم فرمایا۔ وہاں شیخ ابراہیم بن محمد ملتانی سے اخذ علم کیا۔ پھر ایلچ پور کی راہ لی اور ایک مدت تک وہاں اقامت اختیار کیے رکھی۔ وہاں سے عازم برہان پور ہوئے اور اس تعلق کی بنا پر برہان پوری کہلائے۔

علامہ طاہر سندھی تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے اور کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے جو حسب ذیل ہیں:

مجمع البحرین: قرآن مجید کی تفسیر ہے، جس میں صوفیا کے ذوق و مشرب کی جھلک نمایاں ہے۔

[1] منتخب التواریخ کے علاوہ مآثر الامرا میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے۔

مختصر قوت القلوب للمکی: ابو طالب کی قوت القلوب کا اختصار۔

منتخب مواہب اللدنیہ للقسطلانی: حافظ ابن حجر قسطلانی کی مواہب اللدنیہ کا انتخاب۔

مختصر تفسیر المدارک: قرآن مجید کی تفسیر المدارک کا اختصار، جو اپنے دو بیٹوں عبداللہ اور رحمت اللہ کے لیے کیا۔

تلخیص شرح اسماء رجال البخاری للکرمانی: شارح صحیح بخاری کرمانی کی شرح اسماء رجال البخاری کی تلخیص۔

ملتقط جمع الجوامع للسیوطی۔

ریاض الصالحین: یہ ایک مفید کتاب ہے اور تین روضات پر مشتمل ہے۔ روضہ اول احادیث صحیحہ پر محیط ہے۔ روضہ ثانی مقالات صوفیا کو محتوی ہے جن میں شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی، ابو طالب مکی (صاحب قوت القلوب) شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ زین الدین خافی اور شیخ علی متقی ایسے اکابر صوفیا و علما شامل ہیں۔ روضہ ثالث ملفوظات اہل توحید کو متضمن ہے۔

ان کی تصنیفات میں جمع البحرین قرآن مجید کی تفسیر ہے جو صوفیا کے انداز بیان کے مطابق ہے۔ یہ تفسیر عربی زبان میں ہے۔ ذیل میں اس کے ایک حصے کا اردو ترجمہ دیا جاتا ہے تاکہ اس کے نہج و اسلوب کا پتا چل سکے۔

قرآن کی آیت فی قلوبهم مرض (ان منافقین کے دلوں میں بیماری ہے) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: مرض دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حقیقی اور ایک مجازی۔ حقیقی مرض کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ جسم کو لاحق ہو جاتا ہے تو اس کو اعتدال و توازن کے دائرے سے باہر نکال دیتا ہے اور مریض کے افعال و حرکات میں خلل انداز ہوتا ہے۔

مرض مجازی اس کیفیت سے تعبیر ہے جو اعراض نفسانی کو پیش آتی اور ان کے کمال میں خلل ڈالتی ہے۔ مثلاً جہالت، سوئے عقیدہ، کج فہمی اور ترغیب معصیت وغیرہ۔ یہ تمام مجازی امراض ہیں، اس لیے کہ یہ چیزیں یا تو انسان کے حد فضائل تک پہنچنے میں مانع ہوتی ہیں یا پھر اس کو حقیقی اور ابدی حیات کے زائل ہونے کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں اور قرآن کی اس آیت میں یہی مجازی معنی مراد ہیں۔ کیوں کہ منافقین کے ہاتھوں سے مدینہ منورہ کی جو سیادت نکل گئی تھی، وہ ہر وقت اس کے غم میں مبتلا رہتے تھے، اور یہ گویا ان کے دلوں میں ایک مرض تھا جو ہر لحہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ پھر آئے دن رسول اللہ ﷺ کے اثر و رسوخ کا جو دائرہ وسیع ہو رہا تھا اور آپ کی عزت و شان بڑھ رہی تھی، اس سے وہ حسد کرتے تھے اور ان کے دل اس صورت حال سے سخت الم و تکلیف محسوس کرتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ ان کے مرض یا الم کو اللہ تعالیٰ نے اور زیادہ کر دیا۔ جیسے جیسے رسول اللہ ﷺ کے احکام پھیلتے جاتے تھے اور آپ کی عزت و شان میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، اسی نسبت سے حضور ﷺ

سے اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منافقین کی عداوت اور دشمنی بڑھتی جاتی تھی۔

اس سے آگے تفسیر رحمانی کے حوالے سے علامہ سندھی لکھتے ہیں کہ: **فی قلوبھم مرض** کا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے دلوں میں قوت حکمیہ کی کمی اور قوت شہوانیہ کی کثرت ہے۔

بہر حال علامہ طاہر کی تفسیر مجمع البحرین خالص متصوفانہ اسلوب کی حامل ہے۔ اس میں امام غزالی کی احیاء علوم الدین اور دیگر کتب تصوف کے کثرت سے حوالے دیے گئے ہیں۔

علامہ ممدوح نے ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء میں وفات پائی [1]۔

## ۱۱۸۔ شیخ طیب بلگرامی

شیخ طیب بن عبدالواحد حسینی واسطی بلگرامی اتوار کے روز ۹ ربیع الثانی ۹۸۶ھ/۱۵ جون ۱۵۷۸ء کو پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ عبدالواحد سے علم حاصل کیا اور اونچے درجے کو پہنچے۔ شیخ وقت اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ اکثر شیخ عبدالحق دہلوی کے پاس دہلی جاتے، مختلف مسائل میں ان سے تبادلہ خیال کرتے اور کتب درسیہ کے مشکل مقامات کے حل و توضیح میں ان سے مستفید ہوتے۔ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ تفسیر و فقہ میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تفسیر بیضاوی اور ہدایہ پر تعلیقات سپرد قلم کیں۔ نہایت عابد و زاہد اور متقی بزرگ تھے۔ بدو شعور سے لے کر وفات تک کبھی ان سے نماز کا وقت فوت نہیں ہوا۔ ۵ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ/۲۳ دسمبر ۱۶۵۵ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے [2]۔

## ۱۱۹۔ شیخ طیب بنارسی

شیخ طیب کا سلسلہ نسب یہ ہے: طیب بن معین بن حسن بن داؤد بن خلیل عمری بنارسی۔ ارض ہند کے متقی اور پرہیزگار علما میں سے تھے۔ چھوٹی عمر ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور چچا نے اپنی گود تربیت میں لے لیا تھا۔ قرآن مجید اور درسیات کی ابتدائی کتابیں گھر میں پڑھیں۔ علم صرف اور علم نحو کی تکمیل شیخ نظام الدین بنارسی کے مدرسے میں کی۔ پھر جون پور کا قصد کیا، جس کو اس زمانے میں علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں شیخ نور اللہ بن طٰہ جون پوری کا سلسلہ درس جاری تھا، ان سے شرح وقایہ اور حسامی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ پھر اپنے وطن بنارس گئے اور شادی کی۔ تین سال وہاں رہے۔ بعد ازاں پھر جون پور کا عزم کیا اور فقہ و اصول کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس مرتبہ ایک سال جون پور میں قیام رہا۔ اب کے شیخ خواجہ کلاں بن نصیر الدین جھونسوی سے بھی ملاقات کی اور ان سے بیعت ہوئے۔ جون پور سے پھر بنارس گئے اور بعض

---

1. تفصیل کے لیے دیکھیے: اذکار ابرار، ص ۴۲۶ تا ۴۳۳۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۸۵ تا ۱۸۹۔
2. مآثر الکرام، ص ۴۴ تا ۴۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۸۹، ۱۹۰۔ تقصار جنود الاحرار، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔

امرائے حکومت کے حلقہ ملازمت میں داخل ہوگئے۔ ایک عرصہ تک ملازمت کا سلسلہ جاری رہا۔ بعدازاں اس سے علیحدگی اختیار کرلی اور شیخ پورہ وغیرہ میں دس سال تک بعض علما و مشائخ سے استفادہ کرتے رہے۔ پھر بنارس گئے۔ کئی سال منڈواڈیہ میں بھی اقامت اختیار کیے رکھی۔

شیخ طبیب بنارسی عابد و زاہد، متقی و متورع اور بلند اخلاق وخوش مزاج عالم دین تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑے تیز تھے۔ سلوک میں سلسلہ قادریہ سے منسلک تھے اور اس ضمن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے شرف اجازہ حاصل تھا۔ ابتدا میں سماع بھی کرتے تھے لیکن بعد کو اسے ترک کر دیا تھا۔ رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ر رمضان ۱۰۸۳ھ/ ۱۹ر دسمبر ۱۶۷۲ء) شیخ یٰسین بن احمد بنارسی (ولادت ۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۳ء) اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

اس عالم دین نے ۸ر شوال ۱۰۴۲ھ/ ۸ر اپریل ۱۶۳۳ء کو وفات پائی اور منڈواڈیہ میں دفن کیے گئے ❶۔

## ۱۲۰۔ قاضی طیب عباسی موی

قاضی طیب کا سلسلہ نسب یہ ہے: قاضی طیب بن قاضی قطب الدین محمد درویش بن محمد افضل بن عاشق محی الدین عباسی چریاکوٹی۔ قاضی طیب، گیارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور فتح پور کے منصب قضا پر متمکن تھے۔ پھر الٰہ آباد (یوپی) سے دس میل دور ایک جگہ کو مسکن ٹھہرایا اور اسے تعمیر کیا۔ یہ وہی جگہ ہے جو مؤ قاضی طیب کے نام سے معروف ہے اور الٰہ آباد کے نواح میں اچھا خاصا بارونق شہر ہے ❷۔

## ع

## ۱۲۱۔ شیخ عباس برہان پوری

شیخ عباس بن نصیر الدین بن سراج محمد برہان پوری، علم و معرفت میں مرتبۂ بلند پر فائز اور یگانہ روزگار فقیہ تھے۔ مغل حکمران شاہ جہان ان سے بہت متاثر تھا اور انھیں دارالسلطنت دہلی میں لے آیا تھا۔ وہ ان سے نہایت احترام سے پیش آتا تھا اور اس کے نزدیک انھیں انتہائی قبولیت حاصل تھی۔ بعدازاں بادشاہ نے انھیں اپنے شہر جانے کی اجازت دے دی تھی اور وہ سب سے منقطع ہو کر گھر میں بیٹھ گئے تھے ❸۔

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۰، ۱۹۱ بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۱۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۳ بحوالہ تحفۃ الکرام۔

# ۱۲۲۔ شیخ عبدالاحد سرہندی

شیخ عبدالاحد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے والد تھے۔ ان کا سلسلہ نسب چھبیس واسطوں سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباو اجداد کے چند اسمائے گرامی یہ ہیں: شیخ عبدالاحد بن زین العابدین بن عبدالحی بن محمد بن حبیب اللہ بن رفیع الدین عمری سرہندی۔ حضرت شیخ اونچے مرتبے کے ہندی عالم وفقیہ تھے۔ مشرقی پنجاب کے ضلع پٹیالہ کے معروف شہر سرہند میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ کچھ عرصہ وہیں تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں گنگوہ گئے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے استفادہ کیا اور ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ انھوں نے انکار فرمایا اور علوم مروجہ وفنون متعارفہ کی تکمیل کا حکم دیا۔ واپس سرہند آئے اور حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ تمام علوم میں مہارت پیدا کی اور فتویٰ وتدریس کے قابل ہو گئے۔ لیکن ابھی علوم کی تکمیل نہ کر پائے تھے کہ شیخ عبدالقدوس انتقال فرما گئے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف بلاد وامصار کا سفر کیا، مختلف مشائخ وعلما سے ملے اور ان سے مستفیض ہوئے۔ بعدازاں گنگوہ کا عزم فرمایا اور شیخ عبدالقدوس کے لڑکے شیخ رکن الدین گنگوہی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں گزارا۔ ۹۷۹ھ/ ۱۵۷۱ء میں شیخ رکن الدین گنگوہی نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور اپنے شہر سرہند واپس آ گئے۔ وہاں درس وافادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

شیخ عبدالاحد معقول ومنقول میں ماہر اور فنون میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ بالخصوص فقہ، اصول فقہ اور تصوف میں یگانۂ عصر تھے۔ چند کتابوں کے مصنف بھی تھے، جو اس دور کے مذاق کے مطابق متصوفانہ نوعیت کی حامل تھیں۔

شیخ عبدالاحد نے ۱۷ رجب ۱۰۰۷ھ/ ۳ فروری ۱۵۹۹ء کو اسی (۸۰) سال عمر پا کر سرہند میں وفات پائی❶۔

# ۱۲۳۔ علامہ عبدالباقی جون پوری

علامہ عبدالباقی بن غوث الاسلام صدیقی جون پوری، اپنے عصر کے جلیل القدر عالم تھے۔ منطق اور فلسفہ میں بالخصوص اس دور کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ شمس البازغہ کے مصنف شہیر علامہ محمود جون پوری (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/ ۹ فروری ۱۶۵۲ء) کے شاگرد تھے۔

علامہ ممدوح کی وفات کے بعد جون پور کی مسند تدریس پر فائز ہوئے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے ان کے علم وفضل سے متاثر ہو کر ان کو بطور انعام ایک گاؤں عنایت کیا، جس کی جمع بندی کی آمدنی آٹھ یا نو سو روپے

❶ حالات کے لیے دیکھیے زبدۃ المقامات۔ اذکار ابرار۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ وغیرہ۔

سالانہ تھی اور یہ اس دور کی بہت بڑی آمدنی تھی۔

علامہ عبدالباقی نے ماہ رمضان ۱۰۶۰ھ/ستمبر ۱۶۵۰ء میں آداب الباقیہ کے نام سے فن مناظرہ کی مشہور کتاب شریفیہ کی شرح سپرد قلم کی۔ اس کا آغاز: سبحانك یا مجیب دعاء المسلمین بلا مانع ومعارض......الخ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ شریفیہ کی ایک اور شرح بھی لکھی، جس کا نام ابحاث الباقیہ ہے۔ یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک علمی اور فنی کتاب ہے۔

ابحاث الباقیہ انھوں نے اپنے استاذ علامہ محمود جون پوری کے حکم سے لکھی تھی، جیسا کہ اس کے مقدمے میں وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں شیخ محمد رشید جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ/ ۱۹ دسمبر ۱۶۷۲ء) کی فن مناظرہ کی معروف تصنیف رشیدیہ کے بارے میں بعض دقیق مباحث ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

علامہ عبدالباقی جون پوری نے جلوس عالم گیری کے چودھویں سال وفات پائی، جو ۱۰۸۲ھ/ ۱۶۷۱ء کے قریب ہے[1]۔

## ۱۲۴۔ مولانا عبدالجلیل جون پوری

مولانا عبدالجلیل بن شمس الدین بن نورالدین صدیقی برونوی جون پوری عالم وفقیہ اور شیخ وقت تھے۔ ان کے والد مولانا شمس الدین بھی نامور عالم تھے، جو ان کے استاذ بھی تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالجلیل نے صاحب شمس البازغہ علامہ محمود جون پوری اور صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری سے استفادہ کیا اور فحول علمائے عصر میں سے گردانے گئے۔ پھر درس وافادہ کی مسند آراستہ کی۔ تمام عمر خدمت تدریس میں صرف کردی اور اس کے لیے کبھی روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا۔ ہمیشہ قناعت اور عفاف کی زندگی بسر کی۔ اس عالم دین نے ۸ شوال ۱۰۷۶ھ/۱۳ اپریل ۱۶۶۶ء کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے[2]۔

## ۱۲۵۔ مولانا عبدالجلیل لکھنوی

مولانا عبدالجلیل بن عمر صدیقی بیانوی ثم لکھنوی، شیخ صالح اور فقیہ زاہد تھے۔ تصوف وطریقت سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۱۶ھ/۳ اگست ۱۶۰۷ء کو فوت ہوئے[3]۔

---

[1] تجلی نور، ج ۲، ص ۶۵، ۶۶۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۵۔ بزم تیموریہ، ص ۲۵۱۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۳۴ تا ۱۳۶۔

[2] تجلی نور، ج ۲، ص ۶۵، ۶۶۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۶۸۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹۵۔ بزم تیموریہ، ص ۲۵۱۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۳۴ تا ۱۳۶۔

[3] تجلی نور، ج ۲، ص ۶۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۱۴۰، ۱۴۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۰۔

# ۱۲۶۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سرزمین برصغیر کے رفیع المرتبت محدث، عظیم الشان فقیہ، جلیل القدر عالم دین اور فقید المثال مصنف تھے۔ علوم و فنون کی تمام شاخوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ارض ہند کے اس وحید العصر بزرگ کے حالات ہم قدرے تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے آباواجداد اور خاندان کے کوائف بھی نظر و بصر کے زاویوں میں آسکیں۔

## آغا محمد ترک:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اسلاف میں ایک بزرگ آغا محمد ترک تھے جو بخارا کے باشندے تھے اور اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں جب مغلوں نے وسط ایشیا میں بربریت کا مظاہرہ کیا اور آتش و خون کا کھیل کھیلا تو آغا محمد ترک نے وہاں کے حالات سے مایوس ہو کر اپنے ہم نوا ترکوں کی بڑی جماعت کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا اور اس ملک کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ اس طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اجداد میں یہ پہلے شخص تھے جو وارد ہند ہوئے۔ اس زمانے میں تخت ہند پر سلطان علاء الدین خلجی متمکن تھا۔ اس ضمن میں شیخ خود تحریر فرماتے ہیں:

جد بزرگ ما آغا محمد ترک بخاری از بخارا در زمان عظمت نشان سلطان محمد علاء الدین خلجی در دہلی تشریف آوردہ، چوں درآں جا قبیلہ دار و سرقوم بودہ است، جماعۃ کثیر از اتراک کہ پیوند قرابت و رابطہ بیعت و خدمت بوی داشتند، نیز از وطن اصلی انتقال نمودہ در ملازمت او دریں دیار رسیدہ اند و بنظر عنایت و تربیت آں سلطان عالی مرتبت درآمدہ، باقصی مراتب شوکت و عظمت رسیدہ ❶۔

یعنی ہمارے اسلاف میں سے آغا محمد ترک بخاری اپنے وطن بخارا سے سلطان محمد علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی تشریف لائے، چوں کہ وہ بخارا میں ایک بڑے قبیلے کے فرد اور اپنی قوم کے سردار تھے، لہٰذا ترکوں کی ایک کثیر جماعت بھی جو ان سے تعلق قرابت اور رابطہ بیعت رکھتی تھی، اپنے وطن سے منتقل ہو کر ان کی خدمت میں یہاں آ گئی۔ یہاں وہ عالی مرتبت سلطان علاء الدین خلجی کی نظر عنایت اور التفات خاص کے مستحق قرار پائے اور شوکت و عظمت کے اونچے مرتبے کو پہنچے۔

ہندوستان میں سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کو انتہائی عروج کے عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہندی مسلمان اس کے دور میں علمی، سیاسی اور ثقافتی میدان میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ علمائے دین کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ آغا محمد ترک کو بھی اس نے اعلیٰ مراتب اور بلند مناصب سے نوازا۔ اس کا ثبوت اس

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۹۸، ۲۹۹۔

واقعہ سے مل سکتا ہے کہ اس زمانے میں گجرات اور اس کی بعض بندرگاہوں پر حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں، سلطان نے اس کی تسخیر کے لیے ایک فوج روانہ کی، جس میں سلطنت کے بڑے بڑے امرا شامل تھے۔ اس میں آغا محمد ترک کو بھی شامل کیا گیا۔ فتح کے بعد سلطان کے حکم سے آغا موصوف نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ لکھتے ہیں:

از برائے تسخیر ممالک گجرات وفتح بنادر آں با جماعہ از امرائے عالی شان متعین شدہ از امضا وانصرام آں مہم بحکم سلطانی ہماں جا مخیم اقامت ساخت ❶۔

(وہ چیدہ چیدہ امرا کی ایک جماعت کے ساتھ ملک گجرات اور اس کی بندرگاہوں کی فتح پر متعین ہوئے اور اس مہم کے انتظام وانصرام کے لیے سلطان کے حکم سے وہیں اقامت گزین ہو گئے۔)

آغا محمد ترک کو اللہ نے بہت سے مال ومنال سے نوازا تھا اور کثیر صلبی اولاد عطا کی تھی، جس کی تعداد ایک سو ایک بتائی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ وہ گجرات میں شان وشوکت اور اطمینان وسکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن ناگہاں اللہ نے ان کو آزمائش میں ڈالا اور ان کی اولاد واحفاد میں سے سو افراد موت کی آغوش میں چلے گئے اور صرف ایک بڑا بیٹا زندہ رہا، جس کا نام ملک معزالدین تھا۔ شیخ فرماتے ہیں:

ودراندک مدتے آن ہمہ بحکم قادر مختار رفت اقامت بدار القرار بردند، غیر یک پسر ملک معزالدین نام داشتہ است واکبر اولاد بود ❷۔

یعنی بہت تھوڑی مدت میں ان کی تمام اولاد قادر مطلق کے حکم سے وفات پا گئی۔ بجز ایک بیٹے کے جس کا نام ملک معزالدین تھا اور یہ ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔

یہ ان کے لیے ایک عظیم صدمہ تھا، جس کے بعد ان کا گجرات میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ اکلوتے بیٹے کو ساتھ لیا اور دہلی واپس آ گئے اور وہیں ۱۷ ربیع الثانی ۷۳۹ھ/۲ نومبر ۱۳۳۸ء کو وفات پائی۔ باپ کی وفات کے بعد ملک معزالدین نے دہلی ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی ❸۔ ہندوستان میں یہ سلطان محمد تغلق (۷۲۵۔۷۵۲ھ/ ۱۳۲۵ء۔۱۳۵۱ء) کا عہد حکومت تھا۔

## ملک موسیٰ:

ملک موسیٰ، آغا محمد ترک کے پوتے اور ملک معزالدین کے بیٹے تھے۔ انھوں نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ہوش سنبھالا۔ فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۲ھ سے لے کر ۷۹۹ھ/۱۳۵۱ء سے ۱۳۹۷ء تک سینتالیس سال

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

❸ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

ہندوستان پر حکومت کی۔ اس کی وفات کے بعد سلطنت دہلی کی مرکزیت ختم ہوگئی اور اس کا جاہ و جلال تاریخ کے اوراق میں منتقل ہوگیا۔ کئی خود مختار سلطنتیں عالم وجود میں آ گئیں اور سیاسی اعتبار سے انتشار و افتراق کا ایسا بے پناہ ریلا آیا کہ دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علمی مراکز کا بھی خاتمہ ہوگیا، جس کے نتیجے میں وہاں کے علما و مشائخ کی کثیر تعداد گجرات، بنگال، جون پور اور دیگر علاقوں میں منتقل ہونے پر مجبور ہوگئی۔ ملک موسیٰ بھی انقلاب کی زد میں آ گئے اور انھیں دہلی کو خیر باد کہہ کر ماوراء النہر کی راہ لینا پڑی۔ شیخ عبدالحق نے یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وی در فترات کہ بعد انقضائے عہد دولت فیروزی واقع شد باز بولایت ماوراء النہر رفتہ ❶۔

(فیروز شاہ تغلق کے عہد کے بعد جس سیاسی انتشار اور بدنظمی نے سر اٹھایا، اس سے کبیدہ خاطر ہو کر ملک موسیٰ ماوراء النہر چلے گئے۔)

لیکن وہاں ملک موسیٰ زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکے۔ ۸۰۱ھ/ ۱۳۹۹ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ اس کی فوج کے ساتھ پھر ہندوستان آ گئے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تیمور نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے ماوراء النہر کے علما سے مشورہ کیا تھا اور ان کی خاصی تعداد اس کی معیت میں ہندوستان آئی تھی، جن میں صاحب ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کے پوتے بھی شامل تھے اور تیمور کے دربار میں شیخ احمد تھانیسری نے ان پر کچھ اعتراضات بھی کیے تھے۔ بہت ممکن ہے، ملک موسیٰ بھی علما کی اس جماعت کے ساتھ ہی تیمور سے وابستہ ہوگئے ہوں اور اسی سلسلے میں دہلی پہنچے ہوں۔ اس کا اندازہ شیخ عبدالحق کے اس فرمان سے ہو سکتا ہے:

در رکاب دولت مآب صاحب قران اعظم امیر تیمور گورگان بدہلی قدم آوردہ، سلسلہ آبا و اجداد تازہ کردہ، قدم اقامت و استقامت محکم ساخت ❷۔

یعنی صاحب قران اعظم امیر تیمور گورگان کے ساتھ وہ دہلی آئے۔ اپنے بزرگوں کے سلسلے کا احیا کیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

## شیخ فیروز:

ملک موسیٰ کے کئی فرزند تھے، جن میں ایک شیخ فیروز تھے جو اپنے خاندان میں خاص امتیاز کے حامل اور عمدہ شہرت کے مالک تھے۔ شیخ عبدالحق محدث نے اخبار الاخیار میں ان کی زندگی کے متعدد پہلوؤں کی وضاحت کی ہے اور بہترین الفاظ میں ان کا تعارف کرایا ہے۔ ان کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ فیروز کی ذات میں بہت سے ظاہری، باطنی، وہبی اور کسبی فضائل جمع ہوگئے تھے۔ سپاہ گری میں وہ

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹۔

اپنے دور کی بے مثل شخصیت تھے اور فن حرب میں عدیم النظیر سلیقہ رکھتے تھے۔ علم، شعروشاعری، شجاعت وسخاوت، خوش طبعی و بذلہ سنجی، ظرافت، عشق الٰہی ومحبت خداوندی اور دیگر اوصاف حمیدہ میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ دولت و حشمت، جاہ ومرتبت، عزت وعظمت میں مشہور روزگار تھے۔ عذوبت کلام وحلاوتِ لسان اور شعروظرافت کی ابتدا ہمارے خاندان میں ان ہی کی ذات سے ہوئی ❶۔

شیخ فیروز جیسا کہ پہلے گزر چکا، بڑے بہادر اور جنگ جو تھے۔ وہ بہرائچ کی کسی جنگ میں شریک ہوئے اور مرتبہ شہادت کو پہنچے۔ ان کا مدفن بھی وہی خطہ ارض ہے۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں کہ جن دنوں وہ جنگ کو جارہے تھے ان کی بیوی حاملہ تھیں۔ اس نے شوہر کو روکنے کی کوشش کی تو جواب میں فرمایا:

از خدا خواستہ ام کہ آں فرزند نرینہ باشد واز وے اولاد بسیار شود و اور او شمارا بخدا سپردیم، تابعد ازیں مارا چہ پیش آید ❷۔

(میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ بیٹا ہو اور اس سے نسل چلے۔ اب میں اس کو اور تم کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں، نہ معلوم آئندہ مجھے کیا حالات پیش آئیں۔)

شیخ فیروز کے محاربہ بہرائچ پر جانے سے کچھ عرصہ بعد ان کے بیٹے شیخ سعد اللہ پیدا ہوئے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے دادا تھے۔ شیخ فیروز ۸۶۰ھ/۱۴۵۶ء کو شہید ہوئے۔

## شیخ سعد اللہ:

شیخ سعد اللہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، وہ ان تمام اوصاف سے متصف تھے، جو ان کے شہید باپ شیخ فیروز میں پائے جاتے تھے۔ عمر کا ابتدائی زمانہ تحصیل علم میں گزرا۔ پھر سلوک وتصوف کی وادی میں چلے گئے اور عبادت وریاضت کو مرکز توجہ ٹھہرا لیا۔ ایک صاحب حال بزرگ شیخ محمد منکن کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ شیخ سعد اللہ کی عظمت وبزرگی کا یہ عالم تھا کہ سلطان سکندر لودھی ان کے حلقہ عقیدت میں شامل تھا۔

شیخ سعد اللہ کی نرینہ اولاد میں ان کے دو بیٹوں (شیخ رزق اللہ اور شیخ سیف الدین)۔ نے علم وفضل کی دنیا میں بڑی شہرت پائی۔ باپ کی وفات کے وقت شیخ سیف الدین کی عمر صرف آٹھ سال تھی شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں کہ شیخ سعد اللہ وفات سے کچھ دن پہلے سحری کے وقت اپنے اس بیٹے (سیف الدین) کو مکان کے بالائی حصے میں لے گئے۔ اس سے آگے خود شیخ سیف الدین فرماتے ہیں۔

وبعد ادائے تہجد مرا مقابل ایستادہ کردند وگفتند، خداوندا تو می دانی کہ پسران دیگر را تربیت کردہ واز ادائے حقوق ایشاں برآمدہ ام، ایں را یتیم می گزارم وبے کس۔ حق ایں ہنوز برذمۂ منست۔ ایں را بتو می سپارم،

---

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹، ۳۰۰۔

مربی ومتولی اموراوتوباش ❶۔

(نماز تہجد کے بعد مجھے (یعنی سیف الدین کو) قبلہ رو کھڑا کیا، اور کہا، اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں دوسرے لڑکوں کی تربیت سے فارغ ہو چکا اور ان کے حقوق سے عہدہ برا ہو گیا۔ لیکن اس لڑکے کو یتیم و بے کس چھوڑ رہا ہوں۔ اس کے حقوق ابھی میرے ذمے باقی ہیں۔ اس کو اب تیرے سپرد کرتا ہوں، تو ہی اس کی تربیت وحفاظت فرما۔)

یہ الفاظ کہہ کر نیچے اتر آئے۔ (ایں گفت وفرود آمد) چند روز بعد جمعے کے دن ۲۲ ربیع الاول ۹۲۸ھ/ ۱۸ فروری ۱۵۲۲ء کو انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور ان کا یہ بیٹا آگے چل کر نہ صرف دہلی، بلکہ پورے ہندوستان کی ایک معزز ومؤقر شخصیت بنا۔ اس کے گھر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شکل میں علم وفضل کا وہ آفتاب طلوع ہوا، جس کی روشنی سے دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں علم وتحقیق کی روشنی پھیلی۔

## شیخ رزق اللہ:

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، شیخ سعد اللہ کے بیٹوں میں سے دو بیٹے شیخ رزق اللہ اور شیخ سیف الدین علم وفضل کی دنیا میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ باپ کی طرح جذبہ محبت الٰہی سے سرشار اور نہایت متقی تھے۔ دہلی کی عبادت وریاضت کی رونقیں ان کے دم سے وابستہ تھیں۔

مردم ایں شہر اتفاق دارند کہ دہلی عبارت ازیں برادران بود ❷۔

(اس شہر (دہلی) کے تمام لوگ اس پر متفق ہیں کہ دہلی ان ہی بھائیوں کے وجود سے تعبیر تھی۔)

ان کی مجلسیں ذکر الٰہی کا مرکز تھیں۔ اللہ کی یاد کے سوا ان میں کسی چیز کا دخل نہ تھا۔ اس سلسلے میں شیخ عبدالحق کے الفاظ قابل ملاحظہ ہیں۔ فرماتے ہیں:

مجلس ایشاں از اول تا آخر شوق وگریہ ودرد ومحبت بود۔ نسبت شیخ رزق اللہ درسوز وگرمی چناں بود کہ آتشے درزیر خاکستر پنہاں می باشد، اندک کہ کاویدند ہمہ آتش برآید۔ ومثال والد ماجد چناں کہ آب از چیزے چکیدہ می ماند، ادنیٰ آزارے کہ باو رسید تراوید۔ بغایت رقیق القلب وسریع التاثیر بودہ اند ❸۔

یعنی ان کی مجلس شروع سے آخر تک شوق وگریہ سے پُر اور درد ومحبت سے مملو تھی۔ سوز وگرمی سے شیخ رزق اللہ کا تعلق یوں سمجھیے، جیسا کہ راکھ کے نیچے آگ دبی ہو۔ جوں ہی اس کو ذرا کریدا، آتش بھڑک اٹھی۔

---

❶ اخبار الاخیار، ص ۳۰۰، ۳۰۱۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۳۰۱۔

❸ اخبار الاخیار، ص ۳۰۵۔

لیکن ان کے برعکس والد ماجد (شیخ سیف الدین) کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے کسی شے سے مسلسل پانی ٹپکتا رہے۔ ان کو اگر معمولی اذیت بھی پہنچتی تو فوراً آنسو بہنے لگتے۔ بدرجہ غایت رقیق القلب اور سریع التاثیر تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے عم محترم شیخ رزق اللہ کے حالات بطور خاص بیان کیے ہیں۔ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے فاضل تھے۔ تاریخ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور فارسی اور ہندی کے شاعر بھی تھے۔ فارسی میں مشتاقی اور ہندی میں راجن تخلص کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق نے ان کے علم ومطالعہ کی وسعت کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

شیخ رزق اللہ مردے کامل و فاضل و عارف واز نوادر روزگار واز مردم سلف یادگار بود۔ جامع فضائل صوری ومعنوی، و در مشرب عشق ومحبت وسلامت عقل ووسعت حوصلہ وصبر بر مصائب و دوام حضور و استقامت احوال یگانۂ عصر بود❶۔

(شیخ رزق اللہ مرد کامل، فاضل و عارف، نادر روزگار اور یادگار سلف تھے۔ فضائل صوری ومعنوی کے جامع تھے۔ مشرب عشق ومحبت، سلامتیٔ عقل وفہم، وسعت حوصلہ، مصائب و آلام کو صبر سے برداشت کرنے والے اور استقامت ودوام حضور میں یگانۂ عصر تھے۔)

اس ہمہ اوصاف موصوف عالم دین کا سن ولادت ۸۹۷ھ/۱۴۹۲ء اور تاریخ وفات ۲۰ربیع الاول ۹۸۹ھ/۲۴/اپریل ۱۵۸۱ء ہے۔ بانوے (۹۲) سال عمر پا کر راہی ملک دوام ہوئے۔

## شیخ سیف الدین:

شیخ سیف الدین رحمہ اللہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے والد تھے۔ ۹۴۰ھ/۱۵۳۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس دور کے بہت سے علما وصوفیا سے فیض حاصل کیا۔ کوئی بڑے عالم دین تو نہ تھے البتہ نیکی وتدین، زہد وعبادت، شعر وشاعری اور ذکر وفکر میں بہت مشہور تھے۔ شیخ عبدالحق ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

در شعر وفضیلت وقبول خواطر وذوق وشوق ومحبت وظرافت ولطافت و بے تعلقی ووارستگی وطیبت قلب وحضور خاطر وذکر لطائف ونکات وفہم دقائق واشارت یگانہ روزگار وافسانہ دیار خود شد❷۔

یعنی شعر وشاعری، فضیلت ومقبولیت عامہ، ذوق وشوق، محبت وظرافت، زہد وعبادت، پاکیزگی دل، حضور قلب، لطائف ونکات، باریک بینی، دقت نظر اور نکتہ سنجی میں بے مثال تھے اور اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

نہایت مستغنی المزاج تھے اور دنیوی جاہ وجلال سے سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ اکبری دور کے

❶ اخبار الاخیار، ص ۱۷۴۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۳۰۱۔

بعض علمائے عصر کو بادشاہ اور دنیا داروں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتے تو شدید ذہنی اذیت محسوس کرتے اور اللہ کے شکر گزار ہوتے کہ اتنا علم حاصل نہیں کیا، جتنا علمائے سوئے کیا ہے، ورنہ ہوسکتا ہے ان کی بھی یہی حالت ہوتی جو ان علمائے دین کی ہے۔ شیخ عبدالحق ان کے اس تاثر کو خود ان کی زبانی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

چوں مشاہدہ کردہ می شود کہ علما و فضلا در طلب جاہ و عزت و کثرت اسباب و جمعیت اموال و نزاع و خصومت کہ با خلق می رفتند، مرا شکرانہ آید برآں کہ بسیار نخواندیم و اکابر نشدیم❶۔

(جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دور کے علما و فضلا عزت و جاہ کے حصول میں، زیادہ سے زیادہ مال و دولت سمیٹنے میں خلق خدا سے نزاع و خصومت میں مصروف ہیں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے زیادہ علم حاصل نہیں کیا اور بڑے لوگوں میں میرا شمار نہیں ہوتا۔)

شیخ سیف الدین شاعر بھی تھے اور سیفی تخلص کرتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی شیخ سیف الدین کی زندگی کے آخری دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شیخ اپنی حیات مستعار کی آخری علالت کے دنوں میں کچھ ایسی کیفیت سے دوچار ہوئے کہ ان پر خوف و دہشت کا غلبہ طاری ہوگیا اور وہ پریشان سے رہنے لگے۔ جب قرآن کی کوئی ایسی آیت سنتے جو اللہ کی رحمت و رافت کے مضمون پر مشتمل ہوتی تو چہرے پر مسرت کے آثار نمودار ہوجاتے۔ شیخ عبدالحق ان کے سامنے بلند آواز سے قرآن کی آیات تلاوت کرتے اور وہ سن کر بہت خوش ہوتے۔ ایک مرتبہ رات کو سعادت مند بیٹے نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾❷

یہ آیت سن کر شیخ نے اظہار مسرت کیا اور بیٹے کو بہت دعائیں دیں۔ شیخ عبدالحق اس رات کی دعاؤں کے بارے میں لکھتے ہیں:

امیدوارم کہ مرا دعائے آں شب سرمایہ دنیا و آخرت شود۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(میں امید رکھتا ہوں کہ اس رات کی دعا میرے لیے دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہوگی۔)

وقت رحلت قریب آیا تو مندرجہ ذیل کلمات و اشعار تحریر کرکے کفن کے ساتھ رکھنے کی ہدایت کی، اس لیے کہ ان میں اللہ سے عفو و مغفرت کی التجا کی گئی ہے اور اپنی بے عملی اور بے بسی کا اظہار کیا گیا ہے:

❶ اخبار الاخیار، ص ۳۰۲۔

❷ یہ آیت سورۂ حم السجدہ کی تیسویں آیت ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:
''جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے (یعنی توحید کا اقرار کیا) پھر اس پر جمے رہے، ان پر (رحمت کے) فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) تم نہ تو ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور جس بہشت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس کی خوشی مناؤ۔''

دارم دلکے غمین بیا مرز کہ مپرس — صد واقعہ در کمیں بیا مرزو مپرس
شرمندہ شوم اگر بپرسی عملم — اے اکرم الاکرمین بیا مرزومپرس

ان کے علاوہ دو شعر یہ ہیں:

قدمت علی الکریم بغیر زاد — من الحسنات والقلب السلیم
فحمل الزاد اقبح کل شئی — اذا کان القدوم علی الکریم ❶

قبر میں منکر ونکیر کے جواب کے لیے یہ الفاظ لکھنے کا حکم دیا:

ربی اللہ و دینی الاسلام۔ ونبی محمد الامی وشیخی الشیخ عبدالقادر الجیلانی۔

وفات کے وقت خوف وخشیت کی کیفیت ذوق و ذشوق میں بدل گئی تھی۔ عصر کا وقت تھا اور شیخ عبدالحق مسجد میں تھے۔ انھیں مسجد سے بلایا گیا تو چہرے پر فرحت وطرب اور تازگی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فرمایا:

بابا ایدانکہ مارا اکنواں اصلاً رنجے ومحنتے وکوفتے نیست۔ شوق درشوق درطرب درطرب است، ہر زحمتے وبیماری کہ دربدن مابود بدررفتہ است، ولیکن ترا باید کہ مشغول شوی ودعائی کہ مرازودازیں جابردارند۔ مرا مطلوبے کہ درتمام عمر بود، دست دادہ است مبادا بازایں حالت نماند۔ دائم دعامی کردم کہ آخردم دریاد خودداری و بشوق ازیں جابری۔ اکنوں جمال ایں مراد باحسن وجوہ جلوہ گرشدہ است۔ اگر ہم دریں حالت پیش خود طلبد کمال لطف وعنایت او باشد ❷۔

(بابا! جان لو کہ مجھے اس وقت بالکل کوئی رنج وفکر نہیں ہے، بلکہ شوق پر شوق اور خوشی پر خوشی طاری ہے۔ جو بھی تکلیف اور بیماری میرے بدن میں تھی، چلی گئی ہے۔ تم کو چاہیے کہ مشغول ہو کر یہ دعا کرو کہ اللہ مجھے جلد یہاں سے لے جائے۔ تمام عمر جو میرا مطلوب تھا، اب حاصل ہو گیا ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ وہ ہاتھ سے جاتا رہے۔ میں عمر بھر اللہ سے دعا کرتا رہا کہ آخر وقت میں ذوق وشوق کے ساتھ اس دنیا سے لے جائیو۔ اب اس مراد کا جمال ہزاروں حسن کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ اگر وہ اس حالت میں اپنے سامنے بلالے گا تو اس کا انتہائی لطف وکرم ہوگا۔)

شیخ سیف الدین نے ۲۷/شعبان ۹۹۰ھ/ ۱۶/ستمبر ۱۵۸۲ء کو وفات پائی ❸۔

یہ ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے آباواجداد کا مختصر تعارف اور ان کی علمی وعملی زندگی کا مجمل سا تذکرہ۔ اب خود شیخ عبدالحق کے حالات وسوانح ملاحظہ فرمایے۔

---

❶ ان دو عربی شعروں کا ترجمہ یہ ہے:
میں کریم کے دربار میں بغیر کسی خرچ اور توشے کے حاضر ہوا ہوں۔ نہ نیکیاں پاس ہیں اور نہ قلب سلیم۔ مگر توشہ اور خرچ ساتھ لے جانا، اس صورت میں نامناسب بات ہے جب کہ ایک کریم اور بدرجہ غایت سخی کے پاس جانا مقصود ہو۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۳۰۹۔

❸ اخبار الاخیار، ص ۳۰۱۔

## شیخ عبدالحق کی ولادت:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اسلام شاہ سوری کے عہد میں محرم ۹۵۸ھ/جنوری ۱۵۵۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید محمد جون پوری کی مہدوی تحریک زوروں پر تھی اور علمائے دین ان کے مذہبی افکار و تصورات کے بارے میں مختلف الخیال تھے۔ بعض حضرات ان کی تکفیر و تضلیل کر رہے تھے، بعض ان کو برسر حق ٹھہراتے تھے اور کچھ لوگ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

اس زمانے کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدوی تحریک ایک اصلاحی دینی تحریک تھی۔ اس کے بانی سید محمد جون پوری کا مقصد احیائے شریعت، قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔ اس زمانے میں جو بدعات اور محدثات پھیلی ہوئی تھیں اور جن منکرات اور خلاف شرع امور کا زور تھا، ان کی جڑ کاٹنا اس تحریک کا بنیادی مقصد تھا۔ لیکن بعد کو اس کے غالی متبعین کے غلو کی وجہ سے اس کے بنیادی مقاصد میں زبردست تبدیلی پیدا ہوگئی اور خود یہی لوگ منکرات و محدثات کا شکار ہو گئے۔ تفصیل کا یہ محل نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ شیخ عبدالحق کی ولادت اس زمانے میں ہوئی، جب ہندوستان یا تو مختلف رجحانات کی آماج گاہ بن چکا تھا یا اس کی ذہنی و فکری پرورش کے اسباب پیدا ہو رہے تھے، جن میں ایک رجحان سید محمد جون پوری کی مہدوی تحریک کی شکل میں ارض ہند میں نمایاں طور سے ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔

## ابتدائی تعلیم و تربیت:

شیخ عبدالحق کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشو و نما اپنے والد ماجد شیخ سیف الدین کی آغوش میں ہوئی۔ شیخ خود فرماتے ہیں:

شب و روز در کنار مرحمت و جوار عنایت ایشاں تربیت می یافتم ❶۔

(میں رات دن ان کی آغوش عاطفت میں تربیت حاصل کرتا تھا۔)

سب سے پہلے شیخ سیف الدین نے اس زمانے کے رواج کے مطابق بیٹے کو قرآن مجید پڑھانا شروع کیا۔ باپ سبق لکھتے تھے اور بیٹا پڑھتا تھا۔ چند روز بعد ذہین بیٹا اس قابل ہو گیا کہ خود ہی قرآن مجید پڑھنے لگا۔ معمول یہ تھا کہ پہلے خود قرآن کا کچھ حصہ پڑھتے اور بعد میں استاذ کو سنا دیتے۔ اس طرح دو تین مہینے میں پورا قرآن مجید ختم کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ والد بیٹے کو بزرگان دین کے اقوال و افعال سے بھی آگاہ کرتے اور بچے کی ذہنی سطح کے مطابق اس کو تصوف و طریقت کے بعض پہلوؤں سے متعلق بھی واقفیت بہم پہنچاتے۔ بہت ہی کم مدت میں کتابت و انشا کا سلیقہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنے اس ہونہار بیٹے کو ابتدائی تعلیم خود

❶ اخبار الاخیار، ص ۳۱۰۔

ہی دینا شروع کی تھی۔ فارسی نظم واشعار کی ان کتابوں میں سے جو اس وقت مروج تھیں خود شیخ عبدالحق کے بقول شاید بوستان، گلستان کے چند اجزا اور دیوان حافظ پڑھایا ہو۔ پھر بچپن ہی میں قرآن مجید ختم کرنے کے بعد میزان الصرف سے مصباح اور کافیہ تک کتابیں پڑھیں۔ شیخ کی ذہانت وقابلیت کے جوہر عالم طفولیت ہی میں نمایاں ہونے لگے تھے، جس سے خوش ہو کر شیخ سیف الدین کہا کرتے تھے:

ان شاء اللہ تو زود دانش مندی شوی ❶۔

(ان شاء اللہ تم جلد ہی عالم ہو جاؤ گے۔)

شیخ سیف الدین نے تمام تر توجہ بیٹے کی تعلیم وتربیت پر مرکوز کر دی تھی اور ہر وقت یہی شوق اور جذبہ ان کے دل میں موج زن رہتا تھا کہ میرا یہ بیٹا جلد از جلد عالم دین ہو جائے اور علم وفضل میں درجہ کمال کو پہنچے۔ بیٹے سے کہا کرتے تھے:

مرا حظے غریب دست دہد بتصور آں کہ حق تعالیٰ ترا بکمالے کہ من خیال کردہ ام برساند ❷۔

(مجھے اس سے نہایت خوشی ہوتی ہے جب میں یہ تصور کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس مرتبۂ کمال کو پہنچا دے جو میں اپنے نہاں خانہ خیال میں چھپائے ہوئے ہوں۔)

شیخ سیف الدین تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو بہت سی نصیحتوں سے بھی نوازتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ بے مقصد بحث مباحثے سے گریز کرو اور صرف حصول علم کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہراؤ۔ اگر کوئی صحیح بات کہے تو اسے فوراً تسلیم کر لو۔ اگر کوئی تمھاری بات نہیں مانتا تو اس سے جھگڑا نہ کرو۔ بس دو ایک مرتبہ بات سمجھا کر خاموش ہو جاؤ۔ شیخ کی یہ نصیحت کس درجہ عمدہ ہے، اس کا اندازہ ان کے اصل الفاظ سے ہوتا ہے:

باید کہ باہیچ کس در بحث علم نزاع نہ کنی، و بہ کلفت نرسانی۔ اگر دانی کہ حق بجانب دیگر است قبول کنی، واگرنہ، دو سہ بار بگو، اگر قبول نکنند بگو کہ بندہ راچنیں معلوم است آں نوع نیز تواند بود کہ شامی گوئید، نزاع برائے چیست ❸۔

(تمھیں چاہیے کہ علمی بحث میں نہ کسی سے جھگڑا کرو اور نہ کسی کو تکلیف پہنچاؤ۔ اگر یہ سمجھو کہ دوسرا حق بجانب ہے تو اس کی بات مان لو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو دو تین بار سمجھاؤ۔ اور وہ نہ مانے تو کہو مجھے تو یہی معلوم ہے، ممکن ہے جو تم کہتے ہو، وہی صحیح ہو۔ جھگڑا کس بات کا ہے۔)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک تو خود نہایت ذہین اور طباع طالب علم تھے۔ دوسرے ان کے والد انھیں ہر وقت طلب علم کا شوق دلاتے اور کسی دوسری طرف ان کا ذہن ملتفت نہ ہونے دیتے۔ انھوں نے اپنی

❶ اخبار الاخیار، ص ۳۱۱۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۳۱۱۔

❸ ایضاً، ص ۳۱۰۔

تصنیف اخبار الاخیار میں اپنے طالب علمی کے دور کی کہانی تفصیل سے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھ لی تھی۔ پندرہ سولہ سال کو پہنچے تو مختصر معانی اور مطول سے فارغ ہو چکے تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر کے ہوئے تو علوم عقلی و نقلی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا، جس کی سیر نہ کر چکے ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرے والد (شیخ سیف الدین) فرمایا کرتے تھے کہ ہر مروجہ علم میں سے مختصر طور پر پڑھ لو گے تو کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس کے بعد تم پر برکت اور سعادت کے دروازے کھل جائیں گے اور بلا تکلف تمام علوم حاصل ہو جائیں گے۔ ان کے اس ارشاد کا اثر یہ ہوا کہ نہایت مختصر مدت میں تیزی کے ساتھ تحصیل علوم کی منزلیں طے ہو گئیں۔ یعنی مختصرات نحو مثلاً کافیہ، لب اور ارشاد وغیرہ کا کوئی حصہ یاد کرتے تو اس کے شروح و حواشی پڑھنے کے لیے طبیعت بے چین ہو جاتی۔ مطالعہ اس احتیاط اور محنت و شوق سے کرتے کہ تمام مطالب کتاب ذہن کی گرفت میں آ جاتے اور مزید سمجھنے کے لیے استاذ کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ فرماتے ہیں، اکثر ایسی کتابیں بھی پڑھ ڈالتا، جو نصاب میں داخل نہ تھیں۔ جو کتاب ہاتھ آ جاتی اول سے آخر تک پورے غور اور توجہ سے پڑھتا۔ میرا مطلب محض معلومات کا حصول اور علم میں اضافہ کرنا تھا[1]۔

شیخ کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز حصول علم تھا۔ کھیل کود اور دیگر غیر علمی امور سے ان کو زندگی کے کسی دور میں کبھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حتیٰ کہ حصول علم کے مقابلے میں آرام و راحت اور کھانے پینے کی بھی کوئی پروا نہ رہی تھی۔ اس ضمن میں ان کے اپنے الفاظ قابل ملاحظہ ہوں:

از ابتدائے ایام طفولیت نمی دانم کہ بازی چیست وخواب کدام ومصاحبت کیست، وآرام چہ وآسائش وسیر کجا۔

شب خواب چہ و سکوں کدامست — خود خواب بعاشقاں حرامست

ہرگز در شوق کسب وکار، طعام بوقت نخوردہ وخواب در محل نبردہ[2]۔

شیخ کے ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''میں بچپن ہی سے یہ نہیں جانتا کہ کھیل کود کیا شی ہے؟ نیند کیا ہے اور کسی کے ساتھ چلنا پھرنا کیا ہوتا ہے؟ آرام کے کیا معنی ہیں؟ آسائش کا کیا مطلب ہے اور سیر کیسی ہوتی ہے؟ تحصیل علم کے غلبۂ شوق کی بنا پر کھانا کبھی وقت پر نہیں کھایا اور نیند بھر کر کبھی نہیں سویا۔''

اس سے آگے شیخ نے حصول علم کے بارے میں اپنے بے پناہ شوق اور نظام اوقات کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ذیل میں ان کے الفاظ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

''میں جاڑے کی ٹھنڈی ہوا اور گرمی کے جھلسا دینے والے جھونکوں میں گھر سے روزانہ دو مرتبہ دہلی کے

---

1. اخبار الاخیار، ص ۳۱۱، ۳۱۲۔
2. اخبار الاخیار، ص ۳۱۲، ۳۱۳۔

مدرسے میں جاتا تھا جو ہمارے مکان سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ دوپہر کو تھوڑی دیر گھر میں قیام کے دوران ضرورتاً چند لقمے کھا لیتا...... میرے والدین بہت کہتے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل لو اور وقت پر سو جاؤ۔ میں کہتا تھا، آخر کھیلنے سے مقصد دل کو خوش کرنا ہی تو ہے۔ میری طبیعت اس سے خوش ہوتی ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں۔ عام طور پر ماں باپ بچوں کو پڑھنے اور مکتب جانے کی تاکید اور تنبیہ کیا کرتے ہیں، لیکن اس کے برعکس مجھے کھیل کود کی ترغیب دیتے تھے۔ کبھی مطالعہ کے دوران میں ایسا بھی ہوتا کہ نصف رات گزر گئی ہے۔ میرے والد نے آواز دی، بابا! کیا کرتے ہو؟ میں سنتے ہی فوراً لیٹ جاتا کہ مبادا جھوٹ نہ بول بیٹھوں، اور کہتا، میں سوتا ہوں۔ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ جب وہ مطمئن ہو جاتے تو پھر اٹھ بیٹھتا اور مشغول مطالعہ ہو جاتا❶۔

شیخ نے چھوٹی عمر میں سال، سوا سال کی محنت سے قرآن مجید بھی حفظ کر لیا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں علوم نقلی و عقلی پر عبور حاصل کر لیا تھا اور کتابت و انشا پردازی میں بھی مہارت پیدا کر لی تھی۔ ان کی عادت تھی کہ جو کتابیں اور ان کے شروح و حواشی ان کی نظر سے گزرتے انھیں باقاعدہ ضبط کتابت میں لے آتے۔ ان کا معمول تھا کہ رات کا زیادہ اور دن کا تھوڑا حصہ مطالعہ میں گزارتے اور رات کا تھوڑا اور دن کا زیادہ حصہ لکھنے میں صرف کرتے۔

اس کے علاوہ عبادت و ریاضت اور تہجد و شب خیزی کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ یعنی ایک طرف اگر شہراہ علم و مطالعہ پر گام زن ہیں تو دوسری طرف طریقت و تصوف کی دشوار گزار وادیوں کو بھی قطع کر رہے ہیں۔ ان دونوں سے قلبی لگاؤ کیوں تھا اور علم کے ساتھ ساتھ ریاضت و طریقت سے دلچسپی کس بنا پر تھی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ والد مکرم کی ہدایت تھی کہ محض علم کافی نہیں، اس کے ساتھ تصوف کی آمیزش بھی ضروری ہے۔ شیخ کے والد اس عالم کو جو راہ تصوف سے آشنا نہ ہو "ملائے خشک" سے تعبیر کرتے ہیں اور بیٹے کو محض اسی زمرے کا ایک فرد ہو کر رہ جانے سے منع فرماتے ہیں۔ شیخ لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے مجھے زندگی کے ابتدائی دور ہی میں حضور قلب اور طریقت سے طبعی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا:

از بدو فطرت بحکم وصیت پدر کہ می گفت بآں تا ملائے خشک و ناہموار نباشی، ہموارہ از عشق و محبت دمے می زنم و در طریق غربت و دردمندی قدمے می نہم❷۔

## فارغ التحصیل ہونے کے بعد:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی چھوٹی عمر ہی میں تکمیل علم کے مرحلے طے کر گئے تھے۔ اس کے بعد جب

❶ اخبار الاخیار، ص ۳۱۳۔

❷ ایضاً، ص ۳۱۴۔

بیس سال کو پہنچے تو مسند تدریس پر فائز ہو گئے لیکن جیسا کہ "بادشاہ نامہ" میں عبدالحمید لاہوری نے اور "شاہ جہان نامہ" میں محمد صالح کنبوہ نے بیان کیا ہے، ہنگامہ تدریس کا یہ دور بہت مختصر ہے۔ وہ جلد ہی حجاز مقدس روانہ ہو گئے تھے ❶۔

سفر حجاز کا ذکر انھوں نے اخبار الاخیار میں بھی کیا ہے ❷۔ اور زاد المتقین میں بھی۔ ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء میں سفر بیت اللہ کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور پھر اس ملک میں ٹھہرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ وہ ہندوستان میں اپنے آپ کو "بے خانماں" سمجھنے لگے اور دل میں ایک "وحشت" سی پیدا ہوگئی اور ذہن وقلب پر "دیوانگی" کی ایسی کیفیت رونما ہوئی کہ ارادۂ سفر کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ زاد المتقین میں اس کیفیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

درسن ست وتسعین وتسع مأة جاذبہ از غیب دررسید و وحشت دردل پدید آید چارہ نماند جز دیوانگی کردن وزاد ہمت بخیال سفر بربستن۔

یعنی ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء میں عالم غیب سے ایک جذبہ پیدا ہو گیا اور دل پر وحشت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر اس دیوانگی کی حالت میں سفر کے ارادے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا۔

جس زمانے میں شیخ نے دیار ہند سے کوچ کرنے اور سرزمین حجاز کو اپنا مسکن قرار دینے کا فیصلہ کیا، اس زمانے میں اس ملک پر مغل حکمران جلال الدین اکبر داد حکمرانی دیتا تھا اور یہاں کی دینی فضا پر تکدر کی وسیع چادر تنی ہوئی تھی۔ علمائے سو نے اکبر کے دل میں اسلامی امور اور دینی احکام کے خلاف نفرت اور عناد کی افسوس ناک کیفیت پیدا کر دی تھی، جس کے نتیجے میں اس سرزمین میں کسی صحیح العقیدہ عالم دین کا قیام ممکن نہ رہا تھا۔ شیخ بھی ان حالات سے متاثر ہوئے اور ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

چوں وضع زمانہ وزمانیاں کہ ہمہ مخل و برمکارہ طبیعی مشتمل است دگرگوں شد و بر اوضاع آشنایاں اعتماد نماند، صحبت فلانی وفلانی راست نیامد وتوفیق رفتن بکعبہ شریفہ رفیق اوشد، از دہلی بطریق جذبہ ہیچ چیز مقید نہ شدہ بگجرات رفت ❸۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

جب وقت اور اہل زمانہ کی وضع میں، جو اوقات میں مخل اور مکروہات طبعی پر مشتمل ہے فرق آیا اور ملنے والوں کے حالات قابل اعتماد نہ رہے اور فلاں وفلاں کی صحبت ورفاقت سازگار نہ رہی اور کعبہ شریف جانے کی توفیق رفیق حال ہوئی تو شیخ عبدالحق کے عالم جذبہ کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو سکی اور وہ دہلی سے گجرات روانہ ہو گئے۔

❶ بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۲۴۱، ۲۴۲۔ شاہ جہان نامہ، ج ۳، ص ۳۸۴۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۳۱۴۔

❸ منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۱۱۳۔

ظاہر ہے یہاں ''صحبت فلانی وفلانی'' سے فیضی اور ابوالفضل مراد ہیں۔ ملا عبدالقادر نے ان کے نام کی صراحت کے بجائے ان ہی الفاظ کو کافی سمجھا ہے۔

مکہ معظمہ میں شیخ عبدالوہاب کی خدمت میں حاضر ہو کر شیخ عبدالحق نے جس نہج سے بات کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث اکبر بادشاہ اور اس کے امرا کے پاس بھی گئے تھے اور ان سے مل بھی چکے تھے، لیکن ان کی گرفت میں آنے سے اللہ نے ان کو محفوظ رکھا۔ اس لیے کہ ان کی تربیت علم وعبادت اور زہد و ریاضت کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے المکاتیب والرسائل میں کیا ہے۔ ان کے عربی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔ شیخ عبدالوہاب سے کہتے ہیں:

''یا سیدی! میں وہ شخص ہوں، جس نے بچپن ہی سے تحصیل علم اور عبادت گزاری کی محنت و ریاضت کے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ میں نے کبھی لوگوں کی صحبت اور اختلاط کو اہمیت نہیں دی، اور جب اللہ کے فضل و کرم سے مجھے علم کا اچھا خاصہ حصہ میسر آ گیا، اور میں نے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں یہاں سے مکمل کر لیں تو بعض اہل حقوق نے مجھے دنیادار لوگوں کی طرف جانے کی دعوت دی۔ چنانچہ میں بادشاہ وقت اور امرائے دولت سے ملا۔ انھوں نے میری طرف بہت عنان توجہ مبذول کی۔ میرا مقام و مرتبہ بلند کیا اور یہ چاہا کہ میرے ذریعے اپنی جماعت میں اضافہ کریں اور مجھ کمزور و ناتواں سے اپنی طاقت کو مضبوط و مستحکم بنائیں، لیکن اللہ نے مجھے ان سے محفوظ رکھا اور ان کے ساتھ نہ رہنے دیا۔ اس نے اپنے اس بندے کے دل میں ایک ایسا داعیہ اور جذبہ پیدا کیا کہ جس نے مجھے اس مقدس مقام پر پہنچا دیا[1]۔''

دینی اعتبار سے اکبری دور کے ہندوستان کے حالات شیخ عبدالحق اور دیگر اصحاب تقویٰ کے لیے نہایت ناسازگار اور روحانی لحاظ سے سخت تکلیف دہ تھے اور ان کے لیے وہاں ٹھہرنے کا اب کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ ہندوستان کے نامور مؤرخ جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''ابوالفضل اور فیضی نے اس دینی انتشار و ابتری کی رہبری کی۔ شیخ عبدالحق کے فیضی سے ذاتی تعلقات تھے۔ دربار کے یہ حالات دیکھ کر ان کی طبیعت گھبرا اٹھی۔ اگر زمانہ سازی پر ان کی طبیعت ذرا بھی راضی ہو جاتی تو دولت و ثروت، عزت و حشمت ان کے قدم چومتی۔ لیکن ان کا مذہبی شعور بیدار تھا اور وہ کسی قیمت پر اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اکبر کا سیاسی اقتدار اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں مخالف تحریکوں کا نشوونما پانا ناممکن تھا۔ ان حالات میں ترک وطن کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی سمجھ میں نہ آیا، اور انھوں نے غیرت دینی سے مجبور ہو کر حجاز کی راہ لی[2]۔

---

[1] المکاتیب والرسائل، ص ۲۷۹۔

[2] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۹۵۔

## دہلی سے روانگی:

۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء کے شروع میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے سفر حجاز کا عزم کیا اور دہلی سے روانہ ہوئے۔ ان کی پہلی منزل مالوہ تھی، مالوہ سے عازم گجرات ہوئے۔ گجرات پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گزر چکا ہے۔ چنانچہ سال بھر وہیں رہے اور ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء میں حجاز روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں اکبر کی طرف سے مالوہ کا حاکم مرزا کوکہ تھا۔ یہ اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ اخلاق حسنہ کا حامل اور بہت سے اوصاف وفضائل کا مالک تھا۔ شیخ نے اثنائے سفر میں اس کے پاس بھی قیام کیا۔ مرزا عزیز کوکہ کا لقب خان اعظم تھا۔ اکبر جب اس سے ناراض ہوتا تو کہا کرتا تھا کہ میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کی نہر بہتی ہے، لہٰذا مجبور ہوں۔ جہاں گیر نے بھی تزک جہاں گیری میں عزیز کوکہ کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ سوانح و تاریخ اور تقریر وتحریر میں مہارت رکھتا تھا۔ لطیفہ بازی، بذلہ سنجی اور شعر گوئی میں بھی بہت مشہور تھا۔ شیخ کچھ عرصہ مالوہ میں عزیز کوکہ کے ہاں قیام پذیر رہے۔ مالوہ سے مانڈو تشریف لے گئے۔ وہاں گلزار ابرار کے مصنف محمد غوث شطاری مانڈوی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بقول خود شیخ کے ''با فروغ دیدار سے بہت کچھ فیروزی اور فرخندگی کے فوائد حاصل کیے ❶۔ مانڈو سے احمد آباد پہنچے۔ احمد آباد میں ان دنوں طبقات اکبری کے مصنف مرزا نظام الدین احمد صوبے کے بخشی تھے۔ انھوں نے گرم جوشی سے شیخ کا استقبال کیا اور ''بے حد التماس کر کے آئندہ موسم تک ٹھہرایا اور نہایت خواہش کر کے آپ کی خدمات انجام دیں ❷۔''

احمد آباد میں شیخ نے وہاں کے ایک جید عالم دین، صاحب تصنیفات کثیرہ اور بہت بڑے مدرس و معلم شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۰ء) کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے فیض حاصل کیا ❸۔

دہلی سے شیخ بلا کسی زادراہ کے احمد آباد پہنچے تھے۔ احمد آباد میں مرزا نظام الدین احمد بخشی نے، جو ان کے دیرینہ دوست تھے، ان کو اپنے یہاں ٹھہرایا۔ جب شیخ کے حجاز کو روانہ ہونے کا وقت آیا تو زادراہ اور جہاز کا انتظام کیا۔

## شیخ محدث مکہ مکرمہ میں:

شیخ محدث رمضان المبارک سے کافی پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ رمضان ۹۹۶ھ/ اگست ۱۵۸۸ء

---

❶ اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار، ص ۵۹۹۔

❷ ایضاً۔

❸ اخبار الاخیار، ص ۱۶۳۔

میں انھوں نے محدثین مکہ معظمہ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا۔ پھر شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ اور استفاضہ کیا۔ ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۱ء تک شیخ کا قیام مکہ مکرمہ میں رہا۔ تقریباً تمام عرصہ انھوں نے شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت ہی میں گزارا جو ہندوستان کے بہت بڑے علما میں سے تھے اور ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۶ء سے مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے، جب کہ ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔

## شیخ عبدالوہاب متقی:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شیخ عبدالوہاب متقی کے مختصر حالات درج کر دیے جائیں۔

شیخ عبدالوہاب کے والد کا اسم گرامی شیخ ولی اللہ اور مقام ولادت مانڈو تھا، جو ہندوستان کے علاقہ مالوہ کی قدیم حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ شیخ ولی اللہ مانڈو کے اعیان واکابر میں سے تھے۔ مانڈو میں ان کو کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انھیں ترک وطن کر کے برہان پور جانا پڑا۔ یہ شیخ عبدالوہاب کے بچپن کا زمانہ تھا اور اس پُرآلام سفر میں یہ والد کے ساتھ تھے۔ عبدالوہاب ابھی کم سن ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس حادثے سے دل اس درجہ متاثر و مغموم ہوا کہ وطن کو خیرباد کہہ دیا اور خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کر لی۔ گجرات، دکن، لنکا، سراندیپ وغیرہ میں عرصے تک سرگرم سیاحت رہے۔ عام طور پر تین دن سے زیادہ کسی مقام پر نہ ٹھہرتے۔ البتہ اگر کوئی مرد خدا اور عالم دین مل جاتا تو مدت قیام میں کچھ توسیع ہو جاتی۔ اثنائے سفر میں نہ کسی سے کچھ طلب کرتے اور نہ اپنی ضرورت کے لیے کسی کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ اس طرح بھوک پیاس کی بے پناہ شدتیں برداشت کرتے اور مختلف قسم کی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں اٹھاتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ ان تکلیف دہ ایام سفر کا ذکر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شیخ عبدالوہاب کی زبانی اخبار الاخیار میں کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

فرمودند کہ چند گاہ قوتِ ما آں بود کہ یارے می رفت، واستخوان ہائے ناکارآمدنی کہ قصابان می برتافتند برداشتہ می آورد، و پارۂ از کاہِ گندم کہ درمیان کشت زارہا افتادہ بود می آورد، وآں استخوانہا را می کوفتند وآں کاہ راشتہ و پاکیزہ می کردند، و درمیان دیگر کردہ درآب می جوشانیدند، و ہر کدام کاسہ ازاں صاف کردہ می خوردند، بعد از چند روز مردم شہر آگاہ می شدند و طعامہا می آوردند، و دیگر ازاں جا انتقال می کردیم، و جائے دیگری رفتیم و زیادت برسہ روز اقامت نمی کردیم[1]۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

''شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں۔ بارہا ہمارا کھانا اس طرح ہوا کہ کوئی ساتھی جاتا اور وہ بے کار ہڈیاں جو قصاب اپنی دکان کے آگے پھینک دیتے ہیں، اٹھا لاتا، اور گیہوں کے بال جو کھیتوں میں پڑے رہتے تھے، چن لیتا۔ ان ہڈیوں کو کوٹ کر اور اس گھاس کو پاک صاف کر کے پکا لیا جاتا اور پھر سب ایک ایک پیالہ پی

[1] اخبار الاخیار، ص ۲۷۷۔

لیتے۔ اس کے بعد جب شہر والوں کو ہمارے بارے میں معلوم ہو جاتا تو وہ کھانا لاتے تو ہم وہاں سے منتقل ہو کر دوسری جگہ چلے جاتے۔ کسی جگہ ہم تین دن سے زیادہ قیام نہ کرتے تھے۔''

اسی طرح شیخ عبدالوہاب متقی بھوک پیاس کی سختیاں برداشت کرتے اور سفر کے مصائب و آلام جھیلتے ہوئے جمادی الاولیٰ ۹۶۳ھ کو مکہ مکرمہ پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔ مکہ مکرمہ کی مسند تدریس پر اس زمانے میں مشہور ہندی عالم شیخ علی متقی (متوفی ۲ر جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ/ ۴ر نومبر ۱۵۶۷ء) متمکن تھے۔ ان کی شہرت علمی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ شیخ عبدالوہاب کے والد گرامی شیخ ولی اللہ کے علم و فضل سے باخبر تھے۔ شیخ عبدالوہاب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر انہی کے ہو رہے اور ان کی زندگی کے آخری سانس یعنی ۲ر جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ/ ۴ر نومبر ۱۵۶۷ء تک ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ تمام علوم کی تحصیل انہی سے کی اور ظاہری و باطنی علوم میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ ان کی وفات کے بعد مکہ معظمہ ہی کو اپنا مسکن ٹھہرا لیا۔ شیخ عبدالوہاب نہایت خوش خط تھے اور انتہائی صفائی اور احتیاط سے کتابت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں زود نویس بھی تھے۔ شیخ علی متقی کی ایک کتاب جو بارہ ہزار سطور پر مشتمل تھی، شیخ عبدالوہاب نے بارہ راتوں میں اس کی کتابت مکمل کر لی تھی۔ تقویٰ و تدین، بدرجہ غایت جذبہ ذوق و شوق، زہد و سلوک سے شدید لگاؤ، بے حد اشتیاقِ حصولِ علم، استاذ سے بے پناہ عقیدت و محبت اور کتابوں کی تصحیح و کتابت میں انتہائی دلچسپی ان کے وہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے شیخ علی متقی کو ان سے خاص تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا اور وہ انھیں انتہائی محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب کو مکہ معظمہ کے حلقہ علما و فضلا میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ دور دور سے لوگ ان سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ اس زمانے میں علوم شرعیہ پر عبور و استحضار میں بہت کم لوگ ان کا لگا کھاتے تھے۔ شیخ عبدالحق تحریر فرماتے ہیں:

می تواں گفت کہ دریں زمان بدانش ایشاں در علوم شرعیہ کمتر کسے خواہد بود۔ قاموس لغت مبالغہ می تواں گفت کہ گویا ہمہ یادداشت وفقہ و حدیث نیز ہمیں حکم دارد، ومبادی علوم عربیت نیز زیادہ از قدر کفایت است۔ سالہا در حرم شریف درس ایں علوم گفتہ بودند [1]۔

(اس دور میں علوم شرعیہ پر عبور و مہارت میں بہت ہی کم لوگ ان کے مقابلے کے ہوں گے، وہ ایک زندہ قاموس تھے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ سب کچھ انھیں یاد تھا۔ فقہ اور حدیث میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ مبادی علوم عربیہ (یعنی صرف ونحو اور ادب وغیرہ) سے بھی کفایت سے زیادہ نظر رکھتے تھے۔ برسوں حرم شریف میں ان کی تدریس کا سلسلہ جاری رہا تھا۔)

شیخ عبدالوہاب متقی مختلف مسائل اور فقہی معاملات میں معتدل مزاج رکھتے تھے۔ بحث و مباحثہ سے

[1] اخبار الاخیار، ص ۲۷۲۔

انھیں سخت نفرت تھی۔ اس زمانے کے صوفیا میں مسئلہ وحدت الوجود کا بڑا زور تھا اور توحید وغیرہ کے سلسلے میں عام طور پر یہ لوگ ابن عربی سے متاثر تھے۔ زیادہ تر فصوص الحکم اور اس موضوع کی دیگر کتابیں ان صوفیا کے زیر مطالعہ رہتی تھیں اور اپنے شاگردوں کو درساً درساً یہ کتابیں پڑھاتے بھی تھے۔ لیکن اس ضمن میں شیخ عبدالوہاب کا مسلک توقف وسکوت کا تھا۔ نہ وہ ان کتابوں کا درس دیتے، نہ ان سے اشتغال رکھتے، نہ ان کا انکار کرتے اور نہ ان کو برا کہتے۔ ان کی عادت ان فقہا کی سی نہیں تھی جو ان کتابوں پر طعن وتشنیع کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک ظاہراً و باطناً سنت پر عامل ہونا ضروری اور عقیدے کی مضبوطی لازمی ہے۔ صوفیا کی بعض مروج ومعروف کتابوں کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ ان کا مطالعہ تو کرنا چاہیے مگر یہ احتیاط رکھنی چاہیے کہ اپنے خاص انداز میں وہ جن اسرار و معارف کا ذکر کرتے ہیں، اگر وہ حیطہ فہم میں نہ آئیں تو انھیں ترک کر دیا جائے۔ طبیعت میں خلجان اور تذبذب نہ پیدا کیا جائے۔ یہ مستحسن نہیں ہے کہ انھی کتابوں کے مطالعہ سے عقیدہ درست کرنے کی ابتدا کی جائے اور جو کچھ کسی سے سن لیا، اس کی پیروی شروع کر دی جائے۔ عقیدے کی مضبوطی اصل شی ہے۔ اس میں کسی قسم کا خلل نہیں آنا چاہیے۔

شیخ عبدالوہاب کسی کی تکفیر وتفسیق کرنے اور اس کو ملحد قرار دینے سے دامن کشاں رہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ جس نقطہ نظر کے حامل تھے، شیخ عبدالحق محدث نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

فرمودند کہ ہر کہ را بینند کہ بکلمہ اسلام اقراری کند ونماز وروزہ می کند از وے اگر امثال ایں کلمات چیزے صادر شود، معذور دارند، و تکفیر و تشنیع نکنند ونسبت بالحاد نکنند ❶۔

یعنی جس کو دیکھو، کلمہ پڑھتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے، نماز روزے کا پابند ہے، اس سے اگر ایسے کلمات صادر ہو جائیں تو اسے معذور سمجھو، اس کی تکفیر و تشنیع نہ کرو اور اس کو ملحد نہ جانو۔

شیخ ممدوح حصول علم کو انسان کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی افادیت ہر شخص کے لیے عام ہے:

علم بمنزلہ غذا است کہ ہمیشہ احتیاج باقی است ونفع آں عام ❷۔

(علم غذا کی مانند ہے، جس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے اور اس کی افادیت کا سلسلہ عام ہے۔)

ان کے نزدیک علم دین کی تحصیل، درس و تدریس، نماز، تلاوت قرآن مجید، اور ہر عمل خیر ذکر الٰہی ہے ❸۔

حلقہ باندھ کر اور دیگر انداز سے ذکر الٰہی میں مشغول ہونے کو شیخ عبدالوہاب متقی سنت قرار نہیں دیتے،

---

❶ اخبار الاخیار، ص ۲۷۱۔

❷ اخبار الاخیار، ص ۲۷۲۔

❸ اخبار الاخیار، ص ۲۷۲۔

بلکہ اسے مشائخ کا ایک طریق قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ذکر الٰہی لا الہ الا اللہ ہے۔

می فرمودند کہ ایں کیفیت حلقہ ذکر و بعضے اوضاع و انواع ذکر درویشاں می کنند، اگرچہ آں را سندے صحیح درسنت نبوی ﷺ نیست اما از مستحسنات مشائخ است...... واصل ذکر ہمیں لا الہ الا اللہ است[1]۔

یعنی فرماتے ہیں کہ ایک خاص انداز سے حلقہ باندھ کر ذکر کرنے کا ثبوت نبی ﷺ سے بہ سند صحیح نہیں ملتا۔ البتہ صوفیا و مشائخ اسے مستحسن قرار دیتے ہیں۔ اصل ذکر الٰہی کا لا الہ الا اللہ ہے۔

## شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں:

ماہ رمضان ۹۹۶ھ/ اگست ۱۵۸۸ء کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشکوٰۃ شریف کا درس لینا شروع کیا۔ رمضان کے عشرۂ آخر میں ان کے ساتھ معتکف رہے۔ مناسک حج بھی انہی کے ساتھ ادا کیے اور پھر درس میں مشغول ہو گئے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ/ یکم مارچ ۱۵۸۹ء کو شیخ کی اجازت سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے اور آخر رجب ۹۹۸ھ/ ۲۵ مئی ۱۵۹۰ء تک وہاں مقیم رہے۔ شیخ کو رسول پاک ﷺ کی ذات اقدس سے اس درجہ محبت تھی کہ جب دیار حبیب میں داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے۔ ''در مدینہ برہنہ پا گردیدے۔'' مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آکر مشکوٰۃ کا درس مکمل کیا، جو شیخ عبدالوہاب سے لینا شروع کیا تھا۔ اس سے فارغ ہوئے تو شیخ نے فرمایا:

الحمدللہ! اب اس علم پر بدرجہ اتم عبور حاصل ہو گیا ہے۔ بلکہ اس قدر ہو گیا ہے کہ اس علم کی خدمت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اب چند روز دوسرے امور میں مصروف ہونا اور خلوت اور ذکر الٰہی کی لذت سے بہرہ اندوز ہونا چاہیے۔

اس کے بعد ان کو آداب و اوضاع ذکر اور تقلیل طعام وغیرہ کی تعلیم دی۔ نیز تصوف کی کچھ کتابیں پڑھائیں۔ ''نهج السالك الى اشرف المسالك'' نام کی ایک کتاب بھی ان کو دی جو عربی میں تھی۔ شیخ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ایک اور کتاب جس کی خاص طور پر تعلیم دی، ''قواعد الطريقة في الجمع بين الشريعة والحقيقة'' تھی۔ پھر عبادت و ریاضت کے کچھ طرق کی تلقین فرمائی، جن کا تعلق خلوت سے تھا۔ استاذ سے صحیح مسلم کی قرأت کی اجازت چاہی۔ اس سے فارغ ہو گئے تو شیخ کی طرف سے واپس ہندوستان جانے کا حکم ہوا۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ قیام حجاز کے دوران میں فقہ حنفی کے متعلق شیخ عبدالحق دہلوی کے خیالات بدل گئے تھے اور وہ شافعی مذہب اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہو سکا[2]۔

---

1. اخبار الاخیار، ص ۲۷۳۔
2. حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۱۱۔

## دیارِ ہند میں واپسی:

جب شیخ عبدالحق دہلوی مکہ معظّمہ میں شیخ عبدالوہاب متقی کے فیض صحبت سے ظاہری و باطنی علوم کی منزلیں طے کر چکے تو شیخ نے واپس ہندوستان جانے کا حکم دیا اور فرمایا:

بخانہ خود بروید کہ والدہ و فرزندان شما بسیار پریشان حال و بجانب شما نگران خواہند بود۔

(اب اپنے گھر جایے کہ والدہ اور بچے آپ کی طرف سے پریشان حال اور آپ کے منتظر ہوں گے۔)

لیکن شیخ عبدالحق ہندوستان کے دینی اور مذہبی حالات سے سخت مایوس اور دل برداشتہ ہو چکے تھے اور یہاں آنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ استاذ کا فرمان سن کر عرض گزار ہوئے۔

فقیر را نیت اقامت ایں مقامات شریفہ بسیار است۔

(فقیر کے دل میں ان مقدس مقامات میں مقیم رہنے کی بہت ہی تمنا ہے۔)

اس موضوع پر مشفق استاذ اور سعادت مند شاگرد کے درمیان کافی گفتگو ہوئی۔ استاذ کا اصرار تھا کہ اپنے وطن ہندوستان واپس جائیں اور شاگرد ابھی جانے کو تیار نہ تھے۔ بالآخر استاذ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

ان شاء اللہ تعالیٰ خیریت است۔ استخارہ بکنید اکنوں در ظاہر خود خیریت منحصر است در آں کہ بخانہ خود روید۔

(ان شاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔ استخارہ کر لیں۔ اب بظاہر خیریت اسی میں نظر آتی ہے کہ اپنے وطن واپس چلے جایے۔)

بہر حال شیخ عبدالوہاب کے پیہم اصرار سے شیخ عبدالحق محدث نے ہندوستان واپس جانے کا ارادہ کر لیا اور آخر شعبان ۹۹۹ھ/۱۲ر جون ۱۵۹۱ء کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی قبر پر دعا کے لیے طائف گئے۔ پھر رمضان کے آخر تک مکہ معظّمہ میں شیخ عبدالوہاب کی خدمت میں حاضر رہے۔ بعد ازاں شوال میں عازم ہند ہوئے اور ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء کو واپس گھر پہنچے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب بادشاہ ہند جلال الدین اکبر کے مذہبی تصورات نے الحاد کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہندوستان کی دینی فضا بادشاہ کے غیر دینی افکار سے آلودہ ہو چکی تھی۔ احکام شریعت اور سنت نبوی سے روگردانی کا دور دورہ تھا۔ دربار شاہی میں اسلامی شعار کی تضحیک ہوتی تھی اور دینی اقدار کو ماننے سے برملا انکار کیا جاتا تھا۔ علمائے سو نے مسائل و احکام شرعی میں حیلہ سازی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ بلکہ ملا عبدالقادر بدایونی تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں:

حیل بنی اسرائیل پیش آں شرمند[1]۔

(بنی اسرائیل کی حیلہ سازیاں بھی ان کی حیلہ سازیوں کے آگے شرمندہ تھیں۔)

---

[1] منتخب التواریخ ج ۲، ص ۲۰۳۔

ان روح فرسا حالات میں شیخ عبدالحق محدث مکہ معظمہ سے ہندوستان آئے۔ بلاشبہ یہ وہی حالات تھے، جس سے مایوس و بددل ہو کر انھوں نے اس ملک کو خیر باد کہا تھا اور حجاز روانہ ہوئے تھے۔ لیکن اب خود ان کی زندگی کی کیفیات بدل چکی تھیں، وہ علوم دینی کے سرمایہ سے پوری طرح بہرہ ور ہو گئے تھے اور ملک میں اسلام کی مخالفت اور رواج پذیر گمراہیوں کے سد باب کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس موجود تھا۔ چنانچہ آتے ہی دہلی میں مسند درس و ارشاد بچھائی اور ملک میں ہنگامۂ تدریس کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں یہ پہلا مدرسہ تھا، جس میں قرآن و حدیث دونوں کی تعلیم کا سلسلہ عمدہ ترین نہج سے شروع کیا گیا اور شریعت اسلامیہ کی باقاعدہ تبلیغ و ترویج کی طرح ڈالی گئی۔ بلاشبہ اس دور کے ہندوستان میں دین کی نشر و اشاعت کا سب سے بنیادی اور سب سے مؤثر ذریعہ یہی ہو سکتا تھا کہ تدریس و تعلیم کے میدان میں کتاب و سنت کو علوم دینی کا مرکزی نقطہ نظر قرار دیا جائے، اور شیخ عبدالحق دہلوی نے اسی کو اختیار کیا۔ ساتھ ہی تصنیف و تالیف میں بھی سرگرم عمل ہوئے۔ اس کا ذکر انھوں نے خود بھی اخبار الاخیار میں کیا ہے اور بادشاہ نامہ میں عبدالحمید لاہوری نے بھی کیا ہے[1]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیخ کا یہ مدرسہ اس پرفتن دور میں شریعت اسلامی اور سنت نبوی ﷺ کا سب سے بڑا حصار تھا۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ شیخ نے ہندوستان آ کر خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے بیعت کا شرف حاصل کیا۔

## شیخ عبدالحق اور شاہان ہند:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی سلیم شاہ سوری کے عہد میں پیدا ہوئے اور مغل حکمران شاہ جہان کے عہد میں اس کے سولھویں سال جلوس میں وفات پائی۔ اس اثنا میں یکے بعد دیگرے آٹھ فرماں روا تخت ہند پر متمکن ہوئے، جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ سلیم شاہ سوری: اس کو اسلام شاہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شیر شاہ سوری کا بیٹا تھا اور ہندوستان کا ایک منصف مزاج حکمران تھا۔ اس نے نو سال حکومت کی اور ۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں وفات پائی۔

۲۔ مبارز خاں: یہ سلیم شاہ سوری کا عم زاد اور سالا تھا۔ سلیم کے بارہ سالہ بیٹے فیروز خاں کو قتل کر کے اور محمد شاہ عادل کا لقب اختیار کر کے حکمران بنا تھا۔ نہایت ظالم اور رذیل آدمی تھا۔ لوگ اس کو عدلی کہتے تھے اور یہ قتل ہو گیا تھا۔

۳۔ ابراہیم شاہ: یہ مبارز خاں کا زبردست حریف تھا۔ اس کے ساتھ جنگ کے بعد دہلی اور آگرہ وغیرہ کے علاقوں پر قابض ہو گیا تھا۔ اس کا انجام بھی قتل ہوا۔

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے اخبار الاخیار، ص ۳۱۳، ۳۱۴۔ بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۲۴۱، ۲۴۲۔

۴۔ سکندر شاہ: یہ بھی سور خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کو نصیر الدین ہمایوں نے شکست دی اور ہمایوں دوبارہ ہندوستان کا بادشاہ بنا۔

۵۔ ہمایوں۔

۶۔ اکبر۔

۷۔ جہاں گیر۔

۸۔ شاہ جہان۔

یہ چاروں (نمبر ۵ تا ۸) ہندوستان کے مشہور مغل حکمران تھے اور تاریخ ہند میں خاص مرتبے کے مالک تھے۔

ان میں اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہان وہ بادشاہ ہیں، جن کا عہد حکومت شیخ نے اچھی طرح دیکھا تھا اور ان کے زمانے کے حالات کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا، لیکن اس مرد خدا کی ذہنی بلندی اور کمال خودداری ملاحظہ ہو کہ ملوک وسلاطین اور ارباب حکومت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا اور عمر بھر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کیے رکھی۔ ہمیشہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز سے کبھی لگاؤ نہیں ہوا۔ وہ اپنے بارے میں کہا کرتے تھے:

حقی از گوشہ دہلی نہ نہم پا بیروں  خود گرفتیم کہ ملک گجراتم دادند

اس تنہا پسندی اور عزلت نشینی کی کچھ معقول وجوہ تھیں۔

ایک یہ کہ دربار اکبری میں دنیا دار علما نے جس طرح احکام شریعت اور دین صحیح کی مخالفت اور اس پر طنز وتشنیع کے اسباب فراہم کیے، اس سے صحیح العقیدہ اور حق پرست علما شدید روحانی پریشانی میں مبتلا تھے اور یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ دربار سے منقطع رہنے ہی سے علم اور دین کے سرمائے کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ دربار شاہی سے تعلق قائم کرنے سے علمی معاملات اور دینی امور میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ علمی سرگرمیاں اور درباری وابستگیاں دو الگ الگ چیزیں ہیں، ان کا ایک جگہ جمع ہونا محال ہے۔

تیسرے یہ کہ شیخ طبعاً مدح سرائی اور مبالغہ آمیزی سے متنفر تھے اور دربار میں آمد ورفت رکھنے والوں میں مدح سرائی اور مبالغہ آمیزی کے اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے۔

## شیخ محدث اور جہاں گیر بادشاہ:

عہد اکبری میں دین ومذہب کا جو حال ہوا، اس سے بہت سے دیگر اصحاب دل کی طرح شیخ کا دل بھی سخت مغموم تھا اور ان کا ضمیر بے حد اذیت محسوس کرتا تھا لیکن ملک کی زمام اقتدار جہاں گیر کے ہاتھ میں آئی تو حالات بہت ہی رو با صلاح ہو گئے تھے اور ارباب حکومت میں ایک خوش گوار ذہنی اور فکری تبدیلی رونما ہو گئی

تھی۔ خود جہاں گیر نے بڑی حد تک اپنے باپ کے افکار وتصورات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے بادشاہ کے لیے شیخ محدث کے دل میں بھی خیر خواہانہ جذبات ابھر آئے اور اس پر شرعاً جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان سے اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ ''نورانیہ سلطانیہ'' کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا، جس میں ''قواعد وارکان سلطنت'' پر مفصل بحث کی۔ بعد ازاں شیخ نے جہاں گیر کے بیٹے شاہ جہان کے لیے ایسی چالیس احادیث جمع کیں، جن میں رسول اللہ ﷺ نے سلاطین کو پند ونصائح سے نوازا ہے۔ یہ رسالہ شیخ محدث نے ''ترجمة الاحاديث الاربعين فى نصيحة الملوك والسلاطين'' کے نام سے موسوم کیا۔

بہر حال اکبر کی وفات کے بعد ہندوستان کے مذہبی حالات بدل گئے تھے اور شیخ کے نزدیک اب فرماں روایانِ ہند کو صحیح دینی تعلیم سے روشناس کرانے کا وقت آ گیا تھا، لہٰذا انھوں نے جہاں گیر سے میل جول رکھنے اور اس سے تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے علاوہ جناب خلیق احمد نظامی یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''ممکن ہے، شیخ محدث کے رویہ میں اس تبدیلی کا سبب حضرت خواجہ باقی باللہ کی تعلیم ہو۔ خواجہ صاحب کا اصول یہ تھا کہ جھونپڑوں سے لے کر محلوں تک ارشاد وتلقین کا ہنگامہ برپا کرنا چاہیے اور سلاطین سے علیحدہ رہنے کی بجائے، ان کو متاثر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے [1]۔''

## جہاں گیر سے ملاقات:

جہاں گیر بادشاہ شیخ کو بڑے قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کے علم وفضل اور زہد وورع سے بہت متاثر تھا۔ شیخ بھی اس کے اس جذبے اور اخلاص کی بے حد قدر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ دربار میں اس سے ملاقات کے لیے بھی گئے۔ جہاں گیر اپنے تزک میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کا ذکر کرتا ہے:

شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہل فضل وارباب سعادت است، دریں آمدن دولت ملازمت دریافت، کتابے تصنیف نمودہ بود، مشتمل براحوال مشائخ ہند، بنظر درآمدہ، خیلکے زحمت کشیدہ، مدتہاست کہ در گوشۂ دہلی بوضع توکل وتجرید بسر می بود، مرد گرامی است صحبتش بے ذوق نیست۔ بانواع مراحم دل نوازی کردہ رخصت فرمودم [2]۔

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ عبدالحق دہلوی جو اہل فضل اور اصحاب سعادت میں سے ہیں، میری یہاں آمد پر تشریف لائے۔ انھوں نے مشائخ ہندوستان کے حالات میں ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا، اس

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۶۔

[2] تزک جہاں گیری، ص ۲۸۵۔

تصنیف میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے[1]۔ وہ مدت سے دہلی کے ایک گوشے میں توکل و تجرید کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قابل احترام شخص ہیں۔ ان کی صحبت بے ذوق نہیں۔ میں نے ان کو بہت سی عنایات و نوازشات سے رخصت کیا۔

جہاں گیر اس دور میں شیخ کے علم و فضل، زہد و عبادت اور توکل و تجرید سے بہت متاثر تھا۔ اس نے ان کو ایک گاؤں بھی جاگیر کے طور پر پیش کیا، جس کا نام بکروالا تھا اور دہلی کے جنوب مغرب میں نوکوس کے فاصلے پر واقع تھا۔ شیخ نے پہلے تو یہ گاؤں قبول کرنے سے انکار کیا مگر جب بادشاہ کا اصرار بڑھا تو قبول فرمالیا۔

زندگی کے آخری دنوں میں جہاں گیر کے دل میں شیخ کے بارے میں کچھ کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی کے ایک مرید خاص مرزا حسام الدین کے متعلق بھی بادشاہ کے دل میں کبیدگی کے آثار ابھر آئے تھے۔ سکینۃ الاولیا میں داراشکوہ اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

در وقتے کہ جہاں گیر بادشاہ در کشمیر بودند، بعضے مردمان سخنان غیر واقع از طرف شیخ عبدالحق دہلوی کہ امام محدثانِ وقت اند و مرزا حسام الدین کہ از مریدانِ باکمال شیخ احمد سہرندی بودہ اند، بعرض بادشاہ رسانیدند[2]۔

یعنی جس زمانے میں جہاں گیر بادشاہ کشمیر میں مقیم تھا۔ کچھ لوگوں نے محدثین عصر کے امام شیخ عبدالحق دہلوی اور شیخ احمد سرہندی کے مرید باکمال مرزا حسام الدین کے متعلق بے سروپا باتیں بادشاہ کے گوش گزار کیں۔

اس سے متاثر ہو کر جہاں گیر نے شیخ عبدالحق محدث اور مرزا حسام الدین، دونوں کو کشمیر بلا بھیجا۔ شیخ کے بیٹے نورالحق کو حکم ہوا کہ دہلی سے کابل چلے جائیں۔ شیخ عبدالحق یہ حکم سن کر لاہور پہنچے تو سخت پریشان تھے۔ حضرت میاں میر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے تو اس کی وجہ دریافت کی۔ فرمایا اس بڑھاپے میں وطن اور بچوں سے جدا ہونے کے خیال سے پریشان ہوں۔ لیکن قدرت خداوندی ملاحظہ ہو کہ شیخ عبدالحق ابھی کشمیر نہ پہنچے تھے کہ جہاں گیر کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے بیٹے نورالحق کے ساتھ واپس دہلی تشریف لے گئے۔

داراشکوہ کا کہنا ہے کہ یہ بے سروپا باتیں (سخنان غیر واقع) جو شیخ کے بارے میں جہاں گیر سے کی گئی تھیں، بالکل غلط اور محض بہتان تھیں۔ مگر اس نے ان بے سروپا باتوں کی جنھیں وہ ''سخنان غیر واقع'' سے تعبیر کرتا ہے، وضاحت نہیں کی۔ اس ضمن میں جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ داراشکوہ نے ''سخنانِ غیر واقع'' کی وضاحت نہ کر کے شیخ محدث کی زندگی کے اس اہم حادثے کی نوعیت کو سمجھنے میں ایک محقق کے لیے دشواری پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ہی مراۃ الحقائق کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ (جہاں گیر کی بیوی) نور جہاں اور شیخ محدث کے درمیان بعض معاملات میں کشیدگی تھی۔ ممکن ہے اسی نے غلط باتوں اور ''سخنان غیر واقع'' سے جہاں

[1] اس کتاب سے شیخ کی مشہور تصنیف ''اخبار الاخیار'' مراد ہے۔

[2] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ بحوالہ سکینۃ الاولیا (قلمی نسخہ) ص ۶۴، ۶۵۔

گیر کے کان بھرے ہوں۔ مشہور ہے کہ ایک بار نور جہاں نے شیخ محدث کو محل میں آنے کی دعوت دی تھی، جس کے جواب میں شیخ نے کہا تھا کہ فقیر کا بادشاہوں یا بیگمات کے پاس کچھ کام نہیں ہے۔ فقیر کے لائق جو امر ہو، کہلا بھیجیے، اس کے انجام دینے میں حتی الامکان دریغ نہ ہوگا❶۔

لیکن اس ضمن میں رود کوثر میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم نے جس نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے، وہ بھی لائق تذکرہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں گیر نے تزک میں جس احترام سے شیخ عبدالحق کا ذکر کیا ہے، اس کے پیش نظر داراشکوہ کا بیان مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ شاید شیخ سے باز پرس میں جہاں گیر کی شیعہ بیگم نور جہاں کی شکایتوں کو دخل ہو، لیکن شیعہ سنی مسئلے پر شیخ عبدالحق محدث کی رائے معتدلانہ تھی۔ شیعہ مؤرخ خافی خان ان کی نسبت لکھتا ہے: ''صد کتاب از علوم عقلی و نقلی تالیف فرمودہ۔ خصوص شرح مشکوٰۃ و تاریخ مدینہ کہ دراں ذکر حضرت ائمہ طاہرین وظلم و تعدی مخالفین باظہار کمال حسن عقیدت نمودہ...... گویند بعد مراجعت از کعبۃ اللہ اکثر برزبان صداقت بیان ایں سخن جاری بود کہ تا بہ بیت اللہ رفتہ مدتے مقیم گشتہ صرف اوقات برائے تحقیقات احادیث نمودہ، ندانستم کہ بیشتر احادیث مشہور وضعی است۔'' شیعہ سنی اختلاف کے بارے میں شیخ کا مسلک شاہ ولی اللہ کا تھا، حضرت مجدد الف ثانی کا نہ تھا۔ اس کی بنا پر حکومت سے چپقلش قرین قیاس نہیں۔ اگر داراشکوہ کا بیان صحیح ہے تو ممکن ہے کہ جہاں گیر کے خلاف شاہ جہان نے جو بغاوت کی تھی، اس میں دوسرے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرح شیخ محدث اور شیخ حسام الدین کی ہمدردیاں شاہ جہان کے ساتھ ہوں۔ بہر کیف شاہ جہان کی تخت نشینی نے یہ الجھن ختم کر دی اور عہد شاہ جہانی میں آپ کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہو گیا❷۔

یاد رہے، داراشکوہ نے سکینۃ الاولیا میں شیخ عبدالحق اور مرزا حسام الدین کے خلاف بادشاہ کے کانوں میں جن ''سخنان غیر واقع'' ڈالنے کا ذکر کیا ہے، وہ کسی اور تذکرے میں مذکور نہیں۔ اگر اس میں کوئی صداقت ہے تو اس کے نتیجے میں بادشاہ کی طرف سے انھیں کابل چلے جانے کا حکم دینے کی دو وجہیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ بادشاہ کی بیوی نور جہاں شیعہ تھی اور وہ دربار شاہی میں شیخ کے اثر و رسوخ کو برداشت نہ کرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شاہ جہان نے جب اپنے باپ جہاں گیر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس میں شیخ اپنی ہمدردی کا مستحق شاہ جہان کو سمجھتے تھے، اس لیے قدرتی طور پر جہاں گیر کے دل میں اس سے کبیدگی پیدا ہوئی۔ مگر اندازہ یہ ہے کہ ''سخنان غیر واقع'' کا قصہ غالباً صحیح نہیں ہے، کیوں کہ شیخ اعتدال پسند عالم تھے، نہ تو انھیں شیعہ مسلک سے کوئی ایسی عداوت تھی جو معاملے کو یہاں تک پہنچا دے کہ بادشاہ انھیں علاقہ بدر ہونے کا حکم دینے پر مجبور ہو جائے اور نہ سیاست اور ملکی معاملات سے انھیں کوئی اتنی دلچسپی ہو سکتی تھی، وہ تو ایک گوشے میں بیٹھ کر

---

❶ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۹ بحوالہ مرأۃ الحقائق، ص ۸۷۔

❷ رود کوثر، ص ۳۸۲۔

تصنیف وتالیف اور تدریس وتعلیم کی خدمت انجام دینے والے بزرگ تھے، ان کی عمر بھی اس قسم کے ہنگاموں میں دخیل ہونے کے قابل نہ تھی۔ اس وقت وہ پچھتر (۷۵) سال سے زیادہ عمر کو پہنچ چکے تھے۔

## شیخ کا مکان، مدرسہ اور کتب خانہ:

شیخ کے حالات بیان کرتے ہوئے جناب خلیق احمد نظامی نے ان کے مکان، مدرسے اور کتب خانے کے بارے میں بعض ضروری معلومات بہم پہنچائی ہیں اور درج ذیل سطور اسی سے مستفاد ہیں۔

شہر دہلی میں جو شیخ کا مولد و مدفن ہے، دہلی دروازے سے آگے، باغ مہدیاں کے قریب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا مکان، خانقاہ اور مسجد واقع تھی۔ اس خانقاہ کو خانقاہ قادریہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا تذکرہ خود شیخ نے مشکوٰۃ کی شرح میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

تم فی الخانقاہ القادری وھذا الفقیر یخدمه ویکنسه ویوقد سراجه۔
کانماتم فی مجلس واحد۔

(یعنی یہ کتاب خانقاہ قادریہ میں ختم ہوئی، جس کی خدمت یہ فقیر کرتا ہے اور اس میں جھاڑو دیتا ہے اور اس کا چراغ روشن کرتا ہے۔ یہ کتاب ایک جلسہ میں ختم ہوئی۔)

شیخ کی خانقاہ کا کچھ حصہ انیسویں صدی کے آخر تک موجود تھا۔ منشی برکت علی حقی مصنف مرأۃ الحقائق نے اس کی زیارت کی تھی۔ مسجد کی اس زمانے میں مرمت کرائی گئی تھی۔ شیخ کے مکانات کی زمین کی پیمائش ان کے خاندان کے لوگوں نے کرائی تھی۔ کل رقبہ چھ بیگہ اور چند بسوہ تھا۔ شیخ کے خاندان کے افراد ہی اس پر قابض تھے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ جس مدرسے میں شیخ نے تعلیم حاصل کی وہ کہاں تھا۔ اخبار الاخیار میں شیخ فرماتے ہیں، وہ ہمارے گھر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

ہر روز باوجود غلبہ برودت ہوائے زمستان وشدت حرارت تابستان، دوبار بمدرسہ دہلی کی شاید از منزل مابُعد دو میل داشتہ باشد، میل می کردم۔ درمیانہ روز ادنیٰ وقفہ در غربت خانہ بسبب تناول چند لقمہ کہ سبب عادی قوام حرکت ارادیست واقع می شد، ومدتے پیشتر از وقت صبح بمدرسہ می رسیدیم و در سایہ چراغ جزوی کشیدیم ❶۔

(موسم سرما کی سخت ٹھنڈی ہواؤں اور موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ میں گھر سے روزانہ دو مرتبہ صبح اور دوپہر کو مدرسے جاتا۔ مدرسہ ہمارے مکان سے تقریباً دو میل دور تھا۔ دوپہر کو مدرسے سے لوٹ کر دوسروں کی طرح قوت ارادی اور حرکت جسمانی کو قائم رکھنے کی غرض سے صرف چند نوالے کھا لیتا۔ وقت صبح سے کچھ پہلے اٹھ کر چراغ کی روشنی میں دو جز پڑھتا اور پھر اول وقت مدرسے پہنچ جاتا۔)

❶ مرأۃ الحقائق، ص ۱۰۳۔

یہ مدرسہ پرانے قلعے کے قریب واقع تھا۔ مرأۃ الحقائق کے مصنف منشی برکت علی حقی اس کے متعلق درج ذیل تفصیلات بیان کرتے ہیں:

یہ مدرسہ بعمارت پختہ دومنزلہ مع مسجد، مقابل قلعہ کہنہ، لب سڑک دہلی و آگرہ واقع ہے یعنی دروازہ قلعہ کا بجانب غرب ہے اور اس مدرسہ کا بسمت شرق ہے۔ یہ مکان مدرسہ اب تک بدستور قائم ہے۔ سامنے دروازہ سے مسجد اس کی نظر آتی ہے، اور گرد صحن کے ہر چہار طرف مکانات بنے ہوئے ہیں، اور اس سے زیادہ تر پتہ یہ کہ سمت دکھن جو دیوار مکانات بالا کی ہے، اس میں چند دروازے باہر کی طرف ہیں کہ منجملہ ان کے کوئی دروازہ پتھر اور چونے سے مسدود شدہ ہے اور کوئی بدستور کشادہ ہے کہ یہ ہیئت پلوں سے جانے والوں کو دور سے دکھائی دیتی ہے اور جانب شمال متصل اس مدرسہ کے ایک ایسا ہی مکان عظیم الشان اسی زمانے کا بنا ہوا ہے اور اس کے دروازہ صدر پر سنگ سرخ لگا ہوا ہے [1]۔

شیخ کا کتب خانہ دیار ہند کا ایک عظیم کتب خانہ تھا اور بیش قیمت علمی ذخائر پر مشتمل تھا۔ ان کے بیٹے شیخ نور الحق اور خاندان حقی کے بعض دیگر حضرات وقت کے اکابر علما میں سے تھے۔ انھوں نے شیخ کے کتب خانے کی بھی حفاظت کی اور اپنے علمی ذوق کی بنا پر اس میں مزید اضافہ بھی کیا۔ لیکن اٹھارویں صدی عیسوی میں جب دہلی کی سیاسی فضا میں انقلاب و تغیر کی مہیب لہریں اٹھیں اور مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں نے ہنگامہ آرائی کا ایک وسیع سلسلہ شروع کر دیا تو معنوی اور علمی دولت کے یہ انمول خزانے بھی دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ شیخ نور الحق کے پوتے شیخ الاسلام شرح بخاری کی دوسری جلد کے خاتمے پر شیخ عبدالحق محدث کے کتب خانے کی بربادی کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

درہنگام تشتت بال و پریشانی حال ازنہب و غارت خانہ درحملہ شہر کہنہ دہلی کہ باستیلاء کفار عتاۃ باتفاق طغاۃ ولغاۃ واقع شد وذہاب کتب خانہ قدیمہ وجدیدہ کہ بسیار ازاں دریں دیار کمیاب بود وبعضے ازاں بہ تصحیح وتحشیہ و تدریس شیخ المحدثین شیخ اجل محقق دہلوی بود، رحمہ اللہ...... نماند درخانہ مگر چند کتب درگوشہ ہائے شکستہ افتادہ۔

یعنی دہلی کے قدیم شہر میں سرکش و باغی کفار کے غلبہ واستیلا کے زمانے میں جب عوام میں اضطراب و پریشانی پیدا ہوئی، قتل و غارت کے سلسلے دراز ہوئے اور سلب ونہب کا معاملہ انتہا کو پہنچ گیا تو شیخ المحدثین حضرت علامہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کا کتب خانہ بھی اس کی نذر ہو گیا جو اس نواح میں سب سے بڑا کتب خانہ تھا۔ بعض کتابیں خود شیخ محدث کی تصحیح شدہ تھیں، بعض وہ تھیں جو تدریس کے وقت ان کے سامنے رہتی تھیں اور بعض ان کے حواشی اور تعلیقات سے مزین تھیں...... ان میں سے چند کتابیں باقی بچیں اور وہ بھی پھٹی ہوئی اور شکستہ حال میں۔

[1] مرأۃ الحقائق، ص ۱۰۳۔

## تصانیف و تالیفات:

شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے مصنف اور شارح تھے۔ اس ضمن میں اللہ کی مدد سے انھوں نے جو خدمات انجام دیں، وہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز انھوں نے طالب علمی ہی کے زمانے میں کر دیا تھا جو زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔ ان کی کل تصانیف کی تعداد ساٹھ ہے۔ بعض مؤرخین مثلاً عبدالحمید لاہوری ❶، محمد صالح کنبوہ ❷ اور خافی خان ❸ نے یہ تعداد سو (۱۰۰) سے زیادہ بتائی ہے، جو صحیح نہیں۔ شیخ نے اپنے ایک رسالے میں، جسے انھوں نے ''تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف'' کے نام سے موسوم فرمایا ہے، اپنی تالیفات کی فہرست درج کی ہے۔ اس میں انچاس (۴۹) کتابوں کے نام مندرج ہیں، لیکن اس رسالے کی تالیف کے وقت سلسلہ تصنیف جاری تھا۔ چنانچہ اس کے آخر میں رقم طراز ہیں:

هنوز سلسلۂ سخن دراز است و در فیض الٰہی باز۔ تا کجا رسد و بکجا رساند۔

(ابھی سلسلہ تصنیف جاری اور طویل ہے اور بابِ فیض خداوندی کھلا ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے اور وہ اسے کہاں تک پہنچاتا ہے۔)

اس کے بعد مزید گیارہ کتابیں تصنیف کیں، یعنی کل ساٹھ ہو گئیں۔ جو حضرات سو سے زیادہ کتابیں بتاتے ہیں، وہ شیخ کی ایک کتاب ''المکاتیب والرسائل'' کو اس تعداد میں شامل کرتے ہیں، جو چھوٹے بڑے اڑسٹھ رسائل پر مشتمل ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب مختلف رسائل و مسائل پر محیط ہے مگر درحقیقت یہ ایک ہی کتاب ہے جیسا کہ خود شیخ ممدوح نے اس کی وضاحت کی ہے:

ایں ہمہ را یک صحیفہ سازند و در یک جلد شیرازہ بہ بندد۔

(اسے ایک ہی کتاب سمجھا جائے اور تمام رسائل کی ایک ہی جلد بنائی جائے۔)

شیخ محدث کی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ وہ تمام اصناف علم پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے اور اپنے نقطہ فکر کی وضاحت میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ تفسیر، تجوید، حدیث، فقہ، عقائد، اخلاق، تصوف، سیرت، تاریخ، سیاست، منطق، فلسفہ، نحو وغیرہ تمام علوم میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ذیل میں موضوع کے اعتبار سے ان کی تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

### تفسیر:

تفسیر قرآن سے متعلق شیخ نے مندرجہ ذیل تین کتابیں تحریر کیں:

---

❶ بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۳۴۱، ۳۴۲۔

❷ شاہ جہان نامہ، (عمل صالح) ج ۲، ص ۳۸۴۔

❸ منتخب اللباب، ج ۱، ص ۲۴۰۔

تعلیق الہادی علی تفسیر البیضاوی: یہ تفسیر بیضاوی یعنی علامہ عبداللہ بن عمر بیضاوی کی مشہور تصنیف ''انوار التنزیل والاسرار التاویل'' کے چند مقامات پر حواشی ہیں۔ شیخ نے ان حواشی کے ذریعے تفسیر بیضاوی کے بعض ضروری مقامات کی توضیح کی ہے اور ان کے خیال کے مطابق بیضاوی میں جو زائد اور مشکل مباحث تھے، ان کو نکال دیا ہے تاکہ حواشی کی افادیت میں مزید اضافہ ہو سکے۔ شیخ کو ان حواشی کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ انھیں بیضاوی کے بعض مقامات سے شدید اختلاف ہے جس کا اظہار وہ ''نکات الحق'' میں بایں الفاظ کرتے ہیں:

بیضاوی رحمہ اللہ در تفسیر قرآن و شرح احادیث ازیں باب قباحتہا بسیار کردہ، تجاوز اللہ عنہ۔ واگر آں مواضع را بشمارم سخن دراز گردد۔

(یعنی علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے تفسیر قرآن اور تشریح احادیث میں بہت سی لغزشیں کی ہیں، اللہ انھیں معاف فرمائے۔ میں اگر ان مقامات کا شمار کرنے لگوں تو سلسلۂ گفتگو دراز ہو جائے۔)

افسوس ہے ان حواشی کا اب کوئی نسخہ دست یاب نہیں۔

شرح صدور تفسیر آیت النور: یہ سورۂ نور کی پینتیسویں آیت اللہ نور السموات والارض کی تفسیر ہے، جو ایک ہزار سے زائد سطور پر مشتمل تھی۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی اس کا قلمی نسخہ ۱۹۰۲ء تک شیخ محدث کی اولاد امجاد میں سے ایک بزرگ خان بہادر مولوی انوار الحق حقی دہلوی مرحوم کے کتب خانے میں دہلی میں موجود تھا❶۔ معلوم نہیں مرحوم کا کتب خانہ اب کہاں ہے اور کس حال میں ہے یا یہ تفسیر اس میں موجود ہے یا نہیں ہے۔

تحصیل الغنائم والبرکات بتفسیر سورۃ والعادیات: یہ سورہ والعادیات کے برکات وغنائم پر ڈھائی صفحے کا مختصر نوٹ ہے جو المکاتیب والرسائل میں شامل ہے۔

## تجوید و قرأت:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی قرأت و تجوید میں بھی مہارت رکھتے تھے اور یہ علم انھوں نے شیخ عبدالوہاب متقی سے حاصل کیا تھا۔ اس موضوع میں ان کے درک وکمال کا یہ عالم تھا کہ اس میں دو کتابیں تصنیف فرمائیں جو درج ذیل ہیں:

درۃ الفرید فی قواعد التجوید: یہ کتاب اب نایاب ہے اور غالباً برصغیر کے کسی کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اس نام کی ایک تصنیف حافظ طاہر اصفہانی کی بھی ہے۔

شرح العقیدۃ الجزریہ: شیخ کی یہ کتاب بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ایک نسخہ جو بہترین خط میں لکھا ہوا ہے اور ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء کا مکتوبہ ہے، اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ میں موجود ہے❷۔

❶ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۶۲۔

❷ لباب المعارف العلمیہ، کتاب نمبر ۱۰۹۲۔

حدیث:

شیخ کی بہت بڑی خدمت علم وہ ہے جو انھوں نے علم حدیث کی ترویج واشاعت کے لیے انجام دی۔ اس باب میں اس پورے خطہ برصغیر میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ تمام تذکرہ نگاروں نے اس میدان میں ان کی تگ وتاز کا نمایاں الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ خافی خان کہتا ہے:

درکمالات صوری ومعنوی وتحصیل علوم عقلی ونقلی، خصوص تفسیر وحدیث در ہندوستان ثانی نداشت ❶۔

یعنی (شیخ عبدالحق) صوری ومعنوی کمالات اور علوم نقلی وعقلی کی تحصیل کے سلسلے میں بالخصوص تفسیر وحدیث میں ہندوستان بھر میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

فقیہ ومحدث، بقیۃ السلف وحجۃ الخلف، جامع علوم ظاہر وباطن بود، علم حدیث بہ محروسہ ہندوستان از وشیوع یافتہ ❷۔

(وہ فقیہ ومحدث، بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، جامع علوم ظاہری وباطنی تھے۔ خطۂ ہند میں علم حدیث انہی کی مساعی سے اشاعت پذیر ہوا۔)

مآثر الکرام میں میر غلام علی آزاد بلگرامی علم حدیث سے متعلق ان کی خدمات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

بہ نشر علوم سیما علم شریف حدیث پرداختہ بہ نہجے کہ در دیار عجم احدے را از علمائے متقدمین ومتاخرین دست نداده است۔ ممتاز ومستثنیٰ گردید۔ در فنون علمیہ خاصۂ فن حدیث، کتب معتبرہ تصنیف کرد۔ چنانکہ علمائے زماں اعتنا بآں ورزیده دستور العمل خود دارند ❸۔

(اشاعت علوم، خصوصاً علم حدیث شریف کے نشر وذیوع میں پورے دیار عجم میں علمائے متقدین ومتاخرین میں سے کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ سب سے ممتاز ومستثنیٰ تھے۔ تمام فنون علمیہ بالخصوص فن حدیث سے متعلق مستند اور لائق اعتماد کتابیں تصنیف کیں، جن کو علمائے عصر قابل اعتنا گردانتے اور اپنے لیے راہنمائے عمل قرار دیتے ہیں۔)

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی مشہور تصنیف تذکرہ میں رقم طراز ہیں:

مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمر میں بڑی

---

❶ منتخب اللباب، ص ۵۵۱۔

❷ تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۰۹۔

❸ مآثر الکرام، دفتر ا ص ۱۸۸۔

برکت دی اور ان کے درس وتصنیف نے ایک پورا سلسلہ تعلیم ملک میں عام کیا۔

مولانا مزید لکھتے ہیں:

حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دور علم وتعلم کے بانی ہوئے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی، تصنیف وتراجم کی بنیاد ڈالی گئی۔ خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر ان کے صاحب زادے شیخ الاسلام نورالحق نے صحیح بخاری کا۔

نواب صدیق حسن خان ان کے متعلق ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

شیخ عبدالحق دہلوی، فقیہ حنفی و علامہ دین حنیفی است، واما بمحدث مشہور است و ترجمہ او بر مشکوٰۃ و جز آں از مؤلفات نافعہ ممعہ معروف...... دست گاہش در فقہ بیشتر از مہارت در علوم سنت سنیہ است، ولہٰذا جانب داری اہل رائے جانب او گرفتہ۔ معہذا جاہا حمایت سنت صحیحہ نیز نمودہ۔ طالب علم را باید کہ در تصانیف وے خذ ماصفا ودع ماکدر پیش نظر دارد❶۔

یعنی شیخ عبدالحق دہلوی فقیہ حنفی اور علامہ دین حنیفی ہیں۔ وہ محدث کی حیثیت سے مشہور ہیں اور ترجمہ مشکوٰۃ اور دیگر مؤلفات نافعہ ومفیدہ میں معروف......لیکن علوم سنت نبویہ میں مہارت کی نسبت فقہ میں زیادہ دست رس رکھتے ہیں۔ اس لیے اہل الرائے کے لیے جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ تاہم بہت سے مقامات میں سنت صحیحہ کی حمایت بھی فرماتے ہیں۔ طالب علم کو چاہیے کہ ان کی تصانیف سے استفادہ کرتے وقت خذ ماصفا ودع ماکدر کے اصول کو پیش نظر رکھے۔

نواب صاحب ﷫ ان کے بارے میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:

حق ایں است کہ شیخ عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ در ترجمہ عربی بفارسی یکے از افراد ایں امت است۔ مثل او در یں کاروبار خصوصاً دریں روزگار احدے معلوم نیست❷۔

(حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبدالحق ﷫ عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے میں اس امت کے یگانہ روزگار فرد ہیں۔ اس معاملے میں بالخصوص اس عہد میں بجز ان کے کسی اور کا پتا نہیں چل سکا جو ان کا ہم سر ہو۔)

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں:

اول من نشر علم الحدیث بارض الھند تصنیفاً و تدریساً❸۔

(شیخ عبدالحق محدث دہلوی پہلے عالم دین ہیں، جنھوں نے تصنیف وتدریس کے ذریعے سرزمین ہند میں علم حدیث کی نشرواشاعت کی۔)

---

❶ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار، ص ۱۱۲۔

❷ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار۔ ص ۱۱۲۔

❸ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰۱۔

مولوی فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں:

آپ ہی ہیں جنھوں نے پہلے پہل حدیث کا علم، عرب سے لا کر اس سے ہندوستان کو منور کیا اور اپنی تصنیفات سے علم حدیث کو ہند کے ہر ایک خطہ وقطعہ میں پھیلایا❶۔

بہر حال علم حدیث کی ترویج واشاعت میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور اس موضوع سے متعلق تیرہ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، جن میں بعض کتابیں بڑی ضخیم ہیں اور بعض مختصر! ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اشعۃ اللمعات شرح المشکوٰۃ: یہ فارسی زبان میں مشکوٰۃ شریف کی بڑی جامع اور مفصل شرح ہے۔ اس عظیم خدمت حدیث کا آغاز شیخ موصوف نے ۱۰۱۹ھ/ ۱۶۰۱ء کو دہلی میں کیا تھا، جس کا سلسلہ ۱۰۲۵ھ/ ۱۶۱۶ء تک جاری رہا۔ دیگر علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ چھ سال کی مسلسل محنت اور پیہم تگ وتاز کے بعد یہ اہم کام تکمیل کو پہنچا۔

اشعۃ اللمعات چار جلدوں پر محیط ہے، پہلی جلد میں ایک مقدمہ بھی ہے جو انتالیس (۳۹) صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ، علم حدیث، محدثین اور اقسام حدیث پر مشتمل ہے اور نہایت عالمانہ اور محققانہ مواد اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مقدمے میں اختصار کے ساتھ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، ابن ماجہ، دارمی، دارقطنی، بیہقی، رزین، نووی، ابن جوزی کے حالات بیان کیے ہیں۔ معلومات کے اعتبار سے یہ مقدمہ چوں کہ خاص اہمیت وافادیت کا حامل ہے، اس لیے ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء کو مطبع اعظم جون پور سے اس کو علیحدہ بھی شائع کیا گیا۔

اس مقدمے کے علاوہ اشعۃ اللمعات کی پہلی جلد، مشکوٰۃ کی مندرجہ ذیل پانچ کتابوں کے ترجمے پر مشتمل ہے:

۱۔ کتاب الایمان، ۲۔ کتاب العلم، ۳۔ کتاب الطہارت، ۴۔ کتاب الصلوٰۃ، ۵۔ کتاب الجنائز۔

دوسری جلد میں مندرجہ تحت چھ کتابیں شامل ہیں:

۱۔ کتاب الزکوٰۃ، ۲۔ کتاب الصوم، ۳۔ کتاب فضائل القرآن، ۴۔ کتاب الدعوات، ۵۔ کتاب اسماء اللہ تعالیٰ، ۶۔ کتاب المناسک۔

تیسری جلد درج ذیل نو کتابوں کو محتوی ہے۔

۱۔ کتاب البیوع، ۲۔ کتاب العتق، ۳۔ کتاب الحدود، ۴۔ کتاب الامارت والقضاء، ۵۔ کتاب الجہاد، ۶۔ کتاب الصید والذبائح، ۷۔ کتاب الاطعمۃ، ۸۔ کتاب اللباس، ۹۔ کتاب الطب والرقی۔

چوتھی جلد میں دو کتابیں ہیں جو یہ ہیں:

❶ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۹۔

۱۔ کتاب الادب، ۲۔ کتاب الفتن:

لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح: یہ عربی زبان میں مشکوٰۃ کی شرح ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تسوید وتحریر کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب شیخ ممدوح اشعۃ اللمعات کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اس اثنا میں بعض ایسے مباحث سامنے آئے جن کو فارسی میں منتقل کرنا مناسب نہ سمجھا، کیوں کہ فارسی اس دور کے عوام کی زبان تھی اور یہ وہ مباحث تھے، جن کی وضاحت عوام کے لیے بوجوہ خلاف مصلحت تھی، لہٰذا انھیں فارسی کے بجائے عربی کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اس ضمن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مختلف مباحث کی نزاکت کے پیش نظر فارسی اور عربی دونوں شرحوں کی تسوید شروع کی گئی اور عربی کی شرح فارسی سے پہلے مکمل ہوگئی❶۔

لمعات التنقیح سے شیخ محدث ۲۴؍رجب ۱۰۲۵ھ/ ۲۸؍جولائی ۱۶۱۶ء کو فارغ ہوئے۔ اس شرح کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بعض لغوی ونحوی مشکلات کی نہایت عمدگی سے عقدہ کشائی کی گئی ہے اور فقہی مسائل کی بہت سی پیچیدگیوں کو بہترین اسلوب سے حل کیا گیا ہے۔ اس کے آغاز میں ایک مقدمہ ہے جو بڑی جامعیت اور افادیت کا حامل ہے۔ یہ مقدمہ مولانا احمد علی سہارن پوری نے مشکوٰۃ کے متن کے ساتھ شائع کیا ہے۔

جمع الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین وترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین: یہ کتاب یعنی جمع الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین ان چالیس احادیث کا مجموعہ ہے، جن میں رسول اللہ ﷺ نے بادشاہوں اور حکمرانوں کو ہدایات ونصائح سے نوازا ہے۔ اور ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین، ان احادیث کے فارسی ترجمے کا نام ہے۔ یہ ترجمہ شیخ نے شاہ جہان کے لیے کیا تھا۔

جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ: اس کتاب کو شرح مشکوٰۃ کے خلاصے کی حیثیت حاصل ہے اور دو جلدوں پر محیط ہے۔ یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جو بقول شیخ ''شامل فوائد کثیرہ وعوائد عزیزہ'' ہے۔ اس کا انداز کیا ہے؟ شیخ فرماتے ہیں۔ ''در ہر باب یک دو تین حدیث ذکردہ وباقی احادیث بر مضامین آں اقتصار کردہ و اختصار نمودہ شدہ است❷۔''

یہ کتاب ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے مولوی انوار الحق دہلوی مرحوم کے کتب خانے میں موجود تھے❸۔

رسالہ اقسام حدیث: یہ عربی زبان میں علم حدیث سے متعلق ایک مفید رسالہ تھا۔ فہرست التوالیف میں شیخ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مولوی انوار الحق دہلوی مرحوم کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود تھا❹۔

---

❶ اشعۃ اللمعات، ج۱، ص۲۔

❷ فہرس التوالیف۔

❸ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۰۔

❹ ایضاً۔

رسالہ شب برأت: شیخ محدث کا یہ رسالہ فارسی زبان میں تھا۔ فہرست التوالیف میں اس کا نام مذکور نہیں۔ گزشتہ صدی تک اس کا قلمی نسخہ شیخ کے خاندان میں موجود تھا[1]۔

ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ماہ محرم سے لے کر ماہ ذی الحجہ تک یعنی سال بھر کے قمری مہینوں میں کن دینی امور کی انجام دہی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ عاشورۂ محرم کے باب میں جو صحیح احادیث مروی ہیں، وہ اس میں درج کر دی گئی ہیں اور ان توہمات کی تردید کی گئی ہے جو محرم کے سلسلے میں مشہور عوام ہیں۔ مثلاً یہ جو کہا جاتا ہے کہ جو شخص یوم عاشورہ کو سرمہ لگائے گا اسے کبھی آشوب چشم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ یا یہ کہ اس دن غسل کرنے والا کبھی کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوتا، شیخ نے اس کتاب میں ان باتوں کو لغو اور باطل قرار دیا ہے۔ پھر جو احادیث حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تعلق رکھتی ہیں ان پر محدثانہ نقطۂ نگاہ سے ناقدانہ بحث کی ہے۔ آخر میں حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے تعلقات کا ذکر فرمایا ہے۔ ماہ صفر کے بارے میں اس خیال کی تردید فرمائی ہے کہ یہ نامبارک اور منحوس مہینا ہے۔ شعبان، رمضان، شوال، ذی الحجہ کے ذکر میں روزہ، تراویح، عیدالفطر، صیام شوال، حج اور عیدالاضحیٰ وغیرہ کے متعلق مروی احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ ماہ ربیع الاول کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مختصر حالات درج کیے ہیں۔ ربیع الثانی کے ضمن میں اختصار کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح بیان فرمائے ہیں۔

یہ کتاب ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء کو کلکتہ سے اور ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء کو لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ ۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۲ء میں سبحان بخش شکارپوری نے ''اعمال ماثورہ'' کے نام سے اس کو مع ترجمہ دہلی سے شائع کیا تھا۔ اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

الاکمال فی اسماء الرجال: شیخ عبدالحق نے فہرس التوالیف میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ ڈاکٹر زبید احمد نے اپنی تصنیف ''دی کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی عربک لٹریچر'' میں حدیث سے متعلق عربی تصانیف کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کتاب کتب خانہ دہلی اور کتب خانہ بانکی پور میں دست یاب ہے اور علی الترتیب اس کا نمبر ۱۰۵ اور ۳۲۷ ہے۔

اسماء الرجال والرواۃ المذکورین فی کتاب المشکوٰۃ: اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ان تمام رواۃ حدیث کا تذکرہ ہے، جن کا ذکر مشکوٰۃ میں آیا ہے۔ سب سے پہلے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے معرض کتابت میں لائے گئے ہیں۔ شیخ کی یہ عمدہ ترین تصنیف اب تک اشاعت کے مراحل سے نہیں گزری۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بانکی لائبریری میں موجود ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی غالباً برصغیر کے دوسرے عالم ہیں، جنھوں نے اسما الرجال کے موضوع پر

---

[1] ...یات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۰۔

اس انداز کی کتاب تصنیف کی۔ اس سے پہلے صاحب مشارق الانوار امام حسن صغانی لاہوری (متوفی ۶۵۰ھ/ ۱۲۵۲ء) نے ''دارالسحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ'' تصنیف فرمائی۔ اس کتاب میں امام ممدوح نے ان مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ کے آٹھ سو کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وفات پائی۔ اس میں صحابہ کے اسمائے گرامی بترتیب حروف ہجا لکھے گئے ہیں۔

شرح سفر السعادۃ: سفر السعادۃ علامہ مجدالدین فیروز آبادی کی تصنیف ہے جو لغت کی مشہور کتاب قاموس کے منصف تھے۔ علامہ موصوف باقاعدہ ہندوستان سے تعلق تو نہ رکھتے تھے، البتہ دو مرتبہ وارد ہند ہوئے تھے۔ پہلی بار فیروز شاہ تغلق کے عہد میں، دوسری مرتبہ محمود شاہ تغلق کے زمانے میں۔ ہندوستان کے شاہی درباروں میں اس عالم دین کی بے حد قدر افزائی ہوئی اور انھیں شاہانہ سرپرستی کا مستحق سمجھا گیا۔ حدیث کے موضوع پر سفر السعادۃ ان کی ایک قابل قدر تصنیف ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کی وہ احادیث جو عبادات اور زندگی کے ضروری مسائل سے متعلق ہیں، جمع کی گئی ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کتاب کی گوناگوں افادیتوں کے پیش نظر اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی۔ لیکن چوں کہ علامہ فیروز آبادی خالص محدثانہ نقطۂ فکر کے حامل ہیں اور صرف رسول اکرم ﷺ کے اقوال و افعال اور فرامین اقدس کو مشعل راہ اور مرکز دلیل ٹھہرانے کے حامی ہیں، اس کے مقابلے میں وہ آئمہ مجتہدین سے متعدد مسائل میں اختلاف بھی کرتے ہیں، اس لیے حضرت شیخ ان سے مختلف رجحان رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ (علامہ فیروز آبادی) ''در مبالغہ وافراط از حد اعتدال و جادۂ انصاف بیروں رفتہ است۔''

شیخ محدث سفر السعادۃ کے بارے میں یہ تو مانتے ہیں کہ اس کے مصنف کا مقصد رسول اکرم ﷺ کے اعمال مبارکہ کو حدیث کی روشنی میں ثابت کرنا ہے۔ ''مقصد وے دریں کتاب آنست کہ اعمال شریفہ حضرت نبویہ را از عبادات و عادات با حدیث اثبات کردہ، و تصحیح نمودہ و ہر دو انکار بر آنچہ مخالف آں از مذاہب اربعہ واقع شدہ تصریح کردہ است۔'' لیکن ساتھ ہی رقم طراز ہیں۔ ''پس در شرح تائید مذاہب اربعہ خصوصاً مذہب حنفی و معارضہ کلام مصنف ادعائے صحت احادیث موافق مدعائے خود نمودہ، رقم رد و بطلان برخلاف آں کشیدہ است، کردہ شد۔''

بہرحال شیخ عبدالحق کی شرح سفر السعادۃ تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں ان احادیث اور ان کے اسناد و رجال پر بحث کی گئی ہے جو علامہ فیروز آبادی نے کتاب میں درج فرمائی ہیں۔ حصہ دوم میں مجتہدین کے فقہی رجحانات کو زیر بحث لایا گیا ہے، بالخصوص مذہب حنفی کے اصولوں کی حمایت کی گئی ہے، اور درحقیقت جیسا کہ خود شیخ فرماتے ہیں، سفر السعادۃ کی شرح لکھنے کا اصلی اور بنیادی باعث یہی ہے۔ حصہ سوم میں احکام شرعی کو بتفصیل بیان کیا گیا ہے۔

سفر السعادۃ کی یہ شرح شیخ نے پچھتر ۷۵ سال کی عمر میں لکھنا شروع کی تھی، انھیں خیال تھا کہ شاید وہ

یہ اہم کام مکمل نہ کر پائیں اور اس کی تتمہ ی لاہور وغیرہ میں موجود ہیں۔ بانکی پور میں اس کا ایک ایسا نسخہ بھی
نور الحق کو اس کے مکمل کرنے کی وصیت فرما
درج کر دی جو شرح کرتے وقت ان کے پیش
کام کی تکمیل کے سلسلے میں کتابوں کی تلاش میں دف
"وصیت می کنم فرزند عزیز نور دیدۂ دانش ..... ایں
مہم را صورت دہد ❶۔

شرح سفر السعادۃ ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۶ء میں کلکتہ سے اور ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۵ء اور ۱۹۰۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے قلمی نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں مثلاً لندن کی انڈیا آفس لائبریری، حیدر آباد دکن، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، کلکتہ مدرسہ، پشاور اور بانکی پور کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ بانکی پور کا نسخہ خود حضرت شیخ محدث کے ہاتھ کا مکتوبہ ہے اور اس کے آخر میں یہ الفاظ درج ہیں:

ثم انہ کان تسوید ھذا الکتاب بین الصلوٰۃ من یوم الاثنین الرابع والعشرین من شھر جمادی الاولیٰ سنۃ ست عشر والف والحمدللہ۔ ثم تم انتساخ ھذہ النسخۃ و مقابلتھا علیٰ ید مولفہ الفقیر الی اللہ عبدالحق بن سیف الدین بن سعد اللہ سحرۃ یوم الثلاثاء ألسابع والعشرون من جمادی الاخریٰ سنۃ الف و ثلاث و ثلاثین من ھجرۃ سید الاولین والاخرین ❷۔

انڈیا آفس لائبریری لندن کا نسخہ خود مصنف کا تصحیح شدہ ہے۔ حیدر آباد (دکن) کا نسخہ ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء) کا ایشیاٹک سوسائٹی کا ۱۰۸۷ھ کا اور کلکتہ مدرسہ کا ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء کا مکتوبہ ہے۔

شرح سفر السعادۃ کا ایک نسخہ مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا اور یہ وہ نسخہ تھا جو شیخ کے زیر درس رہ چکا تھا۔ مرزا صاحب اس نسخے کو نہایت احتیاط اور قدر سے رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے ایک دوست فرید الدین نے یہ نسخہ عاریتاً مانگا تو مرزا صاحب نے ایک شخص محمد عظیم کے ہاتھ بھیج دیا مگر ساتھ ہی خط بھی لکھا کہ یہ نسخہ میرے نزدیک قابل احترام ہے کیوں کہ یہ مصنف کے درس میں رہ چکا ہے اور اس پر خود شیخ عبدالحق کے ہاتھ کے حواشی لکھے ہوئے ہیں۔ میں اس کی بے حد قدر کرتا ہوں، آپ بھی اس کی طرح قدر کریں، جس کا یہ مستحق ہے۔ مرزا مظہر جانان جاناں کے الفاظ یہ ہیں:

نسخہ شرح سفر السعادۃ موجود است، اما میان ما وشما وعدہ آں نبود، ہرگاہ شما طلبید ید مستحق تر از شما کیست۔ آں را ہم حوالہ محمد عظیم کردیم۔ ایں نسخہ از درس مصنف گزشتہ و حواشی بدست مصنف دارد و خط شیخ عبدالحق رامی شناسم۔ قدر آں را بدانید، و آب و تاب نگاہ دارید چنانچہ ہست ❸۔

❶ ملاحظہ ہو شرح سفر السعادۃ: ص ۲،۴۔
❷ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۵ بحوالہ فہرست بانکی پور لائبریری، ج ۱۴، ص ۴۷۔
❸ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۵، بحوالہ کلمات طیبات، ص ۶۶۔

اس انداز کی کتاب تصنیف کی۔ اس سے پہلے صاحب مشارق الانوعہ احادیث ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ
۱۲۵۲ء) نے ''دارالسحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ'' تصنیف فر کی طرف سے کسی صحابی رسول کو جنت کی
کا ذکر کیا ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ کے آٹھ سو کے قریب صحیح احادیث بھی درج کر دی ہیں جو اہل بیت رسول
ے اسمائے گرامی بترتیب حروف ہجا لکھے گئے ہیں۔ اثیر کی جامع الاصول اور علی متقی کی تصنیف کنز العمال
سے جمع کی ہیں۔ ڈاکٹر زبید احمد سفر السعادۃ علامہ مجد الدین فیروز عربک لٹریچر'' میں لکھتے ہیں کہ اس کا ایک نسخہ دہلی
کے ایک کتب خانے میں موجود ہے۔ ہندوستان سے

ترجمہ مکتوب النبی فی تعزیۃ ولد معاذ بن جبل: یہ رسول اللہ ﷺ کے اس تعزیتی مکتوب کا فارسی ترجمہ ہے جو حضور ﷺ نے اپنے مشہور صحابی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ان کے بیٹے کی وفات کے موقعے پر لکھا تھا۔ شیخ کی تصنیف المکاتیب والرسائل میں اس مکتوب کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے جو دو صفحوں پر مشتمل ہے [1]۔

## فقہ:

علم فقہ سے متعلق شیخ محدث نے تین کتابیں تصنیف فرمائیں، جن کا مختصر تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے۔

فتح المنان فی تائید النعمان: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور فقہ حنفی کی تائید میں ہے۔ اس میں شیخ نے مختلف عنوانات قائم کر کے احادیث جمع کی ہیں اور ان میں ائمہ اربعہ کے منضبط شدہ مسائل بیان کیے ہیں۔ آخر میں محاکمہ ہے اور مسائل فقہ کے سلسلے میں مآخذ ائمہ پر بحث ہے جس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ماخذ فقہی کو دیگر ائمہ کے ماخذ پر ترجیح دی ہے۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں دست یاب ہے۔

الفوائد: یہ بھی فقہ اور عقائد کے بارے میں شیخ کا ایک رسالہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔

ہدایت الناسک الی طریق المناسک: یہ رسالہ مناسک حج اور آداب زیارت حرمین کے متعلق ہے۔

## عقائد:

عقائد اسلام سے متعلق شیخ کی کتاب تکمیل الایمان وتقویۃ الامان ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ اپنے موضوع میں یہ ایک جامع کتاب ہے، جس میں ایمان، اس کی نوعیت، عذاب قبر، جبر و اختیار، بعثت، معراج، شفاعت، جنت و دوزخ، توبہ، استمداد از قبور، معجزات، اہل بیت وغیرہ عنوانات پر اہل سنت کے نقطہ نظر کو نہایت وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی اور کئی دفعہ چھپی۔ ۱۸۷۳ء میں میر علی نے اس کا اردو ترجمہ ''سبیل الجنان'' کے نام سے کان پور سے شائع کیا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں یہ دوسری مرتبہ طبع ہوئی۔

تکمیل الایمان کے قلمی نسخے برٹش میوزم، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد، انڈیا آفس لائبریری لندن،

[1] ملاحظہ ہو المکاتیب والرسائل، ص ۲۸۶ تا ۲۸۸۔

بانکی پور لائبریری اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور وغیرہ میں موجود ہیں۔ بانکی پور میں اس کا ایک ایسا نسخہ بھی ہے جو خود مصنف رحمہ اللہ کا تصحیح شدہ ہے ❶۔

## تصوف:

تصوف کے مختلف گوشوں کے متعلق شیخ عبدالحق نے دس کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

تنبیہ العارف بما وقع فی العوارف: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس کی تصنیف کا پس منظر شیخ عبدالقادر جیلانی کا یہ قول ہے:

قدمی هذا علی رقبة کل ولی الله۔

کہ میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف میں اس قول پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر نے یہ بات بحالت سکر کہی تھی۔ شیخ عبدالحق نے تنبیہ العارف ما وقع فی العوارف میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی نے یہ بات بحالت صحو کہی تھی اور اللہ کے حکم کے مطابق کہی تھی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ رام پور لائبریری میں موجود ہے۔ رام پور کی فہرست کتب میں اس کا نام الرسالة فی بیان قول قدمی هذا علی رقبة کل ولی الله درج ہے۔

تحصیل التعرف فی معرفة الفقة والتصوف: یہ بھی عربی میں ہے۔ اس میں فقہ اور تصوف یا شریعت اور طریقت میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ مرآة الحقائق میں لکھا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ مولوی انوار الحق حقی کے کتب خانے میں موجود تھا۔

شرح فتوح الغیب: فتوح الغیب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے ۷۸ مواعظ کا دلچسپ مجموعہ ہے جس میں دینی مسائل کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں بطریق تصوف بیان کیا گیا ہے۔ شیخ عبدالحق دہلوی نے ''شرح فتوح الغیب'' کے نام سے فارسی میں اس کی شرح قلم بند کی۔ یہ کتاب ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء کو مکمل ہوئی۔ ''شرح فتوح الغیب'' ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں ''فتوح الغیب'' کے متن کے ساتھ لاہور سے چھپی تھی۔ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے بھی شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے بھی یورپ اور برصغیر کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔

ترجمہ غنیۃ الطالبین: غنیۃ الطالبین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ اس میں شیخ نے بہت سے دینی مسائل بیان کیے ہیں، جن میں ایک بحث تہتر فرقوں کے متعلق ہے، جو بڑی علمی بحث ہے۔ شیخ عبدالحق نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ معلوم نہیں یہ ترجمہ کہیں موجود ہے یا نہیں۔

❶ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۷۸۔

انتخاب المثنوی المولوی المعنوی: یہ کتاب دو ہزار تین سو سطور پر مشتمل تھی۔ اب نایاب ہے۔

توصیل المرید الی المراد بہ بیان الاحزاب والاوراد: یہ فارسی زبان میں ایک رسالہ ہے جس میں ادعیہ و اوراد کے بارے میں محدثین اور مشائخ کے نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء کو یہ رسالہ مطبع مفید عام آگرہ سے چھپا تھا۔

مرج البحرین فی الجمع بیان الطریقین: اس میں قرآن و حدیث اور کتب تصوف کے حوالوں سے شریعت و طریقت، تصوف و فقہ اور علم و عقل کے بارے تعلیمات بیان کی گئی ہے۔ کتاب فارسی میں ہے اور تیرہ وصال پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۲۵۶ھ/ ۱۸۴۰ء میں مطبع عبدالرحمٰن سے اور ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء کو مطبع محمدی کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ ''وصال السعدین'' کے نام سے مولوی غوث محمد فرخ آبادی نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء کو مطبع نامی لکھنؤ میں چھپا۔ مولوی شیخ عبدالقادر نے ''شرح البحرین'' کے نام سے فارسی زبان میں اس کی شرح بھی سپرد قلم کی۔ بانکی پور لائبریری میں مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین کا ایک ایسا قلمی نسخہ موجود ہے، جو خود شیخ عبدالحق محدث کا تصحیح شدہ ہے۔

نکات الحق والحقیقہ من باب معارف الطریقہ: یہ فارسی زبان میں ہے اور تصوف کے مختلف مسائل پر مشتمل ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مولوی محمد یوسف مراد آبادی نے یہ کتاب مطبع احتشامیہ مراد آباد سے شائع کی تھی۔ لطائف الحق کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

جواب بعض کلمات شیخ احمد سرہندی: حضرت مجدد الف ثانی کے نام شیخ کا یہ ایک طویل مکتوب ہے۔

رسالہ وجودیہ: یہ شیخ محدث کا ایک رسالہ ہے جو مولوی انوار الحق حقی دہلوی کے کتب خانے میں موجود تھا❶۔

## اخلاق:

آداب و اخلاق کے موضوع پر شیخ محدث نے چار کتابیں تصنیف فرمائیں، جن کا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے:

آداب الصالحین: یہ کتاب درحقیقت امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء علوم الدین کے چند ابواب کا فارسی زبان میں ایک خلاصہ ہے، جو چھپ چکا ہے۔ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں نواب الدین خان دہلوی نے ''ہادی الناظرین'' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔ ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں یہ اردو ترجمہ دوسری دفعہ شائع ہوا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مولانا عبدالعزیز کی وساطت سے آداب الصالحین کا ایک ایسا قلمی نسخہ دیکھا تھا، جس کی تصحیح خود کتاب کے مصنف شیخ محدث دہلوی نے اپنے ہاتھ سے کی تھی❷۔

❶ مرآۃ الحقائق، ص ۵۵۔

❷ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۸۸۔

آداب اللباس: اس رسالے میں شیخ نے لباس کے بارے میں اتباع سنت کی تلقین فرمائی ہے اور اس لباس کی تفصیل بیان کی ہے جو شرعاً ممانعت اور کراہت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم، برلن لائبریری، اور بانکی پور وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ایک مرتبہ یہ رسالہ اردو ترجمے کے ساتھ چھپ بھی چکا ہے۔

آداب المطالعۃ والمناظرہ: یہ ایک مثنوی ہے علمائے [illegible] نے طالب علمی کے زمانے میں آداب مناظرہ اور آداب گفتگو کے متعلق لکھی تھی۔ یہ مثنوی اب دست یاب [illegible]۔

تسلیۃ المصاب لنیل الاجر والثواب: اس رسالے میں مصیبت کے وقت صبر کرنے اور اللہ سے اجرو ثواب حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

## وظائف واوراد:

وظائف واوراد اور اعمال کے موضوع سے متعلق شیخ نے پانچ کتابیں تصنیف کیں جو یہ ہیں:

اجوبۃ الاثنا عشر فی توجیہ الصلوٰۃ علی سید البشر: اس کا ایک قلمی نسخہ مولوی انوار الحق حقی دہلوی کے کتب خانے میں ۱۹۰۲ء تک موجود تھا[1]۔

ترغیب اہل السعادات علی تکثیر الصلوٰۃ علی سید الکائنات: یہ فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے اور درود شریف کی فضیلت سے متعلق ہے۔

رسالہ عقد انامل: یہ فارسی زبان میں انگلیوں پر اوراد کا شمار کرنے کے بارے میں ایک رسالہ ہے۔

مطلب الاعلیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ: اس رسالے میں اسمائے الٰہی کے خواص بیان کیے گئے ہیں: اس کا اردو ترجمہ مع متن کے مولوی قطب الدین نے محرم ۱۲۶۹ھ/ نومبر ۱۸۵۲ء کو مطبع مصطفائی لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔

## منطق اور فلسفہ:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے منطق اور فلسفہ کے موضوع سے متعلق عربی زبان میں تین کتابیں قلم بند کیں۔

بناء المرفوع فی ترصیص مباحث الموضوع۔

درۃ البهیه فی اختصار الرسالة الشمسیه۔

شرح شمسیه۔

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث بحوالہ مرآۃ الحقائق، ص ۴۸۔

## تاریخ:

تاریخ ایک نہایت اہم موضوع ہے۔اس پر شیخ محدث تین کتابیں ضبط تحریر میں لائے، جو یہ ہیں:

جذب القلوب الی دیار المحبوب: یہ فارسی زبان میں مدینہ طیبہ کی تاریخ ہے اور مندرجہ ذیل سترہ ابواب کو محتوی ہے۔

اسمائے ایں بلدۂ عظیم۔

در ذکر فضائل ومحامد وے کہ بہ احادیث وآثار بہ ثبوت رسیدہ۔

در اخبار سکان ایں بقعہ کرامت نشان در قدیم الزمان۔

در انبعاث باعثہ قدوم سید الکائنات بدیں بلدہ۔

در ہجرت نمودن سید المرسلین۔

در کیفیت عمارت مسجد نبوی۔

در میان تغیرات وزیارتہا کہ در مسجد شریف بعد از حضرت راہ یافتہ۔

در فضائل مسجد شریف وروضہ آنحضرت ﷺ۔

در ذکر عمارت مسجد قبا وبیان سائر مساجد نبوی۔

در ذکر بعض آثار متبرکہ کہ بشرف حضور فائض النور مشہور اند۔

در ذکر بعض اماکن شریفہ کہ در مابین مکہ ومدینہ مشہور ومعروف اند۔

فضائل مقبرۂ شریفہ۔

فضائل جبل احد وشہدا۔

فضائل زیارت حضرت سید الانام۔

در حکم زیارت قبر شریف۔

در آداب زیارت حضرت سید الانام واقامت در آں عالی مقام۔

فضائل وآداب صلوٰۃ بر سید کائنات۔

اس کتاب کی تالیف میں حضرت شیخ نے زیادہ تر سید نورالدین علی کی تصنیف ''وفاء الوفاء باخبار المصطفیٰ'' سے استفادہ کیا ہے۔اس کی تسوید کا آغاز ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء کو مدینہ منورہ میں کیا تھا اور اختتام ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء کو دہلی میں ہوا۔اس بات کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وابتدائے تسوید ایں حروف در سنہ ثمان وتسعین وتسع مآتہ در مدینہ منورہ بودہ وتوفیق تبییض آں در سنہ احدی والف در بلدۂ دہلی یافتہ [1]۔

---

[1] جذب القلوب، ص ۶۔

جذب القلوب الی دیار المحبوب اور ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ سے دو مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے بھی سب سے پہلے متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ بزم لندن اور بانکی پور وغیرہ میں موجود ہیں۔ ''منہاج النبوۃ'' کے میں شائع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ''تاریخ مدینہ'' جو چھپ چکا ہے۔

ہندوستان کی بانکی پور لائبریری کی نسائخ ہند کا یہ مستند اور قابل اعتماد تذکرہ ہے اور اس موضوع پر وفات سے صرف چار سال پیشتر۔ ۹ ؍صفر ۱۰۴۸ھ/ ۱۶۳۸ء کے علمائے ۔۔ اء کو نقل کیا گیا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جو اچھی حالت میں ہے ❶۔ سکتا

ذکر ملوک: یہ تاریخ سلاطین ہند ہے جو ذکر ملوک یا تاریخ حقی کے نام سے موسوم ہے۔ کتاب سلطان شہاب الدین محمد غوری سے جلال الدین اکبر کے چالیسویں سن جلوس تک کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کا آغاز قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتا ہے:

﴿اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ﴾❷

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم کے خیال کے مطابق یہ کتاب ''غالباً (شیخ محدث کے) قیام فتح پور سیکری کے زمانے میں شروع ہوئی'' جو اکبری حکومت کے پورے جاہ و جلال کا دور تھا اور اس کے چالیسویں سن جلوس یعنی شیخ محدث کے حجاز سے واپسی کے تین چار سال بعد (۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء میں) پایہ تکمیل کو پہنچی، مگر اس میں فاضل مصنف نے اکبر کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی۔ شیخ محدث فرماتے ہیں:

واز اول جلوس تا الآن کہ از مدت سلطنت عظمیٰ و دولت کبریٰ ایں شہنشاہ عالی نژاد عالم مدار اقالیم شاں زیادہ بر چہل سال رفتہ است۔

شیخ ممدوح کتاب کے آخری باب میں بادشاہ کی فتوحات اور حکومت کے قواعد وضوابط وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ باتیں قلم بند کرنا چاہتے تھے، مگر اس کی فرصت نہ ملی، تاہم اس کے بعد کچھ اضافے ہوتے رہے ہیں۔

ذکر ملوک ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ البتہ اس کے قلمی نسخے حیدر آباد دکن، مدراس، علی گڑھ وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ علی گڑھ کا نسخہ بڑا قدیم ہے اور ۱۰۳۰ھ/ ۱۶۲۱ء کا کتابت شدہ ہے۔ یعنی مصنف کی زندگی میں اس کی کتابت ہو چکی تھی۔



❶ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۴۔ بحوالہ فہرست مرتبہ براؤن، ص ۳۵۵۔

❷ یہ سورۂ آل عمران کی چھبیسویں آیت ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

اے اللہ! مالک تمام ملک کے، تو جس کو چاہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہے ملک چھین لیتا ہے۔ تیرے اختیار میں ہے سب بھلائی، بلاشبہ تو ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

## تاریخ:

تاریخ ایک نہایت اہم موضوع ہے۔اس پر شیخ محدث کی ایک رسالہ سیاسی نوعیت کا ہے۔اس کو ضبط تحریر میں لانے

جذب القلوب الی دیار المحبوب: یہ فارسی زبان میں ہے، جہاں گیر قواعد سلطنت، اس کے بنیادی احکام، اطوار و آداب اور ارکان و اسباب سے باخبر ہوئے ... ن التوالیف میں شیخ اس کی وجہ تالیف کے بارے میں فرماتے ہیں:

در بیان قواعد سلطنت و احکام ارکان و اسباب و آلات تحصیل آں و اوضاع آداب ایں امر عظیم الشان بہ اسم سامی سلطان الوقت و ملک الزمان خلد اللہ ملکہ۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ ۱۹۴۷ء سے قبل دہلی میں سید ظہیر الحسن صاحب کے کتب خانے واقع قرول باغ میں دیکھا تھا۔اور کسی کتب خانے میں اس کا کوئی قلمی نسخہ نہیں ہے۔

## تذکرہ و سیرت:

سیرت و تذکرہ کے موضوع کے تحت شیخ کی مندرجہ ذیل سات تصانیف ہیں:

مدارج النبوۃ: اس میں رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے مفصل حالات بیان کیے گئے ہیں۔کتاب بارہ سو سے زائد صفحات کو شامل ہے اور ذیل کی ترتیب سے رسول اکرم کے سوانح اقدس کو پانچ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے:

قسم اول: در ذکر فضائل و کمالات، اخلاق و صفات۔

قسم دوم: در ذکر نسب و ولادت۔

قسم سوم: در ذکر وقائع سنوات از ابتدائے ہجرت تا وفات۔

قسم چہارم: در ذکر حدوث مرض و غسل و تکفین وغیرہ۔

قسم پنجم: در ذکر اولاد طاہرہ و ازواج مطہرہ۔

مدارج النبوۃ اکبری عہد میں لکھی گئی اور ان حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی جن میں لوگوں کا روحانی تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات ستودہ صفات سے منقطع ہو رہا تھا اور احکام شریعت اور امور سنت سے رغبت باقی نہ رہی تھی۔اس دور میں شیخ محدث نے ضروری خیال فرمایا کہ ملک کے عوام و خواص کو رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے پاکیزہ واقعات سے روشناس کرایا جائے۔یہ بات شیخ نے خود ہی بیان فرمائی [1]۔

مدارج النبوۃ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء میں فخر المطابع دہلی اور ۱۲۷۱ھ اور ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء میں مظہر العجائب

[1] ملاحظہ ہو مدارج النبوۃ، ج ۱، ص ۳۔

پریس سے طبع ہوئی۔ علاوہ ازیں ۱۸۶۷ء اور ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ سے دو مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے بھی انڈیا آفس لائبریری لندن، جرمنی، برٹش میوزم لندن اور بانکی پور وغیرہ میں موجود ہیں۔ ''منہاج النبوۃ'' کے نام سے خواجہ عبدالمجید نے اس کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا جو چھپ چکا ہے۔

اخبار الاخیار: فارسی زبان میں علما و مشائخ ہند کا یہ مستند اور قابل اعتماد تذکرہ ہے اور اس موضوع میں اس کو بنیادی مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ برصغیر کے علمائے عظام اور مشائخ کرام کے واقعات و حالات لکھنے اور معلوم کرنے والا کوئی شخص اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ اس کے مطالعہ سے شیخ کے وسعت معلومات کا پتا چلتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بزرگان دین سے انتہائی عقیدت کے باوجود تحقیق و تفحص کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ اخبار الاخیار میں شیخ نے اپنے بعض اسلاف اور خود اپنے کچھ ذاتی واقعات بھی اختصار کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ان کی زندگی ہی میں اس کتاب کو اہل علم میں شہرت و قبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ جب یہ کتاب بادشاہ ہند جہاں گیر کے سامنے آئی تو اس نے اس کی بہت تعریف کی اور شیخ کی محنت و کاوش کو خراج تحسین پیش کیا ❶۔

یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی سے ۱۳۰۹ھ اور ۱۳۳۲ھ اور ۱۹۱۴ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے بھی بوڈلین، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، برٹش میوزم لندن، کیمبرج یونیورسٹی اور بانکی پور وغیرہ کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔

احوال ائمہ اثنا عشر خلاصہ اولاد سید البشر: یہ بارہ اماموں کے حالات پر ایک رسالہ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

انوار الجلیلہ فی احوال مشائخ الشاذلیہ: یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں ہے اور مشائخ سلسلہ شاذلیہ کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔

زبدۃ الآثار: یہ عربی زبان میں ہے اور شیخ نورالدین ابوالحسن بن یوسف (۶۴۴ھ۔۷۱۳ھ/ ۱۲۴۷ء سے ۱۳۱۳ء) کی تصنیف ''بہجۃ الاسرار'' کی تلخیص ہے۔ بہجۃ الاسرار شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات میں ایک قدیم اور مستند کتاب ہے۔ زبدۃ الآثار ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا فارسی ترجمہ خود شیخ عبدالحق محدث نے داراشکوہ کی فرمائش پر کیا تھا۔

مطلع الانوار البہیہ فی الحلیۃ النبویۃ: اس میں رسول اکرم ﷺ کا حلیہ مبارک بیان کیا گیا ہے۔

## علم نحو:

علم نحو سے متعلق شیخ کی دو کتابیں ہیں، جو یہ ہیں:

❶ دیباچہ تزک جہاں گیری، ص ۲۵۸۔

حاشیۃ الفوائد الضیائیہ: نحو کی مشہور کتاب شرح جامی پر حاشیہ ہے۔

افکار الصافیہ فی ترجمۃ کتاب الکافیہ: یہ کتاب انھوں نے زمانہ طالب علمی میں، جب کہ وہ صرف پندرہ یا سولہ سال کی عمر کے تھے، کافیہ کے بعض مباحث کے بارے میں لکھی۔

## ذاتی حالات سے متعلق:

شیخ نے بعض ایسی کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں، جن میں اپنے ذاتی حالات درج کیے ہیں اور ساتھ ہی بعض ان بزرگان دین کے کوائف بیان کیے ہیں، جن سے ان کے ذاتی مراسم تھے یا ان سے عقیدت اور محبت کے تعلقات استوار تھے۔ اس قسم کی کتابیں چار ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

اجازت الحدیث فی القدم والحدیث: اس میں شیخ نے اپنی اسناد حدیث تحریر فرمائی ہیں۔

تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف: یہ ان کی تصانیف کی ایک فہرست ہے، جو انھوں نے خود مرتب کی تھی۔ آغاز کتاب میں دہلی کے چند شعرا اور مصنفین کے حالات بھی مندرج ہیں۔ یہ کتاب سب سے پہلے مطبع عزیزی رام پور میں چھپی۔ پھر ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ بعدازاں حیدر آباد دکن سے سید شمس اللہ قادری نے ''تذکرۂ مصنفین دہلی'' کے نام سے اس کا ابتدائی حصہ شائع کیا تھا۔

زاد المتقین الی طریق الیقین: اس میں شیخ علی متقی، شیخ عبدالوہاب متقی، اور ان شیوخ و اساتذہ کے حالات درج ہیں، جن سے شیخ محدث نے مکہ مکرمہ میں استفاضہ و استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں اپنے ذاتی واقعات بھی شامل کتاب ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں شیخ نے وضاحت کی ہے کہ اس میں وہ واقعات بیان کیے گئے ہیں جو دو سال قیام مکہ کے دوران میں ان کے مشاہدہ یا سماعت میں آئے۔ الفاظ یہ ہیں:

تامدت دو سال و کسرے بحالت قیام مکہ معظمہ آنچہ دیدم یا شنیدم ضبط کردم۔

یہ کتاب شیخ نے مکہ معظمہ میں لکھنا شروع کی تھی مگر ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء میں ہندوستان آ کر مکمل کی۔

وصیت نامہ: اس میں شیخ ممدوح نے اپنی وصیتیں درج فرمائی ہیں۔

## خطبات:

فصول الخطب لنیل اعالی الرتب: اس میں شیخ نے اپنے خطبات جمع کیے تھے۔ غالباً خطبات کا یہ قیمتی مجموعہ اب نایاب ہے۔

## مکاتیب:

کتاب المکاتیب: یہ شیخ کے ان ۶۸ مکتوبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بعض اہم اور ضروری مسائل

کے بارے میں خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ابوالمعالی، شیخ عبداللہ نیازی، نواب مرتضیٰ خاں، عبدالرحیم خان خاناں اور شیخ فرید کے نام تحریر کیے۔ ان کے علاوہ اس میں شیخ ابوالخیر اور فیضی وغیرہ کے نام بھی بعض مکتوبات درج ہیں۔ مکتوبات میں نہایت تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ بعض اہم امور کو مدار بحث ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ مجموعہ مکاتیب ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء کو مطبع مجتبائی دہلی میں چھپا۔ پھر ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء اسی مطبع سے اخبار الاخیار کے حاشیے پر شائع ہوا۔

صحیفۃ المودۃ: یہ شیخ کے دوستوں کے نام بصورت مثنوی مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے۔ غالبًا اس مثنوی کا اب کوئی نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔

## شعروشاعری:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی بہت اچھے شاعر بھی تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ کہنا چاہیے کہ شعروسخن کا یہ ذوق انھیں وراثت میں ملا تھا۔ ان کے والد شیخ سیف الدین سیفی، چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی اور دادا شیخ فیروز بھی شاعرانہ ذوق رکھتے تھے اور شیخ موصوف کے خاندان میں یہ ذوق شیخ فیروز کے زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ شیخ عبدالحق اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

معنی حلویت وشعروظرافت درخانۂ ما ازوے پیدا شد۔

یعنی ہمارے خاندان میں لطافت کلام، شعروشاعری اور حلاوت وظرافت انہی (یعنی شیخ فیروز) کے عہد سے پیدا ہوئی۔

شیخ محدث کی رغبت شعر کے متعلق معارج الولایت کے مصنف رقم طراز ہیں:

در شعر نیز رغبتے تمام داشت...... وحقی تخلص خود را نہادے، چنانچہ در کتب ورسائل ایشاں اشعار ایشاں مکتوبست۔

یعنی (شیخ عبدالحق محدث) شعرگوئی میں کامل رغبت رکھتے تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی کتب ورسائل میں ان کے اشعار درج ہیں۔

نظام الدین بخشی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

زبان شعر دارد:

شیخ عبدالحق شاعرانہ اسلوب کلام کے مالک تھے۔

شیخ کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

حقی توزِ تاریخ و حکایات گوئی    در راہ تتبع روایات مپوئی
در زاویۂ فقر نشستی، کارے    جز ذکر خدا، نفی و اثبات مجوئی

حقی زپئے قصہ و افسانہ شدی　　چوں مردم روزگار فرزانہ شدی
درولش ترازِ ذکر شاہاں چہ غرض　　مفتونِ سخن گشتی و دیوانہ شدی

---

مقصودِ اہل ذوق زِ ذکرِ گزشتگاں　　تنبیہ عبرت است چہ مسکیں چہ بادشاہ

---

حقا بیانِ شوق بپایاں نمی رسد　　کو تاہ از، قصۂ دررو دراز را

---

دوش از کثرت اغیار نجاتم دادند　　روہ بسوئے حرم وحدتِ ذاتم دارند
حقی از گوشۂ دہلی نہ نہم پابیروں　　خود گرفتیم کہ ملک گجراتم دادند

---

چوں من میرم چہ حاصل گر لبت آرام جاں باشد
من از حسرت بمیرم، او بکام دیگراں باشد
بہر چوریکہ آں مہ می کند از جا مروحقی
کہ بد خوئے مرا شاید کہ مقصود امتحاں باشد

---

عجب ز اطوارِ خود پسندانست　　طور ما طور درد مندانست
ہیچ چیزے چو درد مندی نیست　　کہ در بوے خود پسندی نیست

---

صد شکر کہ از تشنگی غم رستم　　چو قطرہ بدریائے کرم پیوستم
برکشتی توفیق ازل بنشتم　　وزِ زمزم قدس چہرۂ دل شستم

---

ایں نامہ کہ پایۂ ترقی آمد　　شائستہ اقبال و ترقی آمد
جنبیدن خامہ در وقتِ تسویدِ حروف　　دردست، دل شکستۂ حقی آمد

---

شب فراق کو از ہجر یاری گریم　　بہانہ درد کنم، زار زاری گریم
بہر جا کہ بود ماتمے روم آنجا　　بدیں بہانہ زہجر نگار می گریم

---

قاتلش در جلوہ آمد طاقتم برباد رفت      نرگش در خواب رفت و فتنہ رابیدار کرد
حال حقی برتو کے ظاہر شود زیرا کہ وے      حالتے دارد کہ نتواند بخود اظہار کرد

---

اے آنکہ ترا طالع مسعود بود      دانی کہ مرا از توچہ مقصود بود
یک فاتحہ از بہرِ من خستہ بخواں      تا عاقبت کارِ تو محمود بود

---

در خواب ہمیشہ باخیالِ تو خشم      در بیدارم بخط و خال تو خوشم
القصہ چہ در خواب و چہ در بیداری      اے مردم دیدہ با جمالِ تو خوشم

## وفات:

شیخ عبدالحق نے چورانوے (۹۴) سال عمر پائی اور آخر دم تک تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ زندگی کے آخری دور میں بھی جسمانی اور روحانی طور پر اسی طرح صحت مند و توانا تھے، جس طرح کہ ابتدائی دور میں تھے۔ نہ کبھی درس و مطالعہ میں فرق آیا، نہ تدریس کے سلسلے کم ہوئے، نہ تحقیق و کاوش میں کمی واقع ہوئی، نہ قلم و قرطاس کی صحبتیں ماند پڑیں اور نہ وظائف و اوراد اور روزانہ کے معمولات میں خلل پیدا ہوا۔ اپنی گوناگوں علمی ضوفشانیوں سے سرزمین برصغیر میں روشنی کی ایک وسیع فضا پیدا کر کے ۲۱/ربیع الاول ۱۰۵۲ھ/ ۹/جون ۱۶۴۲ء کو وفات پائی اور دہلی میں دفن ہوئے۔ وصیت کے مطابق نماز جنازہ ان کے جلیل القدر صاحب زادے شیخ نورالحق نے پڑھائی۔

## اولاد:

شیخ عبدالحق محدث کے تین بیٹے تھے۔ شیخ نورالحق، شیخ علی محمد اور شیخ محمد ہاشم۔ یہ تینوں اصحاب علم و فضل تھے، مگر شیخ نورالحق ان میں سب سے فائق اور بلند مرتبے کے مالک تھے۔ ان کے تفصیلی حالات ان شاء اللہ کتاب کے اصل مقام پر درج ہوں گے، یہاں اختصار کے ساتھ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ شیخ محدث اپنے اس فرزند کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے لیے ایک واقعہ لائق تذکرہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ میر سید طیب بلگرامی (جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے) ایک عالم و فاضل اور زاہد و متورع بزرگ تھے۔ ''سبع سنابل'' کے مصنف میر سید عبدالواحد بلگرامی کے فرزند اور جانشین تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کے اوصاف و کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

وے ذات مقدسی کہ اگر ثقلین باو ناز کنند می زیبد و اگر زمین و زمان برخود بالندمی شاید [1]۔

---

[1] مآثر الکرام، ص ۴۵۔

یعنی وہ ایسی پاک باز شخصیت کے مالک ہیں کہ اگر دونوں جہان ان پر ناز کریں تو صحیح ہوگا اور اگر زمین اور اس پر بسنے والے ان پر خوش ہوں تو بجا ہوگا۔

وہ ایک فرشتہ صفت بزرگ تھے۔ آزاد بلگرامی ان کی تعریف میں سید کرم اللہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اگر کسے خواہد، ملک را بر روئے زمین بہ بیند میر سید طیب را مشاہدہ کند ❶۔

(اگر کوئی شخص زمین پر فرشتہ دیکھنا چاہتا ہے تو میر سید طیب کو دیکھ لے۔)

میر سید طیب تدریس و تصنیف میں ماہر تھے۔ تفسیر بیضاوی اور ہدایہ پر انھوں نے عالمانہ حواشی تحریر کیے ہیں۔ میر موصوف اور شیخ عبدالحق دہلوی کے درمیان بڑے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، جس کا تذکرہ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

درمیان شیخ عبدالحق دہلوی قدس سرہ، حضرت میر محبتے و مودتے عظیم بود، شیخ عبدالحق بہ رعایت بزرگی اور اشیخ طیب می گفت ❷۔

(شیخ عبدالحق اور حضرت میر کے درمیان انتہائی محبت و مودت کے مراسم قائم تھے۔ شیخ عبدالحق ان کی بزرگی کی وجہ سے انھیں شیخ طیب کہا کرتے تھے۔)

میر طیب کی فضیلت علم اور شیخ محدث پر ان کے اثر کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک مرتبہ اپنے زمانۂ کبرسنی میں شیخ محدث کسی کتاب کا درس دے رہے تھے کہ ایک مقام پر رُک گئے اور فرمانے لگے، اگر میر سید طیب اس وقت موجود ہوتے تو اس مشکل مسئلہ کو آسانی سے حل کر دیتے۔ حسن اتفاق سے میر سید اسی وقت تشریف لے آئے۔ شیخ بہت خوش ہوئے اور خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد وہ مشکل ان کے سامنے بیان کی۔ میر ممدوح نے کتاب ہاتھ میں پکڑی اور تھوڑے سے تامل کے بعد متعلقہ مقام کی عبارت کچھ اس انداز سے پڑھی کہ مسئلہ خود بخود حل ہوگیا اور مشکل رفع ہوگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ نورالحق آگرہ میں مقیم تھے اور منصب قضا پر فائز تھے۔ شیخ عبدالحق نے میر صاحب سے دریافت فرمایا ''کس راستے سے آئے ہیں؟'' انھوں نے بتایا ''براستہ آگرہ آیا ہوں۔'' فرمایا ''راستے میں نورالحق سے ملاقات ہوئی ہوگی۔'' میر صاحب نے جواب دیا: ''سفر میں کچھ ایسے مواقع پیش آئے کہ ان سے مل نہ سکا۔''

شیخ نے فرمایا:

ظاہراً ازیں کہ او مرتکب قضا شد، اعراض بہ عمل آمد ❸۔

یعنی بظاہر نہ ملنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ محکمہ قضا پر متعین ہے۔

---

❶ مآثر الکرام، ص ۴۵۔

❷ ایضاً، ص ۴۶۔

❸ مآثر الکرام، ص ۴۶۔

پھر شیخ نور الحق کی ان الفاظ میں تعریف کی:

اگر چہ پسرِ من است اما بجائے پدر، اگر چہ شاگردِ من است اما بجائے استاد، اگر چہ مرید من است اما بجائے پیرمی دانم ❶۔

(اگر چہ وہ میرا بیٹا ہے لیکن باپ کے بجائے ہے۔ اگر چہ میرا شاگرد ہے لیکن استاد کے بجائے ہے۔ اگر چہ میرا مرید ہے لیکن میں اسے پیر کے بجائے سمجھتا ہوں۔)

میر سید طیب نے شیخ کی یہ بات پوری توجہ سے سنی اور پھر اس طرح اٹھے اور باہر نکلے جیسے کسی ضرورت سے جاتے ہیں۔ مگر وہ اسی وقت آگرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور شیخ نور الحق سے ملاقات کر کے واپس دہلی آئے۔ شیخ کو معلوم ہوا تو ان کی اس اخلاقی رفعت سے بہت متاثر ہوئے اور میر صاحب سے انتہائی معذرت کی۔

معذرتہا برزبان آورد ❷۔

(بڑے ہی معذرت خواہانہ الفاظ استعمال کیے۔)

شیخ عبدالحق دہلوی کے دوسرے فرزند شیخ علی محمد بخاری دہلوی تھی، جو اپنے عصر کے فضلا میں سے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور اپنے والد ماجد سے کتب درسیہ کی تحصیل کی، شیخ علی محمد تصنیف وتایف کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور تین کتابوں کے مصنف تھے، جن کے نام یہ ہیں:

خزائن الدرر: یہ عربی، فارسی، اور ترکی زبانوں کی لغت ہے۔

رسالہ احوال پنج پیران چشت: یہ خواجہ معین الدین چشتی، قطب صاحب، بابا فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیا اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے حالات پر مشتمل ہے۔

نجات المریدین: اس میں شیخ عبدالقادر جیلانی کے احوال وواقعات بیان کیے گئے ہیں۔

تیسرے فرزند شیخ محمد ہاشم دہلوی تھے، جو عالم باعمل اور عبد صالح تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی اور اپنے عالی مرتبت والد شیخ عبدالحق دہلوی سے علم حاصل کیا، طویل عرصے تک ان سے منسلک رہے اور اس قدر استفادہ کیا کہ حدیث اور فقہ کے ماہر علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔

شیخ عبدالحق محدث کے یہ تینوں فرزند گیارھویں صدی ہجری کے معروف ہندی علمائے دین میں سے تھے۔

---

❶ مآثر الکرام، ص ۴۶۔

❷ مآثر الکرام، ص ۴۶۔

# مراجع ومصادر

فقہائے ہند کی اس جلد کی تصنیف میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ آئین اکبری: ابوالفضل۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۹۳ھ

۲۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقیہ، بھوپال۔ ۱۲۹۵ھ

۳۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق صدیق خاں۔ مطبع نظامی، کان پور۔ ۱۲۸۸ھ

۴۔ اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۳۲ھ

۵۔ اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار: تصنیف محمد غوثی شطاری مانڈوی۔ ترجمہ۔ فضل احمد جیوری۔ مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۳۲۶ھ

۶۔ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۷۔ الاعلام: خیرالدین زرکلی، طبع ثانی۔

۸۔ انشائے ابوالفضل: مطبوعہ لکھنؤ۔ ۱۲۶۸ھ

۹۔ انوار العارفین: حافظ محمد حسین مرادآبادی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۷۶ء۔

۱۰۔ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون: اسماعیل پاشا۔ مطبع بہیہ، استنبول۔ ۱۹۴۵ھ/۱۳۶۴ء۔

۱۱۔ بادشاہ نامہ: عبدالحمید لاہوری۔ تصحیح عبدالرحمٰن۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۷ء۔ ۱۸۷۲ء۔

۱۲۔ برصغیر پاک وہند میں علم فقہ: محمد اسحاق بھٹی۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۳ء۔

۱۳۔ بزم تیموریہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

۱۴۔ تاریخ برہان مآثر: سید علی طباطبائی ناشر مجلس مخطوطات فارسیہ۔ حیدرآباد، دکن مطبع جامعہ، دہلی۔ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء۔

۱۵۔ تاریخ تحفۃ الکرام۔ جلد اول، دوم، سوم۔ مطبع حسینی اثناعشری، محلہ فراش خانہ وزیر گنج، لاہور ۱۳۰۴ھ و مطبع ناصری۔

۱۶۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس جون پور (ہندوستان)، ۱۹۶۳ء۔

۱۷۔ تاریخ طاہری: سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹھوی۔ سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد۔ سندھ ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء۔

۱۸۔ تاریخ فرشتہ: محمد قاسم فرشتہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۳۳ء۔

۱۹۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر غلام محمد، نور محمد، تاجران کتب سری نگر۔ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء۔

۲۰۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء۔

۲۱۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی۔ ۱۹۵۹ء۔

۲۲۔ تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبۂ احباب، لاہور۔

۲۳۔ تذکرۃ الابرار والاشرار: حضرت اخون درویزہ۔ ادارہ اشاعت سرحد۔ قصہ خوانی بازار پشاور۔

۲۴۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی: سید احمد قادری۔ ناشر، شاہ بکڈ پو۔ پٹنہ (ہندوستان)

۲۵۔ تذکرہ علمائے ہند: مولوی رحمان علی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء۔

۲۶۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ): محمد ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء۔

۲۷۔ تزکِ جہاں گیری: مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء۔

۲۸۔ تعلیمات مجددیہ: ملک حسن علی جامعی۔ انجمن اشاعت التوحید والسنۃ۔ شرق پور۔ ۱۹۶۵ء۔

۲۹۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع شاہ جہانی، بھوپال ۱۲۹۸ھ۔

۳۰۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء۔

۳۱۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی: پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔ ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء۔

۳۲۔ خزینۃ الاصفیاء: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیجناتھ۔ الموسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ء۔

۳۳۔ خلاصۃ التواریخ: لالہ سجان رائے بٹالوی، بہ تصحیح ظفر احسن۔ مطبع جی اینڈ سنز، دہلی۔ ۱۹۱۸ء۔

۳۴۔ رودِ کوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔

۳۵۔ ذخیرۃ الخوانین: شیخ فرید بھکری۔ مقدمہ وتصحیح، ڈاکٹر سید معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی۔

۳۶۔ زبدۃ المقامات: خواجہ محمد ہاشم کشمی، مطبع نول کشور، کان پور۔ طبع اول ۱۸۹۰ء۔

۳۷۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی ۱۳۰۳ھ۔

۳۸۔ سفینۃ الاولیا: داراشکوہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۸۴ء۔

۳۹۔ سنن ابی داؤد: امام سلیمان بن اشعث ابی داؤد سجستانی۔ اصح المطابع وکارخانہ تجارت، کراچی۔

۴۰۔ سیر المتاخرین: غلام حسین خاں طباطبائی۔ نول کشور، لکھنؤ۔

۴۱۔ شرح سفر السعادہ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۰۳ء۔

۴۲۔ طبقات اکبری: نظام الدین ہروی۔ طابع نول کشور، مطبع گرامی قدر اودھ اخبار، لکھنؤ، ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء۔

۴۳۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا ابوالحسنات عبدالحی حنفی لکھنوی۔ مطبع یوسفی لکھنؤ۔ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء۔

۴۴۔ عالم گیرنامہ: منشی محمد کاظم بن محمد امین۔ کالج پریس، کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء۔

۴۵۔ عمل صالح، الموسوم بہ شاہ جہان نامہ: محمد صالح کنبوہ لاہوری۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔

۴۶۔ عون المعبود شرح سنن ابی داؤد: علامہ شمس الحق ڈھیانوی۔ مطبع انصاری، دہلی۔

۴۷۔ عہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے فرامین واسناد: مطبوعہ ہندوستان۔ ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲ء۔

۴۸۔ فرحت الناظرین (شخصیات): محمد اسلم پسروری۔ ترجمہ و ترتیب۔ محمد ایوب قادری۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔ ۱۹۷۲ء۔

۴۹۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ مع التعلیقات البینہ: مولانا ابوالحسنات عبدالحی حنفی لکھنوی۔ طبع اول، مصر ۱۳۲۴ھ۔

۵۰۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ مطبع فیض منبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ۔

۵۱۔ کشف الظنون۔ جلد اول، ثانی: حاجی خلیفہ۔ مطبع بہیہ استنبول۔ ۱۹۴۱ء/ ۱۳۶۰ھ۔

۵۲۔ مآثر الامرا۔ جلد اول، دوم، سوم: نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۸۸ء۔ ۱۸۹۰ء۔

۵۳۔ مآثر رحیمی۔ جلد اول، دوم سوم: ملا عبدالقادر نہاوندی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔ ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۱ء۔

۵۴۔ مآثر عالم گیری: محمد ساقی الملقب بہ مستعد خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال، کلکتہ۔

۵۵۔ مآثر الکرام، جلد اول: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ۔ لاہور۔ ۱۹۷۱ء۔

۵۶۔ مرآۃ احمدی: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۹۲۷ء۔

۵۷۔ مرآۃ العالم: بختاور خاں (قلمی نسخہ) پنجاب یونیورسٹی، لائبریری۔ لاہور۔

۵۸۔ معجم المؤلفین: عمر رضا کحالہ۔ المکتبہ العربیہ، دمشق۔ مطبعۃ الترقی، دمشق۔ ۱۹۵۷ء۔

۵۹۔ مفتاح التواریخ: منشی دانشور۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ۔

۶۰۔ منتخب التواریخ: عبدالقادر بدایونی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ و ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء۔

۶۱۔ منتخب اللباب، جلد اول، دوم: محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال کلکتہ۔ ۱۸۶۹ء۔

۶۲۔ نجات الرشید: عبدالقادر بدایونی۔ مقدمہ و حواشی، ڈاکٹر سید معین الحق۔ ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور۔ ۱۹۷۲ء۔

۶۳۔ نزہۃ الخواطر، جلد پنجم: علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدر آباد، دکن ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء۔

۶۴۔ النور السافر فی اخبار القرن العاشر: عبدالقادر بن عبداللہ عیدروس۔ المکتبہ العربیہ بغداد۔ مطبعۃ الفرات، بغداد۔ ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء

۶۵۔ ہدیۃ العارفین فی اسماء المؤلفین و آثار المصنفین: اسماعیل پاشا بغدادی۔ مطبع بہیہ، استنبول۔ ۱۹۵۱ء۔ ۱۹۵۵ء۔

۶۶۔ ہفت اقلیم، جلد اول، دوم، سوم: امین احمد رازی۔ تصحیح و تعلیق، جواد فاضل۔ مطبوعہ تہران۔

۶۷۔ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی: محمد بن یحییٰ المدعو بہ محسن تیمی ثم بکسری۔ طبع ہند۔

# فقہائے ہند

## گیارھویں صدی ہجری

### حصہ دوم

# ترتیب


| | |
|---|---|
| ♦ مقدمہ | ۲۱۱ |
| ♦ جہاں گیر | ۲۱۲ |
| ♦ تعلیم وتربیت | ۲۱۳ |
| ♦ جہاں گیر کی بغاوت | ۲۱۴ |
| ♦ تخت نشینی اور بارہ احکام | ۲۱۵ |
| ♦ شرع محمدی کے نفاذ وتحفظ کی شرط | ۲۱۷ |
| ♦ بیٹوں کی مخالفت | ۲۱۸ |
| ♦ علمائے کرام سے محبت وعقیدت | ۲۱۹ |
| ♦ خلاف شرع رسوم سے نفرت | ۲۲۰ |
| ♦ سفر کانگڑہ میں علمائے اسلام کی معیت | ۲۲۲ |
| ♦ مطالعۂ کتب کا شوق اور مدارسِ دینیہ کی تعمیر | ۲۲۲ |
| ♦ قرآن مجید سے قلبی لگاؤ | ۲۲۳ |
| ♦ اورادو وظائف | ۲۲۳ |
| ♦ ادب وشعر کا ذوقِ بلند | ۲۲۴ |
| ♦ مے نوشی اور افیون خوری | ۲۲۴ |
| ♦ ملکی مصالح | ۲۲۴ |
| ♦ دورِ جہاں گیری کے علمائے کرام | ۲۲۵ |
| ♦ شیخ محمد میر سے عقیدت وتعلق | ۲۲۵ |
| ♦ برصغیر میں انگریز کا قدم | ۲۲۶ |
| ♦ وفات | ۲۲۷ |
| ♦ شاہ جہان | ۲۲۸ |
| ♦ بغاوت اور اس کا پس منظر | ۲۲۹ |
| ♦ داور بخش کی عارضی تخت نشینی | ۲۳۱ |
| ♦ شاہ جہان کی تخت نشینی | ۲۳۳ |
| ♦ اعیانِ دولت اور عمالِ حکومت کے نام فرنان | ۲۳۳ |
| ♦ پابندیٔ نماز اور وظائف واوراد | ۲۳۵ |
| ♦ عدل وانصاف | ۲۳۷ |
| ♦ ایک نہایت قبیح رسم کا خاتمہ | ۲۳۸ |
| ♦ ہندوؤں کے قبضے سے مسلمان عورتوں کی رہائی اور مساجد کی واگزاری | ۲۳۹ |
| ♦ صوبہ کابل کی ایک انتہائی مذموم رسم ختم کرنے کا حکم | ۲۳۹ |
| ♦ ہگلی کے فرنگیوں کی گوشمالی | ۲۴۰ |
| ♦ بدعات کا خاتمہ اور ٹیکسوں کی معافی | ۲۴۰ |
| ♦ بادشاہ کا فرض | ۲۴۲ |
| ♦ اللہ کی عبودیت کا قرار | ۲۴۲ |
| ♦ دورِ شاہ جہان کے علما ومشائخ | ۲۴۲ |
| ♦ شجاعت اور فتوحات | ۲۴۳ |
| ♦ علمی، ثقافتی اور تہذیبی ترقی | ۲۴۳ |
| ♦ معزولی اور وفات | ۲۴۴ |
| ♦ ع | |
| ♦ ۱۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی | ۲۴۵ |
| ♦ حصول علم | ۲۴۶ |

◆ مسند درس وتدریس ۲۴۷
◆ عہد جہاں گیری میں ۲۴۸
◆ عہد شاہ جہان میں ۲۴۸
◆ وسعت علم وفضل وقبولیت عامہ ۲۴۹
◆ ہم عصر علما سے علمی مباحثے ۲۵۲
◆ مجدد الف ثانی سے تعلق خاطر ۲۵۴
◆ حضرت میاں میر سے ملاقات ۲۵۵
◆ تصانیف وحواشی ۲۵۵
◆ تفسیر بیضاوی ۲۵۶
◆ مولانا عبدالحکیم کا حاشیہ ۲۵۸
◆ حاشیہ کشاف ۲۶۱
◆ حاشیہ مقدماتِ تلویح ۲۶۱
◆ حاشیہ شرح عقائد نسفی ۲۶۲
◆ حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی ۲۶۵
◆ حاشیہ شرح شمسیہ ۲۶۸
◆ حاشیہ شرح مطالع الانوار ۲۷۰
◆ حواشی درکنار شرح حکمۃ العین ۲۷۲
◆ حواشی درکنار مراح الارواح ۲۷۳
◆ تکملہ حاشیہ عبدالغفور ۲۷۳
◆ حاشیۂ حاشیہ عبدالغفور ۲۷۵
◆ حاشیہ مطول ۲۷۵
◆ ترجمہ غنیۃ الطالبین ۲۷۷
◆ الدرۃ الثمینہ ۲۷۷
◆ بعض دیگر تصانیف ۲۷۹
◆ مسجد اور مدرسہ وغیرہ ۲۷۹
◆ وفات ۲۸۱
◆ تلامذہ ۲۸۴
◆ قاضی عبدالرحیم مراد آبادی ۲۸۴
◆ ملا عصمت اللہ سہارن پوری ۲۸۴
◆ مولوی محمد احمد قنوجی ۲۸۵
◆ ملا عبدالوہاب پسروری ۲۸۵
◆ مولوی محمد معظم ۲۸۵
◆ ملا عبدالعزیز عزت اکبر آبادی ۲۶۸
◆ ملا محمد افضل جون پوری ۲۸۷
◆ چندر بھان برہمن ۲۸۷
◆ میر سید اسماعیل بلگرامی ۲۸۷
◆ اولاد ۲۹۰
◆ ۲۔ مولانا عبدالحکیم کشمیری ۲۹۲
◆ ۳۔ مولانا عبدالحی بلگرامی ۲۹۲
◆ ۴۔ مفتی عبدالحی سنبھلی ۲۹۲
◆ ۵۔ شیخ عبدالخالق سہارن پوری ۲۹۲
◆ ۶۔ مولانا عبدالدائم گوالیاری ۲۹۲
◆ ۷۔ مفتی عبدالرحمٰن کابلی ۲۹۳
◆ ۸۔ شیخ عبدالرحمٰن سنبھلی ۲۹۳
◆ ۹۔ قاضی عبدالرحیم مراد آبادی ۲۹۳
◆ ۱۰۔ مفتی عبدالرحیم سندھی ۲۹۳
◆ ۱۱۔ مولانا عبدالرزاق بانڈی کشمیری ۲۹۴
◆ ۱۲۔ مولانا عبدالرشید کشمیری ۲۹۴
◆ ۱۳۔ قاضی عبدالرشید دہلوی ۲۹۴
◆ ۱۴۔ شیخ عبدالستار برہان پوری ۲۹۵
◆ ۱۵۔ مفتی عبدالسلام دیوی ۲۹۵
◆ ۱۶۔ مفتی عبدالسلام لاہوری ۲۹۶
◆ اساتذہ ۲۹۷
◆ مسند تدریس اور تلامذہ ۲۹۸
◆ حاشیہ بیضاوی ۲۹۹
◆ کیا نافع المسلمین انہی کی تصنیف ہے؟ ۳۰۰

| | |
|---|---|
| ◆ ۱۷۔قاضی عبدالسلام برہان پوری | ۳۰۲ |
| ◆ ۱۸۔شیخ عبدالشکور جون پوری | ۳۰۲ |
| ◆ ۱۹۔شیخ عبدالشکور منیری | ۳۰۲ |
| ◆ ۲۰۔قاضی عبدالشکور لاہوری | ۳۰۳ |
| ◆ ۲۱۔قاضی عبدالعزیز نصیر آبادی | ۳۰۳ |
| ◆ ۲۲۔شیخ عبدالعزیز الہ آبادی | ۳۰۴ |
| ◆ ۲۳۔شیخ عبدالغفور اجینی | ۳۰۴ |
| ◆ ۲۴۔قاضی عبدالنبی خاندیسی | ۳۰۴ |
| ◆ ۲۵۔شیخ عبدالفتاح چڑیا کوٹی | ۳۰۵ |
| ◆ ۲۶۔قاضی عبدالقادر پانی پتی | ۳۰۵ |
| ◆ ۲۷۔قاضی عبدالقادر لکھنوی | ۳۰۶ |
| ◆ ۲۸۔شیخ عبدالقادر حضرمی | ۳۰۷ |
| ◆ ۲۹۔شیخ عبدالقادر اُچی | ۳۰۸ |
| ◆ ۳۰۔شیخ عبدالقادر لاہوری | ۳۰۹ |
| ◆ ۳۱۔علامہ عبدالقادر اجینی | ۳۰۹ |
| ◆ ۳۲۔ملا عبدالقادر بدایونی | ۳۰۹ |
| ◆ بدایونی کی ولادت | ۳۱۰ |
| ◆ حصولِ علم | ۳۱۱ |
| ◆ والد اور نانا کی وفات | ۳۱۲ |
| ◆ امیر حسین خاں کی ملازمت | ۳۱۲ |
| ◆ بیٹے اور بھائی کی وفات | ۳۱۳ |
| ◆ واقعۂ عشق اور اس کی سزا | ۳۱۳ |
| ◆ بدایوں میں آتش زدگی | ۳۱۵ |
| ◆ ترکِ ملازمت | ۳۱۵ |
| ◆ دربارِ اکبری میں | ۳۱۶ |
| ◆ معرکۂ جہاد میں شرکت | ۳۱۸ |
| ◆ فتح کی خوش خبری بدایونی کے ذریعے | ۳۲۰ |
| ◆ حق گوئی و بے باکی | ۳۲۲ |
| ◆ متعہ کی بحث | ۳۲۶ |
| ◆ شاہ پسندوں سے بُعد | ۳۳۲ |
| ◆ بدایونی حج کی سعادت نہ حاصل کر سکے | ۳۳۴ |
| ◆ بیٹے کا نام بادشاہ نے رکھا | ۳۳۴ |
| ◆ دوستوں کی جدائی کا غم | ۳۳۵ |
| ◆ علمی و تصنیفی خدمات | ۳۳۶ |
| ◆ شاعری | ۳۴۹ |
| ◆ دورِ اکبری کا آئینہ | ۳۴۹ |
| ◆ وفات | ۳۵۰ |
| ◆ بدایونی کا مدفن اور اولاد | ۳۵۱ |
| ◆ ۳۳۔شیخ عبدالقادر بخاری اکبر آبادی | ۳۵۱ |
| ◆ ۳۴۔مفتی عبدالقدوس امروہی | ۳۵۱ |
| ◆ ۳۵۔ملا عبدالکریم پشاوری | ۳۵۲ |
| ◆ ۳۶۔مولانا عبدالکریم سلطان پوری لاہوری | ۳۵۲ |
| ◆ ۳۷۔مفتی عبدالکریم گجراتی | ۳۵۳ |
| ◆ ۳۸۔شیخ عبداللطیف سندھی | ۳۶۳ |
| ◆ ۳۹۔شیخ عبداللہ سندیلوی | ۳۶۳ |
| ◆ ۴۰۔سید شیخ عبداللہ حضرمی | ۳۶۴ |
| ◆ ۴۱۔شیخ عبداللہ حضرمی | ۳۶۵ |
| ◆ ۴۲۔مولانا عبداللہ لبیب سیالکوٹی | ۳۶۷ |
| ◆ ۴۳۔خواجہ عبداللہ دہلوی | ۳۷۱ |
| ◆ ۴۴۔مولانا عبداللہ سنبھلی | ۳۷۲ |
| ◆ ۴۵۔مولانا عبداللہ برہان پوری | ۳۷۳ |
| ◆ ۴۶۔قاضی عبداللہ بیجاپوری | ۳۷۳ |
| ◆ ۴۷۔علامی عبداللہ چلپی رومی | ۳۷۳ |
| ◆ ۴۸۔شیخ عبدالمجید امروہی | ۳۷۴ |
| ◆ ۴۹۔مولانا عبدالمجید لاہوری | ۳۷۴ |
| ◆ ۵۰۔خواجہ عبدالمنعم احراری | ۳۷۵ |

| | | |
|---|---|---|
| ◆ | ۵۱۔مولانا عبدالمومن لاہوری | ۳۷۵ |
| ◆ | ۵۲۔مولانا عبدالنبی اکبرآبادی | ۳۷۵ |
| ◆ | ۵۳۔مفتی عبدالنبی کشمیری | ۳۷۶ |
| ◆ | ۵۴۔شیخ عبدالواحد مندسوری | ۳۷۷ |
| ◆ | ۵۵۔شیخ عبدالوہاب متقی مکی | ۳۷۸ |
| ◆ | فقر و تجرید کی راہ پر | ۳۷۸ |
| ◆ | ورودِ مکہ مکرمہ اور شیخ علی متقی سے حصولِ فیض | ۳۷۹ |
| ◆ | صوفیا کی تصانیف کے بارے میں شیخ کا نقطۂ نظر | ۳۸۲ |
| ◆ | سماع اور قوالی کے بارے میں شیخ کا فرمان | ۳۸۴ |
| ◆ | علم و فضل | ۳۸۵ |
| ◆ | حصولِ علم ہی درحقیقت ذکر الٰہی ہے | ۳۸۶ |
| ◆ | مشائخ کے مروجہ اندازِ ذکر کے بارے میں | ۳۸۷ |
| ◆ | ہندو جوگی کا قبولِ اسلام | ۳۸۸ |
| ◆ | ریاضت اور ترکِ سوال کا دور | ۳۸۸ |
| ◆ | شیخ کا موقف | ۳۹۰ |
| ◆ | حلقۂ تلامذہ | ۳۹۱ |
| ◆ | وفات | ۳۹۲ |
| ◆ | ۵۶۔قاضی عبدالوہاب گجراتی | ۳۹۲ |
| ◆ | ۵۷۔ملا عبدالوہاب پسروری | ۳۹۳ |
| ◆ | ۵۸۔شیخ عبدالوہاب قدوائی راج گیری | ۳۹۴ |
| ◆ | ۵۹۔خواجہ عبیداللہ دہلوی | ۳۹۴ |
| ◆ | ۶۰۔علامہ عثمان بوبکانی | ۳۹۶ |
| ◆ | ۶۱۔قاضی عثمان سندھی | ۳۹۷ |
| ◆ | ۶۲۔شیخ عثمان سارنگ پوری | ۳۹۸ |
| ◆ | ۶۳۔مولانا عطاءاللہ عثمانی جون پوری | ۳۹۸ |
| ◆ | ۶۴۔مولانا عطاءاللہ سہسوانی | ۳۹۸ |
| ◆ | ۶۵۔ملا عصمت اللہ سہارن پوری | ۳۹۹ |
| ◆ | ۶۶۔مولانا علاءالملک حسینی مرعشی | ۳۹۹ |
| ◆ | ۶۷۔شیخ علم اللہ امیٹھوی | ۴۰۰ |
| ◆ | ۶۸۔سید علم اللہ شاہ بریلوی | ۴۰۱ |
| ◆ | عہدِ طفولیت | ۴۰۵ |
| ◆ | شادی، سلسلۂ ملازمت اور ترکِ دنیا | ۴۰۶ |
| ◆ | شیخ آدم بنوری کی بیعت و خلافت | ۴۰۸ |
| ◆ | رائے بریلی میں قیام | ۴۰۸ |
| ◆ | سفرِ حج | ۴۰۹ |
| ◆ | اتباعِ سنت اور عمل و ایثار کا بے پناہ جذبہ | ۴۱۰ |
| ◆ | علم و فضل | ۴۱۱ |
| ◆ | اسلامیت کی تصویرِ کامل | ۴۱۲ |
| ◆ | سماع و مزامیر اور بدعات کی مخالفت | ۴۱۲ |
| ◆ | فقر و تنگ دستی کی دعا | ۴۱۴ |
| ◆ | صبر و تحمل کی انتہا | ۴۱۴ |
| ◆ | ایک عجیب و غریب واقعہ | ۴۱۵ |
| ◆ | وفات | ۴۱۵ |
| ◆ | ۶۹۔قاضی علی بیجاپوری | ۴۱۶ |
| ◆ | ۷۰۔قاضی علی اکبر الہ آبادی | ۴۱۷ |
| ◆ | ۷۱۔شیخ علی پانی پتی | ۴۱۹ |
| ◆ | ۷۲۔خواجہ علی پنوکشمیری | ۴۲۰ |
| ◆ | ۷۳۔سید عمر حضرمی | ۴۲۱ |
| ◆ | ۷۴۔قاضی عمر اکبرآبادی | ۴۲۲ |
| ◆ | ۷۵۔قاضی عنایت اللہ بلگرامی | ۴۲۲ |
| ◆ | ۷۶۔مولانا عوض وجیہ سمرقندی | ۴۲۲ |
| ◆ | ۷۷۔قاضی عیسیٰ سندھی | ۴۲۴ |
| ◆ | ۷۸۔مفتی عیسیٰ گوپاموی | ۴۲۷ |
| ◆ | ۷۹۔قاضی عیسیٰ اکبرآبادی | ۴۲۸ |

| | |
|---|---|
| **غ** | |
| ۸۰۔ سید غضنفر گجراتی | ۴۲۸ |
| **ف** | |
| ۸۱۔ سید فاضل سنبھلی | ۴۲۹ |
| ۸۲۔ شیخ فتح محمد برہان پوری | ۴۲۹ |
| ۸۳۔ شیخ فرخ نارنولی | ۴۳۰ |
| ۸۴۔ میر سید فیروز بلگرامی | ۴۳۰ |
| **ق** | |
| ۸۵۔ مولانا قاسم حسینی بیانوی | ۴۳۱ |
| ۸۶۔ شیخ قطب الدین دہلوی | ۴۳۱ |
| ۸۷۔ مرزا قلیچ محمد اندجانی | ۴۳۱ |
| ۸۸۔ مولانا قیام الدین لاہوری | ۴۳۳ |
| **ک** | |
| ۸۹۔ شیخ کمال الدین بیجاپوری | ۴۳۴ |
| ۹۰۔ قاضی کمال الدین کشمیری | ۴۳۴ |
| ۹۱۔ مفتی کمال محمد عباسی گجراتی | ۴۳۴ |
| **ل** | |
| ۹۲۔ علامہ لطف اللہ کوروی | ۴۳۵ |
| **م** | |
| ۹۳۔ مفتی مبارک جون پوری | ۴۳۶ |
| ۹۴۔ شیخ مبارک ناگوری | ۴۳۶ |
| ۹۵۔ مولانا محب اللہ سندھی برہان پوری | ۴۴۱ |
| ۹۶۔ علامہ حکیم محمد مصری برہان پوری | ۴۴۲ |
| ۹۷۔ شیخ محمد بیجاپوری | ۴۴۲ |
| ۹۸۔ سید محمد عاملی | ۴۴۲ |
| ۹۹۔ شیخ محمد غوثی مانڈوی | ۴۴۳ |
| ۱۰۰۔ قاضی محمد نصیر آبادی | ۴۴۴ |
| ۱۰۱۔ شیخ محمد سندھی | ۴۴۴ |
| ۱۰۲۔ سید محمد جالندھری کالپوی | ۴۴۵ |
| ۱۰۳۔ سید محمد حضرمی | ۴۴۶ |
| ۱۰۴۔ شیخ محمد راندیری | ۴۴۷ |
| ۱۰۵۔ سید محمد عاملی | ۴۴۷ |
| ۱۰۶۔ شیخ محمد برہان پوری | ۴۴۸ |
| ۱۰۷۔ مولانا محمد سندھی | ۴۴۹ |
| ۱۰۸۔ قاضی محمد آصف الہ آبادی | ۴۴۹ |
| ۱۰۹۔ شیخ محمد آفاق لکھنوی | ۴۵۰ |
| ۱۱۰۔ قاضی محمد اسلم ہروی | ۴۵۰ |
| ۱۱۱۔ سید محمد اشرف نہٹوری | ۴۵۲ |
| ۱۱۲۔ علامہ محمد افضل جون پوری | ۴۵۲ |
| ۱۱۳۔ قاضی محمد افضل لاہوری | ۴۵۳ |
| ۱۱۴۔ قاضی محمد حسین جون پوری | ۴۵۴ |
| ۱۱۵۔ مولانا محمد حسین کشمیری | ۴۵۵ |
| ۱۱۶۔ مفتی محمد خلیل جون پوری | ۴۵۵ |
| ۱۱۷۔ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری | ۴۵۶ |
| ۱۱۸۔ قاضی محمد زاہد کابلی | ۴۵۸ |
| ۱۱۹۔ شیخ محمد سعید سرہندی | ۴۵۹ |
| ۱۲۰۔ شیخ محمد سعید ہندی | ۴۶۰ |
| ۱۲۱۔ مفتی محمد شریف الہ آبادی | ۴۶۰ |
| ۱۲۲۔ قاضی محمد شریف صدیقی گجراتی | ۴۶۱ |
| ۱۲۳۔ علامہ محمد شفیع یزدی | ۴۶۱ |
| ۱۲۴۔ مولانا محمد صادق جون پوری | ۴۶۲ |
| ۱۲۵۔ مفتی محمد صادق جون پوری | ۴۶۳ |
| ۱۲۶۔ شیخ محمد صادق گنگوہی | ۴۶۴ |
| ۱۲۷۔ مولانا محمد صادق کشمیری | ۴۶۴ |

| | | |
|---|---|---|
| ◆ | ۱۲۸۔ شیخ محمد صالح سندھی | ۴۶۵ |
| ◆ | ۱۲۹۔ شیخ محمد طاہر لاہوری | ۴۶۵ |
| ◆ | ۱۳۰۔ مفتی محمد طاہر کشمیری | ۴۶۶ |
| ◆ | ۱۳۱۔ شیخ محمد عاشق ہندی | ۴۶۶ |
| ◆ | ۱۳۲۔ میر محمد علی کشمیری | ۴۶۶ |
| ◆ | ۱۳۳۔ مولانا محمد فاضل بدخشی | ۴۶۷ |
| ◆ | ۱۳۴۔ مولانا محمد قلی دہلوی | ۴۶۷ |
| ◆ | ۱۳۵۔ شیخ محمد معصوم سرہندی | ۴۶۸ |
| ◆ | ۱۳۶۔ مولانا محمد مومن ترمذی | ۴۶۸ |
| ◆ | ۱۳۷۔ قاضی محمد مودود جون پوری | ۴۶۹ |
| ◆ | ۱۳۸۔ مولانا محمد نافع اکبر آبادی | ۴۶۹ |
| ◆ | ۱۳۹۔ شیخ محمد نعمان بدخشی | ۴۷۰ |
| ◆ | ۱۴۰۔ شیخ محمد ہاشم دہلوی | ۴۷۰ |
| ◆ | ۱۴۱۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی | ۴۷۱ |
| ◆ | ۱۴۲۔ میر محمد ہاشم گیلانی | ۴۷۱ |
| ◆ | ۱۴۳۔ شیخ محمد یحییٰ سرہندی | ۴۷۲ |
| ◆ | ۱۴۴۔ مولانا محمد یعقوب بنانی لاہوری | ۴۷۲ |
| ◆ | ۱۴۵۔ سید محمود سندھی | ۴۷۳ |
| ◆ | ۱۴۶۔ شیخ محمود گجراتی | ۴۷۳ |
| ◆ | ۱۴۷۔ شیخ محمود فاروقی جون پوری | ۴۷۴ |
| ◆ | ۱۴۸۔ شیخ محمود سہارن پوری | ۴۷۷ |
| ◆ | ۱۴۹۔ مولانا محی الدین بہاری | ۴۷۸ |
| ◆ | ۱۵۰۔ قاضی مرتضیٰ بیجاپوری | ۴۷۹ |
| ◆ | ۱۵۱۔ سید مصطفیٰ بیجاپوری | ۴۷۹ |
| ◆ | ۱۵۲۔ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی | ۴۷۹ |
| ◆ | ۱۵۳۔ خواجہ معین الدین کشمیری | ۴۸۰ |
| ◆ | ۱۵۴۔ شیخ منور لاہوری | ۴۸۱ |
| ◆ | ۱۵۵۔ شیخ مودود کالپوی | ۴۸۴ |
| ◆ | ۱۵۶۔ سید میراں بیجاپوری | ۴۸۴ |
| ◆ | ن | |
| ◆ | ۱۵۷۔ شیخ ناصر الدین شیخ پوری | ۴۸۵ |
| ◆ | ۱۵۹۔ قاضی نصیر الدین برہان پوری | ۴۸۵ |
| ◆ | ۱۵۹۔ شیخ نظام الدین تھانیسری | ۴۸۷ |
| ◆ | ۱۶۰۔ سید نظام الدین سندھی | ۴۸۸ |
| ◆ | ۱۶۱۔ شیخ نظام الدین برہان پوری | ۴۸۹ |
| ◆ | ۱۶۲۔ سید نعمت اللہ فیروز پوری | ۴۹۰ |
| ◆ | ۱۶۳۔ مفتی نور الحق دہلوی | ۴۹۱ |
| ◆ | ۱۶۴۔ شیخ نور محمد سہارن پوری | ۴۹۲ |
| ◆ | ۱۶۵۔ شیخ نور محمد جون پوری | ۴۹۲ |
| ◆ | ۱۶۶۔ شیخ نور محمد پٹنی | ۴۹۳ |
| ◆ | و | |
| ◆ | ۱۶۷۔ مفتی وجیہ الدین گوپاموی | ۴۹۳ |
| ◆ | ہ | |
| ◆ | ۱۶۸۔ سید ہدایت اللہ حسنی نصیر آبادی | ۴۹۵ |
| ◆ | ی | |
| ◆ | ۱۶۹۔ شیخ یسین بنارسی | ۴۹۵ |
| ◆ | ۱۷۰۔ مولانا یتیم اللہ احمد نگری | ۴۹۶ |
| ◆ | ۱۷۱۔ میر سید یحییٰ بلگرامی | ۴۹۶ |
| ◆ | ۱۷۲۔ شیخ یعقوب صرفی کشمیری | ۴۹۶ |
| ◆ | ۱۷۳۔ قاضی یوسف بلگرامی | ۴۹۹ |
| ◆ | ۱۷۴۔ مولانا یوسف لاہوری | ۴۹۹ |
| ◆ | ۱۷۵۔ مفتی یوسف کاشمیری | ۴۹۹ |
| ◆ | ۱۷۶۔ مولانا یونس کردی | ۵۰۰ |
| ◆ | مراجع ومصادر | ۵۰۱ |

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

# مقدمہ

اللہ عز وجل کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کی نصرت وتوفیق سے ''فقہائے ہند'' کی جلد چہارم کا (حصہ دوم) معزز قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ اس میں گیارھویں صدی ہجری کے ۱۷۶ فقہائے عظام اور علمائے کرام کے حالات وسوانح مندرج ہیں۔ اس سے قبل چوتھی جلد کے مقدمے میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے بارے میں وہ معلومات درج کی گئی ہیں جو ہمارے موضوع سے مطابقت رکھتی تھیں۔ اب پانچویں جلد کے مقدمے میں جہاں گیر اور شاہ جہان کی زندگی کے دینی اور علمی پہلوؤں کی وضاحت کرنا اور یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ دونوں بادشاہان ہند علماء سے کس قدر روابط رکھتے تھے اور اپنے دور کے اصحاب علم اور ارباب فقہ کو کس درجہ اپنی محبت والفت کا مستحق گردانتے تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ گیارھویں صدی ہجری میں دودمان مغلیہ کے یکے بعد دیگرے تین عظیم الشان حکمران تخت ہند پر جلوہ افروز ہوئے۔ ایک جلال الدین محمد اکبر' جو ۹۶۳ھ سے ۱۰۱۴ھ/ ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ھ تک اکاون (۵۱) سال داد حکمرانی دیتا رہا۔ دوسرے نورالدین محمد جہاں گیر' جس نے ۱۰۱۴ھ سے ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۸ھ تک بائیس (۲۲) سال ارض ہند پر حکومت کی۔ تیسرے شہاب الدین محمد شاہ جہان' جو ۱۰۳۷ھ سے ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء تک اکتیس سال تخت فرماں روائی پر متمکن رہا۔ یہ عرصہ ایک سو چار سال پر محیط ہے۔ علمی اعتبار سے یہ مغل عہد کے ہندوستان کا نہایت ترقی یافتہ دور ہے۔ اس دور میں علوم وفنون اور تہذیب وثقافت نے ارتقا کی بہت سی نئی منزلیں طے کیں' فہم وادراک کے قافلے جدید راہوں کی تلاش میں نکلے اور علما کی کثیر تعداد نے گلستان علم کی آب یاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں بعض وہ علمائے کرام بھی ہیں جنھوں نے ان تینوں بادشاہان ہند کے عہد کا کچھ نہ کچھ حصہ پایا اور مدت تک تصنیف وتالیف اور درس وافادہ کا غلغلہ بلند کیے رکھا۔ علما کی اس جماعت سے ان حکمرانوں کو خاص تعلق خاطر تھا اور وہ حسب مراتب ان کی قدر کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حکمرانوں کی خود اپنی حیات مستعار کے شب وروز علم وادب کے ماحول میں گزرے اور عرفان وادراک کی فضا میں بسر ہوئے تھے۔ ان سطور میں جو مقدمے کی شکل میں پیش کی جارہی ہیں' جہاں گیر اور شاہ جہان کی علمی زندگی کی نقاب کشائی کی جائے گی اور ان کے مذہبی ودینی رجحانات کو نمایاں کیا جائے گا۔ نیز علما و فقہا سے ان کے تعلقات کی صراحت کی جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز و علیہ التکلان۔

لیجیے پہلے جہاں گیر اور پھر شاہ جہان کی زندگی کے دینی وعلمی گوشوں کو نظر و بصر کے زاویوں میں لانے کی کوشش کریں گے کہ واقعات کی پوری تصویر قارئین کی نگاہوں کے سامنے گھوم جائے۔

# جہانگیر

جہاں گیر، مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کا سب سے بڑا بیٹا اور بابر کی نسل کا چوتھا بادشاہ تھا جو چہار شنبہ کے روز ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ/ ۳۰ اگست ۱۵۶۹ء کو نواح آگرہ میں سیکری کے مقام پر ایک تارک الدنیا بزرگ کے گھر میں پیدا ہوا۔ اس بزرگ کا نام شیخ سلیم چشتی تھا۔ جہاں گیر کی ماں کا شاہی نام مریم زمانی تھا۔ وہ راجہ بہاڑا مل کی بیٹی تھی اور ہندوستان کے راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ جہاں گیر سے پہلے اکبر اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ اس زمانے میں وہ مذہبی رجحانات کا حامل تھا اور اس کے ذہن وقلب پر اسلامی احکام واوامر کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ وہ فتح پور سیکری کے مشہور بزرگ شیخ سلیم بن بہاء الدین چشتی کا مرید تھا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ شیخ سلیم چشتی، شیخ فریدالدین گنج شکر کی اولاد سے تھے۔ اکبر نے شیخ سے بیٹے کی ولادت اور زندگی کی دعا کرائی۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور بادشاہ کو بیٹا عطا کیا۔ بیٹے کا نام مرشد کے نام پر سلیم رکھا گیا۔ جہاں گیر اپنے تزک کے آغاز میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جس زمانے میں اس کے والد بزرگ وار کے دل میں بیٹے کی شدید آرزو کروٹ لے رہی تھی، ان دنوں نواحی آگرہ میں موضع سیکری کے ایک پہاڑ میں شیخ سلیم نامی ایک صاحب حال درویش فروکش تھے۔ وہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکے تھے اور اس نواح کے لوگ ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ شہنشاہ اکبر چوں کہ بزرگوں کا بڑا معتقد تھا، لہٰذا شیخ سلیم کی خدمت میں بھی جاتا اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا۔ ایک روز جب کہ شیخ عالمِ بے خودی میں تھے، اکبر نے ان سے پوچھا، میرے کتنے بیٹے ہوں گے۔؟

فرمایا۔ بخشندۂ بے منت سہ پسر بہ شما ارزانی خواہد داشت۔

(اللہ تعالیٰ تمھیں تین فرزند عطا کرے گا۔)

اکبر نے کہا:

نذر نمودم کہ فرزندِ اول را بہ دامنِ تربیت وتوجہ شما انداختہ۔ شفقت ومہربانی شمارا حامی وحافظ او سازم۔

(میں نے نذر مانی ہے کہ پہلا بیٹا آپ کے دامن تربیت اور التفاتِ توجہ میں دوں گا، اور آپ کی شفقت وعنایت کو اس کا حامی ومحافظ بناؤں گا۔)

شیخ نے بادشاہ کی یہ پیش کش قبول فرمائی اور کہا

مبارک باشد، باہم ایشاں راہم نامِ خود ساختیم۔
(مبارک ہو، ہم اس بچے کو اپنا ہم نام بنائیں گے۔)
جہاں گیر کی ولادت، شیخ سلیم کے گھر میں ہوئی۔ چنانچہ وہ اس سے آگے خود لکھتا ہے:۔
چوں والدۂ مرا ہنگام وضع حمل نزدیک می رسد بخانۂ شیخ می فرستند تا ولادتِ من دراں جا واقع گردد، بعد از تولد نامِ مرا سلطان سلیم نہادند۔
(جب میری والدہ کے وضع حمل کا وقت قریب آیا تو ان کو شیخ کے مکان میں بھیج دیا گیا تا کہ میری ولادت وہیں ہو۔ ولادت کے بعد میرا نام سلیم رکھا گیا۔)
چوں کہ جہاں گیر کا نام اکبر کے مرشد کے نام پر سلیم رکھا گیا تھا، اس لیے نام کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے باپ نے بیٹے کو کبھی کسی حالت میں بھی نام لے کر نہیں پکارا۔
اما من از زبان مبارک پدر خود نہ در مستی و نہ در ہوشیاری شنیدم کہ مرا محمد سلیم یا سلطان سلیم مخاطب ساختہ باشند، ہمہ وقت شیخو بابا گفتہ سخن می کردند۔
(یعنی میں نے اپنے باپ کی زبان سے، نہ عالم مدہوشی میں، نہ حالت سرشاری میں مجھ کو محمد سلیم یا سلطان سلیم کے نام سے پکارتے نہیں سنا۔ وہ ہمیشہ مجھے شیخو بابا کہتے تھے۔)
جہاں گیر کی ولادت کے بعد اکبر نے سیکری کو مقامِ مبارک سمجھ کر اپنا دارالحکومت بنایا اور چودہ پندرہ سال میں اس پہاڑ اور جنگل میں ایک ایسا شہر آباد کر دیا جہاں ہر سو نوع بنوع باغات دکھائی دیتے اور ہر طرف دل کش عمارات نظر آتی تھیں۔ پھر فتحِ گجرات کے بعد اس کو فتح پور سیکری کے نام سے موسوم کیا❶۔

## تعلیم و تربیت:

جہاں گیر نے ابتدائی تربیت شیخ سلیم چشتی کے گھر میں پائی اور چار سال چار ماہ چار روز کا ہوا تو چہار شنبہ کے روز ۲۲ رجب ۹۸۱ھ/ ۱۷ ر نومبر ۱۵۷۳ء کو تعلیم کے لیے مکتب میں بٹھا دیا گیا❷۔ اس کے اساتذہ میں مولانا محمد سعید ہروی المعروف بہ میر کلاں محدث اور مفتی صدر جہاں پھانی شامل ہیں۔ میر کلاں سے اس نے حدیث کی سماعت کی۔ اس کے ایک معلم و اتالیق قطب الدین محمد خاں تھے، جن کے بارے میں وہ خود لکھتا ہے کہ "آں برگزیدۂ دین و دولت خلعت امتیاز پوشید❸۔" جہاں گیر ترکی زبان کا بھی عالم تھا۔ یہ زبان اس نے عبدالرحیم خانِ خاناں سے سیکھی۔ چہل حدیث کا درس اس نے شیخ عبدالنبی کی خدمت میں رہ کر لیا❹۔

❶ تزک جہاں گیری، ص ۲، ۳
❷ مقدمہ تزک جہاں گیری، ص ٦
❸ تزک جہاں گیری، ص ٦
❹ ایضاً، ص ۱۰

جلال الدین اکبر نے جہاں گیر کی تربیت کا عمدہ تریں اہتمام کیا اور ملک کے مشاہیر اساتذہ کو اس کی تعلیم پر مامور فرمایا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ شہنشاہ اکبر کا یہ جانشین اپنے دور کا عالم و فاضل شخص تھا۔ علما و فقہا سے اس کے مخلصانہ مراسم تھے۔ اصحاب تصوف و طریقت سے نہایت احترام سے پیش آتا تھا۔ شعرا و ادبا کی بڑی حوصلہ افزائی کرتا اور ارباب فن کی اس کے دل میں بدرجہ غایت قدر و منزلت تھی۔ قرآن و تفسیر' حدیث و فقہ' فلسفہ و حکمت اور دیگر مروجہ علوم سے اس کو گہرا لگاؤ تھا۔ بہترین شاعر تھا۔ اس کے دربار میں شعر و شاعری کی بالالتزام محفلیں جمتیں' شعرا اپنا کلام سناتے اور داد پاتے۔ جہاں گیر ان محفلوں میں شرکت کرتا اور ادبی مباحث میں حصہ لیتا۔ مشہور شعرا کے بے شمار اشعار اسے زبانی یاد تھے' وہ انھیں مناسب مواقع پر پڑھتا اور اونچے درجے کے نقاد کی طرح ان کے حسن و قبح کو تنقید کی میزان میں رکھتا۔

## جہاں گیر کی بغاوت:

اکبر نے اگرچہ جہاں گیر کے لیے بہترین تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا' تاہم ایک مرحلے میں باپ بیٹے کے باہمی تعلقات میں سخت کشیدگی پیدا ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں اکبر کو شدید بیماری نے آگھیرا اور اس نے کرب و اذیت کے اس عالم میں بیٹے پر الزام عاید کیا کہ اس نے سازش کر کے مجھے زہر دے دیا ہے۔ پھر دونوں میں ذہنی بعد اس وقت نقطۂ عروج کو پہنچا جب ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء میں جہاں گیر نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے الہ آباد کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اکبر نے بعض ذرائع سے مصالحت کی کوشش کی مگر جہاں گیر اس پر آمادہ نہ ہوا۔ حالات کی رفتار نے ایسا رخ اختیار کیا کہ ۱۰۱۰ھ میں وہ ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ آگرے کی طرف بڑھا۔ اکبر نے بھی دفاعی کارروائیاں شروع کیں اور اس کا لشکر شہزادے سے مقابلے کے لیے میدان کارزار میں نمودار ہوا۔ لیکن شہزادہ الہ آباد کی طرف واپس لوٹ گیا اور شاہی لقب اختیار کر کے باقاعدہ دربار قائم کر لیا۔ حالات میں زیادہ پیچیدگی پیدا ہوئی تو اکبر کے مرحوم وزیر بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ سلطان بیگم درمیان میں پڑی اور مصالحت کی دوبارہ ایک صورت سامنے آئی' لیکن شہزادہ اس پر بھی قائم نہ رہا اور جلد ہی پہلی روش اختیار کر لی' اور الہ آباد جا کر پھر اپنا دربار قائم کر لیا۔

واقعات کا تیز رو کارواں اسی نہج پر آگے بڑھتا رہا۔ اس اثنا میں جہاں گیر اس قطعی نتیجے پر پہنچا کہ اکبر کا وزیر ابوالفضل ہی تمام مصیبتوں کا باعث ہے اور وہ اس کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرتا رہتا ہے۔ لہذا ابوالفضل کو درمیان سے ہٹانا ضروری ہے۔ ان دنوں ابوالفضل دکن میں مقیم تھا۔ اکبر نے ضروری مشوروں کے لیے اسے دارالحکومت میں طلب کیا۔ اس کی اطلاع جہاں گیر کو بھی پہنچ گئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ ابوالفضل شہنشاہ کو میری مزید مخالفت پر آمادہ کرے گا اور معاملہ اور الجھ جائے گا۔ اب اس نے بندیلہ کے ایک سردار نرسنگھ دیو کو

اس پر آمادہ کیا کہ جب ابوالفضل تمھارے علاقے سے گزرے تو اسے قتل کر دو' میں تمھیں بہت سی مراعات دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نرسنگھ دیو کے ملازموں نے ابوالفضل کو قتل کر کے اس کا سر جہاں گیر کے پاس الہ آباد بھیج دیا۔ اس قتل کا اکبر کو بہت افسوس ہوا مگر وہ بیٹے کو کچھ نہ کہہ سکا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں گیر کو باپ کے مذہبی افکار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس نے کسی موقعے پر بھی ان افکار و تصورات کی حمایت نہیں کی جو اکبر کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔ بلکہ واقعات کی مختلف کڑیاں ملائی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکبر کے دینی تصورات کا مخالف تھا۔ اکبر ہندوستان کا بہت بڑا حکمران اور عظیم منتظم تھا۔ اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر ابوالفضل سے اگرچہ اب اکبر کے تعلقات اچھے نہ رہے تھے اور ابوالفضل کو اس کا شدید احساس بھی تھا تاہم اس کو قتل کر دینا امر سہل نہ تھا۔ جہاں گیر کی تعلیم و تربیت چوں کہ علمائے حق کی نگرانی میں ہوئی تھی' اس لیے وہ ان سے متاثر تھا اور اپنے باپ کے دینی افکار اور ابوالفضل اور اس کے باپ ملا مبارک اور بھائی شیخ فیضی نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا' اس سے خوب واقف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ مزید آگے بڑھے۔ باپ سے اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی اور ابوالفضل کے قتل میں بھی یہ راز مضمر تھا۔ ملا مبارک اور فیضی پہلے وفات پا چکے تھے۔ ابوالفضل ہی باقی رہ گیا تھا۔ ہندوستان میں کسی شکل میں اسلامی فضا پیدا کرنے کے لیے اس کو راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔

جہاں گیر کی تخت نشینی میں جن امرائے مملکت کا ہاتھ ہے اور جن شرائط پر اسے حکومت دی گئی' پھر برسر حکومت آتے ہی بارہ احکام پر مشتمل جو دستور العمل اس نے جاری کیا' اس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ جہاں گیر مذہبی اور دینی اعتبار سے باپ سے بالکل مختلف تھا اور اس کے دل میں اسلام کی روشنی موجود تھی۔

## تخت نشینی اور بارہ احکام:

جہاں گیر پنجشنبہ کے روز ۱۴ جمادی الاولی ۱۰۱۴ھ/ ۱۷ ستمبر ۱۶۰۵ء کو چھتیس (۳۶) سال کی عمر میں اپنے والد جلال الدین اکبر کی وفات کے بعد دارالحکومت آگرہ میں نور الدین محمد جہاں گیر کے نام سے تخت نشینِ ہند ہوا اور برصغیر کی وسیع سلطنت کی زمام اختیار ہاتھ میں لی۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور امرا و وزرا اور ارکانِ سلطنت کو خلعات و انعامات اور ترقیات سے نوازا گیا۔ اس نے عدل و انصاف کے ساتھ کاروبارِ حکومت کا آغاز کیا۔ سید عبدالحی حسنی لکھنوی لکھتے ہیں:

> وافتتح امره بالعدل والسخاء و قرب اليه العلماء وكان صحيح العقيدة خلافا لوالده[1]۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۱۲۰

(جہاں گیر نے اپنا سلسلۂ حکومت عدل وانصاف اور جود وسخا کے ساتھ شروع کیا۔ علمائے کرام اس سے قرب وتعلق رکھتے تھے اور وہ اپنے باپ (اکبر) کے برعکس صحیح العقیدہ مسلمان تھا۔)

جہاں گیر کی معدلت گستری کا یہ عالم تھا کہ اس نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی حکم جاری کر دیا کہ قلعے کے برج پر ایک زنجیر عدالت آویزاں کی جائے تاکہ جو فریادی اور مظلوم کسی وجہ سے شاہی دربار تک رسائی حاصل نہ کر سکیں، وہ اس زنجیر کو ہلا دیں تاکہ بادشاہ براہِ راست ان کی فریاد سن سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے حسب ذیل بارہ احکام جاری کیے:

۱۔ محصول چونگی اور محصول میر بحری معاف کر دیے جائیں اور جو بگاریں صوبوں کے جاگیر دار اور عمال حکومت اپنے ذاتی مفاد کے لیے لوگوں سے لیتے ہیں، وہ ختم کر دی جائیں۔ اپنے اختیارات سے جن تکلیفوں اور مشقتوں میں وہ عوام کو مبتلا کرتے ہیں ان کا سلسلہ فوری طور پر بند کر دیا جائے۔

۲۔ جو راستے آبادیوں سے دور ہونے کی وجہ سے چوروں اور ڈاکوؤں کی زد میں ہیں اور مسافر ہر وقت خطرے میں گھرے رہتے ہیں، وہاں منزل بہ منزل سرائیں اور مسجدیں تعمیر کی جائیں، کنویں کھدوائے جائیں اور ان میں محافظ مقرر کیے جائیں تاکہ راہ گزر امن وامان سے اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔

۳۔ جو لوگ لاوارث فوت ہو جائیں، وہ مسلمان ہوں یا ہندو، ان کی متروکہ دولت سے مسجدیں، سرائیں اور نئے پل تعمیر کیے جائیں، کنوئیں اور تالاب کھدوائے جائیں۔ یا پرانے اور شکستہ پلوں کی مرمت کرائی جائے۔ یہ سب مصارف ان کی دولت کے شرعی مصارف ہوں گے۔

۴۔ ملک میں شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کی فروخت بند کر دی جائے۔

۵۔ سرکاری ملازمین اور سرکاری اہل کار کسی کے گھر میں قیام نہ کریں۔

۶۔ کسی کو ناک، کان کاٹنے کی سزا نہ دی جائے۔ (جہاں گیر کہتا ہے) میں خود بھی بارگاہِ الٰہی میں عہد کرتا ہوں کہ کسی کو یہ سزا نہ دوں گا۔

۷۔ سرکاری زمین کے منتظموں اور جاگیر داروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ رعایا کی زمین پر ظلم وتعدی سے قبضہ کر کے اس پر کاشت نہ کریں۔

۸۔ دیہات کے سرکاری عامل اور منتظم وملازم وہاں بلا اجازت شادی نہ کریں۔

۹۔ بڑے بڑے شہروں میں شفا خانے قائم کیے جائیں اور ان میں جو طبیب متعین کیے جائیں ان کے اخراجات شاہی خزانے سے ادا کیے جائیں۔

۱۰۔ ہر سال ۱۷ ربیع الاول کو جو کہ جہاں گیر کی تاریخ ولادت ہے، اور ہفتے میں دو روز یعنی جمعرات اور ہفتے کو جانور ذبح نہ کیے جائیں۔

۱۱۔ جلال الدین اکبر بادشاہ کے زمانے کے تمام عہدے دار بدستورِ سابق برقرار رہیں۔

۱۲۔ تمام قیدی جو مختلف قلعوں اور جیلوں میں محبوس ومقید ہیں، رہا کر دیے جائیں [1]۔

## شرع محمدی کے نفاذ وتحفظ کی شرط:

تخت نشینی کے بعد جہاں گیر کے یہ بارہ احکام (احکام دوازدہ) ملک کے دستور العمل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں وہ ہندوستان میں کسی نہ کسی صورت میں اسلامی احکام نافذ کرنا چاہتا تھا۔ یہ تو واقعہ ہے کہ اس کو اپنے باپ کے دین سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ اس سے تعلق کا اظہار کبھی اپنے چھتیس (۳۶) سالہ دور شہزادگی میں کیا اور نہ حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے بعد اس سے وابستگی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ بلکہ ''اکبر اینڈ دی جیوئس'' کا مصنف سی، ایچ، پین تو صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ ''جو امرائے سلطنت جہاں گیر کو وارث تخت ہند بنانا چاہتے تھے، ان کی بنیادی شرط یہ تھی کہ بادشاہ اس ملک میں شرع محمدی کا نفاذ وتحفظ کرے گا [2]۔

جن امرائے مملکت نے جہاں گیر کو بادشاہ ہند بنانے میں اہم کردار ادا کیا ان میں شیخ فرید بخاری جسے بعد میں نواب مرتضیٰ خاں کا خطاب ملا، پیش پیش تھا۔ درحقیقت دربار کے دو نامور رکن، اکبر کا جانشین، جہاں گیر کے بیٹے خسرو کو بنانا چاہتے تھے۔ ان دو میں سے ایک اکبر کا مشہور مصاحب عزیز خاں کوکہ تھا جو خان اعظم کے لقب سے ملقب تھا، اور دوسرا راجا مان سنگھ تھا۔ خسرو کی بیوی خان اعظم کی بیٹی تھی، راجا مان سنگھ کا بھی وہ رشتے دار تھا۔ ان دونوں نے خسرو کی تخت نشینی کے لیے کوشش بھی کی۔ لیکن شیخ فرید اور بعض دیگر مسلمان امرا نے اس کوشش کو کامیابی سے ہم کنار نہیں ہونے دیا۔ ان کی تگ ودو سے جہاں گیر ہی اکبر کا جانشین بنا اور انھوں نے جہاں گیر سے دو شرطوں پر پابند رہنے کا وعدہ لیا۔ ایک یہ کہ وہ ملک میں شرع محمدی کا نفاذ کرے گا، دوسرے یہ کہ اپنے بیٹے خسرو اور اس کے معاونوں سے کسی قسم کی سرزنش نہیں کرے گا۔ شہزادے نے ان شرائط کی پابندی کا حلف اٹھایا اور محافظوں کی خاص تعداد کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو گیا [3]۔

بلاشبہ جہاں گیر نے بہت حد تک اپنے وعدے کا ایفا کیا۔ ملک میں اسلام اور علوم اسلامی کو ترقی دی۔ اس کے عہد میں بہت بڑا کام یہ ہوا کہ اکبر کے مذہبی افکار کا کوئی اثر اگر کہیں باقی بھی تھا تو اس کے عہد میں بالکل ختم ہو گیا۔

---

[1] تزک جہاں گیری، ص ۵

[2] اکبر اینڈ دی جیوئس، ص ۲۰۴

[3] ...نڈ دی جیوئس، ص ۲۰۴

اس کا اظہار کرتے ہیں' ان کا ترجمہ لائق مطالعہ ہے۔

"الحمد لله و سلام علی عباده الذین اصطفی" اس طرف کے احوال اوضاع حمد کے لائق ہیں۔ (بادشاہ کے ساتھ) عجیب وغریب صحبتیں گزر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ میں قطعاً کسی قسم کی سستی اور مداہنت کا دخل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو دفتر ہو جائے۔ بالخصوص آج رمضان کی سترھویں شب کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت' عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان' اس کے عذاب وثواب' رویت و دیدار کے اثبات' حضرت خاتم الرسل ﷺ کی نبوت کی خاتمیت' ہر صدی کے مجدد' خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی اقتدا' تراویح کی سنیت' تناسخ کے ابطال' جنوں اور جنیوں کے احوال اور ان کے عذاب وثواب کے بارے میں بہت کچھ مذکور ہوا۔ بادشاہ بڑی خوشی سے سب باتیں سنتا رہا۔ اس اثنا میں اور بھی بہت سی باتوں کا ذکر ہوا۔ اقطاب' اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیات وغیرہ کا تذکرہ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ بادشاہ سب باتیں تسلیم کرتا رہا اور دوران گفتگو میں کوئی ایسا تغیر ظاہر نہیں ہوا جو برہمی پر دلالت کناں ہو۔ ان واقعات اور ملاقات میں شاید اللہ تعالیٰ کی حکمت پوشیدہ ہوگی اور کوئی راز مخفی ہوگا۔

الحمد لله الذی هدٰنا لهذا وما کنا لنهتدی لو لا ان هدنا الله لقد جآء ت رسل ربنا بالحق۔

"دوسرے یہ کہ قرآن مجید بادشاہ کو سورہ عنکبوت تک ختم کرا چکا ہوں۔ جب رات کو اس مجلس (بادشاہی) سے اٹھ کر آتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ حفظ قرآن کی یہ اعلیٰ دولت' اس پراگندہ حالی میں جو عین جمعیت قلب ہے' حاصل ہوئی۔ الحمد الله اولا و اخرا"❶۔

جہاں گیر کے متعدد امرا و وزرا بھی حضرت مجدد کے عقیدت مندوں میں شامل تھے اور ان کے نام انھوں نے مکتوب بھی تحریر فرمائے۔ اس محبت وعقیدت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے دل میں اسلامی شریعت کی فلاح و بہبود کا جذبہ بیدار ہوا اور اس کے ارکان دربار بھی ان سے بہت متاثر ہوئے۔

مشہور ہے کہ جہاں گیر کہا کرتا تھا کہ میرے پاس نجات کی ایک دستاویز ہے' اور وہ حضرت شیخ احمد سرہندی کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے۔

## خلاف شرع رسوم سے نفرت:

جہاں گیر کے قلب و ذہن اور فکر وعمل کی دنیا بالکل بدل گئی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں میں ہندوؤں اور

❶ مکتوبات امام ربانی' دفتر سوم' مکتوب ۴۳

## بیٹوں کی مخالفت:

تخت نشین ہونے کے بعد خود جہاں گیر کو بھی بیٹوں کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد ۱۰۱۵ھ/ ۱۶۰۶ء میں اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کا اعلان کیا۔ اگرچہ بعد میں مصالحت ہوگئی لیکن جہاں گیر نے بیٹے کے اس گستاخانہ اقدام کو کبھی معاف نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ء میں جب وہ برہان پور میں فوت ہوگیا تو جہاں گیر نے اطمینان کا سانس لیا' کیوں کہ اس کی ایک بڑی پریشانی ختم ہوگئی تھی۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو نے جہاں گیر کے خلاف بغاوت کے زمانے میں خسرو کی مدد کی اور اسے پناہ دی تھی' جس کی بنا پر شہنشاہ نے اسے موت کی سزا دی۔ اس واقعہ کے آئندہ سکھ مسلم تاریخ پر گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

اس سے کئی برس قبل ۱۰۱۶ھ/ ۱۶۰۷ء میں جب جہاں گیر کابل میں خیمہ زن تھا' اسے قتل کرنے کی سازش کی گئی' جسے اس نے ناکام بنا دیا۔ سازش کے چار سرغنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور شہزادہ خسرو کی' جو اس سازش کا اصل محرک تھا' بادشاہ کے حکم سے آنکھیں بے کار کر دی گئیں۔

۱۰۳۲ھ/ ۱۶۲۳ء میں جہاں گیر کو اپنے ایک اور بیٹے شہزادہ خرم کی (جو آگے چل کر شہاب الدین محمد شاہ جہان کے نام سے وارثِ تختِ ہند ہوا)' بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بغاوت کا باعث شہزادہ خرم اور ملکہ نور جہاں کے باہمی اختلافات تھے۔ نور جہاں سے جہاں گیر کی ۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء میں شادی ہوئی تھی اور وہ اپنے حسن و خوبروئی اور عقل و دانش کی بنا پر حکومت کے دروبست پر تقریباً قابض ہوگئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ شہزادہ خرم راستے سے ہٹ جائے تاکہ اس کے داماد شہر یار کو' جو شاہ جہان کا سوتیلا بھائی تھا' تخت ہند پر متمکن کیا جا سکے۔ شہزادہ خرم کی بغاوت کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا اور اس نے ملک میں خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس سے شاہی وقار کو بڑا صدمہ پہنچا اور خزانہ تقریباً خالی ہوگیا۔ بغاوت کا یہ سلسلہ تین سال تک چلا۔ آخر مہابت خاں کی فوجی قوت نے جمادی الاخری ۱۰۳۵ھ/ مارچ ۱۶۲۶ء میں خرم کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

ان واقعات سے ہمیں حیران اور متعجب ہونے کی ضرورت نہیں' بادشاہوں کی تاریخ ہمیشہ تلوار کے قلم اور خون کی روشنائی سے انسانوں کی ہڈیوں پر رقم کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں باپ بیٹے کے خلاف سینہ سپر ہے اور کہیں بیٹا باپ کی گردن پر تیغ کی دھار آزما رہا ہے۔ تاریخ کے یہ مختلف موڑ ہیں جو وہ ایک خاص انداز کے ساتھ کاٹتی رہتی ہے۔ ہمیں ان کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں' ہم اس ڈھیر میں سے فقط اپنے مطلب کی چند چیزیں تلاش کرنا چاہتے ہیں۔

## علمائے کرام سے محبت وعقیدت:

جہاں گیر سنی العقیدہ بادشاہ تھا اور اس کو علمائے وقت سے بے حد محبت وعقیدت تھی' اس کے بائیس سالہ دورِ حکومت میں جون پور' دہلی' لاہور' آگرہ' کشمیر' سیالکوٹ' ملتان' سرہند' برہان پور' ٹھٹھہ وغیرہ بلا دوامصار اور مختلف دیہات وقصبات میں متعدد علمائے کرام موجود تھے اور ان علاقوں کو فقہا وشعرا' صوفیا واتقیا اور علما وصلحا کے مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ان علما وفقہا میں سے جہاں گیر بالخصوص شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ذات گرامی' ان کے علم وفضل کی وسعت پذیری اور تقوی وتدین سے بڑا متاثر تھا۔ دہلی میں اپنے چودھویں سال جلوس میں اس نے شیخ عبدالحق سے ملاقات بھی کی' جس کا وہ اپنی تزک میں ذکر کرتا ہے [1]۔ حضرت مجدد الف ثانی کی صحبتِ کیمیا اثر سے بھی اس نے غیر معمولی روحانی اور مذہبی برکات حاصل کیے۔ ابتدا میں بعض درباری امرا کی فتنہ پرور گفتگو سے متاثر ہو کر وہ حضرت مجدد سے برگشتہ رہا' یہاں تک کہ اشتعال میں آ کر ان کو گوالیار کے قلعے میں نظر بند بھی کر دیا مگر بعد میں انھیں رہا کر دیا تھا اور ان سے بدرجہ غایت محبت ومودت پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت مجدد کی رہائی کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ ایک روز جہاں گیر نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اس سے فرما رہے ہیں کہ جہاں گیر! تم نے ایک بڑے آدمی کو قید میں ڈال رکھا ہے۔ خواب دیکھنے کے فوراً بعد وہ بیدار ہوا اور حضرت کی رہائی کا حکم صادر کیا۔ انھیں اپنے پاس بلایا' معذرت طلب کی اور لطف وکرم سے پیش آیا۔ پھر ان کی ذات گرامی سے جہاں گیر کی شیفتگی اور عقیدت مندی یہاں تک پہنچی کہ زیادہ تر انہی کی خدمت میں رہنے لگا۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

> بادشاہ از محبان شیخ شد' بحد یکہ گاہی آں جناب را از خود جدانمی کرد' وشہزادہ خرم را واصل حلقہ مریدان شیخ نمود' چنانچہ تا عہد شاہ جہان وعالم گیر بادشاہان باہمہ علما ووزرا داخل سلسلہ مجددیہ می شدند [2]۔

(جہاں گیر بادشاہ) کا شمار محبان شیخ مجدد میں سے ہوا' یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو حضرت سے جدا نہ کرتا تھا' شہزادہ خرم کو حضرت شیخ کے حلقۂ مریدین میں شامل کیا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ شاہ جہان اور عالم گیر کے عہد تک شاہان ہند اپنے تمام علما ووزرا کے ساتھ سلسلۂ مجددیہ میں داخل ہوتے تھے۔)

حضرت مجدد سے جہاں گیر کے تعلق وشیفتگی کی یہ نوعیت تھی کہ وہ روزانہ مغرب کے بعد ان سے ملاقات کرتا اور ان ملاقاتوں اور باہمی مذاکرات کے نتیجے میں اس کے قلب وذہن دین کی روشنی سے منور ہوئے۔ حضرت مجدد اپنے صاحب زادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کے نام اپنے مکتوب میں جن الفاظ میں

---

[1] دیکھیے: تزک جہاں گیری' ص ۲۸۵

[2] خزینۃ الاصفیا' ص ۲۸۳

غیر مسلموں سے میل جول کی وجہ سے جو غیر اسلامی رسوم وعوائد رواج پا گئے تھے، جہاں گیر ان کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس پر دکھ کا اظہار کرتا تھا۔ اس نے اپنے پندرھویں سال جلوس میں حضرت مجدد الف ثانی کو قلعہ گوالیار سے رہا کیا، اسی سال وہ کشمیر گیا، وہاں علاقہ راجوڑی کے مسلمانوں کی حالت دیکھی اور ان میں مروج غلط رسمیں اس کے علم میں آئیں تو بادشاہ کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ اس کا وہ تزک جہاں گیر میں جن الفاظ میں اظہار کرتا ہے، ان کا ترجمہ یہ ہے:

یہاں کے زمینداروں کو "راجا" کہتے ہیں۔ ان لوگوں کو سلطان فیروز نے دائرۂ اسلام میں داخل کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو راجا کہتے ہیں اور ابھی تک زمانۂ جہالت کی بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ بدعات ان میں پوری طرح جاری اور مستمر ہیں۔ یہاں کسی ہندو عورت کا شوہر مر جائے تو وہ اس کے ساتھ ہی آگ میں جل جاتی ہے، اور مسلمان عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو بیوی کو زندہ اس کی قبر میں دفن کر دیتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ اس علاقے کی ایک عورت کو انہی دنوں میں اس کے ہم عمر مردہ شوہر کے ساتھ زندہ درگور کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگ بیٹی کو پیدائش کے وقت ہی قتل کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ ہندوؤں سے رشتے داری قائم کرتے ہیں۔ اپنی لڑکیاں ان کو دیتے ہیں اور ان کی لڑکیاں ان سے لیتے ہیں۔ نعوذ باللہ، ان بدعات کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ (اب سرکاری طور پر) حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص اس قسم کی بدعات کا ارتکاب کرے، اسے سزا دی جائے [1]۔

پھر آئندہ برس (سولھویں سال جلوس میں) بادشاہ فتح کانگڑہ کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کی غیر دینی حالت کو دیکھتا ہے تو سخت افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ کانگڑہ میں پہاڑ کے دامن میں ہندوؤں کا ایک بت خانہ ہے، جسے جوالا مکھی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس بت خانے میں مسلمان بھی جا کر بت پرستی کرتے اور نذرانے پیش کرتے تھے۔ جہاں گیر اپنے تزک میں اس کا ذکر خاصی تفصیل سے کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

قطع نظر از کفار کہ بت پرستی آئین آنہاست، گروہ گروہ از اہل اسلام مسافت بعید طے نمودہ، نذورات می آرند و پرستش ایں سنگ سیاہ می نمایند [2]۔

(قطع نظر کفار کے کہ بت پرستی ان کا مذہبی شیوہ ہے، گروہ در گروہ مسلمان بھی دور دراز کی مسافت طے کر کے وہاں آتے ہیں۔ نذریں پیش کرتے ہیں اور اس سنگ سیاہ کی پرستش کرتے ہیں۔)

اس سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کی غیر دینی اور خلاف شرع حرکات کے ارتکاب سے جہاں گیر کو سخت ذہنی اذیت پہنچتی تھی۔

---

[1] تزک جہاں گیری، ص ۳۲۲۔

[2] ایضاً، ص ۳۴۷۔

## سفر کانگڑہ میں علمائے اسلام کی معیت:

سولھویں سال جلوس میں جہاں گیر فتح کانگڑہ کی غرض سے روانہ ہوا تو علمائے اسلام بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ کون کون علما اس کے ہم رکاب تھے، تاہم اس کا تذکرہ وہ صراحت سے کرتا ہے۔ قلعہ کانگڑہ میں اذان اور شعائر اسلام کی بجا آوری کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

متوجہ سیر قلعہ کانگڑہ شدم و حکم کردم کہ قاضی و میر عدل و دیگر علمائے اسلام دررکاب بودہ، آنچہ شعار اسلام و شرائط دین محمدی است در قلعہ مذکور بعمل آورند۔ بتوفیق ایزد سبحانہ بانگ نماز و خواندن خطبہ وکشتن گاؤ وغیرہ کہ از ابتدائے بناء ایں قلعہ تا حال نشدہ بود، ہمہ را در حضور خود بعمل آوردم۔ سجدات شکر ایں موہبت عظمیٰ کہ ہیچ بادشاہے توفیق براں نیافتہ بود بتقدیم رسانیدہ۔ حکم فرمودم کہ مسجد عالی درون قلعہ بنا نہند ❶۔

(قلعہ کانگڑہ کی طرف عنان توجہ مبذول کی اور حکم دیا کہ قاضی، میر عدل اور دیگر علمائے اسلام ہم رکاب ہوں تاکہ اس قلعے میں شعائر اسلام اور شرائط دین محمدی پر عمل کیا جائے۔------ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی توفیق سے نماز کے لیے اذان کہی گئی، خطبہ پڑھا گیا اور گائے ذبح کی گئی، دیگر احکام اسلام پر بھی عمل ہوا۔ یہ وہ امور دینی تھے، جن پر قلعے کی تعمیر سے لے کر آج تک اس قلعے میں عمل نہیں ہوا تھا۔ یہ سب امور میں نے اپنے سامنے ادا کرائے۔ اللہ کی اس عنایت عظیم پر شکر کے سجدے ادا کیے کہ اس سے قبل کسی بادشاہ کو اس کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ اس میں مجھے ہی تقدم حاصل ہوا۔ میں نے حکم جاری کیا کہ قلعے کے اندر ایک عالی شان مسجد تعمیر کی جائے۔)

## مطالعہ کتب کا شوق اور مدارس دینیہ کی تعمیر:

جہاں گیر کو مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا۔ سرکاری کتب خانے کے علاوہ اس کا ایک اپنا شان دار ذاتی کتب خانہ تھا۔ اس کے مہتمم کا نام مکتوب خاں تھا۔ بادشاہ سفر میں بھی ضروری کتابیں ساتھ رکھتا تھا۔ تزک جہاں گیری میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ جب بادشاہ گجرات گیا تو وہاں کے مشائخ کو اپنے کتب خانے سے تفسیر حسینی، تفسیر کشاف اور روضۃ الاحباب پیش کیں۔

وہ اپنے بارھویں سال جلوس کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے:

مشائخ گجرات راکہ بمشایعت آمدہ بودند مرتبہ دیگر خلعت وخرچی با اراضی مدد معاش دادہ رخصت فرمودم، و بہ ہر یک ازیں ہا کتابے از کتاب خانہ خاصہ مثل تفسیر کشاف و تفسیر حسینی و روضۃ الاحباب مرحمت شد و بر پشت آں کتب تاریخ آمدن گجرات و مرحمت نمودن کتاب مرقوم گشت ❷۔

❶ تزک جہاں گیری، ص ۳۴۶، ۳۴۷

❷ تزک جہاں گیری، ص ۲۲۰

(مشائخ گجرات میرے پاس آئے تو میں نے ان کے مرتبے کے مطابق انھیں خلعت، مصارف اور مدد معاش کے لیے اراضی دے کر رخصت کیا۔ ساتھ ہی ان میں سے ہر ایک کو اپنے ذاتی کتب خانے سے تفسیر کشاف، تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب وغیرہ کتابیں پیش کیں، اور ان کتابوں کی پشت پر اپنی گجرات میں آمد اور کتاب دینے کی تاریخ تحریر کی۔)

جہاں گیر مدارس دینیہ کی تعمیر کا بھی شائق تھا۔ بقول خافی خاں اس کے لیے اس نے یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ کوئی امیر اور متمول شخص لاوارث فوت ہو جاتا تو اس کے مال و اسباب میں سے مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرتا تھا۔ تاریخ خان جہان کی روایت کے مطابق اس نے وہ تمام مدارس از سر نو آباد کیے جو گزشتہ تیس سالوں سے پرندوں اور چوپایوں کے مسکن بنے ہوئے تھے ❶۔

## قرآن مجید سے قلبی لگاؤ:

جہاں گیر کو قرآن مجید سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے اپنے عہد کے ایک عالم دین شیخ محمد بن جلال حسینی گجراتی کو قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ترجمہ لفظی ہو اور الفاظ قرآن سے ایک حرف بھی زائد نہ ہو۔ نیز تاکید کی کہ ترجمہ آسان اور عام فہم ہونا چاہیے۔ الفاظ اور زبان میں کسی قسم کا تصنع اور تکلف ہرگز نہ ہو ❷۔

معلوم نہیں اب یہ ترجمہ کہیں موجود ہے یا نہیں۔ غالباً یہ پہلا ترجمہ ہے جو برصغیر کے ایک عالم نے فارسی زبان میں کیا۔

## اوراد و وظائف:

اس کی ایک تحریر بتاتی ہے کہ وہ اوراد و وظائف کا بھی قائل تھا۔ نیز وہ علما و صلحا کی صحبت میں بیٹھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> بعلما و دانایان اسلامیہ فرمودم کہ مفردات اسمائے الٰہی را کہ دریاد گرفتن آسان باشد جمع نمائند تا آں راوِرد خود سازم، و در شبہائے جمعہ با علما و صلحا و درویشان و گوشہ نشینان صحبت می دارم ❸۔

---

❶ بزم تیموریہ، ص ۱۶۸

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۱

❸ تزک جہاں گیری، ص ۱۰

(میں نے علمائے اسلام اور فقہا کو حکم دیا ہے کہ وہ مفرد اسمائے الٰہی جمع کریں، کیوں کہ ان کو یاد رکھنا آسان ہے۔ میں ان کا وظیفہ کرنا چاہتا ہوں۔ جمعرات کو میں علما وصلحا اور درویشوں اور گوشہ نشینوں کی صحبت اختیار کرتا ہوں۔)

## ادب وشعر کا ذوق بلند:

دودمانِ مغلیہ کا یہ بادشاہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ رحم دلی، حلم، نرم مزاجی اور عدل وانصاف اس کا خاصہ تھا۔ ظریف الطبع، بہترین شاعر، فصیح البیان اور ذکی وفطین تھا۔ تحریر وتقریر میں کامل مہارت رکھتا تھا۔ تزک جہاں گیری اس کی اپنی تصنیف ہے۔ اس کے مندرجات سے پتا چلتا ہے کہ وہ ادبیت وفصاحت میں مرتبہ کمال پر فائز تھا۔ انتخاب الفاظ میں بے حد محتاط تھا۔ منظر کشی میں کوئی اس کا حریف نہ تھا۔

تزک جہاں گیری کے علاوہ فارسی زبان میں ''پند نامہ'' کے نام سے اپنے بیٹوں کے لیے ایک رسالہ قلم بند کیا جو چند اوراق پر مشتمل ہے۔

## مے نوشی اور افیون خوری:

بہت سی خوبیوں کے باوجود جہاں گیر میں کچھ ایسی عادتیں بھی تھیں، جو سراسر غیر اسلامی اور خلاف شرع ہیں۔ مثلاً وہ مے نوش اور افیون خور تھا، اور اس کا وہ برملا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس کے قول وفعل کا تضاد ملاحظہ ہو کہ ایک طرف وہ خود اپنے ہی جاری کردہ دستور العمل اور بارہ احکام میں سے چوتھے حکم میں یہ اعلان کرتا ہے:

شراب ودر بہرہ وآنچہ از قسم مسکرات منہیہ باشد نہ سازند ونہ فروشند ❶۔

کہ شراب اور دیگر نشہ آور چیزیں جن سے شریعت میں روکا گیا ہے، نہ تیار کی جائیں اور نہ فروخت کی جائیں۔

لیکن خود شراب پیتا اور افیون کھاتا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں نشہ آور ہیں اور نشہ آور چیزوں سے شریعت نے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ زندگی کے آخری دور میں تو وہ کثرت سے مے نوشی کرنے لگا تھا، اور یہی عادتِ بد اس کی موت کا سبب بنی۔

## ملکی مصالح:

جہاں گیر کے حالات میں اس کی رحم دلی اور منصف مزاجی کا خصوصیت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن

❶ تزک جہاں گیری، ص ۵

اس کے ساتھ ہی اس کے کردار کا یہ پہلو بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ اس نے خود اپنے بیٹوں پر سختیاں کیں اور بعض اہم شخصیتوں کی موت کا باعث بنا۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ ذاتی طور واقعی نرم دل اور متحمل مزاج تھا۔ عدل وانصاف میں بھی خاص شہرت کا حامل تھا۔ لیکن اتنے بڑے ملک کے بادشاہ اور حکمران کی حیثیت سے اس پر کچھ نازک ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی تھیں' جو ملک کے سیاسی مصالح کی بنا پر اسے بعض اوقات تشدد پر مجبور کرتی تھیں' اس لیے اگر اس کو کسی پر عملاً سختی اور تشدد کرنا پڑا ہے تو ممکن ہے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر ایسا کرنا اس کے نزدیک ضروری ہو۔

## دور جہاں گیری کے علمائے کرام:

دور جہاں گیری کے علمائے کرام' فقہائے عظام' حکمائے عالی مقام اور شعرائے نام دار کے اسمائے گرامی کی فہرست بہت طویل ہے' ان میں سے جو حضرات ہمارے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں' ان کے نام اور علمی کارنامے "فقہائے ہند" کی جلد چہارم میں مرقوم ہیں۔! ان میں حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا تذکرہ تو بار بار آتا ہے۔ ان کے علاوہ جن فضلائے عصر کی فہرست جہاں گیر نامہ وغیرہ نے بہم پہنچائی ہے' ان میں سے چند حضرات یہ ہیں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی' ملا عبداللطیف سلطان پوری' علامہ محمود جون پوری' ملا محمد فاضل کابلی' ملا حسن مراغی' قاضی نور اللہ شستری' میر شکر اللہ شیرازی' ملا روز بہان شیرازی' میر ابوالقاسم گیلانی' ملا عبدالرحمٰن گجراتی' ملا نفسہائے شستری' ملا باقر کشمیری' ملا مقصود علی' شیخ محمد یمنی ❶۔

## شیخ محمد میر سے عقیدت و تعلق:

جہاں گیر کو جن مشائخ کرام اور علمائے عظام سے خاص عقیدت تھی' ان میں لاہور کے شیخ محمد میر بھی شامل ہیں' جنھیں اب میاں میر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جہاں گیر اپنے تزک میں بڑے احترام سے ان کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

چوں بعرض رسید کہ در لاہور شیخ محمد میر نام درویشے است ہندی الاصل' بغایت فاضل و مرتاض و مبارک نفس و صاحب حال' در گوشہ توکل و عزلت منزوی گشتہ از فقر غنی واز دنیا مستغنی نشستہ است۔ بنابریں خاطر حق طلب بے ملاقات ایشاں قرار نہ گیرد و بدیدن ایشاں رغبت افزود۔ چوں بہ لاہور رفتن متعذر بود رقعہ بخدمت ایشاں نوشتہ' شوق باطن را ظاہر ساختم' و آں عزیز باوجود کبر سن و ضعف بینہ تصدیعہ کشیدہ تشریف آوردو مدت ممتد تنہا با ایشاں نشستہ صحبت مستوفی داشتہ شد۔ الحق ذات شریف است و دریں عہد بغایت غنیمت و عزیز الوجود۔ ایں نیاز مند از خود برآمدہ با ایشاں صحبت داشت و بسا سخنہا بلند از حقائق و معارف استماع افتاد۔ ہر چند خواستم

❶ جہاں گیر نامہ' ص ۲۷۹

نیازے بگزارنم' چوں پایۂ ہمت ایشاں رااز اں عالی تریافتم خاطر باظہار ایں مطلب رخصت نہ داد۔ پوست آہو سفید بہ جہت جائے نماز بایشاں گزرانیدم ❶۔

(مجھے جب پتا چلا کہ لاہور میں شیخ محمد میر نام کے ایک درویش سکونت پذیر ہیں' جو اصلاً ہندی ہیں' نہایت فاضل' پسندیدہ خو' شریف النفس اور صاحب حال بزرگ ہیں' توکل وعزلت کی زندگی بسر کرتے ہیں' فقر پر قانع اور دنیا سے بے نیاز ایک گوشے میں بیٹھے ہیں' تو طلب حق کی غرض سے ان سے ملاقات کے بغیر دل میں چین نہ آیا اور ان کی زیارت کا شوق بے قرار کرنے لگا۔ چنانچہ جب لاہور جانا مشکل ہوگیا تو ان کی خدمت میں رقعہ لکھا اور اپنے باطن کا اشتیاق ظاہر کیا۔ وہ عزیز القدر بزرگ باوجودیکہ کبر سنی کو پہنچ گئے تھے اور جسم پر کمزوری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے' تکلیف سے تشریف لائے۔ بڑی دیر تک تنہائی میں ان کی خدمت میں بیٹھنے کا موقع ملا اور خوب صحبت رہی۔ بلاشبہ وہ اونچے مرتبے کی شخصیت ہیں' اور اس عہد میں ان کا وجود مسعود انتہائی غنیمت ہے۔ یہ نیاز مند خود باہر نکل کر ان سے ملا' ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوا' اور حقائق و معارف سے بھرپور باتیں سننے کا بہترین موقعہ میسر آیا۔ ہر چند چاہا کہ کوئی نذر پیش کروں' مگر جب ان کے مرتبے کو اس سے بلند تر پایا تو دل نے اس کے اظہار کی اجازت نہ دی۔ البتہ جائے نماز کی شکل میں سفید ہرن کی کھال پیش خدمت کی۔)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں گیر کے دل میں علما و مشائخ کی کیا قدر و منزلت تھی اور وہ کس عقیدت واحترام کے ساتھ ان سے ملتا تھا۔

## برصغیر میں انگریز کا قدم:

جہاں گیر کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں تجارت کی غرض سے انگریز سب سے پہلے جہاں گیر ہی کے عہد میں آئے تھے۔ مختصر الفاظ میں واقعہ یوں ہے کہ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کے عہد میں لندن کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کا پہلا چارٹر ملا۔ کپتان ولیم ہاکنز ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا انگریز تاجر ہے جس نے ساحل ہند پر قدم رکھا۔ ۱۶۰۸ء میں اس کا جہاز ہیکٹر سورت کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ ہاکنز نے جہاں گیر کے دربار میں حاضر ہو کر انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کا مکتوب اس کی خدمت میں پیش کیا۔ انگریزوں کی پہلی تجارتی کوٹھی ۱۶۰۸ء میں سورت میں تعمیر کی گئی۔ ۱۶۱۳ء میں بادشاہ جہاں گیر نے سورت' کھمبایت' گوگو اور احمد آباد میں کوٹھیاں بنانے کی اجازت دی۔ اسی سال انگریزوں کو سورت میں ایک فیکٹری قائم کرنے اور مغل دربار میں سفارت کے فرائض انجام دینے کی

❶ تزک جہاں گیری' ص ۲۹۰

سند حاصل ہوئی۔ بعد ازاں' مچھلی پٹم میں بھی انھوں نے ایک کارخانہ قائم کیا۔ سر طامس رو پہلا سفیر تھا جو شاہ انگلستان جیمس اول کی طرف سے شہنشاہ ہند جہاں گیر کے دربار میں آیا۔ شاہی دربار میں اس کی بڑی عزت و توقیر کی گئی۔ سفیر مذکور چار سال فرائض سفارت پر مامور رہا۔ اس اثنا میں اس نے ایک کتاب بھی لکھی' جس میں ہندوستان کے بادشاہ' یہاں کے سیاسی حالات اور دربار کی کیفیات قلم بند کیں۔ اس سے پہلے ولیم ہاکنز بھی ہندوستان میں موجود تھا۔ وہ بھی بادشاہ سے قریبی روابط رکھتا تھا' اس نے بھی یہاں کے حالات تحریر کیے' جن میں بادشاہ کو ظالم اور سفاک قرار دیا گیا ہے۔ ۱۶۱۵ء میں دو اور انگریز رچرڈ سٹیل اور جان کروتھر' اصفہان جاتے ہوئے دہلی سے گزرے تھے' انھوں نے بھی اپنی ڈائری میں بادشاہ پر سخت تنقید کی ہے اور یہاں کی رعایا کو مفلس لکھا ہے۔

جہاں گیر کے زمانے میں انگریز کے ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آنے' عہدہ سفارت پر فائز ہونے اور پھر یہاں کے حالات وکوائف کو قلم بند کرنے کا تذکرہ ہم نے چند الفاظ میں اس لیے کیا ہے کہ آئندہ چل کر اس سے برصغیر کی تاریخ کا رخ بالکل بدل گیا اور یہ خطۂ ارض سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے انقلاب وتغیر کے خوف ناک طوفانوں کی زد میں آ گیا۔ اگر اللہ نے توفیق عطا فرمائی اور زندگی باقی رہی تو ان واقعات کی تفصیل اس کتاب کی آئندہ جلدوں میں اس کے اصل مقام پر بیان کی جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔ علیہ توکلنا و الیہ المنیب۔

## وفات:

بہر حال بادشاہ ہند نور الدین محمد جہاں گیر میں اگرچہ اچھائیوں کے ساتھ بحیثیت انسان برائیاں بھی پائی جاتی تھیں لیکن مجموعی اعتبار سے وہ ایک اچھا حکمران تھا اور بہت سے اوصاف اس کی ذات میں سمٹ آئے تھے۔

شہنشاہ جہاں گیر کی موت حالت سفر میں واقع ہوئی۔ وہ کشمیر کے دورے پر تھا اور وہاں کے ایک مقام راجوڑی سے بھمبر جا رہا تھا کہ راستے میں چاشت کے وقت ہفتے کے روز ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ/ ۲۹ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو اٹھاون (۵۸) سال کی عمر پا کر اپنے جلوس سلطنت کے بائیسویں برس میں انتقال کر گیا۔ اس کی میت لاہور لائی گئی اور اسی شہر میں اسے دفن کیا گیا۔ مقام تدفین کا انتخاب اس کی بیوی نور جہاں نے کیا تھا جہاں اس نے اپنے خرچ سے ایک شان دار مقبرہ تعمیر کیا۔

اس زمانے کے سیاسی حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ بابر کی نسل کے اس چوتھے عظیم بادشاہ کی رسوم تعزیت شاہی روایات کے مطابق ادا نہ کی گئیں۔

# شاہ جہان

شاہ جہان چہار شنبہ کے روز ۲۸ ربیع الاول ۱۰۰۰ھ/ ۳ جنوری ۱۵۹۲ء کو لاہور میں پیدا ہوا' اور اس کا نام خرم رکھا گیا۔ شاہ جہان کی رگوں میں بھی جہاں گیر کی طرح راجپوت خون کی آمیزش تھی۔ اس کی ماں کا نام جودھا بائی تھا' اور وہ جودھ پور کے راجا بھگوان داس کی بیٹی تھی۔ شہزادہ چار سال چار ماہ چار دن کا ہوا تو خاندانی روایت کے مطابق حصول علم کے لیے مکتب میں داخل کرا دیا گیا' اور تحصیل علم سے بہرہ مند ہوا۔ لیکن یہ علم و ادراک کی کن منازل پر فائز تھا اور کس عالم سے کیا استفادہ کیا؟ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ پھر چوں کہ اس کی کوئی تصنیف بھی نہیں ہے' اس لیے اس کی علمی گہرائی کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ بابر کے تزک اور اس کی بعض دوسری علمی سرگرمیوں سے اس کے علم و فضل کی نشان دہی ہوتی ہے۔ جہاں گیر کا تزک بھی اس کے معلومات کا پتا دیتا ہے۔ اورنگ زیب کے رقعات اس کی فضیلت علمی کے شاہد ہیں' لیکن شاہ جہان کے بارے میں ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے کہ جس سے اس کے مرتبۂ علمی کا اندازہ ہو سکے۔ البتہ اس کے بعض فرمان بتاتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے مروجہ علوم میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس کا انتخاب الفاظ اور اسلوبِ کلام عالمانہ اور پُر وقار ہے۔ پھر اس نے اپنے بیٹوں داراشکوہ اور اورنگ زیب کو جس نہج سے تعلیم دلائی' اپنے دور کے مشاہیر علما سے تعلقات استوار کیے اور ان کی قدر افزائی کی' دربار میں جن اہم مباحث کا اہتمام کیا اور ایرانی علما سے خالص فنی اور علمی نوعیت کی بحثوں میں علمائے ہند کو حصہ لینے پر مامور فرمایا' وہ سب واقعات اس کی علمی پختگی اور مذہبی گہرائی پر دلالت کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ جلال الدین اکبر کے دینی افکار بعض لوگوں کی موت کے ساتھ ہی مر گئے تھے۔ اس کی زندگی کا آخری دور تو اسے ایک اچھے خاصے مسلمان کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی بات رہ بھی گئی تھی تو جہاں گیر نے اس کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اس ضمن میں ہندوستان کے مشہور مورخ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے یہ الفاظ قابل مطالعہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''جہاں گیر' ایک راجپوت شہزادی کا فرزند اور متعدد راجپوت شہزادیوں کا شوہر تھا۔ لیکن اس کے

باوجود یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں کہ وہ علما کی تعلیمات سے پوری طرح متاثر رہا۔ ایک بار وہ ابوالفضل سے ملنے گیا‘ دیکھا کہ اس کے گھر پر بہت سے کاتب‘ کلام پاک اور تفسیر کی کتابت کرنے میں مشغول ہیں۔ ابوالفضل ہی نے اکبر کو یہ یقین دلایا تھا کہ قرآن مجید الہامی کتاب نہیں‘ کلام رسول ہے۔ جہاں گیر اپنے باپ کی گم راہی کا سبب ابوالفضل ہی کو قرار دیتا تھا‘ اس لیے وہ کاتبوں سے تمام اوراق لے اکبر کے پاس لے گیا اور کہا کہ ابوالفضل کا مذہب‘ خلوت میں کچھ اور ہے اور جلوت میں کچھ اور۔! اور اپنی تزک میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ ابوالفضل کو قتل کرانے میں اس کے مذہبی جذبے کو بھی دخل تھا۔ جہاں گیر کے تعلقات حضرت مجدد سے شروع میں ضرور خراب رہے‘ لیکن جب اچھے ہو گئے تو وہ روزانہ ان سے مغرب کے بعد ملاقات کرتا‘ ان ملاقاتوں سے اس کے قلب کی تطہیر جس طرح ہوئی ہے‘ اس کا اعتراف حضرت مجدد صاحب نے اپنے مکتوبات میں کیا ہے [1]۔“

جہاں گیر کے بعد جب شاہ جہان کا دور آیا تو حالات قطعی طور سے بدل گئے تھے اور ملک میں خالص اسلامی فضا پیدا ہو گئی تھی‘ جس کی چند جھلکیاں اختصار کے ساتھ آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہیں۔

## بغاوت اور اس کا پس منظر:

جہاں گیر اپنے بیٹے شہزادہ خرم سے بہت متاثر تھا اور اس کو ہر لحاظ سے بادشاہت کے لائق سمجھتا تھا‘ اس لیے کہ شہزادہ خرم اوائل عمر ہی میں تدبر و شہامت کے جوہر سے آراستہ تھا۔ بہادری اور شجاعت میں بھی یکتا تھا اور ان تمام اوصاف سے متصف تھا‘ جن کا ایک حکمران میں پایا جانا شرط اولین ہے۔ خرم دکن کی مہم پر گیا اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو جہاں گیر نے اسے شاہ جہان کے خطاب سے سرفراز کیا‘ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس کے بعد وہی وارثِ تختِ ہند ہو گا۔ لیکن واقعات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ شاہ جہان کو باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا پڑا۔ ایسا کیوں ہوا اور بیٹے نے باپ کے خلاف اتنا بڑا اقدام کیوں کیا؟ اس کا ایک خاص پس منظر ہے‘ شاہ جہان کے واقعات کے سلسلے میں جس کی وضاحت ضروری ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہم اپنے معزز قارئین کا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ مختصر الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے۔

نور جہان جو جہاں گیر کی چہیتی بیوی تھی‘ عملاً تمام کاروبار سلطنت پر قابض ہو چکی تھی اور بادشاہ اس کی ہر بات مانتا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں مضبوط کرنے کے لیے ایک کام تو یہ کیا کہ اپنے بھائی آصف خاں کی بیٹی ممتاز محل کو شہزادہ خرم کے عقد میں دے دیا۔ دوسرے خود اپنی بیٹی جو اس کے پہلے شوہر شیر افگن سے تھی‘ جہاں گیر کے سب سے چھوٹے بیٹے شہر یار سے بیاہ دی۔ شروع شروع میں نور جہاں‘ شہزادہ خرم کی حامی تھی‘ اس لیے کہ وہ اس کا بھتیج داماد تھا۔ دکن کی مہم میں اس نے فوجی نوعیت کے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور بے پناہ فتوحات

[1] ہندوستان کے سلاطین‘ علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر۔ ص ۲۲

حاصل کیں، اس سے اس کی جنگی قابلیت کا شہرہ تمام ملک میں پھیل گیا اور دشمن اس سے لرزنے لگے۔ یہ بات بادشاہ کے لیے انتہائی مسرت انگیز تھی اور وہ بہادر بیٹے کی عسکری تدبیروں سے بہت خوش تھا۔ مگر نور جہاں اس سے بگڑ گئی اور اس نے اپنی ہمدردیوں کا سارا وزن شہر یار کے پلڑے میں ڈال دیا جو اس کا حقیقی داماد تھا۔ اس نے یہ منصوبہ تیار کرنا شروع کیا کہ شہزادہ خرم نظروں سے اوجھل ہو جائے اور اس کی جگہ شہر یار کو اورنگِ حکومت پر متمکن کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے جہاں گیر کو یہ پٹی پڑھائی کہ قندھار کا علاقہ حال ہی میں فتح کیا گیا ہے، اس کے انتظام وانصرام کی طرف فوری طور پر عنان توجہ مبذول کرنا انتہائی ضروری ہے، وہاں کسی بہت ہی قابل اور تجربہ کار جنگی ماہر کو متعین کرنا چاہیے اور میرے نزدیک شہزاد خرم اس کے لیے نہایت موزوں رہے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا شخص وہاں کے انتظام پر قابو نہیں پا سکے گا۔ خرم بھی بڑی تیز نگاہ رکھتا تھا اور وہ نور جہاں کے ارادوں کو خوب سمجھتا تھا، چنانچہ بادشاہ نے اس کو قندھار جانے کے لیے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور ساتھ ہی بادشاہ کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ نے شاہی لشکر اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا لیکن شہزادے نے حالات کا موازنہ کر کے اپنے آپ کو عساکرِ شاہی کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ سمجھا اور مانڈو کی طرف ہٹ گیا۔ وہاں اسے کامیابی نہ ہوئی تو دوسری طرف رخ کیا اور بہار اور بنگال کے علاقوں پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ جہاں گیر نے شہزادہ پرویز اور مہابت خاں کو فوج دے کر مقابلے کے لیے بھیجا، تو خرم شکست کھا گیا، کیوں کہ اس بغاوت میں نہ کوئی قابل ذکر فوج اس کے ساتھ تھی اور نہ کوئی مشہور اور نامور جرنیل اس کا حامی تھا۔ وہ تقریباً تنہا تھا۔ پہلے تو مشرقی جانب کو مچھلی بند کی طرف بھاگا، بعد کو دکن کا راستہ لیا۔ دکن میں ملک عنبر حکمران تھا، اس نے موقع غنیمت جان کر خرم کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی تکریم سے پیش آیا۔ بالآخر جب شہزادے نے دیکھا کہ کامیابی کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں تو بادشاہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور معافی کا طالب ہوا۔ بادشاہ نے اس شرط پر معافی دی کہ خرم اپنے دونوں بیٹوں، داراشکوہ اور اورنگ زیب کو بطور یرغمال دربار شاہی میں بھیج دے۔۔۔۔۔ خرم نے یہ شرط منظور کی اور باپ بیٹے میں مکمل صلح ہو گئی۔

ان دنوں دکن کا حکمران ملک عنبر تھا۔ اس کی طرف سے بغاوتوں اور شورشوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس کو ختم کرنے کے لیے جہاں گیر نے شہزادہ خرم کو ایک لشکر کے ساتھ روانہ کیا اور شاہ جہان کا خطاب مرحمت فرمایا۔ اس خطاب کے معنی اس کی ولی عہدی کے تھے۔ بادشاہ خود بھی اس کے پیچھے دکن پہنچا، مگر اس سے پہلے شاہ جہان اپنے زورِ شمشیر سے ملک عنبر کو شکست دے کر احمد نگر خالی کرا چکا تھا۔ بادشاہ گجرات ہوتے ہوئے آگرہ کو واپس آ گیا۔ دو سال بعد ملک عنبر نے پھر سر اٹھایا اور شاہ جہان نے اسے پھر شکست دی۔ اسی زمانے میں شہزادہ خسرو نے، جسے شاہ جہان نے بادشاہ سے سفارش کر کے قید سے رہائی دلائی تھی، وفات پائی۔

شاہ جہان نے دو مرتبہ بغاوت میں ہزیمت اٹھانے کے بعد تیسری مرتبہ پھر باپ کے خلاف اعلان بغاوت کیا۔ یہ اس کی آخری بغاوت تھی۔ اب اس نے دارالسلطنت آگرہ پر قبضہ کرنے کا عزم کیا۔ اس کے لیے وہ دہلی کی طرف بڑھا اور دہلی سے نو میل کے فاصلے پر فرید آباد کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ جہاں گیر بادشاہ بھی ان دنوں دہلی میں مقیم تھا' چونکہ شاہ جہان نے یہ اقدام ناگہانی طور پر کیا تھا اور جہاں گیر اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا' اس لیے وہ پہلے تو گھبرایا اور پھر بروقت فوجی امداد پہنچ جانے کی وجہ سے اس کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ باپ ایک بڑی فوج کے ساتھ بیٹے کی سرکوبی کو نکلا' ادھر شاہ جہان بھی اپنے لشکر کی معیت میں نمودار ہوا۔ دونوں طرف کی فوجیں تغلق آباد کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابلے پر اتریں۔ لیکن شہزادے کی فوج کا شیرازہ آناً فاناً منتشر ہو گیا اور وہ خود بھی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس شکست سے شاہ جہان نہایت بددل ہوا' اور اس کو تحیر اور پریشانی نے آ گھیرا۔ آخر راہِ راست اختیار کی اور باپ کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔

ان تمام بغاوتوں کا پس منظر نور جہاں کا وہ خاص منصوبہ تھا' جس کے تحت وہ اپنے داماد شہر یار کو ہندوستان کا بادشاہ بنانے پر تلی ہوئی تھی' اور جہاں گیر کے تیسرے بیٹے شاہ جہان کو تاج و تخت سے ہر حال میں محروم کر دینا چاہتی تھی۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شہر یار بالکل نالائق تھا اور کاروبارِ حکومت کا قطعی اہل نہ تھا۔ اس کے مقابلے میں شاہ جہان لائق و دانا' عاقل و فہیم اور ہر اعتبار سے سزاوارِ تختِ ہند تھا۔

## داور بخش کی عارضی تخت نشینی:

جہاں گیر کی وفات کے وقت اس کے دو بیٹے زندہ تھے۔ ایک شاہ جہان جو دکن میں مقیم اور اس کے انتظام میں مصروف تھا۔ دوسرا شہر یار جو لاہور میں جہاں گیر کے پاس تھا اور اس کا چھوٹا بیٹا تھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا نور جہاں ہر صورت میں شہر یار کو ہندوستان کے تخت پر دیکھنا چاہتی تھی' اس لیے کہ وہ اس کا داماد تھا۔ لیکن نور جہاں کا بھائی آصف خاں' شہر یار کی مخالفت پر کمر بستہ تھا۔ وہ شاہ جہان کی بادشاہت کا متمنی تھا' کیونکہ آصف خاں کی بیٹی ممتاز محل شاہ جہان کے حبالہ عقد میں تھی۔ آصف خاں نے جہاں گیر کی وفات کے فوراً بعد یہ تدبیر کی کہ داور بخش عرف بلاقی خاں کو جو جہاں گیر کا پوتا اور خسرو کا بیٹا تھا' تخت پر بٹھا دیا تاکہ تختِ ہند حکمران سے خالی نہ رہے اور ادھر دکن میں شاہ جہان کے پاس تیز رو قاصد بھیج دیے کہ وہ جلد سے جلد لاہور پہنچ کر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے۔ آصف خاں نے شاہ جہان کو یہ بھی کہلا بھیجا کہ عارضی طور پر داور بخش (مرزا بلاقی) کو تخت نشین کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی بلاتاخیر شاہ جہان دکن سے لاہور روانہ ہو گیا' لیکن اس نے فوری طور پر آصف خاں کو ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے اپنے دستِ خاص سے یہ فرمان لکھ بھیجا:

دریں ہنگام کہ آسمان آشوب طلب و زمین فتنہ جو است' اگر داور بخش پسر خسرو و برادر اؤ و

شہریار و پسران شہزادہ دانیال را آوارہ صحرائے عدم ساختہ دولت خواہاں را از توزع خاطر و شورش دل فارغ سازند' بہ صلاح وصواب دبہ قرین تر خواہد بود ❶۔

(یعنی اس وقت جب کہ آسمان آشوب طلب اور زمین فتنہ جو ہے' اگر خسرو کا بیٹا داور بخش اور میرے بھائی شہریار اور فرزندان شہزادہ دانیال (طہمورث اور ہوشنگ) کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تو ارباب حکومت کے دل اس سے مطمئن ہو جائیں گے۔ یہ کام نہایت احتیاط اور بہتر طریق سے انجام پذیر ہونا چاہیے۔)

چنانچہ چہار شنبہ کی شب' ۲۵ جمادی الاولی ۔۱۰۳۷ھ/۲۳ جنوری ۱۶۲۸ء کو اس حکم کی پوری تعمیل ہوئی اور خاتمہ تزک جہاں گیری کے مصنف کے بقول:

شہریار و طہمورث و ہوشنگ پسران شہزادہ دانیال آوارہ صحرائے فنا ساختند و گلشن ہستی را از خس و خاشاک وجود شاں پرداختند ❷۔

(شہریار اور شہزادہ دانیال کے فرزندوں طہمورث اور ہوشنگ کو صحرائے فنا میں پھینک دیا گیا اور گلشن ہستی کو ان کے وجود کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا گیا۔)

اس سے قبل لاہور میں آصف خاں اور داور بخش سے شہریار کی شدید جنگ ہوئی تھی' جس میں شہریار کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا' اسے گرفتار کر کے قلعہ لاہور میں نظر بند کر دیا گیا۔ "وشہریار در قلعہ لاہور متحصن گشتہ' در معنی بزندان درآمد ❸۔"

اس کے بعد کیا ہوا؟۔

اور ابعد از چندے حسب الحکم داور بخش ہر دو چشمش از نور باصرہ معدوم الفراغ ساختند۔

(اس واقعہ کے چند روز بعد داور بخش کے حکم سے اس کی دونوں آنکھیں نور بصارت سے محروم کر دی گئیں۔)

یہ حادثہ ۱۰۳۷ھ کو پیش آیا تھا' شہریار نے جو کہ طبع موزوں رکھتا اور ذوق شعری سے بہرہ مند تھا' اس پر یہ شعر کہے اور ۱۰۳۷ھ اس کی تاریخ نکالی۔

ز نرگس گلاب از چہ نتواں کشید ۔۔۔ کشیدند از نرگسانم گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ آں ۔۔۔ بگو" کورشد دیدہ آفتاب"

۱۰۳۷ھ

❶ تزک جہاں گیری' ص ۴۳۸' ۴۳۹۔ در بیان "جلوس داور بخش براورنگ سلطنت۔"
❷ ایضاً' ص ۴۳۹۔
❸ تزک جہاں گیری' ص ۴۳۸

## شاہ جہان کی تخت نشینی:

بہرحال شاہ جہان ہر ممکن عجلت کے ساتھ لاہور پہنچا اور والد کی وفات سے تین ماہ آٹھ روز بعد ٦ جمادی الاخری ١٠٣٧ھ/٢ر فروری ١٦٢٨ء کو سینتیس (٣٧) سال کی عمر میں بمقام لاہور ہندوستان کے سریر فرماں روائی پر جلوہ افروز ہوا۔ چند روز لاہور میں قیام کیا' پھر دارالحکومت آگرہ کو روانہ ہو گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاہ جہان کی ولادت بھی لاہور میں ہوئی اور تاج شاہی بھی اسی شہر میں سر پر رکھا گیا۔

شاہ جہان کی حکومت کا آغاز اگرچہ خوں ریزی سے ہوا اور اس نے اپنے حقیقی بھائی' چچیرے بھائیوں' بھتیجوں اور ان کے ہم نواؤں کو' جن سے کسی وقت بھی مخالفت یا بغاوت کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا' سب کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیا' تاہم اس کا اکتیس (٣١) سالہ دورِ حکومت بڑے امن و امان کا دور ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی کریں تو معلوم ہو گا کہ یہ قتل و خوں ریزی عام طور سے بادشاہوں کی فطرت میں داخل رہی ہے اور ہر ایسا شخص ان کے نزدیک معتوب یا کم از کم مشکوک قرار پایا ہے' جس کی نقل و حرکت کو وہ اپنے مخصوص مفاد کے منافی سمجھتے تھے۔ پھر اس کا فیصلہ یا تو ان کی تلوار کرتی تھی یا عمر بھر کی سزائے زنداں ____! شاہ جہان نے بھی اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اسی فضا میں تربیت کی منزلیں طے کی تھیں۔ اگر اس نے اپنے رشتے داروں اور عزیزوں پر سختی کا برتاؤ کیا ہے تو انہی اثرات کے تحت کیا جو اسے خاندانی طور پر وراثت میں ملے تھے۔ اس کی تفصیلات سے کتب تاریخ بھری پڑی ہیں۔ اب بھی حکمران اس پرانی روایت پر عمل پیرا ہیں۔ اپنے سے اختلاف کرنے والوں پر مختلف مقدمے قائم کرتے ہیں' انھیں جیلوں میں ڈالتے ہیں' اقتدار سے دور رکھنے کے لیے ان پر کئی قسم کے الزامات عائد کرتے ہیں' انھیں پھانسیاں دیتے ہیں' لیکن یہ سب باتیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہمارا کام شاہ جہاں کے دورِ حکمرانی کے صرف علمی اور دینی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اپنے عصر کے علماء و فقہا اور مشائخ و صلحا سے اس کے روابط کس قسم کے تھے۔ اس نے اپنے زمانۂ حکومت میں کون سی ایسی اصلاحات کیں جو اسلامی احکام سے ہم آہنگ تھیں' کن غیر اسلامی رسوم کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اہل علم کو کس قدر و منزلت کا مستحق گردانا۔ آیئے اب خاندانِ مغلیہ کے پانچویں فرماں روائے ہند صاحبِ قران ثانی سلطان ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان کے کاروان حیات کے اس پہلو کا جائزہ لیں کہ ہمارا اصل موضوع یہی ہے۔

## اعیان دولت اور عمال حکومت کے نام فرمان:

شاہ جہان زمانۂ شہزادگی میں بھی نیک خصال اور خوش اطوار تھا۔ پابند شریعت اور عامل کتاب و سنت تھا' علما و مشائخ کی صحبتوں میں بیٹھتا اور ان سے استفادہ کرتا بلکہ صحیح روایت کے مطابق وہ حضرت مجدد الف

ثانی کے حلقہ عقیدت میں داخل تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد اس کی ان خوبیوں میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ یہ کوشش کرتا کہ کوئی قدم کتاب وسنت کے خلاف نہ اٹھے۔ اس کی یہ خواہش ہوتی کہ نہ وہ ذاتی طور پر مرتکب معصیت ہو اور نہ رعایا کو اس کے طرز عمل سے کوئی تکلیف پہنچے۔ وہ ہرگز برداشت نہ کرتا تھا کہ اعیان دولت اور عمال حکومت میں سے کوئی کسی . کے لیے اذیت رسانی کا باعث بنے۔ وہ حکومت کے ہر محکمے سے تعلق رکھنے والوں کو کتاب و سنت پر عامل دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ چتر شاہی سر پر رکھتے ہی اس نے ہر صوبے کے قضاۃ' ارکان دولت اور عمال حکومت کے نام خطوط لکھے کہ حدود و احکام نوامیسِ الٰہی کا ہر حال میں لحاظ رکھا جائے اور کما حقہ' اس پر عمل کیا جائے۔ شریعت کے اوامر ونواہی کی اسی طرح پابندی کی جائے جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ہدایت فرمائی ہے۔ دین اسلام کے بارے میں ادب واکرام اور تعظیم واحترام کے تمام تقاضوں کو ہر لحہ پیش نگاہ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں کسی نوع کی گستاخی یا سوئے ادب کا ہرگز مظاہرہ نہ کیا جائے۔ مشتبہ چیز ں سے دامن کشاں رہا جائے۔ دین میں بے راہ روی اور بے اعتدالی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ وہ امور جو نظر بظاہر نا پسندیدہ اور مکروہ ہیں یا جن میں کسی قسم کا اشتباہ پایا جاتا ہے یا جو افعال اصحاب بدعت کے اوضاع واطوار سے ہم آہنگ ہیں' ان سے بہر صورت اپنے آپ کو محفوظ اور دور رکھا ئے۔ اکثر لوگوں نے بدعات کی متعدد اقسام کو اپنا رکھا ہے' ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ انھیں کلی طور پر ترک کر دیں۔

اس سے آگے محمد صالح کنبو لکھتا ہے:

> المنۃ للہ تعالیٰ وتقدس کہ اعلیٰ حضرت ظل سبحانی صاحب قران ثانی از مبداء احوال فرخندہ فال تا الحال' بروفق احکام کتاب وسنت اطاعت وطاعت پیشہ کردہ اند' وطریقہ مطابعت پیروی حضرت رسول ﷺ پیش گرفتہ ❶۔

(یعنی شاہ جہان بادشاہ نے شروع ہی سے اپنی زندگی کو کتاب وسنت کے احکام کے قالب میں ڈھالا اور اسی روش کو اپنایا' جو مبنی بر اسلام تھی۔ اس کا طریقہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی تھا۔)

اس پابند شریعت بادشاہ کے عہد میں برصغیر میں اسلام کو بڑی تقویت پہنچی اور بدعات ومحدثات کا زور ٹوٹا۔ سجدہ تعظیمی جو پہلے سے بادشاہ کے لیے مروج تھا' موقوف ہوا۔ مقدمات کے فیصلے شرع اسلامی کے مطابق ہونے لگے اور علما ومشائخ کی قدر ومنزلت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اس نے جن امور خیر کی ترویج کی اور جن غلط رسوم کا خاتمہ کیا' محمد صالح کنبو لکھتا ہے کہ ان میں سے

> ''نہی سجدہ تعظیم است کہ از عہد حضرت عرش آشیانی مقرر ومعہود شدہ بود ❷۔

---

❶ عمل صالح' ج ا' ص ۲۱۴

❷ عمل صالح' ج ا' ص ۲۱۵

(یعنی ایک سجدہ تعظیمی ہے جو حضرت عرش آشیانی اکبر کے زمانے سے رائج تھا شاہ جہان نے اس سے لوگوں کو منع کر دیا۔)

خافی خاں اس سلسلے میں تفصیل سے کام لیتا ہے۔ وہ بہت سی اور چیزوں کا ذکر بھی کرتا ہے جو پہلے سے رواج پذیر تھیں اور بادشاہ شاہ جہان نے ان سے روک دیا۔ وہ کہتا ہے کہ شاہ جہان نے ملک کی زمام اختیار ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ بعض نامشروع امور کا سدباب کیا۔ مثلاً بادشاہ کی خدمت میں حاضری کے وقت یا اس کے پانی نوش کرتے وقت یا کوئی چیز عنایت کرتے وقت سجدہ کرنا ضروری تھا' شاہ جہان نے اس غلط رسم کو ختم کر دیا۔ اس نے زمین بوس ہونے کے بجائے چار مرتبہ سلام کہنے کا حکم جاری کیا۔ علما و فضلا' اصحاب کمال اور ارباب حال اور فقرا سے کہا کہ وہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے آئیں تو صرف سلام مسنون یعنی السلام علیکم کہیں۔ رخصت کے وقت سورہ فاتحہ پڑھیں۔ اس نے رائج الوقت سکے' روپے اور اشرفی کے ایک طرف کلمہ توحید اور خلفائے راشدین کے نام کندہ کرانے اور دوسری طرف اپنا نام لکھنے کا حکم جاری کیا۔ اپنے والد گرامی نورالدین جہاں گیر بادشاہ کے نام ساتھ "جنت مکانی" کا لقب تحریر کرنے کا حکم دیا اور سن جلوس اکبری الٰہی اور سن شمسی کے بجائے ماہ قمری اور سال ہجری لکھنے کا فرمان جاری کیا[1]۔

## پابندیٔ نماز اور وظائف و اوراد:

شاہ جہان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ جہاں گیر کے مرتبے کا عالم تو نہ تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برصغیر کا یہ حکمران بڑا نیک' خدا ترس' پرہیز گار اور علم پرور بادشاہ تھا۔ علما سے اس کے گہرے مراسم تھے اور وہ ان کی بدرجہ غایت عزت کرتا تھا' صوفیا و اتقیا سے اس کو بے پناہ محبت تھی۔ اس نے اپنے دور میں اسلام اور علم کی جو خدمت کی' اس سے قبل کسی مغل حکمران کو اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے اپنے اوقات شب و روز کو مختلف امور کی انجام دہی کے لیے باقاعدہ تقسیم کر رکھا تھا۔ اس میں سے ایک بڑا حصہ یاد خدا اور نماز کے لیے وقف تھا۔ "عمل صالح" کے درباری مصنف محمد صالح کنبو نے جن الفاظ میں اس کی تفصیل بیان کی ہے' ان کا ترجمہ یہ ہے۔

شاہ جہان نہایت عمدہ اوصاف کا حامل بادشاہ تھا۔ اس کے اوقات غفلت اور بے پروائی سے پاک اور غلط امور سے مبرا تھے۔ اس نے اپنے اوقات لیل و نہار کو اس انداز سے منقسم کر رکھا تھا کہ طلوع فجر سے دو گھڑی پیشتر بیدار ہو جاتا اور اللہ کے ذکر میں مصروف ہو جاتا۔ یہ وہ وقت ہے' جو اللہ کی رضا کے لیے مخصوص ہے اور اس میں عبادت الٰہی بہت بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ جو شخص اس وقت اپنے معبود حقیقی کو پکارتا ہے'

---

[1] منتخب اللباب حصہ اول' ص ۳۹۷

اللہ اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ اس مبارک ساعت میں بادشاہ اس مسجد میں چلا جاتا جو اکبر آباد (آگرہ) کے ایک کونے میں تعمیر کی گئی تھی۔ نماز کے وقت تک وہ قبلہ رو ہو کر مصلے پر بیٹھا رہتا اور اللہ کی عبادت کرتا۔ (وروی توجہ بمسجد ے کہ درخلوت گاہ خطۂ اکبر آباد تعمیر پذیر رفتہ آوردہ تا رسیدن وقت نماز رو بقبلہ بر سجادۂ طاعت می نشیند۔) نماز فجر کا وقت ہو جاتا تو پہلے دو رکعت سنت ادا کرتا' پھر با جماعت فرض پڑھتا۔ بعد ازاں اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتا ❶۔ اس سے فارغ ہوتا تو کاروبار سلطنت کی طرف عنان توجہ مرتکز کرتا۔ عمال حکومت کو ضروری مشورے دیتا اور ان کے مفوضہ فرائض کی انجام دہی کے بارے میں احکام صادر کرتا۔ فوج کا معائنہ کرتا اور اہل کاروں کے نام احکام و ہدایات جاری کرتا۔ ظہر کے وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ظہر کی نماز با جماعت مسجد میں پڑھتا۔ کھانا کھاتا اور قیلولہ کرتا ❷۔ عصر کی نماز بھی جماعت کے ساتھ پڑھتا ❸۔ علما کی مجلس منعقد کرتا اور پیش آمدہ مسائل کے بارے میں ان سے مشورے لیتا۔ مغرب کی نماز کے بعد اس کا وقت دینی اور دنیوی امور میں صرف ہوتا۔ (بعد از انقضائے وقت مغرب اوقات اشرف بکار دین و دنیا صرف می نمائیند ❹۔ نماز عشا جماعت کے ساتھ ادا کرتا اور پھر محل میں چلا جاتا۔ (نماز عشا بجماعت ادا نمودہ بمحل تشریف می برند ❺۔)

شاہ جہان جب خواب گاہ میں جاتا' وہ دن کا وقت ہوتا یا رات کا' فصیح البیان اور شیریں کلام لوگ اس کے ساتھ ہوتے' جو اسے کتب سیر و تواریخ سے انبیا و اولیا' صحابہ و تابعین' ملوک و وزرا' حکما و علما اور عظیم المرتبت حضرات کے واقعات و حالات سناتے۔ گزشتہ بادشاہوں کے دستور العمل سے بھی اسے آگاہ کرتے۔ یہ واقعات وہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر بیان کرتے۔ (در پس پردہ خواب گاہ ❻) اس کا مطلب یہ ہے کہ محل کی خواتین بھی یہ باتیں سنتی تھیں۔

شاہ جہاں کا درباری مورخ عبدالحمید لاہوری تو اس کے تدین و تقوی کی انتہائی تعریف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ وہ ہر وقت باوضو رہتا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

''اوقات شبا روزی آں قدوہ اصحاب طہارت بوضوی گزرد ❼۔

❶ عمل صالح' ج ا' ص ۲۰۱' ۲۰۲

❷ ایضاً' ص ۲۰۷

❸ ایضاً' ص ۲۰۸

❹ ایضاً

❺ ایضاً' ص ۲۰۹

❻ عمل صالح' ج ا' ص ۲۰۹

❼ بادشاہ نامہ' ج ا' ص ۱۴۷

وہ مزید لکھتا ہے:-

درادائے صلوٰۃ وصیام مکتوبہ بہ نہجے کہ در کتب فقہیہ حنفیہ واقع شدہ نہایت اہتمام بہ کار می دارند ❶۔

(وہ فرض نماز روزہ اسی طریقے سے اہتمام کے ساتھ ادا کرتا تھا' جس طرح کہ فقہ حنفیہ کی کتابوں میں مرقوم ہے۔)

## عدل وانصاف:

دودمان مغلیہ کا یہ بادشاہ نہایت عادل اور منصف تھا۔ اس کے عہد میں ملک کے تمام صوبوں میں امن وامان قائم تھا۔ کسی صوبے یا علاقے کے عامل اور اہل کار کو کسی شخص پر ظلم وتعدی کی جرات نہ تھی۔ اور کسی مجرم کو سزا سے بچنا ممکن نہ تھا۔ بادشاہ عدل وانصاف کا دلدادہ تھا۔ رعایا خوش حال تھی اور کوئی کسی کو ہدف ستم نہ ٹھہرا سکتا تھا۔ جمیع خلائق کہ ودیعت کبری خالق اند در مہد امن وامان مرفہ الحال باشند ❷۔

محمد صالح کنبو کی طرح ''بادشاہ نامہ'' کا مصنف عبدالحمید لاہوری بھی شاہ جہان کا درباری مورخ تھا۔ وہ اس کی انتہائی تعریف کرتا ہے۔ اس کی پابندئ شریعت اور نیکی کا زوردار الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے۔ ایک مقام پر لکھتا ہے:

سنت سنیہ الٰہی براں جاری است کہ ہرگاہ کار دین روبہ اندراس نہد وشعار اسلام رخ بہ انطماس۔ بتائید ایزدی یکے از بندگانِ سعادت اندوز بروئے کار آید تا بہ آبیاریٔ مساعی جمیلہ گرد فتور از ساحت اسلام فرونشاند و بدستیاریٔ دین پروری ودیانت وری اساس شریعت رامشید گرداند' وچوں معابد اسلام رو بہ انہدام نہادہ بود ومبانی شریعت رخ بہ انعدام' ایزد کارساز وایں بادشاہ اسلام نواز کفر گداز را اورنگ آرائے اقبال گردانید۔ بنیادِ اسلام راچناں محکم ومرصوص ساخت کہ تا روزِ نشور گرد فتور بردامن دوام نہ نشیند ❸۔

(اللہ کا یہ قانون برابر جاری وساری ہے کہ جب احکام دین رو بزوال ہو جائیں اور شعار اسلام محو ہونے لگیں تو تائید ایزدی حرکت میں آتی ہے اور بندگان سعادت اندوز میں سے کوئی ایسا بندہ ظہور میں آجاتا ہے جو اپنی مساعی جمیلہ سے اسلام کے رخ انور پر مختلف فتنوں کی پڑی ہوئی گرد وغبار کو صاف کر دیتا ہے اور اساس شریعت کو مستحکم ومضبوط بنانے کے فرائض انجام دیتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں بھی جب معابد اسلام منہدم ہونے لگے اور شریعت کی بنیادیں ہلنے لگیں تو نصرت خداوندی نے اس اسلام نواز اور کفر گداز بادشاہ کو تخت

❶ عمل صالح' ج ۱' ص ۱۳۷

❷ عمل صالح' ج ۱' ص ۱۳۷

❸ بادشاہ نامہ' ج ۱' ص ۱۳۸

حکمرانی عطا فرمایا، جس نے اسلام کی بنیاد کو اس طرح محکم و مرصوص بنا دیا کہ تا روز قیامت اس کے دامن تک فتنہ وفتور کی گرد نہیں پہنچ سکے گی۔)

یہ شاہ جہان کے ایک درباری مورخ کے الفاظ ہیں، جو اس میں ایک "مجدد دین" کے اوصاف کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ الفاظ یقیناً مبالغے سے خالی نہیں، کیوں کہ درباری مورخ اور شاہی مصنف، حکمرانوں کے لیے ہمیشہ اسی قسم کے الفاظ استعمال کرتے آئے ہیں۔ اب بھی حکومتوں کے ترجمان سربراہانِ مملکت کے لیے کے بہت سے تعریفی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ جہان بحیثیت مجموعی اونچے کردار کا بادشاہ تھا۔ نماز روزے کا پابند اور اسلام کی ترقی کا خواہاں تھا۔ دینی احکام و اوامر پر خود بھی کار بند رہتا اور ارکانِ دولت کو بھی اس کا پابند دیکھنا چاہتا تھا۔ ملک کی مضبوطی اور رعایا کی خوش حالی اس کا مطمحِ نظر تھا۔ علما و مشائخ کا قدر دان تھا۔ ملک کے دور دراز حصوں سے بھی اگر اس کے علم میں یہ بات آ جاتی کہ وہاں بدعات و محدثات اور خلاف شرع رسوم وعوائد نے قدم جما لیے ہیں تو ان کو ختم کرنے کی کوشش کرتا اور اپنی قلمرو سے غلط چیزوں کو مٹانے میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتا۔ چند واقعات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ وہ واقعی "بادشاہ دین پناہ" تھا۔ غیر اسلامی امور کا قلع قمع کرنا اور اسلام کی ترقی کے ذرائع بروئے کار لانا اس کے مقاصد حیات میں داخل تھا۔

## ایک نہایت قبیح رسم کا خاتمہ:

خدمت شاہی میں عرض ہوا کہ علاقہ بھمبر ❶ کے مسلمان اپنی جہالت کی بنا پر ہندوؤں کو لڑکیاں دیتے اور ان سے لڑکیاں لیتے ہیں۔ ان کے درمیان یہ طے پایا ہے کہ جو ہندو لڑکی اپنے مسلمان سسرال میں مرے وہ دفن کی جائے اور جو مسلمان لڑکی ہندوؤں کے گھر فوت ہو، اسے جلایا جائے۔ اس اطلاع پر دربار شاہی سے یہ حکم ہوا کہ جس ہندو کے گھر میں مسلمان عورت ہو، اگر وہ ہندو اسلام قبول کر لے تو اس مسلمان عورت سے اس کا نکاح دوبارہ پڑھا جائے۔ ورنہ مسلمان عورت کو اس سے الگ کر دیا جائے۔ چنانچہ "جوکو" نام کا ایک زمیندار جس سے یہ فعل سرزد ہوا، اپنے تمام قبیلے کے ساتھ مسلمان ہوا، اور اسے "راجا دولت مند" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ بادشاہ نے اس رسم قبیح کو ختم کرنے کا حکم دیا اور مسلمانوں کی جہالت دور کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے قاضی اور معلم مقرر کیے تاکہ وہاں احکام شریعت پر عمل کیا جائے اور شرعی عبادات انجام دینے کے صحیح طریقے بروئے کار لائے جائیں ❷۔

---

❶ یہ علاقہ اب آزاد کشمیر میں واقع ہے۔

❷ بادشاہ نامہ، ج ۲، ص ۵۷

## ہندوؤں کے قبضے سے مسلمان عورتوں کی رہائی اور مساجد کی واگزاری:

گزشتہ واقعہ کی طرح کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو:

جب بادشاہ کی سواری پنجاب کے قصبہ گجرات میں پہنچی تو وہاں کے سادات و مشائخ نے عرض کیا کہ یہاں کے بعض ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو اپنے گھروں میں ڈال رکھا ہے۔ (ان کے الفاظ یہ ہیں: برخے از کفار نابکار حرائر و امائے مومنہ در تصرف دارند) اور ان میں سے بعض تو یہاں تک سرکشی پر اتر آئے ہیں کہ انھوں نے مسجدوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس پر بادشاہ نے شیخ محمد گجراتی کو جو علوم رسمیہ کے عالم اور نو مسلموں کے داروغہ تھے، حکم دیا کہ واقعہ کے ثبوت کے بعد مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے آزاد کرائیں اور مسجدوں اور غیر مسلموں کی عمارتوں کو علیحدہ علیحدہ کرائیں۔ چنانچہ شیخ مذکور نے ستر مسلمان عورتوں کو ہندوؤں کے قبضے سے نکالا اور جہاں جہاں ہندوؤں نے مسجدوں پر ناجائز تصرف کر رکھا تھا، تحقیق کے بعد انھیں واگزار کرایا، اور غیر مسلموں سے جرمانہ وصول کرنے کے بعد مسجدوں کو بحال کیا[1]۔

## صوبہ کابل کی ایک انتہائی مذموم رسم ختم کرنے کا حکم:

صوبہ کابل سے آمدہ خبروں اور وہاں کے گورنر لشکر خاں کی اطلاع سے پتا چلا کہ افغان آئین شرع کی بالکل پیروی نہیں کرتے۔ بلکہ انھوں نے ایک گمراہ پیر کے احکام کو (نعوذ باللہ) آیت و حدیث کا درجہ دے کر ملحدوں کے سے طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ وہ بیویوں سے شرعی طور پر نکاح نہیں کرتے، بلکہ ایک گائے یا بیل ذبح کر کے اپنے ہم مشربوں کی ضیافت کرتے ہیں اور اس کے بعد بغیر کسی عقد نکاح کے ازدواجی تعلقات شروع کر دیتے ہیں۔ عورت کو طلاق دینا مقصود ہو تو وہ تین سنگریزے عورت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور اس کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ بیوہ عورتیں ان کے رواج کے مطابق ترکے میں داخل ہیں اور میت کے وارث کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو ان سے نکاح کر لے اور چاہے کسی کو ہبہ یا فروخت کر دے۔ جو بدنصیب مسافر اس سرزمین میں جا پہنچتا ہے، اسے یہ لوگ حلال شکار قرار دیتے ہیں اور اسے فروخت کر کے آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ لوگ میت کے ورثے میں سے بیٹیوں کو حصہ نہیں دیتے اور قتل و انتقام اور رہزنی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کو بہت بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ اس اطلاع کے بعد بادشاہ کی طرف سے حکم ہوا کہ ''احکام تورہ و شریعت'' کے مطابق ان لوگوں کو زجر و تنبیہ کی جائے۔ چنانچہ بڑی سختی کے بعد جس میں کئی مرتبہ فساد اور بلوے تک نوبت آئی، آہستہ آہستہ ان لوگوں کی بدعتیں کم ہوئیں، لیکن بالکل رفع پھر بھی نہ ہوئیں۔ خافی خاں اس واقعہ کے پانچ سال بعد لکھتا ہے: چنانچہ تا حال آثار آں بدعتہائے مذموم دراں قوم باقیست[2]۔ یعنی اب بھی ان مذموم بدعتوں کے آثار اس قوم میں باقی ہیں۔

---

[1] شاہ نامہ، ج ۲، ص ۵۷، ۵۸

[2] منتخب اللباب، حصہ اول، ص ۲۲۳، ۲۲۴۔

## ہگلی کے فرنگیوں کی گوشمالی:

آج سے کم وبیش ستر (۷۰) سال پیشتر ملک کی ارائیں برادری کے ترجمان ہفت روزہ ''الراعی'' (لاہور) میں ''پابندیٔ شریعت اور شاہ جہاں'' کے عنوان سے پروفیسر علم الدین سالک مرحوم کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے شاہ جہان کی اسلامی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ''بادشاہ نامہ'' کی جلد اول کے حوالے سے ہگلی کے فرنگیوں سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ پروفیسر صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔:

۱۰۴۲ھ/۱۶۳۳ء میں ہگلی کے فرنگیوں نے بنگال میں بڑا اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ نہ صرف وہاں کے سیاسی معاملات میں مداخلت کرتے تھے بلکہ لوگوں کو زبردستی عیسائی بھی بناتے تھے اور اپنے مذہب کی تبلیغ میں بے حد سختی سے کام لیتے تھے۔ دولت کا لالچ دے کر لوگوں کو ورغلاتے اور مسلمانوں کے ساتھ نہایت برا سلوک روا رکھتے تھے۔ یہ حالات شاہ جہان کے علم میں شہزادگی کے زمانے میں آئے تھے' اور جیسا کہ عمل صالح اور بادشاہ نامہ سے معلوم ہوتا ہے' شاہ جہان اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اور کفر کو مٹانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے بادشاہ بنا دیا تو وہ ان دیار کو ان گمراہ لوگوں سے ہمیشہ کے لیے پاک کر دے گا۔ چنانچہ تخت نشینی کے بعد جب اسے موقع ملا تو اس طرف توجہ مبذول کی اور ہگلی کے نصرانیوں سے ان کے غیر آئینی رویے کے بارے میں باز پرس کی۔ اس نے ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ھ میں تربیت خاں کو تحقیقِ حالات کے لیے بنگال بھیجا۔ مگر ہگلی کے فرنگیوں نے مصالحت کی طرف ہاتھ بڑھانے کے بجائے فسادات کو دعوت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک معمولی جھڑپ کے بعد ان کا سارا زور ٹوٹ گیا اور بہت سے فرنگی قید کر لیے گئے۔ یہ فرنگی ۱۱ محرم ۱۰۴۳ھ/ ۸/جولائی ۱۶۳۳ء کو عنایت اللہ' قاسم خاں اور بہادر خاں کمبو کی نگرانی میں بنگالہ سے پایۂ تخت (آگرہ) میں لائے گئے۔ ان کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ ان کے پاس بت بھی تھے' جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ یہ سب لوگ بادشاہ کے حضور پیش کیے گئے۔ بادشاہ نے ارباب شریعت کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ انھیں اسلام کی دعوت دی جائے اور اسلامی احکام سے روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے تو اسلام قبول کر لیا مگر زیادہ افراد نے انکار کر دیا۔ جن لوگوں نے انکار کیا تھا' انھیں اس زمانے کے آئین کے مطابق امرائے دولت میں تقسیم کر دیا گیا۔

## بدعات کا خاتمہ اور ٹیکسوں کی معافی:

۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء کو شاہ جہان کشمیر گیا۔ اس زمانے میں وہاں کا ناظم اعتقاد خاں تھا۔ بادشاہ کو معلوم ہوا کہ اعتقاد خاں رعایا پر بے حد جبر و تشدد کر رہا ہے۔ اس نے ملک میں بہت سی بدعتیں جاری کر رکھی ہیں' پھل دار درخت ضبط کر لیے ہیں' باغ اور جنگل اپنی تحویل میں لے لیے ہیں' زعفران کی چنائی میں لوگوں سے بیگار لیتا

اور انھیں پریشان کرتا ہے۔ یہ باتیں سن کر شاہ جہان نے اعتقاد خاں کو منصب نظامت سے علیحدہ کر دیا اور اس کی جگہ ظفر خاں احسن کو کشمیر کا ناظم مقرر کیا اور حکم دیا کہ اعتقاد خاں پر الزامات کی فہرست تیار کر کے پیش کی جائے۔ جب فہرست الزامات سامنے آئی تو بادشاہ نہایت حیران اور خفا ہوا۔ اس نے اعتقاد خاں کے زمانے کی رائج کردہ تمام بدعات منسوخ کر دیں اور عوام کی آگاہی کے لیے ایک فرمان تیار کیا' جس کے الفاظ پتھر پر کندہ کیے گئے اور اسے جامع سکندری کے دروازے پر نصب کیا گیا۔ یہ فرمان شاہ جہان کی معدلت گستری' رعایا پروری' رحم دلی اور عوام کے حقوق کے تحفظ کی بیّن دلیل ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ قابل مطالعہ ہیں جو درج ذیل ہیں:

''ہماری سلطنت کا مقصد خلق خدا کی حاجت روائی ہے۔ علاقہ کشمیر میں بعض اس قسم کے امور کا ارتکاب ہو رہا تھا جو رعایا کے لیے موجب آزار اور باعث تکلیف تھے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ ان تمام امور کو منسوخ سمجھا جائے۔''

۱۔ اس فرمان کی رو سے زعفران چننے کے لیے لوگوں سے جو بیگار لی جاتی تھی' وہ حکماً بند کر دی گئی اور حکم ہوا کہ آئندہ سے مناسب اجرت پر مزدوروں سے کام لیا جائے۔

۲۔ رعایا کے لوگ سرکاری جنگلات سے ایندھن کاٹا کرتے تھے' اس کے لیے انھیں دو درم کے خردار دینا پڑتے تھے۔ اعتقاد خاں نے یہ رقم دگنی کر دی تھی۔ اب یہ ٹیکس بالکل معاف کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اعتقاد خاں کے دور نظامت میں مانجیوں کو' وہ بوڑھے ہوں یا جوان' یا کم سن بچے' پچھتر (۷۵) درم سالانہ ادا کرنا پڑتے تھے' حالانکہ اس سے پہلے مانجیوں کے درمیان عمر کا امتیاز تھا۔ جوانوں سے ساٹھ' بوڑھوں سے بارہ اور بچوں سے چھتیس درم لیے جاتے تھے۔ شاہ جہان نے اعتقاد خاں کے اس نئے ٹیکس کو موقوف کر کے پہلا طریقہ بحال کر دیا۔

۴۔ ارض کشمیر کے ان دیہات کو جن کی شال کی پیداوار چار سو خردار سے زیادہ تھی' اور جن سے اعتقاد خاں ٹیکس وصول کرتا تھا' انھیں ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

۵۔ کشمیر کے صوبے دار (گورنر) ان افراد کو ملازم رکھتے تھے' جو لوگوں کے باغات میں جاتے اور بہترین پھلوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ جس باغ میں اچھا پھل دیکھتے' اسے صوبے دار کے لیے محفوظ کر لیتے۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے پھلوں کی کاشت بند کر دی۔ اب اس سلسلے کو حکماً بند کر دیا گیا' کوئی ناظم اور گورنر اس حرکت کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا[1]۔

پروفیسر علم الدین سالک مرحوم کے ستر (۷۰) سال پیشتر کے تحریر کردہ مضمون کی رو سے شاہ جہان کا یہ فرمان اب تک کشمیر کی جامع سکندری کے دروازے پر نصب ہے اور اس کے عدل وانصاف کی شہادت دے رہا ہے۔

[1] منتخب اللباب' ج ا ص ۱۵۰۔ عمل صالح' ج ۲' ص ۶۴۔ بادشاہ نامہ' ج ا حصہ دوم' ص ۵۷' ۵۸

## بادشاہ کا فرض:

شاہ جہان قدیم بادشاہوں کے واقعات سننے اور پڑھنے کا بہت شائق تھا۔ وہ ان کے غلط واقعات سے عبرت حاصل کرتا اور صحیح واقعات کو اپنے لیے مشعل راہ قرار دیتا۔ جب اس کے سامنے سلاطین روم' شاہان قزلباش' ملوک ایران اور فرماں روایان توران کے واقعات بیان کیے جاتے تو وہ لرز اٹھتا اور اس کے چہرے پر خاص قسم کے تاثرات نمایاں ہو جاتے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کسی بادشاہ کی کمزور رعایا اطمینان اور امن سے زندگی نہیں بسر کر سکتی تو وہ بادشاہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے۔ حکومت کا منصب جلیلہ اس سے چھین لینا چاہیے' وہ اس کا حق دار نہیں ہے۔ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ رعایا کے ہر پہلو پر نظر رکھے اور ان کے حقوق کی پوری پوری نگاہ داشت کرے۔

## اللہ کی عبودیت کا اقرار:

پروفیسر علم الدین سالک نے اپنے مطبوعہ مضمون (الراعی) "لاہور میں شیر خاں لودھی کی "مرأۃ الخیال" (صفحہ ۴) کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب شاہ جہان کا تخت طاؤس تیار ہو گیا اور وہ اس پر بیٹھا تو فوراً نیچے اتر آیا۔ خشوع و خضوع سے دو رکعت نفل ادا کیے اور دیر تک سجدے میں پڑا رہا۔ سجدے سے سر اٹھایا تو حاضرین دربار سے مخاطب ہو کر کہا۔

"فرعون کا تخت آبنوس اور ہاتھی دانت کا تھا۔ اس نے اس پر بیٹھ کر خدائی کا دعویٰ کیا۔ اے حاضرین دربار! تم اس پر گواہ رہنا کہ میں اس مرصع تخت پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا اقرار کرتا ہوں۔"

شاہ جہان کی زندگی کے اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں' جو عمل صالح' بادشاہ نامہ' منتخب اللباب اور دیگر کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اس عادل اور دین پناہ بادشاہ کے اکتیس سالہ دور حکومت میں پھیلے ہوئے مزید واقعات حوالہ قرطاس کیے جائیں مگر تنگ دامانیٔ صفحات بار بار قلم کا دامن کھینچتی اور تفصیلات کی وادی میں جانے سے روکتی ہے۔

## دور شاہ جہان کے علما و مشائخ:

دور شاہ جہانی میں متعدد علما و مشائخ اور فقہائے عظام دیار ہند میں رونق افروز تھے اور مختلف بلاد و قصبات میں ان کے درس و افادہ کی مسندیں آراستہ تھیں۔ اس کتاب میں بہت سے مقامات پر ان کا تذکرہ قارئین کرام کے مطالعہ میں آئے گا۔ شاہ جہان کے وزرا میں بھی جید علما شامل تھے' جن میں ایک علامی محمد افضل تھے' جو معقولات و منقولات کے جلیل القدر عالم تھے اور معاملات سلطنت میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ شاہ

جہان ان پر بڑا اعتماد کرتا تھا اور وہ فطانت و فراست میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کے بعد علامی سعد اللہ خاں چنیوٹی کو اس منصب رفیع پر فائز کیا گیا۔ وہ بھی خطہ ہند کے وسیع العلم بزرگ تھے اور ان کے علوم و معارف کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ معقول و منقول کی تفصیلات و جزئیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ فراوانی علم و فضل کے ساتھ ساتھ انتظام مملکت اور جنگ و حرب کا بھی وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ یورپین مورخین بھی ان کی تعریف پر مجبور ہیں، چنانچہ انفسٹن لکھتا ہے کہ ''ہندوستان میں جتنے وزرا گزرے ہیں، سعد اللہ خاں ان سب سے زیادہ لائق اور راست باز تھا۔''

بہرحال عہد شاہ جہانی کے علمائے کرام کی وسیع فہرست میں سے مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں:

شیخ میاں میر محمد سیوستانی لاہوری، سید محمد بخاری، شیخ بلاول قادری، مولانا محبّ علی سندھی، خواجہ خاوند محمود، ملا خواجہ بہاری، شیخ صادق برہان پوری، میاں شیخ پیر محمد، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مفتی نورالحق دہلوی، میر شکر اللہ شیرازی، علامی سعد اللہ خاں، ملا شفیعائی یزدی، ملا محمد فاضل بدخشی، مولانا عبدالسلام لاہوری، علامہ محمود جون پوری، مولانا عبداللطیف سلطان پوری لاہوری، مولانا محمد یعقوب لاہوری، مولانا عوض وجیہ سمرقندی، مفتی عبدالسلام دیوی، مولانا ابوالفتح ملتانی۔

## شجاعت اور فتوحات:

تیمور کے خون میں شجاعت کی گرمی کے اثرات نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔ شاہ جہان اس وراثت تیموری کا بہت بڑا حصے دار تھا۔ بابر سے شاہ جہان تک پوری نسل تیموری بہادری اور شجاعت کا مرقع ہے، جس میں کسی ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنا مشکل ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں بڑی فتوحات ہوئیں۔ اس نے کئی علاقائی سلطنتوں کو مسخر کیا، بہت سے اہم مقامات پر فوج کشی کی اور متعدد نئے صوبوں پر علم مغلیہ لہرایا۔ ان واقعات کی تفصیلات جو تاریخ نے ہم پہنچائی ہیں اگرچہ بڑی تحیر انگیز اور سبق آموز ہیں مگر ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لیے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

## علمی، ثقافتی اور تہذیبی ترقی:

شاہ جہان کے عہد میں بے شک اکبر کی طرح سرکاری اہتمام میں کتابوں کی تصنیف و تراجم کی طرف توجہ نہیں دی گئی، مگر علما نے اپنے طور پر بہت کتابیں لکھیں اور بے حد علمی کام کیا۔ بہت سے حواشی و تعلیقات شاہ جہان کے نام معنون کیے اور اس میں اس نے علما کی بے حد حوصلہ افزائی کی۔ پھر خود اس نے جو ثقافتی اور تہذیبی

نقوش برصغیر کی سرزمین میں ثبت کر دیے وہ ہمیشہ اس کی رفعت ذہن وفکر کی شہادت دیتے رہیں گے۔ مثلاً آگرے کا تاج محل، دہلی کی جامع مسجد، لال قلعہ، تخت طاؤس، لاہور کا شالیمار باغ، اس کی ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کے عظیم شاہکار ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے اس وسیع خطہ ارض میں بے شمار مسجدیں واگزار کرائیں، ہندوؤں کی نئی عبادت گاہوں کی تعمیر پر موقع ومحل کے اعتبار سے نامناسب حد تک پابندیاں عائد کیں اور ان کے غرور وپندار کا زور توڑنے کی کوشش کی، تاکہ اس کے دادا جلال الدین اکبر کے زمانے سے جو سلسلہ چلا آ رہا تھا، وہ اپنے جائز اور مقررہ حدود سے آگے نہ بڑھ پائے۔

## معزولی اور وفات:

شاہ جہان کو اکتیس سال حکومت کرنے کے بعد شعبان کی آخری تاریخ ۱۰۶۸ھ/۲۲ مئی ۱۶۵۸ء کو تخت فرماں روائی سے الگ کیا گیا اور شروع رمضان میں قلعہ آگرہ کو اس نے اپنا مسکن ٹھہرایا۔ معزولی سے آٹھ سال بعد دوشنبہ کے روز ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ/۲۳ جنوری ۱۶۶۶ء کو اسی قلعے میں قید حیات سے رہائی پائی۔ اس کا یہ آٹھ سال کا عرصہ تلاوت قرآن مجید، اوراد ووظائف اور بعض جید علمائے کرام کی صحبت میں گزرا۔

شاہ جہان کے آخری دور حیات کا تعلق چوں کہ اس کے بیٹے اورنگ زیب عالم گیر سے ہے، اس لیے اس کے ضروری کوائف ''فقہائے ہند'' کی جلد پنجم کے مقدمے میں اورنگ زیب عالم گیر کے حالات کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں۔

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی۔ ساندہ لاہور

# گیارھویں صدی ہجری

ع

## ۱- مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی برصغیر پاک و ہند کے آسمان علم و فضل کے درخشندہ ستارے تھے۔ انھوں نے مسند تدریس تو عہد جہاگیری ہی میں آراستہ کر لی تھی لیکن شہرت و ناموری کی منزلیں عہد شاہ جہانی میں طے کیں۔ ان کی تصنیفات کو عالم اسلامی میں نہایت قدر و اہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور پونے چار سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کی فضیلت و عظمتِ تحقیق کا جھنڈا آج بھی پوری شان و شوکت کے ساتھ علمی دنیا میں لہرا رہا ہے۔

### ولادت:

مولانا ممدوح ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ عہد عالم گیری کے معروف مؤرخ بختاور خان (متوفی ۱۰۹۴ھ) نے مراۃ العالم میں ان کی تاریخ ولادت لفظ حفظ میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''تاریخ تولدش لفظ حفظ گفتہ اند۔'' (ح/۸ ف/۸۰ ظ/۹۰۰) بعض لوگوں نے ۹۶۸ھ بھی تحریر کی ہے' جسے بختاور خاں کے مقابلے میں صحیح نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کیونکہ بختاور خاں مولانا سیالکوٹی کے فرزند مولانا عبداللہ لبیب کے ہم عصر تھے اور انھیں بے حد عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے انھوں نے مولانا سیالکوٹی کی زندگی سے متعلق معلومات خود مولانا عبداللہ لبیب سے حاصل کی ہوں گی' جنھیں بہر حال صحیح اور مستند مانا جائے گا۔ مولانا عبدالحکیم کے والد کا نام شمس الدین تھا' جیسا کہ عام طور پر وہ اپنی تصنیفات کے شروع میں ان الفاظ میں اس کا ذکر کرتے ہیں:

فیقول العبدالمسکین عبدالحکیم بن شمس الدین۔

## حصولِ علم:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے مولانا کمال الدین کشمیری سے اخذ علم کیا۔ مولانا کمال الدین کا سلسلۂ درس پہلے کشمیر میں جاری تھا۔ بعد کو سیالکوٹ منتقل ہو گئے تھے اور اسی شہر کو اپنا مرکز درس و افادہ قرار دے لیا تھا۔ مولانا کمال الدین اپنے عصر کے جید اور فحول علما میں سے تھے۔ پیکر زہد و تقوی اور عالم باعمل۔ علوم عقلیہ و نقلیہ پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ مولانا کمال الدین کے زمانے میں کشمیر کا گورنر حسین نامی ایک شخص تھا۔ ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں وہ کسی وجہ سے حسین سے ناراض ہو کر سیالکوٹ آ گئے تھے۔ طویل عرصے تک وہاں تدریس و تعلیم میں مصروف رہے۔ باشندگانِ لاہور کو بھی ان کی تدریس سے بہرہ اندوز ہونے کے مواقع میسر آئے اور یہاں بے شمار تشنگان علوم نے ان سے استفادہ کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے بھی ان سے تحصیل علم کی اور علامی سعد اللہ خاں نے بھی، جو بعد میں شاہ جہاں کے وزیر مقرر ہوئے، ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ مولانا کمال الدین نے ۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء کو لاہور میں وفات پائی۔ ان کے ایک بھائی مولانا جمال الدین کشمیری تھے، وہ بھی وقت کے صاحب علم اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔

تذکرہ نگاروں نے اگرچہ مولانا کمال الدین کشمیری کے علاوہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے کسی اور استاد کا ذکر نہیں کیا، تاہم بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دیگر اساتذہ سے بھی اخذ علم کیا تھا۔ چنانچہ سید احمد قادری نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے تلامذۂ حدیث کے ضمن میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے رسالہ انسان العین کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالباً مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی بھی شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے تلمیذ تھے ❶۔

شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیف ''انسان العین فی مشائخ الحرمین'' میں اپنے ان بعض اساتذہ کا ذکر کیا ہے، جن سے انھوں نے اسناد حدیث حاصل کیں، ان میں شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی بھی شامل ہیں، ان کے حالات لکھتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

خرقہ و اجازت از بزرگان بسیار گرفت ازاں جملہ شیخ عبداللہ لاہوری، اللبیب۔
ملا عبدالحکیم سیالکوٹی از وے روایت کند۔ عن شیخ عبداللہ اللبیب عن مولانا عبدالحکیم، وکتب شیخ عبدالحق محدث دہلوی بہمیں واسطہ از مولانا عبدالحکیم روایت کند و وے از شیخ عبدالحق اجازۃً وروایۃً ❷۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو شیخ

---

❶ تذکرۂ شیخ عبدالحق محدث، ص ۱۵۸۔

❷ انسان العین فی مشائخ الحرمین۔ ص ۱۹۸، ۱۹۹۔

عبدالحق محدث دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا' وہاں یہ حقیقت بھی منقح ہو جاتی ہے کہ خود شاہ صاحب بھی مولانا سیالکوٹی کے شجرۂ نسبِ علمی میں شامل ہیں۔ یعنی ان کی سند علمی اس طرح ہو گی ____ شاہ ولی اللہ دہلوی نے شیخ ابوطاہر محمد سے' انھوں نے شیخ عبداللہ لاہوری سے' انھوں نے شیخ عبداللہ لبیب سے اور انھوں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے تحصیل کی۔

## مسند درس و تدریس:

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے لاہور میں مسند درس کو رونق بخشی اور ان کی علمی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچی' جس سے متاثر ہو کر کثیر تعداد میں علما و طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہونے لگے۔ لالہ سجان رائے بٹالوی ان کے فیضان علم کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

وطلبۂ علم از ممالک دور و نزدیک در مدرسہ متبرکہ ایشاں رسیدہ فیض یاب شدند ❶۔

(یعنی طلبائے علم دور و نزدیک کے ممالک سے ان (مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی) کے مدرسہ مبارکہ میں پہنچتے اور دولت علم سے فیض یاب ہوتے تھے۔)

لاہور کے جس مدرسے میں مولانا نے درس و افادہ کا آغاز کیا' یہ وہی مدرسہ تھا جو مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے قائم کیا تھا اور یہ اس زمانے کا عظیم الشان مدرسہ تھا۔ اس میں مولانا موصوف کا تقرر سرکاری طور پر عمل میں لایا گیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اسی مدرسے کے دور تدریس میں وہ ''فاضل لاہوری'' کے عظیم لقب سے ملقب ہوئے ❷۔ سلم العلوم کے نامور شارح ملا حمد اللہ' ان کا قول پیش کرتے وقت انھیں' قال الفاصل اللاھوری' کے پرشکوہ الفاظ سے یاد فرماتے ہیں ____ اس مدرسے میں وہ خاصی مدت مصروف تدریس رہے اور اس اثنا میں ان سے متعدد علما و طلبا نے استفادہ کیا۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹ کے اس مدرسے کی مسند تدریس پر بھی فائز رہے' جس میں ان کے مرحوم استاد مولانا کمال الدین طلبا کو مستفید کرتے رہے تھے۔ مولانا کشمیری کی وہ مسجد جوان کی عظیم دینی درس گاہ تھی' اب بھی سیالکوٹ میں موجود ہے' اور ان کے لائق شاگرد مولانا عبدالحکیم کے مدرسے کے کچھ آثار بھی ہنوز باقی ہیں۔

ایک زمانے میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو اکبر آباد (آگرہ) کے اس سرکاری مدرسے میں مدرس اعلیٰ کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا' جس کی بنیاد جلال الدین اکبر نے رکھی تھی۔ اس مدرسے میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور مشہور شاعر قدسی ایک ہی وقت میں فرائض درس انجام دیتے تھے ❸۔

❶ خلاصۃ التواریخ' ص ۳۷۔

❷ ملاحظہ ہو روضۃ الادبا۔ ص ۱۴۳۔

❸ ؍؍ ؍؍ کوثر۔ ص ۳۹۱۔

## عہد جہاں گیری میں:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی علمی شہرت اگرچہ عہد جہاں گیری میں بھی حلقہ اہل علم میں کافی پھیل گئی تھی، مگر اس کا دائرہ محدود تھا، کیوں کہ اس زمانے میں مولانا ممدوح عزلت وانزوا کی زندگی بسر کر رہے تھے اور خاموشی سے خدمت علم میں مصروف تھے۔ سرکاری حلقے ان کی آواز سے آشنا نہ تھے۔ جہاں گیر کے عہد میں ان کا اسم گرامی اس عصر کے فضلا میں تو شامل تھا، جیسا کہ "اقبال نامہ جہاں گیری" میں ان کا نام "ذکر فضلا کہ معاصر زمان اشرف بودند" کے ذیل میں درج ہے، لیکن دارالسلطنت سے دور، سیالکوٹ میں اقامت گزین ہونے کی وجہ سے بادشاہ ان کے مرتبہ علم سے واقف نہ تھا۔ اس کی شہادت عبدالحمید لاہور کے ان الفاظ سے ملتی ہے:

درایام سعادت فرجام حضرت جنت مکانی بضروریاتِ معیشت در ساختہ عزلت گزین بود ❶۔

(یعنی سلطان جہاں گیر جنت مکانی کے عہد حکومت میں وہ اپنی معاشی ضرورتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے عزلت گزین ہی رہے۔)

فرحت الناظرین میں محمد اسلم پسروری نے بھی یہی لکھا ہے کہ جنت مکانی جہاں گیر کے زمانے میں مولانا عبدالحکیم معاشی لحاظ سے قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

درایام جنت مکانی بکم وبیش ساختہ بقناعت می گزرانید ❷۔

## عہد شاہ جہان میں:

ہندوستان کے تخت حکومت پر شاہ جہان متمکن ہوا تو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی قدر ومنزلت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ وہ کئی مرتبہ دہلی گئے۔ بارہا دربارِ شاہی میں پہنچے اور ہر مرتبہ گراں قدر عطایا و ہدایا سے سرفراز ہوئے۔ شاہ جہان ان کی اس درجہ قدر کرتا تھا اور اس کے عہد میں ان کو اتنا عروج حاصل تھا کہ اس نے دو مرتبہ ان کو سونے اور چاندی سے تلوایا اور دونوں مرتبہ چھ چھ ہزار روپے کے برابر ان کا وزن ہوا، اور بادشاہ نے یہ ساری رقم مولانا کی نذر کر دی۔ اس نے مولانا کے وطن سیالکوٹ میں کئی دیہات بھی بطور جاگیر ان کی خدمت میں پیش کیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہایت اطمینان وسکون کی زندگی بسر کرنے لگے اور معاشی تفکرات سے آزاد ہو کر تصنیف وتالیف میں مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے زمانے کے واحد عالم دین تھے جنھیں بادشاہ کی جانب سے ایک لاکھ روپے سالانہ ملتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو رفعت شان اور منفرد مقام اللہ کے فضل سے مولانا عبدالحکیم کو حاصل ہوا، سرزمین ہند میں اور کسی عالم دین کو اس دور میں حاصل نہیں ہوا۔

---

❶ بادشاہ نامہ۔ ج ۱، حصہ ۲، ص ۳۴۱۔

❷ فرحت الناظرین۔ ص ۷۳۔

لم یبلغ احمد من علماء الهند فی وقته ما بلغ من الشأن والرفعة ولا انتهی واحد منهم الی ما انتهی الیه جمیع الفضائل عن ید وحاز العلوم وانفرد❶۔

(علمائے ہند میں جس شان و رفعت کو وہ (مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی) پہنچے ان کے عصر میں دوسرا کوئی نہیں پہنچا اور جن فضائل سے وہ متمتع ہوئے' اور کوئی شخص نہیں ہوا۔ انھوں نے علوم کو سمیٹ لیا اور اس سلسلے میں انفرادیت حاصل کی۔)

محمد صالح کنبو نے بھی ان کے علم و فضل اور وسعت معلومات کی بے حد تعریف کی ہے اور شاہ جہانی دور میں انھیں جس عز و شرف کا مستحق گردانا گیا' اس کا شان دار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے❷۔

## وسعت علم و فضل اور قبولیت عامہ:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی وسعت علم کا تمام متقدین و متاخرین تذکرہ نویس صراحت کے ساتھ ذکر فرماتے اور ان کی فضیلت و عظمت اور تحقیق و کاوش کا واضح الفاظ میں اقرار کرتے ہیں۔ متقدین مؤرخین میں سے بعض کے اقتباسات اختصار کے ساتھ پہلے دیے جا چکے ہیں۔ متاخرین میں سے میر سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں۔

علامہ زماں و افتخارِ زمانیاں است۔ الحق در جمیع فنون درسی' مثل او از زمینِ ہند برنہ خاست۔ آثارِ دانش بایں کیفیت و کمیت وحسنِ قبول بر صفحہ روزگار نہ گزاشت❸۔

(وہ (مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی) علامہ زمان اور فخر اہل زمان ہیں۔ تمام اصناف علوم درسیہ میں انھیں جو دسترس حاصل تھی' اس میں سر زمین ہند میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ ان کے آثارِ دانش کی کیفیت و کمیت اور دنیا میں حسن قبول کے اعتبار سے کوئی ان کا ثانی نہیں گزرا۔)

آزاد بلگرامی آگے چل کر ان کی علمی فیض رسانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ عرصہ جہان را بہ لوامع فیض مملو ساختہ❹۔

(انھوں نے خطہ ارض کو اپنے فیض علم و فضل کی ضیا پاشی سے بھر دیا۔)

جب شاہ جہان نے انھیں نقد روپے اور کئی گاؤں بطور جاگیر عطا کیے تو ان کی فکر معاش کا مسئلہ ختم ہو

---

❶ خلاصہ الاثر۔ ج ۲' ص ۳۱۸۔

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے: عمل صالح الموسوم بہ شاہ جہان نامہ۔ ج ۳' ص ۲۹۴' ۲۹۵۔

❸ مآثر الکرام دفتر اول' ص ۱۹۳

❹ مآثر الکرام دفتر اول۔ ص ۱۹۳

گیا اور وہ اطمینان قلب اور سکون ذہن سے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں منہمک ہو گئے۔ آزاد بلگرامی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ملا بہ حضور خاطر و فراغ مال در وطن مالوف اقامت داشت و تخم علم و فضل در سرزمین سینہ ہا و سفینہ ہا می کاشت۔ تصانیف در بلاد عرب و عجم سائر و دائر است ❶۔

(مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے مالی پریشانیوں سے نجات حاصل کر کے دل کے کامل سکون کے ساتھ اپنے وطن مالوف سیالکوٹ میں اقامت اختیار کر لی اور لوگوں کے قلب و نظر کی زمین میں علم و فضل کی تخم ریزی میں مصروف ہو گئے۔ ان کی تصانیف بلاد عرب و عجم میں متداول و متعارف ہیں۔)

اس کا ثبوت حافظ عبدالرحمٰن امرتسری کے ان الفاظ سے بھی ملتا ہے، جو انھوں نے اپنے سفرنامے میں تحریر کیے ہیں:

''عراق، شام اور استنبول کی متعدد درس گاہوں میں، مجھے آپ کی تصانیف، داخل درس دیکھنے کا موقع ملا۔ ہندوستان سے باہر بلاد اسلامیہ میں علمی حیثیت سے جو شہرت مولوی عبدالحکیم صاحب کو حاصل ہوئی، اسے کوئی مصنف حاصل نہیں کر سکا ❷۔

مولوی رحمان علی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی علامہ زمان سر آمد اقران خود ❸۔

(ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، علامہ عصر اور اپنے معاصرین میں سب سے فائق تر تھے۔)

مولانا عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی، اپنے استاذ مولانا کمال الدین کاشمیری کے فیض صحبت سے علم و فضل کے اونچے مرتبے کو پہنچ گئے تھے:

وصار عجبا فی استحضار المسائل وقوۃ العارضۃ وکثرۃ الدرس والافادۃ ❹۔

(انھوں نے استحضار مسائل، قوت تحقیق اور کثرت درس و افادہ میں بہترین مقام حاصل کر لیا تھا۔)

وہ مزید فرماتے ہیں کہ مولانا سیالکوٹی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور ان کی تصنیفات کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی:

---

❶ مآثر الکرام دفتر اول۔ ص ۱۹۳

❷ سیاحت نامہ۔ ص ۵۹

❸ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۱۰۔

❹ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۰۔

ویدرس ویضنف وتصانیفه کلها مقبولة عند العلماء محبوبة الیهم ولاسیما عند علماء بلاد الروم یتنا فسون فیها وهی جدیرة بذلك❶۔

(مولانا عبدالحکیم فرائض تدریس انجام دیتے اور مصروف تصنیف رہتے تھے اور ان کی تمام تصانیف حلقہ علما میں مقبول ہیں اور وہ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، بالخصوص بلاد روم سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام ان کی تصانیف سے ایک دوسرے سے بڑھ کر رغبت رکھتے ہیں۔ اور یہ تصانیف اس قدر افزائی کی مستحق بھی ہیں۔)

بہر حال اپنے عہد کے علمائے عظام میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی بڑے بلند مرتبے کے حامل تھے۔ اہم دینی مسائل سے متعلق تمام ہندوستان میں ان کا فتویٰ جاری تھا اور کوئی اس سے جرأت انکار نہیں کر سکتا تھا، حتیٰ کہ بادشاہِ ہند اور عمالِ حکومت بھی ان کے فرمانِ شرعی سے انحراف نہ کرتے تھے۔

مفتی غلام سرور لاہوری اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

علمائے ہند را بر قول وفعل وے جائے اعتراض و حکام عہد را از حکم شرع کہ بفتویٰ وے جاری شدے جائے انکار واعتراض نبودے❷۔

(ہندوستان کے علما کو ان کے قول و فعل پر مجال اعتراض نہ تھی اور حکامِ وقت کو ان کے صادر کردہ شرعی فتوے سے انکار و اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔)

محمد بن فضل اللہ محبی کا کہنا ہے کہ سلطان ہند شاہ جہان انہی کے مشہورے سے احکام جاری کرتا تھا:

کان رئیس العلماء عند سلطان الهند خرم شاه جهان، لا صدر الا عن رایه❸۔

(فرماں روائے ہند سلطان خرم شاہ جہان ان کو علما کے سربراہ قرار دیتا تھا اور ہر حکم ان کی رائے سے جاری کرتا تھا۔)

اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے جو ''سٹڈیز ان دی ہسٹری آف گجرات'' کے حوالے سے ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے ''ہسٹری آف مسلم سولیزیشن ان انڈیا اینڈ پاکستان'' میں نقل کیا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے گجرات کے زمانۂ گورنری میں احمد آباد کے ایک ناجائز تعمیر کردہ جین مندر کو گرا کر مسجد بنانے کا حکم دیا تھا۔ لیکن جب دارا شکوہ گجرات کا گورنر بنا تو اس نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فتوے کے مطابق شاہ جہان کے حکم سے یہ عمارت دوبارہ بحیثیت مندر واگزار کر دی❹۔

اس فتوے سے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی رواداری، وسعت علم اور وسعت فکر کا پتا چلتا ہے۔

❶ نزہۃ الخواطر۔ ج۵، ص۲۱۰۔
❷ خزینۃ الاصفیا۔ ص۹۸۴، ۹۸۵۔
❸ خلاصۃ الاثر۔ ج۲، ص۳۱۹۔
❹ ملاحظہ ہو ماہنامہ ''ثقافت'' لاہور بابت اپریل ۱۹۶۷ء، ص۷۔

## ہم عصر علما سے علمی مباحثے:

عہد شاہ جہان میں خطہ ہند کو علما و فضلا کے عظیم مرکز کی حیثیت حاصل تھی- شاہ جہان کی محبت علم و علما اور صفت جودت و سخا کا شہرہ سن کر ایران و روم کے اصحاب علم اور اہل فضل بھی کثیر تعداد میں وارد ہند ہو گئے تھے اور ان میں سے بیشتر کا تعلق و انسلاک براہ راست شاہ جہان اور شاہی دربار سے ہو گیا تھا- وہ زمانہ چوں کہ ہندوستان میں علوم عقلیہ کی ترویج و ترقی کا زمانہ تھا' اس لیے مختلف عقلی موضوعات پر علما و فضلا کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا- خود بادشاہ ان علما کی علمی مجالس میں شامل ہوتا اور ان کے مباحثوں میں دلچسپی لیتا تھا-

ایران سے وارد ہند ہونے والی جماعت علما میں ایک بزرگ ملا شفیعا تھے' جو بہت بڑے عالم اور مشہور ایرانی فاضل تھے- انھیں ملا شفیعا یزدی کہا جاتا تھا- ان کا اصل نام محمد شفیع اور لقب دانشمند خاں تھا- یہ لقب ان کے علم و فضل کی بنا پر انھیں شاہ جہان بادشاہ کی طرف سے ملا تھا- فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم پسروری ان کے حالات بیان کرتے ہوئے' انھیں ''یگانہ آفاق و سر آمد علمائے خراسان و عراق'' قرار دیتے ہیں ❶-

ملا شفیعا یزدی' شاہ جہان کے عہد میں درحقیقت تجارت اور سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے- مختلف ذرائع سے جب بادشاہ تک ان کے علم و فضل کی شہرت پہنچی اور یہ معلوم ہوا کہ وہ خراسان و عراق کے یگانہ روزگار علما اور ممتاز فضلا میں سے ہیں تو ان سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا' لیکن اس اثنا میں ملا شفیعا اپنا کام مکمل کر کے اور جس غرض سے یہاں آئے تھے' اس سے فارغ ہو کر عازم وطن ہونے والے تھے اور واپسی کے ارادے سے بندرگاہ سورت میں پہنچ گئے تھے- بادشاہ نے بہت ہی خواہش اور اعزاز و اکرام کے ساتھ انھیں دربار میں طلب کیا اور ان کے امتحان اور مناظرے کے لیے سردار علما مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دعوت دی- دونوں فضلائے عصر ایک دوسرے کے مقابلے پر اترے اور ایاك نعبدو ایاك نستعین کی تفسیر پر بحث شروع ہوئی- شاہ جہان کے فاضل وزیر علامی سعد اللہ خاں حکم قرار پائے- بڑی علمی گفتگو ہوئی' دونوں نے دلچسپ تفسیری اور فنی نکات بیان کیے- فرحت الناظرین کے لائق مصنف نے طوالت کی وجہ سے مناظرے کی تفصیلات حذف کر دی ہیں اور فریقین کے سوال و جواب ضبط تحریر میں لانے سے گریز کیا ہے-

مختصر یہ کہ بادشاہ نے ملا شفیعا کے طرز گفتگو سے متاثر ہو کر' ان کو ملازمان شاہی کے زمرے میں شامل کیا اور پھر ان پر بے حد نوازشیں کیں اور انھیں دانش مند خان کے خطاب سے سرفراز کیا-

مآثر الامرا میں بھی مختصر الفاظ میں اس مناظرے کی روداد بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان دونوں عالموں کے درمیان ایاك نعبدو ایاك نستعین کی واؤ عطف کے بارے میں بڑی طویل گفتگو ہوئی- علامی

❶ فرحت الناظرین- ص ۱۴۴-

سعد اللہ خاں نے حکم کے فرائض انجام دیئے بالآخر دلائل کے اعتبار سے دونوں برابر رہے۔ علامی سعد اللہ خاں

کہ در علم علم بود، ممیز گشت و آخر ہر دو برابر ماندند ❶۔

صاحب فرحت الناظرین محمد اسلم پسروری کے بقول: در تفسیر آیۂ کریمہ (ایاك نعبدو ایاك نستعین) مباحثہ کروند و سخنانِ بلند و نکاتِ دلپذیر ازاں ہر دو دانشمند تحریر منصۂ ظہور آمد۔

ملا شفیعا یزدی کے علاوہ اور بھی متعدد علما کے نام تذکروں میں مسطور ہیں، جن سے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی بعض علمی مسائل میں بحثیں رہتی تھیں، ان میں ایک ملا محمد فاضل تھے جو بڑے عالم، فقیہ اور مشہور مناظر تھے۔

ملا فاضل محرر دانشمند، مدقق بود، و جدل و بحاثے اشتہار یافتہ، اکثر حواشی ملا عبدالحکیم سیالکوٹی را ردمی نوشت ❷۔

(ملا فاضل، فقیہ مصنف اور گہرے علم و فکر کے مالک تھے۔ بحث و مجادلہ میں بڑے مشہور تھے۔ انھوں نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے اکثر حواشی کا رد تحریر کیا ہے۔)

مولانا محمد میاں مرحوم نے اپنی تصنیف ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں ملفوظات عزیزیہ'' کے حوالے سے مولانا عبدالحکیم اور ملا محمد فاضل کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے، جو درج ذیل ہے:

ملا محمد فاضل بدخشاں میں پیدا ہوئے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل و مکمل ہو کر شاہ جہان بادشاہ کے پاس پہنچے اور مطالبہ کیا کہ ''ملک العلما'' کا منصب اور خطاب مجھے مرحمت فرمایا جائے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اس عہدہ و منصب پر فائز تھے۔ شاہ جہان نے کہا، آپ دونوں صاحب مناظرہ کرلیں، جس کو زیادہ قابل سمجھوں گا، اس کو ملک العلما'' بنادوں گا۔ ملا محمد فاضل صاحب نے بذات خود مولانا عبدالحکیم صاحب سے مناظرہ کرنے میں اپنی ہتک سمجھی۔ فرمایا کہ میرا کوئی شاگرد مولانا سے مناظرہ کرے گا۔ یہ کہہ کر دربار شاہی سے رخصت ہوئے اور سیدھے ہرات پہنچے۔ وہاں ابھی مرزا زاہد اپنے والد سے صَرف پڑھا کرتے تھے۔ ملا فاضل نے ذکی اور ذہین سمجھ کر ان کے والد صاحب سے اجازت چاہی کہ وہ خود ان کو تعلیم دیں گے۔ چنانچہ بہت بڑے عرصے میں مرزا زاہد کو عالم و فاضل کرکے اپنے ہمراہ دربار شاہ جہان میں لائے اور فرمایا یہ میرا شاگرد حاضر ہے، جو ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے مناظرہ کرے گا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے پہلی نظر میں تاڑ لیا کہ مرزا زاہد صاحب ''صرف'' میں کچے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے ہی فرمایا، اس بچے سے صرف کے صیغوں کے سوا اور کیا پوچھ سکتا ہوں، اور پھر شافیہ کی ایک عبارت کا مطلب پوچھا۔ وہ عبارت مرزا زاہد کے ذہن میں نہ تھی۔ بولے کتاب دیکھ لوں۔ مولانا عبدالحکیم

---

❶ دیکھیے: فرحت الناظرین (شخصیات)۔ ص ۹۵، ۹۶ نیز ملاحظہ ہو۔ مآثر الامرا۔ ج ۲، ص ۳۲۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی۔ ص ۱۴۴۔

صاحب نے فوراً فرمایا- ابھی تک کتاب کی ضرورت ہے؟ الغرض ملا فاضل اس مرتبہ بھی شکست کھا کر بے نیل مراد واپس ہو گئے ❶-

بلخ کے ایک فاضل بزرگ، بقول محمد صالح کنبو، جلوہ طرازِ حسنِ کلام، فاضل عالی فطرت والا مقام، مولانا عوض وجہیہ سے بھی بعض مسائل میں مولانا عبدالحکیم کی گفتگو اور سوال و جواب کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے ❷-

مولانا سیالکوٹی کے ایک اور معاصر کشمیر کے ملا ابوالحسن المعروف بہ شاہم بابا تھے جو تحقیق علوم میں اپنے عہد کے عدیم المثال عالم تھے- بیضاوی کی عبارتوں کی عبارتیں قرآن کی طرح پڑھتے تھے- وہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حریف تھے اور بعض مسائل میں ان کے نقطہ نظر کی تردید کرتے تھے- اپنے زمانے کے علما کو خاطر میں نہ لاتے تھے-

وا کثر مذکورات ملا عبدالحکیم را ردمی کرد و گاہے التفات بجانب علمائے حاضرنمی کرد ❸-

اسی طرح ایک اور کشمیری عالم ملا باقر نارہ للو تھے، جو معقولات میں ملا باقر صباغ کے شاگرد تھے اور ہندوستان کے وہ عالم تھے جو مختلف مسائل میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور پورب و پنجاب کے علما کے افکار و خیالات پر باقاعدہ معارضہ کرتے اور ان کی تحقیق کو ہدفِ نقد و جرح ٹھہراتے تھے-

ملا باقر نارہ للو، در معقول شاگرد ملا باقر صباغ بودہ، و در ہندوستان با ملا عبدالحکیم و علمائے پنجاب و پورب معارضہ ہا کردہ، وآں ہا را ملزم می کرد ❹-

## مجدد الف ثانی سے تعلق خاطر:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اپنے ہم عصر علما اور صوفیا کے پاس جاتے اور ان میں سے بعض کے ساتھ گہرے اور مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے، جن میں ایک حضرت مجدد الف ثانی تھے- دونوں بزرگ ملا کمال الدین کشمیری کے شاگرد تھے اور ایک دوسرے کے علم و فضل کی وسعتوں کو جانتے اور تدین و تقویٰ کی حدود کو خوب سمجھتے تھے- مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے بارے میں تذکروں میں یہ بھی مرقوم ہے کہ وہ مجدد صاحب سے ملاقات کے لیے سرہند جایا کرتے تھے اور ان کے حلقہ ارادت و بیعت میں شامل تھے- ان کے لیے "مجدد الف ثانی" کا لفاظ سب سے پہلے مولانا سیالکوٹی ہی نے استعمال کیا تھا- ایک مرتبہ تو وہ کئی دن سرہند میں مقیم رہے اور مجدد صاحب نے ان کو "آفتاب پنجاب" کا لقب عطا کیا- ان دونوں کے مخلصانہ مراسم کے بارے میں بہت سے واقعات متعدد تذکروں میں مندرج ہیں-

---

❶ علمائے ہند کا شاندار ماضی- ج ۱، ص ۴۶۶، ۴۶۷-

❷ ملاحظہ ہو: "معارف"- اعظم گڑھ- بابت مارچ ۱۹۶۳ء

❸ دیکھیے: تاریخ کشمیر اعظمی- ص ۱۴۴-

❹ ایضاً- ص ۱۴۸-

## حضرت میاں میر سے ملاقات:

لاہور کے مشہور صوفی بزرگ حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی آمد ورفت تھی اور ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک ملاقات کا واقعہ پروفیسر امین اللہ وثیر نے دارا شکوہ کی سکینۃ الاولیا کے حوالے سے ماہنامہ ''ثقافت'' (لاہور) میں بیان کیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز جہاں گیر حضرت میاں میر صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا۔ مولانا سیالکوٹی بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ حضرت میاں میر نے بادشاہ کو خدا تک پہنچنے کے طریقے بتانا شروع کیے اور کہا کہ یہ وصل الی اللہ دو طریقوں سے ممکن ہے۔ اول جذبہ' جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ یک بارگی بندے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ دوسرا سلوک' جو ریاضت' مجاہدہ اور کسی بزرگ کا دامن تھامنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ راہ سلوک کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ جب سالک پر عالم ملکوت کا کشف ہو جاتا ہے تو اس کا پیر اسے جنگلوں اور ویران جگہوں میں بھیج دیتا ہے تاکہ وہ تنہائی میں یادالٰہی میں مصروف رہے' اور یہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ قرب حق کے حصول کے لیے مخلوق سے کنارہ کشی ضروری ہے۔ مولانا عبدالحکیم نے' جو ایک عالم باعمل تھے اور یہ جانتے تھے کہ بادشاہ حضرت میاں میر کا معتقد ہے اور مجلس میں موجود ہے' اس موقعے پر خاموشی اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا اور کہا: حضرت! آپ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے اگر یہ صحیح ہے تو یہ عین رہبانیت کی تعلیم ہے' اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مولانا عبدالحکیم نے جنگلوں کی تنہائی میں جا کر یادِ الٰہی میں مصروف ہو جانے پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا۔ اس سے نماز باجماعت فوت ہو جاتی ہے اور اس طرح ایک بنیادی سنت نبوی کا ترک لازم آتا ہے [1]۔

## تصنیفات وحواشی:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی ایک معروف تصنیف الدرۃ الثمینہ ہے۔ باقی مختلف مضامین پر مشتمل اہم درسی کتابوں پر حواشی ہیں' جو اپنی جگہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور حلقہ علما وطلبا میں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے نزدیک ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) حاشیہ تفسیر بیضاوی (۲) حاشیہ مقدمات تلویح (۳) حاشیہ مطول (۴) حاشیہ شریفیہ (۵) حاشیہ شرح مواقف (۶) حاشیہ شرح عقائد تفتازانی (۷) حاشیہ حاشیہ خیالی' (۸) حاشیہ شرح شمسیہ (۹) حاشیہ حاشیہ عبدالغفور (۱۰) تکملہ حاشیہ عبدالغفور (۱۱) حاشیہ شرح مطالع (۱۲) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی (۱۳) حواشی درکنار شرح حکمت العین (۱۴) حواشی درکنار شرح ہدایۃ الحکمہ (۱۵) حواشی درکنار مراح الارواح (۱۶) درۃ ثمنیہ' در اثبات واجب تعالیٰ۔

[1] ''ثقافت'' (لاہور) بابت اپریل ۱۹۶۷ء ص ۱۰۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کی سطور میں، ان متون ومتروح کا، جن کو مولانا ممدوح نے شرح وتحشیہ کے لیے منتخب فرمایا، مختصر الفاظ میں تعارف کرا دیا جائے۔

## تفسیر بیضاوی:

تفسیر بیضاوی کا اصلی نام ''انوار التنزیل واسرار التاویل'' ہے اور یہ قاضی ناصر الدین ابو الخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی (متوفی ۶۸۵ھ یا ۶۹۲ھ/ ۱۲۶۸ء یا ۱۲۹۳ء) کی تصنیف ہے۔ درحقیقت یہ محمود ابن عمر زمخشری (۵۲۸ھ/۱۱۳۴ء) کی تفسیر (جو تفسیر ''کشاف'' کے نام سے معروف ہے اور جس کا پورا نام ''الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل'' ہے) کا اختصار ہے۔ زمخشری اگرچہ معتزلی تھا لیکن اس کی تفسیر کشاف اہل سنت کے حلقوں میں متداول اور مدارس میں سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی تھی۔ کشاف ایک ضخیم تفسیر ہے، متعدد اہل علم نے اس کے مختصرات لکھے، مگر ان میں شہرت اور قبولیت عامہ قاضی ناصر الدین بیضاوی کی انوار التنزیل واسرار التاویل ہی کو حاصل ہوئی۔ اسی وجہ سے علمانے بیضاوی کی طرف خصوصیت سے عنان توجہ مبذول کی، اسے داخل نصاب کیا اور اس پر حواشی وتعلیقات تحریر کیے۔ نویں، دسویں، گیارھویں صدی ہجری میں اس پر متعدد علمانے حواشی لکھے۔

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تفسیر بیضاوی کی ترویج دسویں صدی ہجری کے نصف میں ہوئی۔ اس سے پہلے اس ملک کے علما میں کشاف متداول تھی۔ دسویں صدی ہجری سے قبل خود ہندوستان میں دو تصویریں معرض تحریر میں آ چکی تھیں، ایک آٹھویں صدی ہجری میں اور دوسری نویں صدی ہجری میں!

آٹھویں صدی ہجری میں ''تفسیر تاتارخانی'' لکھی گئی جو فیروز تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ/۱۳۵۱ء-۱۳۹۷ء) کے عہد کے معروف عالم وفاضل امیر تاتارخاں کی مرتب کردہ تھی اور بڑی مفصل اور جامع تفسیر تھی۔
نویں صدی ہجری کے نصف اول میں ''تفسیر بحر مواج'' ضبط کتابت میں لائی گئی۔ یہ تفسیر جون پور کے نامور عالم دین، ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۸۴۸ھ/۱۴۴۴ء) کے زور علم وتحقیق کا نتیجہ تھی۔ فارسی زبان کی اس تفسیر نے بہت جلد جماعت علما میں مقبولیت حاصل کر لی۔ لیکن یہ پورے قرآن کی تفسیر نہیں ہے۔

دسویں صدی ہجری میں ہندوستان میں بیضاوی کا رواج ہوا۔ اسی صدی میں محقق جلال الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ھ/۱۵۰۳ء) کے شاگرد ارض ہند میں داخل ہوئے اور ان کی آمد کے بعد یہاں کے علما کو تفسیر بیضاوی سے لگاؤ پیدا ہوا۔ شیخ ابو الفضل خطیب گاذرونی (۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء) محقق دوانی کے شاگرد تھے۔ وہ

گجرات چلے آئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے عصر کے جلیل القدر عالم تھے۔ شاہان گجرات نے ان کی بڑی سرپرستی کی اور عرصہ دراز تک احمد آباد میں مسند درس آراستہ کیے رکھی۔ انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا۔ غالباً یہ پہلے ہندی عالم تھے جنھوں نے یہ اہم علمی خدمت سرانجام دی۔ ان کے شاگردوں میں شیخ وجیہ الدین گجراتی (۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء) شامل ہیں، جو کثیر التصانیف اور کثیر الدرس عالم دین تھے۔ انھوں نے بھی اپنے استاد کی روایت کے مطابق بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔

علامہ جلال الدین دوانی کے ایک اور شاگرد خواجہ جمال الدین محمود تھے اور ان کے شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی تھے، جنھوں نے خواجہ جمال الدین محمود کے علاوہ مولانا کمال الدین شیرانی، مولانا احمد کرد اور میر غیاث الدین منصور سے بھی پڑھا تھا۔ یہ پہلے ایران سے دکن تشریف لائے اور پھر جلال الدین اکبر کی طلب پر ہندوستان چلے آئے تھے۔ انھوں نے بھی تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا❶۔

امیر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد مولانا عبدالسلام لاہوری تھے، جو درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے اور تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتے تھے۔ انھوں نے بھی تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا❷۔

مولانا عبدالسلام لاہوری کے شاگردوں میں ایک عالم دین مولانا عبدالسلام دیوی تھے جو ہندوستان کے صوبہ یو۔پی کے شہر دیوہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بھی تفسیر بیضاوی کو حاشیہ نویسی کے لیے منتخب فرمایا❸۔

ان علمائے کرام کے علاوہ دیگر علمائے ہند میں سے شیخ عیسیٰ بن عثمان سندھی برہان پوری، شیخ صبغت اللہ بن روح اللہ حسینی گجراتی، شیخ شمس الدین بیجاپوری، شیخ طیب بن عبدالواحد بلگرامی، شیخ عبداللہ دہلوی، شیخ طاہر بن رضی ہمدانی، قاضی نور اللہ شوشتری، میر محمد ہاشم گیلانی اور قاضی محمد آصف الٰہ آبادی نے تفسیر بیضاوی پر حواشی تحریر کیے۔

پھر شیخ یعقوب بن یوسف بنانی نے دہلی میں اور ملا حسین کو جو نے کشمیر میں تفسیر بیضاوی پر حواشی لکھے۔ ملا حسین کو جو کے حاشیہ کے بارے میں ''واقعات کشمیر'' کے مصنف کا کہنا ہے کہ یہ حاشیہ مختلف علوم کی روشنی میں لکھا گیا ہے، نہایت عمدہ ہے اور بہت سے فوائد علمیہ اور نکات عالیہ پر مشتمل ہے۔

ملا حسین کوجو، در انواع علوم مشار الیہ بودہ۔ حواشی او بر تفسیر بیضاوی فوائد و نکات عالیہ افادہ می کنند۔

---

❶ ''المعارف'' (لاہور) بابت مارچ ۱۹۶۸ء۔ حکیم فتح اللہ شیرازی کے حالات کے لیے دیکھیے عمل صالح، ج ۳، ص ۳۰۲۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۶۰۔ مفتاح التواریخ، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔ نزہۃ الخواطر، ج ۴، ص ۲۵۴، ۲۵۵۔ منتخب التواریخ، ص ۲۶۷، ۲۶۸۔ دربار اکبری، ص ۶۷۳ تا ۶۸۴۔

❷ مآثر الکرام، ص ۲۲۶۔ مولانا عبدالسلام لاہوری کے حدود علم و فضل کی وسعتوں کے لیے ملاحظہ ہو عمل صالح، ج ۳، ص ۳۰۰۔

❸ ایضاً، ص ۲۲۵، ۲۲۶۔

کشمیری علما کے تذکروں سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں بیضاوی کو اس زمانے میں بہت ہی اہمیت حاصل تھی اور علما اس سے بے حد اعتنا کرتے تھے۔ بعض علما کو تو یہ با قاعدہ حفظ تھی، جن میں ملا ابوالحسن المعروف شاہم بابا خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

## ملا عبدالحکیم کا حاشیہ:

ہندی اہل علم کا یہ وہ دور تھا جب مدارس دینیہ میں تفسیر بیضاوی کا وہ با قاعدہ درس دینے لگے تھے اور اس پر تعلیقات وحواشی کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی جو مسند تدریس پر فائز تھے اور طلبا کو تفسیر بیضاوی پڑھاتے تھے، اس کی شرح ضبط کتابت میں لانے کا ارادہ کیا اور اس کے مشکل اور مغلق مباحث کو سلجھانے کی طرف عنان توجہ مبذول فرمائی۔ لیکن کتاب چونکہ دقیق مسائل پر محیط ہے اس لیے مولانا کو معلوم تھا کہ شرح کے باوجود اس کی پیچیدہ گرہوں کی عقدہ کشائی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کا اظہار وہ مقدمہ کتاب میں ان الفاظ سے کرتے ہیں:

> ان التفسير العتيق والبحر العميق' المسمى بانوار التنزيل' للامام الهمام' قدوة علماء الاسلام' سلطان المحققين برهان المدققين القاضى ناصر الدين عبدالله البيضاوى قد استنهز العلماء بحل مشكلاته واسهر الاذكياء احداقهم لفتح مغلقاته' الا انه لوجازة العبادات واحتوائه على الاشارات' جل ان يكون شريعة لكل وارد' وان يطلع عليه الاواحد بعد واحد۔
>
> (یعنی وہ تفسیر قدیم اور (علوم قرآنی کا) بحر عمیق' جو انوار التنزیل کے نام سے موسوم ہے اور محققوں کے بادشاہ اور دقیقہ سنجوں کی برہان قاضی ناصر الدین عبداللہ بیضاوی کی تصنیف ہے۔ علمائے نام دار اس کے مشکل مباحث کی عقدہ کشائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اذکیائے دوراں نے اس کے پیچیدہ مسائل کی وضاحت کے لیے اپنی آنکھوں کو شب بیداری کرائی۔ لیکن یہ کتاب اپنی عبارتوں کے ایجاز کی وجہ سے اور اشارات علمیہ پر محتوی ہونے کے باعث' اس سے کہیں بلند ہے کہ ہر اترنے والے کے لیے پانی کا گھاٹ بن جائے (یعنی ہر شخص کے فہم کی گرفت میں آ جائے) اور یکے بعد دیگرے سب لوگ اس کے دقائق وغوامض پر مطلع ہو جائیں۔)

مولانا سیالکوٹی چوں کہ بہت بڑے عالم اور وسیع المطالعہ شخص تھے' اس لیے انھیں ذاتی طور پر یقین تھا کہ وہ تفسیر بیضاوی کے غوامض ومغلقات کے حل وکشود سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں' لیکن ان سے تعلق رکھنے

والے اہل علم ان کے اس دعوے کو تسلیم کرنے سے متامل تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ صرف ان کی زبانی باتیں ہیں عملاً اس عظیم کام کی تکمیل بہت مشکل ہے- ان لوگوں نے مولانا ممدوح سے بیضاوی کے مغلقات کے بارے میں کچھ سوالات کیے اور ان کے جواب کے طالب ہوئے- مولانا نے ان کو تسلی بخش جواب دیے- تحریر فرماتے ہیں:

فقلت لهم ايها الخلان الدينية والاخوان الروحانية' انى انست نارا بوادى هذا الكتب' اتيكم منها بقبس لعلكم تصطلون فاستكشفوا منى بعض مظان لبسه فعرضت لهم ماورد فى خلده عند درسه من حل يفيد برد قلوب اولى الابصار وزيادات وقعت الظفرة عنها-

(میں نے ان سے کہا' اے دینی دوستو اور روحانی بھائیو! میں نے اس کتاب کی وادی میں آگ دیکھی ہے- میں اس سے کچھ انگارے لاتا ہوں تاکہ تم اس سے تاپ سکو- اب انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ اس کے بعض ان مقامات کی وضاحت کروں' جہاں شکوک وشبہات کا خیال ہے- چنانچہ میں نے ان کے سامنے وہ فوائد علمی پیش کیے جو اس کتاب کا درس دیتے وقت میری سطحِ قلب پر ابھرے تھے- یہ ان مشکل مسائل کے ایسے حل تھے جس سے اہلِ علم اور اصحاب عقل کے دلوں کو ٹھنڈک اور تسکین پہنچتی ہے- یہ حل ان زیادات وافادات پر محیط تھے' جن پر مجھے دسترس ہوئی-)

مولانا نے جب یہ دعویٰ کیا اور مغلقات کی توضیح وتشریح کے بارے میں ایک بات کہی تو ہر طرف کے اہل علم ان سے عرض کناں ہوئے کہ ان مقامات کی وضاحت فرمائی جائے- لیکن غربت وتنگ دستی اور مال و مکان کی تنگی احباب کی اس خواہش وتمنا کی راہ میں رکاوٹ بن گئی' جس کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فاقترحوا ان تقيد هذه الا وابد تذكرة للاحباب النظار فعللتهم بتفرق البال وتشتت الحال' اذا كنت مطروحا بمكان قفر جل بضاعتى فيه فقر-

(انھوں نے اصرار کیا کہ میں ان دقیق مسائل کو قلم بند کر دوں جو ہر شخص کے فکر وفہم کی گرفت میں آنے والے نہیں ہیں' تاکہ اہل نظر احباب کے لیے وہ ایک تذکرۂ ثابت ہوں- لیکن میں نے ان سے عدم اطمینان قلب اور پراگندگی حال کا بہانہ کیا- کیوں کہ میں اس زمانے میں ایک بالکل خالی مکان میں پڑا ہوا تھا' جہاں میری سب سے قیمتی متاع فقر اور بے سروسامانی تھی-)

مولانا ممدوح کی یہ سخت ذہنی پریشانی اور شدید مالی بدحالی کا زمانہ ہے اور ہندوستان میں یہ جہاں گیر کا عہد حکومت ہے' جب کہ بعض دیگر فضلائے عصر اور علمائے روزگار کی طرح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سرکار کی نظر

عنایت کی سرحدوں سے باہر اور حکومت کے گوشۂ چشم التفات سے دور تھے۔ اسی لیے اپنی گوناگوں پریشانیوں کی وجہ سے تحشیہ بیضاوی تحریر کرنے سے قاصر اور اپنے ذی علم احباب کی درخواست کو شرف قبولیت بخشنے سے عاجز تھے۔ اس قسم کے خالص علمی کام دلجمعی اور سکون خاطر کے متقاضی ہوتے ہیں، لیکن وہ اس سے محروم تھے۔ جہاں گیر کے بعد شاہ جہان تخت ہند کا وارث بنا تو سرکاری سطح پر علما کے وقار و احترام میں بھی اضافہ ہوا۔ مولانا سیالکوٹی نے اس سے ملاقات کی تو وہ ان کے علم و فضل کی فراوانی سے بہت متاثر ہوا اور انھیں صلات و جوائز سے سرفراز کیا۔ اب وہ ذہنی طور پر بالکل مطمئن تھے، چنانچہ دوستوں کے تقاضوں کو عملی شکل دینے کے لیے میدان میں نکلے اور قلم ہاتھ میں پکڑا۔ فرماتے ہیں:

حتی جذب صنیعی وجمع شتات عمری دولة السلطان...... ابو المظفر شهاب الدين محمد شاه جهان بادشاه...... وهدت بعين عنايته ملحوظا وبين اعين الناس مغبوطاً فعيت بی العلل وضاقت علی الحيل، فشرعت فی جمع ما سمع به خاطری العليل وذهنی الكليل...... جاداً فی تحقيق معانيه، بائعاً عن رموز مبانيه، موميا فی اثنائه الی اجوبة شكوك الناظرين...... فجاء ت بعون الله كنزاً لا يحصیٰ فوائده، وبحراً لا يقضی فرائده۔

(تاآنکہ سلطان ابو المظفر شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ...... کی دولت نے مجھے کھینچ لیا اور میرے انتشار طبع کو اطمینان خاطر سے بدل دیا...... میں اس کی نظر عنایت میں سما گیا اور اعیان ملک میں محسود اقران بن گیا۔ اب حیلہ جوئی میرے لیے ناممکن ہوگئی اور بہانوں کے دائرے مجھ پر تنگ ہوگئے۔ پس میں نے وہ نکات و فوائد جمع کرنے شروع کیے جو میری بیمار طبیعت اور کمزور ذہن میں آئے تھے...... لیکن ان کی ترتیب و تدوین میں، میں نے تحقیق معانی کو پیش نگاہ رکھا اور ان کے بنیادی مسائل کو موضوع بحث ٹھہرایا۔ نیز اس تحریر میں قارئین کے شبہات کے جواب کی طرف اشارہ کناں رہا...... چنانچہ اللہ کی مدد سے ایسا خزانہ معرض ظہور میں آیا اور ذہن نے اگلا جو بے شمار فوائد پر مشتمل ہے اور ایسا سمندر سامنے نمودار ہوا، جس کے موتیوں کا ختم ہونا ناممکن ہے۔)

اس طرح پہلے پارے کی تفسیر کا حاشیہ مکمل کر کے انھوں نے شاہ جہان کو پیش کیا۔ لکھتے ہیں:

ثم لما فرغت من تسويد ما يتعلق بتفسير الجزء الاول...... جعلته عراضة لسدة السنية وتحفة لخدمة العلية۔

(پھر جب میں پہلے پارے کی تفسیر سے متعلق تحشیہ سے فارغ ہوا...... تو اسے (شاہ جہان بادشاہ کے) آستانہ بلند کے لیے پیش کیا اور اس کی خدمت عالیہ کے لیے اسے تحفہ بنا دیا-)

شاہ جہان کے ملاحظہ میں آنے کے بعد انھوں نے تفسیر کے دوسرے جز کا حاشیہ لکھا اور عہد شاہ جہانی کی یہ عظیم خدمت معرض ظہور میں آئی- اس تحشیہ نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اسے مصر اور روم کے علما نے بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا- یہ حاشیہ ہندوستان میں بھی چھپ چکا ہے اور مصر میں بھی!

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے اس حاشیے کی خصوصیات یہ ہیں:

- تفسیر بیضاوی کے مشکل الفاظ کی لغوی ونحوی تشریح کی گئی ہے-
- ایسے جملے جو مغلق اور وضاحت طلب ہیں' انھیں واضح کیا گیا ہے اور ان کی پوری طرح صراحت فرمائی گئی ہے-
- ان احادیث کی' جو تفسیر بیضاوی میں درج ہیں' سند بیان کر دی ہے اور جن کا مختصر الفاظ میں ذکر ہے' ان کا پورا متن درج کر دیا ہے-

## حاشیہ کشاف:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے زمخشری کی تفسیر کشاف کا حاشیہ بھی لکھا ہے' جو غیر مطبوعہ ہے اور جس کا قلمی نسخہ ہندوستان کی رام پور لائبریری میں موجود ہے-

## حاشیہ مقدمات تلویح توضیح:

تلویح توضیح' اصول فقہ کی ایک اہم کتاب ہے- اس کا متن ''تنقیح الاصول'' ہے جو صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود المحبوبی (متوفی ۷۴۷ھ/۱۳۴۶ء) کی تصنیف ہے- بعد کو تنقیح الاصول کی شرح صدر الشریعۃ نے خود ہی لکھی' جس کو ''التوضیح فی حل غوامض التنقیح'' کے نام سے موسوم کیا- لیکن یہ شرح بجائے خود شرح طلب اور مزید وضاحت کی متقاضی تھی' اس لیے علما نے اس پر حواشی تحریر کیے- اس کی سب سے اہم اور پہلی شرح علامہ سعد الدین تفتازانی شافعی (متوفی ۷۹۲ھ/۱۳۹۰ء) نے ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء میں ''التلویح فی کشف حقائق التنقیح'' کے نام سے لکھی [1]- سب سے زیادہ مقبولیت اسی حاشیہ ''تلویح'' کو حاصل ہوئی- اور پھر بہت جلد اس حاشیہ نے اصول فقہ کی مستند درسی کتاب کی حیثیت اختیار کر لی اور اسے مدارس عربیہ کے اعلیٰ نصاب میں شامل کیا گیا' جسے اب بھی برصغیر کے مدارس میں باقاعدہ پڑھایا جاتا ہے-

واقعات کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ہندوستان میں ''اصول بزدوی'' مروج تھی-

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: کشف الظنون' ج ۱' ص ۴۹۶-

سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ-۷۵۲ھ/ ۱۳۲۵ء سے ۱۳۵۱ء) کے عہد میں "حسامی" کا ذکر بھی آتا ہے، جس پر عہد تغلق کے ایک ہندی عالم مولانا معین الدین عمرانی دہلوی نے حاشیہ تحریر کیا تھا❶- بعد ازاں "المنار" بھی مدارس میں آ گئی- چنانچہ آٹھویں صدی ہجری کے نصف ثانی میں جب سلطان فیروز شاہ تغلق نے دہلی کے حوض خاص پر مدرسہ تعمیر کیا تو اس میں سید یوسف بن سید جمال حسینی (متوفی ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء) کو مدرس مقرر کیا جو دراصل ملتان کے باشندے تھے اور دہلی چلے گئے تھے- انھوں نے "توجیہ الافکار" کے نام سے "المنار" کی شرح سپرد قلم کی، جس کا تذکرہ شیخ عبدالحق دہلوی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سید یوسف بن سید جمال الحسینی...... برمنار نیز شرح دارد مسمّٰی بتوجیہ الافکار❷-

تلویح توضیح کی ترویج مدارس ہند میں غالباً نویں صدی ہجری میں ہوئی، جب اس ملک کے علما علامہ سعد الدین تفتازانی سے تعلیم حاصل کر کے یہاں آئے- ہندوستان کے علما میں سب سے پہلے تلویح توضیح کا حاشیہ شیخ وجیہ الدین گجراتی نے کیا- اس کے دوسرے محشی شیخ یعقوب بن حسن صرفی کشمیری تھے جو نہ صرف کشمیر کے علما و فضلا میں بلکہ پورے ہندوستان میں بلند مرتبے کے حامل تھے- ان کے علاوہ شیخ نور الدین محمد صالح گجراتی، شیخ محمد عاشق چریاکوٹی اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فرزند شیخ عبداللہ لبیب نے تلویح توضیح کے حواشی قلم بند کیے- متاخرین میں مولانا جمال بن رکن الدین گجراتی، شیخ امان اللہ بنارسی اور قاضی عبدالحق بن محمد اعظم کابلی کے نام اس کے حاشیہ نویسوں میں لائق تذکرہ ہیں-

تلویح توضیح کا معرکہ آرا حصہ "مقدمات اربعہ" کا ہے، جو "حسن و قبح افعال" کے مسئلے کی وضاحت سے متعلق ہے- یہ بحث اگرچہ مسئلہ جبر و اختیار کے بارے میں علم کلام سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اصول فقہ میں بھی اس سے تعرض کیا گیا ہے-

ہندی علما نے پوری تلویح توضیح پر حواشی لکھے اور بڑی عمدگی سے اس خدمت علمی سے عہدہ برآ ہوئے- مگر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اس معاملے میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں- انھوں نے صرف تلویح توضیح کے مقدمات اربعہ کی تشریح کی اور اس اہم بحث کو اپنی کاوش فکر کا موضوع ٹھہرایا-

## حاشیہ شرح عقائد نسفی:

عقائد و کلام ایک اہم موضوع ہے- اس پر بہت سی کتابیں ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں، جن میں ایک کتاب "عقائد نسفی" ہے- احناف میں اس کو بڑی قبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے- اس کے مصنف علامہ نجم الدین عمر

---

❶ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۱۶۷، ۱۶۸-

❷ اخبار الاخیار- ص ۱۵۰-

بن محمد النسفی (متوفی ۵۳۷ھ/۱۱۴۳ء) ہیں- متعدد علما نے اس کی شروح لکھیں، جن میں ایک شرح، جو ''شرح عقائد نسفی'' کے نام سے متداول ہے، علامہ سعد الدین تفتازانی نے لکھی اور بہت جلد مدارس عربیہ میں شامل ہو گئی- ہمارے ممدوح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس کی اہمیت واضح کی ہے اور لکھا ہے کہ علما نے شرح عقائد نسفی کے حواشی تحریر کیے اور اس میں جو امور وضاحت طلب ہیں، ان کو حل کیا-

فاما طوا عنه الغواشی وکتبوا علیه الحواشی-

(علما نے اس کی تہہ میں چھپے ہوئے مطالب کو ظاہر کیا اور اس پر حاشیے لکھے-)

برصغیر پاک و ہند میں شرح عقائد نسفی کا ذکر سب سے پہلے دسویں صدی ہجری کے واقعات کے ضمن میں عہد ہمایوں کے مشہور عالم مولانا حاتم سنبھلی (متوفی ۹۶۹ھ/۱۵۲۲ء) کے حالات میں ملتا ہے- وہ اس طرح کہ عہد ہمایوں میں جو علما مغل فاتحین کے ساتھ وارد ہند ہوئے، ان میں ایک ملا علاء الدین لاری تھے، جن کو اپنے علم و فضل پر اس قدر ناز تھا کہ کسی ہندی عالم کو خاطر میں نہ لاتے تھے- انھوں نے شرح عقائد نسفی پر حاشیہ قلم بند کیا اور بڑے فخر کے ساتھ مولانا حاتم سنبھلی کو بغرض تبصرہ پیش کیا- مولانا حاتم سنبھلی نے یہ حاشیہ دیکھا تو اس پر ایسے دقیق اور وزنی اعتراض کیے کہ ملا علاء الدین لاری سے ان کا کوئی جواب نہ بن پڑا- یہ واقعہ ملا عبدالقادر بدایونی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

چوں ملا علاء الدین لاری بدعوئ تمام حاشیہ را کہ برشرح عقائد نسفی نوشتہ، نزد میاں بردہ- بعد از مطالعہ چنداں تدقیق کردہ اند کہ ملا علاء الدین را ہیچ جواب نماند ❶-

(یعنی ملا علاء الدین لاری اپنے پورے دعوائے علم کے ساتھ وہ حاشیہ جو انھوں نے شرح عقائد نسفی پر لکھا تھا، میاں حاتم سنبھلی کے پاس لے گئے- انھوں نے مطالعہ کے بعد اس پر اس قدر دقیق علمی اعتراض وارد کیے کہ ملا علاء الدین ان کا کوئی جواب نہ دے سکے-)

اس طرح شرح عقائد نسفی مدارس ہند میں آئی- پھر اس پر کئی علمائے ہند نے حواشی لکھے، جن میں مولانا علاء الدین لاری، شیخ نظام الدین بدخشی اور مولانا وجیہ الدین گجراتی کے نام زیادہ مشہور ہیں-

اس پر ایک حاشیہ، علمائے روم میں سے ایک عالم مولیٰ احمد بن موسیٰ الخیالی نے بھی لکھا تھا، جو اپنے محشی کے نام کی مناسبت سے حاشیہ خیالی کے نام سے معروف ہے- شرح عقائد نسفی کا یہ بہت عمدہ حاشیہ ہے، اور عربی مدارس کے علما و طلبا میں متداول و مشہور! دیگر ممالک کے علما کی طرح خطۂ ہند کے علما نے بھی اس کو مرکز توجہ ٹھہرایا- چونکہ یہ داخل نصاب ہو گیا تھا، اس لیے متعدد ہندی علما نے اس پر حواشی لکھے، جن میں گیارھویں صدی ہجری کے اصحاب علم میں سے مولانا عبدالسلام دیوی، شیخ محمد سعید سرہندی اور مفتی وجیہ الدین گوپاموی کے نام لائق تذکرہ ہیں-

❶ منتخب التواریخ- ج ۳، ص ۶۶-

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی اس کو اپنی کاوش فکر کے لیے منتخب فرمایا- اس پر علمائے روم نے بھی حواشی لکھے اور علمائے ہند نے بھی، لیکن طلبائے علم ان حواشی سے مطمئن نہ تھے- اس ضمن میں خود انہی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

لکن ما اتوا بما یروی الغلیل او یشفی العلیل' لما ان ابکاره آبیه عن خطبة کل عاذب و مخدراته محتجبة لا تنجلی لکل طالب-

(لیکن ان حاشیہ نویس علما نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو لوگوں کی علمی تشنگی دور کر سکتی یا بیماروں کو حقیقی شفا بخشنے کے قابل ہوتی' کیوں کہ کتاب کے گہرے مسائل کے نقاب میں چھپی ہوئی دوشیزہ ہر شخص کو پیغام شادی دینے سے انکار کرتی ہے اور اس کے پردوں میں مستور غوامض ہر طلب گار کے سامنے اپنا نقاب نہیں اٹھاتے-)

ان حواشی میں جو کمی رہ گئی تھی' مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حاشیہ نے اس کو کما حقہ' پورا کر دیا اور قاری کی سطح ذہن پر جو شبہات ابھر سکتے تھے' انھیں بطریق احسن رفع فرما دیا- لکھتے ہیں:

فصرفت برهة من عنفوان الشباب فی حل مبانیه وانتهبت فرصة عن اعین الزمان لتحقیق معانیه...... فحققت مقاصده وبینت مصادره و موارده...... مجیبا عن شبهة الناظرین فجاء بحمد الله تعالیٰ موافقاً للمامول وتم بعون الله تعالیٰ مطابقاً للمسئول-

(سو میں نے اپنے عنفوان شباب کا ایک حصہ اس کے بنیادی مسائل کو حل کرنے میں صرف کر دیا اور اس کے تحقیق معانی کی غرض سے زمانے کی آنکھوں سے فرصت کے کچھ لمحات اڑا لیے...... اس کے مقاصد و مطالب کی گہرائی تک پہنچا اور اس کے مصادر و موارد بیان کیے...... کتاب پڑھنے والوں کے شبہات کا جواب دیا- اس طرح یہ کتاب توقع کے عین مطابق ہو گئی- الحمد للہ تعالیٰ- اللہ کی مدد سے کتاب دوستوں کی تمنا کے ہم آہنگ ہو گئی-)

حاجی خلیفہ نے بھی کشف الظنون میں مولانا سیالکوٹی کے حاشیہ بر حاشیہ خیالی کا ذکر کیا ہے اور اس کو بہترین حاشیہ قرار دیا ہے-

وعلی الخیالی حاشیة...... للملا عبدالحکیم بن شمس الدین الهندی السیالکوتی متوفی سنه سبع وستین والف وهی احسن الحواشی مقبولة عند العلماء[1]-

[1] کشف الظنون- ج ۲' ص ۱۱۴۸-

(اور خیالی پر...... ملا عبدالحکیم بن شمس الدین ہندی سیالکوٹی نے حاشیہ تحریر کیا' جو ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء میں فوت ہوئے- خیالی کا یہ بہترین حاشیہ ہے اور علما میں مقبول و مشہور ہے-)

مولانا لکھتے ہیں کہ یہ حاشیہ انھوں نے بادشاہ ہند شاہ جہان کے نام معنون کیا-

## حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوّانی:

قاضی عضد الدین الایجیؒ (متوفی ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء) کی عقائد میں ایک کتاب عقائد عضدی کے نام سے معروف ہے' جس کی بہت سے علما نے شرحیں لکھیں- ان میں ایک شرح محقق دوّانی یعنی علامہ جلال الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ھ/۱۵۰۳ء) نے بھی لکھی جو ''شرح عقائد جلالی'' کے نام سے ہمارے مدارس میں متداول رہی ہے اور علما وطلبا اس سے استفادہ کرتے ہیں- بعد میں شرح عقائد جلالی پر علما نے حواشی تحریر کیے' جن میں خود محقق دوانی کے بعض جلیل القدر تلامذہ بھی شامل ہیں-

شرح عقائد جلالی جب برصغیر میں پہنچی اور علمائے ہند میں مروّج ہوئی تو اس پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے حاشیہ لکھا اور وہی اس برصغیر کے پہلے عالم ہیں' جنھوں نے اس اہم کتاب کو تحشیہ کے لیے منتخب کیا- بعد ازاں دیگر علمائے ہند نے اس پر حواشی تحریر کیے-

## حاشیہ شرح المواقف:

قاضی عضد الدین الایجی (متوفی ۷۵۶ھ/۱۳۵۵ء) کے متون میں علم الکلام سے متعلق ''المواقف فی الکلام'' کو ایک متن متین کی حیثیت حاصل ہے- اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس دور کے وہ سلاطین وملوک جن کو اس کی عظمت کا علم تھا' متمنی تھے کہ اس کے فاضل مصنف' علم کلام کے اس عظیم شاہ کار کا انتساب اس کے نام کریں- ان سلاطین میں ہندوستان کا بادشاہ سلطان محمد تغلق بھی شامل ہے- چنانچہ سلطان محمد تغلق (متوفی ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) نے قاضی عضد الدین کو ہندوستان لانے اور ان کی کتاب ''المواقف'' کو اپنے نام معنون ومنسوب کرانے کے لیے دہلی کے نامور فاضل مولانا معین الدین عمرانی کو شیراز بھیجا- شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں:

چنیں گویند کہ سلطان محمد تغلق کہ قاضی عضد را بہ دیار ہندوستان طلبیدہ وتوشیح متن مواقف بنام خود التماس نمودہ' ہم مولانائے مذکور را فرستادہ بود❶-

---

❶ اخبار الاخیار- ص ۱۴۴-

(کہتے ہیں کہ سلطان محمد تغلق نے قاضی عضد الدین کو ہندوستان آنے کی دعوت دی اوران کی کتاب المواقف کو اپنے نام معنون کرنے کی درخواست کی، اس کے لیے اس نے مولانا معین الدین عمرانی کو ان کے پاس بھیجا۔)

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی سبحۃ المرجان میں مولانا معین الدین عمرانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ تحریر کیا ہے:

ارسله السلطان محمد بن تغلق شاه والی الهند المتوفی سنة اثنين وخمسين وسبعمائة الى القاضی عضد الدين الايجی بشيراز واتحف اليه هدايا غير محصورة والتمس بالهند قدومه❶۔

(سلطان محمد تغلق (متوفی ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) نے مولانا معین الدین عمرانی کو بے شمار تحائف وہدایا دے کر قاضی عضد الدین ایجی کے پاس شیراز بھیجا اور ان سے ہندوستان تشریف لانے کی درخواست کی۔)

لیکن شیراز کے حکمران سلطان ابواسحاق انجو کو پتا چلا تو اس نے اپنی پوری سلطنت قاضی عضد الدین کے سپرد کرنے کی پیش کش کی اور انھیں ہندوستان نہ آنے دیا۔ بعد ازاں قاضی موصوف نے اپنی تصنیف ''المواقف'' ابواسحاق انجو کے نام معنون کردی۔ حافظ شیرازی نے بھی والیٔ شیراز سلطان ابواسحاق انجو کے عہد کے پانچ رتنوں کے ذکر میں اس کتاب اور اس کے مصنف کی تعریف کی ہے:

دگر شہنشہ دانش عضد در بینش بنائے کار ''مواقف'' بنام شاہ پناہ

اس سے ''المواقف'' کی علمی قدر و قیمت اور سلاطین وقت کی اس سے بے پناہ رغبت واعتنا کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

المواقف پر متعدد اہل علم نے حواشی وشروح لکھے جن میں ایک شرح میر سید شریف جرجانی کی ہے، جو محمد بن مبارک شاہ منطقی کے شاگرد تھے اور محمد بن مبارک نے براہ راست مصنف ''المواقف'' قاضی عضد الدین سے یہ کتاب پڑھی تھی۔ گویا میر سید شریف جرجانی کو صرف ایک واسطے سے قاضی موصوف کا شرف تلمذ حاصل تھا۔ یہ نہایت عمدہ شرح ہے جو مدارس عربیہ میں عرصے تک متداول رہی۔ اس پر بہت سے علما نے حواشی تحریر کیے، جن میں ہندی علما بھی شامل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدارس ہند میں ''شرح المواقف'' کا رواج دسویں صدی ہجری میں پڑا۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ سندھ کے حکمران شاہ حسین نے مولانا یونس سمرقندی (متوفی ۹۵۱ھ/۱۵۴۴ء) سے دیگر کتابوں کے علاوہ شرح المواقف کا درس بھی لیا تھا۔ دسویں صدی ہجری کے

❶ سبحۃ المرجان۔ص ۳۷۔

آخر میں ماوراء النہر کے ایک جلیل القدر عالم مولانا عبدالسمیع اندجانی وارد ہند ہوئے' وہ شرح المواقف اور حاشیہ مطالع کی تدریس میں خاص درک اور مہارت رکھتے تھے اور ان کتابوں کو بے حد پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے- وہ مولانا احمد جند کے شاگرد تھے- ان کا سلسلہ نسب صاحب ہدایہ تک پہنچتا ہے-ہفت اقلیم کے مصنف احمد امین رازی لکھتے ہیں:

قاضی عبدالسمیع از شاگردان مولانا احمد جند است ونسبتش بہ صاحب ہدایہ منتہی شود' وشرح مواقف و حاشیہ مطالع نیک می داند ❶-

افاضل ہند میں سے متعدد حضرات نے شرح المواقف پر حواشی تحریر کیے' جن میں مولانا وجیہ الدین گجراتی' شیخ ہبۃ اللہ شیرازی اور مولانا عبدالوہاب کشمیری کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں- ان کے بعد کے اہل علم میں سے میر محمد زاہد ہروی کابلی (متوفی ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۰ء) نے جو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ہم عصر قاضی محمد اسلم ہروی (متوفی ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء) کے صاحب زادے تھے' شرح المواقف کے دوسرے موقف "امور عامہ" پر مبسوط ومفصل حاشیہ لکھا جو عرصے تک معقولات کے اعلیٰ درس میں داخل نصاب رہا-

سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء) کی شرح المواقف پر ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے لکھا اور واقعہ یہ ہے کہ فضلائے ہند میں سے اسی حاشیہ کو سب سے زیادہ قبولیت کا شرف حاصل ہوا- ہندوستان سے باہر کے اہل علم میں بھی اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا حاجی خلیفہ نے ہندی علما کے حواشی میں سے صرف مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حاشیہ کا ذکر کیا ہے-

وعلى شرح المواقف للسيد حاشية لعبد الحكيم السيالكوتي اللاهوري ❷-

(اور میر سید شریف جرجانی کی شرح مواقف پر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی لاہوری نے حاشیہ لکھا-)

بیرون ہند میں اس حاشیہ کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ استنبول اور مصر میں شرح مواقف کے تین حاشیے طبع ہوئے ہیں' جن میں ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ہے-

لیکن مولانا سیالکوٹی کا حاشیہ شرح المواقف مکمل نہیں ہے' صرف موقف خامس (پانچویں موقف) تک ہے- مولانا ممدوح' مقدمہ حاشیہ میں خود وضاحت کرتے ہیں کہ یہ حاشیہ انھوں نے اپنے بیٹے مولانا عبداللہ لبیب کے لیے' جب کہ وہ یہ کتاب ان سے پڑھتے تھے' لکھا تھا- مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

---

❶ ہفت اقلیم- ج ۲' ص ۳۱۴-

❷ کشف الظنون- ج ۲' ص ۱۸۹۴-

ھذہ فوائد بل فرائد علقتھا علی شرح المواقف سید المحقیقن وافضل المدققین عند قراء ۃ قرۃ العین لھذا الغریب عبداللہ الملقب باللبیب، تذکرۃ للاحباب وتحفۃ للاصحاب وعدۃ لیوم الحساب، وانا الفقیر المتمسک بالحبل المتین عبدالحکیم بن الشیخ شمس الدین۔

(یہ فوائد نکات جنھیں موتیوں سے تعبیر کرنا چاہیے، وہ (حواشی) ہیں، جو میں نے سید المحققین اور افضل المدققین (میر سید شریف جرجانی) کی شرح المواقف پر اس زمانے میں تحریر کیے تھے، جب مجھ غریب کی آنکھوں کی ٹھنڈک (میرا بیٹا) عبداللہ، جس کا لقب لبیب ہے، مجھ سے یہ کتاب پڑھتا تھا۔ میں نے ان حواشی کو اپنے احباب کے لیے ایک یادگار، رفقا کے لیے ایک تحفہ اور روز قیامت کے لیے توشہ بنایا ہے۔ اور میں فقیر دین کی مضبوط رسی کو پکڑنے والا عبدالحکیم بن شیخ شمس الدین ہوں۔)

## حاشیہ شرح شمسیہ:

شمشیہ، علم منطق سے متعلق درجہ اعلی کے درسی نصاب کا متن متین ہے، جس کا پورا نام ''الرسالۃ الشمسیہ فی قواعد المنطقیہ'' ہے۔ اس کے مصنف نجم الدین کاتبی ہیں، جو محقق طوسی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی یہ تصنیف خواجہ شمس الدین وزیر کے نام معنون کی تھی، اسی وجہ سے یہ ''شمسیہ'' کے نام معروف ہوئی۔ اہل علم میں اس متن نے بڑی قبولیت حاصل کی اور علما نے اس کی شرحیں سپرد قلم کیں۔ ان شرحوں میں سب سے زیادہ مقبولیت قطب الدین رازی کی شرح کی ہوئی۔ ان کی شرح کا اصل نام ''تحریر المنطقیہ فی شرح الرسالۃ الشمسیہ'' ہے۔ مگر یہ شرح اپنے مصنف کے نام کی مناسبت سے ''قطبی'' کے نام سے معروف ہوئی۔

قطبی، اپنی تصنیف کے جلد ہی بعد داخل نصاب ہوگئی اور متعدد علمائے منطق نے اس پر حواشی تحریر کیے۔ لیکن علما وطلبا کے حلقے میں درجہ قبولیت صرف دو حاشیوں کو حاصل ہوا۔ ایک میر سید شریف جرجانی کے حاشیہ کو جو ''میر قطبی'' کے نام سے موسوم ہے اور دوسرے علامہ سعد الدین تفتازانی کے حاشیہ کو جو اپنے مصنف کے نام کی وجہ سے ''سعدیہ'' کہلاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ علمائے ہند قطبی سے، فیروز شاہ تغلق کے عہد میں، آٹھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں متعارف ہوئے۔ اور وہ اس طرح کہ فیروز شاہ تغلق نے دہلی میں جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس میں صدر مدرس مولانا جلال الدین رومی کو مقرر کیا تھا [1] جو صاحب قطبی قطب الدین رازی کے شاگرد تھے۔ ان کے سلسلۂ تلمذ کا

[1] المعارف (لاہور) اپریل ۱۹۶۸ء، ص ۳۴۔

ذکر شیخ عبدالحق دہلوی نے سید یوسف بن سید جمال حسینی کے حالات کے ضمن میں کیا ہے:

اوشاگرد مولانا جلال الدین رومی است کہ از تلامذۂ مولانا قطب الدین رازی شارح شمسیہ مطالع است ❶۔

(سید یوسف بن جمال حسینی) مولانا جلال الدین رومی کے شاگرد تھے' جو کہ مولانا قطب الدین رازی شارح شمسیہ و مطالع کے تلامذہ میں سے تھے۔)

خیال یہ ہے کہ مولانا جلال الدین رومی ہی اپنے استاد مولانا قطب الدین رازی کی یہ شرح شمسیہ (قطبی) ہندوستان لائے اور وہ یہاں کے مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہوئی اور علما نے اس سے اعتنا کیا۔ پھر دسویں صدی ہجری کے آغاز تک اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ نویں صدی ہجری کے آواخر میں علمائے ملتان' مولانا عزیز اللہ تلنبی اور مولانا عبداللہ تلنبی جب دہلی گئے تو مدارس ہند میں علم کلام کی شرح صحائف اور منطق کی شرح شمسیہ (قطبی) مروّج تھیں۔ انھوں نے دوسری کتابوں کا رواج ڈالا۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی مولانا عبداللہ تلنبی کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

آخرالامر از خرابی ملتان اوو شیخ عزیز اللہ تلنبی رخت رحلت بہ دارالخلافہ دہلی کشیدند و علم معقول رُا دریں دیار مروّج ساختند' و پیش ازیں غیر شرح شمسیہ و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نہ بود ❷۔

(بالآخر ہنگامہ ملتان کے دوران میں مولانا عبداللہ تلنبی اور شیخ عزیز اللہ تلنبی جب رخت سفر باندھ کر (سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں) دارالسلطنت دہلی گئے تو ان دیار میں معقولات کی ترویج کی' ورنہ اس سے پہلے ہندوستان میں علم منطق کی شرح شمسیہ (قطبی) اور علم کلام کی شرح صحائف کے علاوہ کسی اور کتاب کا رواج نہ تھا۔)

چونکہ مدارس ہند میں شرح شمسیہ کو منطق کی اعلیٰ درجے کی نصابی کتاب سمجھا جاتا تھا' اس لیے علمائے ہند نے اس کو مرکز توجہ ٹھہرایا اور اس پر حواشی تحریر کیے' جن میں مولانا عبدالوہاب کشمیری' مولانا وجیہ الدین گجراتی' شیخ ہبۃ اللہ شیرازی اور قاضی نور اللہ شوستری کے حواشی قابل ذکر ہیں۔

لیکن ''قطبی'' اور ''میر قطبی'' پر ان علمائے گرامی قدر کے حواشی کے علاوہ ایک حاشیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی لکھا' اور یہ حاشیہ اس زمانے میں لکھا جب ان کے بیٹے مولانا عبداللہ لبیب ان سے یہ کتابیں پڑھتے تھے۔ اس حاشیے نے فنی اعتبار سے بڑی شہرت پائی اور فاضل محشی نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح اس کا انتساب بھی شاہ جہان بادشاہ کے نام کیا۔

---

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۱۵۰۔

❷ مآثر الکرام دفتر اول' ص ۱۷۵' ۱۷۶۔

اس حاشیے کی علمی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملا محب اللہ بہاری نے ''سلم العلوم'' میں قطبی کے کسی ہندی حاشیہ نویس کا حوالہ نہیں دیا' صرف اسی حاشیہ کو لائق التفات گردانا اور اس سے استفادہ کیا۔ سلم العلوم کے شارحین میں سے ملا حمد اللہ نے بالخصوص اپنی شرح میں متعدد مقامات پر ''فاضل لاہوری'' کا لفظ لکھ کر اس کی صراحت کی ہے اور ان کے افادات عالیہ کا ذکر کیا ہے۔

مولانا سیالکوٹی نے یہ حاشیہ سپرد قلم کرنے کی وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ قطبی اور میر قطبی کے بعض حواشی اپنی شہرت کے باوجود بعض مقامات پر تشنہ تحقیق ہیں اور بعض اپنے اندر بلا مقصد طوالت لیے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے ان فضلا و علما کے حواشی ان کے نزدیک طلبا کے لیے زیادہ مفید مطلب اور لائق استفادہ نہ تھے' لہٰذا انھیں یہ حواشی تحریر کرنا پڑے ❶۔

## حاشیہ شرح مطالع الانوار:

مطالع الانوار' قاضی سراج الدین محمود بن ابوبکر ارموی (متوفی ۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء) کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ''حصے'' کو مصنف شہیر ''طرف'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ طرفِ اول منطق کے موضوع سے متعلق ہے' اور طرفِ ثانی' فلسفہ و حکمت کے مسائل پر محیط ہے۔ اس کے چار اجزا ہیں: جواہر' اعراض' امور عامہ اور العلم الالٰہی۔!

مطالع الانوار کی شرح' قطب الدین رازی (متوفی ۷۶۶ھ/۱۳۶۵ء) نے ''لوامع الاسرار'' کے نام سے تحریر کی اور اس کا انتساب وزیر غیاث الدین کی طرف کیا۔ مطالع الانوار کی یہ شرح اہل علم میں بڑی مقبول ہوئی اور بہت سے فحول علما نے اس پر حواشی لکھے۔ قاضی نور اللہ شوستری کا کہنا ہے کہ ملا جلال الدین دوانی نے جو محقق جلال الدین کے عرف سے معروف ہیں' اس پر دو حاشیے لکھے تھے' ان میں سے ایک حاشیہ قدیم کہلاتا ہے اور دوسرا جدید۔!

لیکن سب سے زیادہ قبولیت کی نظر سے میر سید شریف جرجانی کے حاشیہ کو دیکھا گیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ میر شریف کا یہ حاشیہ' شرح مطالع الانوار کا دوسرا حاشیہ ہے۔ قدیم تریں (یا پہلا) حاشیہ مولیٰ الحاج پاشا کا تھا❷۔ کیونکہ میر شریف نے اس کے تقدم کا اعتراف بھی کیا ہے اور بعض مقامات پر مواخذہ بھی کیا ہے۔

میر سید شریف جرجانی کے بارے میں یہ واقعہ لائق تذکرہ ہے کہ وہ شرح مطالع الانوار خود اس کے مصنف (قطب الدین رازی) سے پڑھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے'

❶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مجموعہ قطبی وحواشی قطبی۔ جلد ۱' ص ۳ تا ۸۔

❷ المعارف لاہور۔ اپریل ۱۹۶۸ء۔ ص ۳۸۔

مگر قطب الدین رازی بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ میں نوجوان طالب علم کے اعتراضات وایرادات کے دفاع و جواب کی ہمت نہ پائی' لہٰذا انھیں اپنے ایک شاگرد شمس الدین محمد بن مبارک شاہ کے پاس بھیج دیا اور فرمایا کہ ان سے پڑھنا' خود شارح (یعنی مجھ) سے پڑھنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ میر سید شریف جرجانی وہاں سے چلے اور شمس الدین محمد بن مبارک شاہ کے درس میں پہنچے۔ انھوں نے کہا' مستقل درس کے لیے تو وقت نہیں ہے' البتہ فلاں امیرزادہ یہ کتاب پڑھ رہا ہے' اس کے شریک درس ہو جاؤ۔ میر شریف نے اس کے ساتھ مل کر پڑھنا شروع کیا۔ درس میں تو وہ خاموش رہتے' لیکن شب کو مطالعہ کے لیے بیٹھتے تو بڑی محنت کرتے۔ ایک شب استاذ' مدرسہ اور طلبا کی دیکھ بھال کے لیے آئے۔ سید شریف کے حجرے کے قریب پہنچے تو انھیں پوری محنت سے مطالعہ میں مصروف اور مطالب کتاب میں مستغرق پایا۔ اندر سے کچھ اس طرح کی آواز آ رہی تھی:

قال الشارح كذاو قال الا ستاذ كذاو انا اقول كذا❶۔

(شارح کتاب (قطب الدین رازی) نے یہ کہا اور استاد نے یہ تقریر کی اور میں یہ کہتا ہوں۔)

استاذ مکرم' لائق شاگرد کے اس اسلوب مطالعہ سے اس درجہ متاثر اور خوش ہوئے کہ دوسرے روز سے مستقل سبق مقرر کر دیا۔ دوران طالب علمی ہی میں میر سید شریف نے شرح المطالع کا حاشیہ قلم بند کیا' اور اس حاشیہ نے فحول و اکابر علما کے نزدیک اس درجہ شہرت و قبولیت پائی کہ انھوں نے اس حاشیہ پر حواشی تحریر کیے' جن میں میر مرتضی شریفی' مرزا جان شریفی اور دیگر علمائے عظام شامل ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شرح مطالع الانوار سے ہندی علما' فیروز شاہ تغلق کے عہد میں آشنا ہو چکے تھے' کیونکہ مدرسہ فیروز شاہی کے ایک مدرس (مولانا جلال الدین رومی) وہ بزرگ تھے جو خود مولانا قطب الدین رازی کے شاگرد تھے ❷۔ غالباً یہ کتاب دیار ہند میں وہی لائے ہوں گے لیکن یہ مدارس ہند میں داخل نصاب کب ہوئی؟ اس سے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ سلطان شاہی بیگ (متوفی ۹۲۸ھ/۱۵۵۲ء) نے جو مغل حکمران ظہیر الدین بابر سے پہلے سندھ کا حاکم تھا' اور حکومت و سیاست کے ساتھ ساتھ' علم و فضل کی نعمت سے بھی مالا مال تھا' شرح مطالع پر تعلیقات قلم بند کی تھیں۔ بعد ازاں ۹۷۲ھ/۱۵۶۵ء میں مولانا عبدالسمیع اندجانی ہندوستان آئے تو اس کتاب کی ترویج و اشاعت اور زیادہ ہوئی۔ اس لیے کہ ان کو شرح مواقف اور شرح مطالعہ کے درس و تدریس میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

قاضی عبدالسمیع۔۔۔۔شرح مواقف و حاشیہ مطالع نیک می داند ❸۔

---

❶ الشقائق النعمانیہ بر حاشیہ تاریخ ابن خلکان۔ ج ۱' ص ۲۳۹۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۱۵۰۔

❸ ہفت اقلیم۔ ج ۳' ص ۴۴۳' ۴۴۴۔

شرح مطالع، برصغیر کے حلقہ درس میں متداول ہوئی تو متعدد علمائے ہند نے اس پر حواشی لکھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بیٹے شیخ نورالحق دہلوی نے بھی حاشیہ لکھا۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی اس پر حاشیہ تحریر کیا، جس کا قلمی نسخہ ہندوستان کی بانکی پور لائبریری میں موجود ہے ❶۔

## حواشی در کنار شرح حکمۃ العین:

حکمۃ العین، فلسفہ و حکمت سے متعلق علامہ نجم الدین کاتبی قزوینی کی تصنیف ہے۔ اس کی شرح ملا قطب الدین رازی نے شرح حکمۃ العین کے نام سے لکھی تھی۔ شرح حکمۃ العین جب نصابِ درسیہ میں آئی تو علمانے اس پر حواشی لکھے۔ علامہ جلال الدین دوانی نے بھی اس کا حاشیہ سپرد قلم کیا تھا۔ دسویں صدی ہجری میں شرح حکمۃ العین ہندوستان میں متداول ہوئی تو یہاں کے علمانے بھی اس کو مستحق التفات گردانا۔ اس پر ایک حاشیہ مولانا وجیہ الدین گجراتی نے لکھا❷۔

ان کے شاگرد مولانا خوش حال تاشقندی نے بھی دیگر کتابوں کے علاوہ اس پر حاشیہ تحریر کیا۔ عبدالباقی نہاوندی لکھتے ہیں:

ملا خوشحال خلف صدق مولانا قاسم تاشقندی است۔۔۔ اوائل طالب علمی شرح ہدایہ و حکمۃ العین و شرح تجرید و حاشیہ قدیم و شرح چغمینی و تحریر اقلیدس حل نمودہ❸۔

ان حضرات علمائے ہند کے علاوہ گیارھویں صدی ہجری میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس کو موضوع فکر ٹھہرایا اور اس پر حواشی تحریر فرمائے۔

## حواشی در کنار شرح ہدایۃ الحکمۃ:

ہدایۃ الحکمۃ، اثیر الدین ابہری کی تصنیف ہے۔ یہ اگرچہ ایک صغیر الحجم رسالہ ہے، لیکن اپنے موضوع میں بڑا اہم ہے اور بہت سے علمانے اس کو شروح و حواشی کا مستحق گردانا۔ اس کی ایک شرح، علامہ جلال الدین دوانی کے تلمیذ رشید میر حسین میبذی نے لکھی، جو اس کے شارح کے نام پر ''میبذی'' کہلائی۔ پھر علما میں یہی میبذی (یعنی شرح ہدایۃ الحکمۃ) مروّج ہوگئی۔ صدرائے شیرازی نے بھی ہدایۃ الحکمۃ کی شرح لکھی جو ان کے نام پر ''صدرا'' کہلاتی ہے۔

---

❶ المعارف لاہور۔ اپریل ۱۹۶۸ء۔ ص ۴۰۔

❷ مآثر الکرام۔ ص ۱۸۱، ۱۸۲۔

❸ مآثر رحیمی۔ ج ۳، حصہ اول، ص ۳۲، ۳۳۔

حلقہ علمائے برصغیر میں بھی میبذی (یعنی شرح ہدایۃ الحکمۃ) پڑھنے اور اس پر حواشی لکھنے کا رواج ہوا۔ ان حواشی میں مولانا محمد حسن علمی، مولانا مفتی نورالحق دہلوی بن شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور قاضی نوراللہ شوستری کے حواشی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس پر ایک مفید حاشیہ لکھا۔

## حواشی درکنار مراح الارواح:

مراح الارواح، احمد بن علی بن مسعود کی تالیف ہے اور عربی زبان میں علم صرف سے متعلق ہے۔ یہ اگرچہ مختصر کتاب ہے لیکن بقول حاجی خلیفہ بڑی مفید ہے اور مدارس عربیہ میں متداول ومشہور ہے:

و هو مختصر نافع متداول[1]۔

اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں علمائے روم اس کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اس نواح میں یہ داخل نصاب تھی۔ اسی وجہ سے اس کی متعدد علما نے شرحیں لکھیں۔ ایک شرح، صحیح بخاری کے معروف شارح علامہ بدرالدین عینی نے لکھی۔ ہندوستان میں مراح الارواح کو بڑی وقعت حاصل ہوئی۔ حضرت علامہ نواب صدیق حسن خاں نے اپنے آخری ایام زندگی میں ''تصریف الریاح'' کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے بھی اس کتاب کو لائق توجہ ٹھہرایا اور اس پر حواشی تحریر کیے۔

## تکملہ حاشیہ عبدالغفور:

علم نحو کی بہت مشہور اور متداول کتاب ''کافیہ'' ہے۔ کافیہ، شیخ جمال الدین ابوعمرو عثمان بن عمرو مالکی (متوفی ۶۴۶ھ/ ۱۲۴۸ء) کی تصنیف ہے، جو ابن حاجب مالکی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ اپنے موضوع کا ایک مختصر متن ہے مگر نہایت بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ حاجی خلیفہ نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

وھی مختصر معتبرة شھرته مغنیته عن التعریف[2]۔

(یہ ایک مختصر اور قابل اعتماد متن ہے، جس کی شہرت نے اسے تعریف سے بے نیاز کر دیا ہے۔)

کافیہ کو مدارس عربیہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور علما نے اس کی طرف بے حد التفات کیا۔ اہل علم نے جتنے شروح یا حواشی کافیہ پر تحریر کیے ہیں، دوسری کم ہی کتابوں پر کیے ہوں گے۔ ان سب کا استقصا مشکل ہے۔ مشاہیر شارحین میں سے شیخ رضی الدین محمد بن الحسن استرآبادی نحوی کی شرح کافیہ بڑی مشہور ہے۔

---

1. کشف الظنون۔ ج ۲، ص ۱۶۵۱۔
2. [کشف] الظنون۔ ج ۲، ص ۱۳۷۰۔

علامہ جلال الدین سیوطی تو رضی کی اس شرح کافیہ کی انتہائی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح مسائل نحو کی جمع و تدوین اور تحقیق، رضی کی شرح کافیہ میں کی گئی ہے اور کسی کتاب میں نہیں کی گئی، بلکہ کتب نحو کی اکثر کتابوں میں اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف ہی نہیں ہوئی۔

کافیہ کے دوسرے مشہور شارح مولانا عبدالرحمٰن جامی متوفی ۸۹۴ھ ہیں، جن کی شرح کافیہ ''الفوائد الفیائیہ'' نہایت شہرت کی حامل ہے اور اپنے شارح کے نام پر ''شرح جامی'' کے نام سے موسوم ہوگئی ہے۔ علماء طلبا میں شرح جامی کی قبولیت و تداول کا یہ عالم ہے کہ کافیہ کے ساتھ یہ باقاعدہ مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔

علمائے ہند کو کافیہ سے شغف و تعلق شروع ہی سے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، آٹھویں صدی ہجری کے ربع اول میں اس کی ترویج کا حلقہ بڑھا، جب شیخ نظام الدین اولیا رحمہ اللہ کے مرید و تلمیذ اور صرف کی درسی کتاب ''زرادی'' کے مصنف شہیر مولانا فخر الدین زرادی نے اس کے مسائل کو حل کیا، لیکن اس کی باقاعدہ شرح لکھنے والے پہلے ہندی عالم دین ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی تھے جنھوں نے ''الارشاد'' کے نام سے اس کی شرح لکھی اور ''شرح ہندی'' کے نام سے معروف ہوئی۔ اس سے پہلے کے کسی ہندی شارح کافیہ کا نام تذکرہ و سوانح کی کتابوں میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی شرح کافیہ کو ہند اور بیرون ہند میں بڑی پذیرائی ہوئی اور اس نے ''شرح ہندی'' کے نام سے شہرت پائی۔ عرصے تک یہ اپنی گوناگوں افادیت کی وجہ سے علمائے روم و عجم کا موضوعِ تحشیہ بنی رہی۔ اس پر مولی توقانی، خطیب ابوالفضل گاذرونی اور میر غیاث الدین منصور نے حواشی تحریر کیے۔

قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے نواسے شیخ صفی الدین ردولوی نے بھی کافیہ کی شرح لکھی اور اسے ''غایۃ التحقیق'' کے نام سے موسوم کیا۔

کافیہ کی معروف شرح ''شرح جامی'' جس کا ذکر اوپر ہوا، مدارس عربیہ میں مروّج ہے، اور علما نے اس کو کافیہ ہی کی طرح لائق اعتنا جانا اور اس پر حواشی لکھے۔ سب سے اول اس پر ملا عصام الدین اسفرائینی نے حاشیہ لکھا اور بیشتر مقامات پر مولانا جامی کو ہدف اعتراضات ٹھہرایا۔ اس کا جواب مولانا جامی ہی کے ایک شاگرد مولانا عبدالغفور لاری (متوفی ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء) نے ایک حاشیہ کی شکل میں دیا اور کافیہ کا یہ حاشیہ ''حاشیہ عبدالغفور'' کہلایا۔ مگر وہ اسے مکمل نہ کر پائے [1]۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا یہ خاص موضوع تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو قابل التفات گردانا اور اس غیر مکمل حاشیہ کی تکمیل کی۔ اہل علم میں مولانا سیالکوٹی کی اس علمی کوشش کو ''تکملہ حاشیہ عبدالغفور'' کے نام سے شہرت نصیب ہوئی۔

---

[1] کشف الظنون۔ ج ۲، ص ۱۳۷۱، ۱۳۷۲۔

## حاشیہ حاشیہ عبدالغفور:

ملا جامی کے شاگرد مولانا عبدالغفور لاری نے اپنے حاشیہ میں ملا عصام الدین اسفرائینی کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو انھوں نے ملا جامی پر وارد کیے تھے۔ بعد ازاں ان دونوں (ملا عصام الدین اور ملا عبدالغفور) پر بعض علما نے محاکمہ کیا' مثلاً مولی مصلح الدین لاری نے اپنے حاشیہ میں ان دونوں کے نقطۂ فکر سے بحث کی۔ مولانا عیسی بن محمد صفوی ایجی (متوفی ۹۵۵ھ/ ۱۶۴۸ء) نے بھی ان پر محاکمہ کیا۔ ان کے بعد ابراہیم ماموئی شافعی نے ملا عبدالغفور لاری کے حاشیہ پر حاشیہ لکھا۔ اس حاشیہ میں انھوں نے مولانا عیسی بن محمد صفوی سے استفادہ کیا تھا۔

کافیہ اور شرح جامی تو مدارس ہند میں بہت مروّج رہے ہیں اور علما نے ان سے بڑا استفادہ کیا ہے' لیکن حاشیہ عبدالغفور سے بھی وہ بے خبر نہ تھے' اس سے وہ مستفید ہوئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حاشیہ عبدالغفور پر حاشیہ صرف مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے تحریر کیا ہے' اور کسی عالم کا نام تذکروں میں مرقوم نہیں۔ پہلے انھوں نے تکملہ حاشیہ عبدالغفور لکھا' بعد میں حاشیۂ حاشیہ عبدالغفور سپرد قلم کیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا سیالکوٹی کو اس حاشیہ سے بہت رغبت تھی اور اسے وہ طلبا و علما کے لیے مفید سمجھتے تھے۔

## حاشیہ مطول:

علامہ سراج الدین ابو یعقوب سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ/ ۱۲۶۹ء) نے صرف' نحو' بلاغت' عروض وغیرہ علوم ادب سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی' جس کا نام ''مفتاح العلوم'' ہے۔ حلقہ اہل علم میں یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی۔ اسے داخل درس کیا گیا اور متعدد علمائے مشاہیر نے اس پر شروح لکھیں' جن میں قطب الدین شیرازی' علامہ سعد الدین تفتازانی اور میر سید شریف جرجانی کی شروح بالخصوص لائق تذکرہ ہیں۔ علمائے ہند نے بھی اس کتاب کو شائستہ التفات ٹھہرایا اور مولانا معین الدین عمرانی دہلوی نے اس پر حاشیہ تحریر کیا[1]۔ ان کے علاوہ شیخ حسین ناگوری نے جو شیخ حمید الدین ناگوری کی اولاد سے تھے' اس کی قسم ثالث کی ایک مفصل و مبسوط شرح سپرد قلم کی[2]۔

بعد ازاں علمائے عظام نے مفتاح العلوم کے مختصرات بھی تیار کیے۔ المواقف فی الکلام کے مصنف شہیر قاضی عضد الدین ایجی نے بھی ''فوائد غیاثیہ'' کے نام سے اسے مختصر کیا۔ یہ وہی فوائد غیاثیہ ہے' جس کی صاحب شمس بازغہ ملا محمود جون پوری نے ''فوائد'' کے نام سے شرح تحریر کی۔

---

[1] اخبار الاخیار- ص ۱۴۴-

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۳۹- و اخبار الاخیار ص ۱۸۲-

علامہ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن بن عمر قزوینی شافعی المعروف بہ خطیب دمشق (متوفی ۷۳۹ھ/ ۱۳۳۹ء) نے سکاکی مفتاح العلوم کا "تلخیص المفتاح" کے نام سے اختصار کیا' جو اس کی القسم الثالث کا اختصار ہے اور معانی' بیان اور بدیع کے فنون کو محتوی ہے۔ تلخیص المفتاح نے علما و طلبا میں بہت جلد شہرت و مقبولیت حاصل کر لی اور متعدد علما نے اس کی شرحیں قلم بند کیں۔

علامہ سعد الدین تفتازانی نے بھی تلخیص المفتاح کو مرکز التفات ٹھہرایا اور اس کی یکے بعد دیگرے دو شرحیں لکھیں۔ ایک بڑی مفصل' جسے انھوں نے "المطول" کے نام سے موسوم کیا۔ یہ شرح ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء میں تکمیل کو پہنچی۔ دوسری اس سے مختصر' جو "مختصر المعانی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ شرح ۷۵۶ھ/ ۱۳۵۵ء کو غجدوان میں مکمل ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں شہرت و تداول کے لحاظ سے بلند مرتبے کو پہنچیں۔ علما و طلبا نے ان کو بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھا اور مدارس عربیہ کے اعلیٰ نصاب میں داخل کی گئیں۔ بہت سے علمائے عظام نے ان کو حواشی و تعلیقات کا موضوع ٹھہرایا ❶۔

مدارس ہند میں مطول کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اور علما نے اس پر تحشیے لکھے۔ ہمارے ہاں عربی مدارس کے نصاب میں مطول "ما انا قلت" کی بحث تک پڑھائی جاتی ہے۔ برصغیر میں اس کتاب کا بہت رواج تھا اور علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات' اس کا باقاعدہ اساتذہ سے درس لیتے تھے۔ اس کی اہمیت و مقبولیت کا اندازہ میر کے اس واقعہ سے ہوسکتا ہے جو ہندوستان کے مشہور عالم مولانا شبیر احمد خاں غوری نے "ذکر میر" کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اردو کے مشہور شاعر میر نے لکھا ہے کہ انھوں نے دہلی کے ایک استاد سے مطول پڑھی' اور اس کے بدلے میں وہ انھیں اپنا صبح کا ناشتہ حاضر خدمت کر دیا کرتے تھے ❷۔

متعدد معروف اور کبار علمائے ہند نے مطول پر حواشی تحریر کیے' جن میں شیخ طاہر بن رضی ہمدانی' مولانا وجیہ الدین گجراتی' قاضی نور اللہ شوستری اور مفتی وجیہ الدین گوپا موی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان سے بعد کے فضلائے ہند میں سے سید محمد بن محمد قنوجی' شیخ نور الدین بن محمد صالح گجراتی' مولانا نور الدین کشمیری' قاضی نجف علی بن عظیم الدین جھجری' قاضی عبدالنبی احمد نگری۔ شیخ فرید الدین احمد آبادی' شیخ جمال الدین بن رکن الدین گجراتی اور حکیم معز الدین خالص پوری کے حواشی کا پتا چلتا ہے ❸۔

گیارھویں صدی ہجری میں ہمارے ممدوح مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اس اہم کتاب کو فکر و نظر کا محور بنایا اور علوم بلاغت و فصاحت اور بیان و بدیع کے اس عظیم شہکار پر حاشیہ تحریر کیا۔

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: کشف الظنون- ج ۲' ص ۱۷۶۲ تا ۱۷۶۸-

❷ المعارف (لاہور) مئی ۱۹۶۸ء- ص ۴۸

❸ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند- ص ۳۹-

## ترجمہ غنیۃ الطالبین:

مولانا سیالکوٹی نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''غنیۃ الطالبین'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ انھوں نے لاہور کے ایک عارف باللہ بزرگ شیخ بلاول قادری لاہوری کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس کتاب کے ساتھ مولانا کے صاحب زادے مولانا عبداللہ لبیب کا خطبہ بھی شامل ہے۔

## الدرۃ الثمینہ:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی فہرست تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر مروّجہ علوم کی مشہور درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے۔ مستقل کتاب صرف ایک ہی ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کا دور کتب درسیہ پر حواشی وتعلیقات اور تشریحات وتوضیحات کا تھا' اور اس دور میں یہ بہت بڑی علمی اور فنی خدمت متصور ہوتی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے' ان میں کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔ دقیق مسائل کو وضاحت سے پیش کرنا اور ان کی زلف گرہ گیر کو حسن وخوبی سے سلجھانا' انہی کا کام تھا۔ ان کے ذہن رسا نے جن پیچیدگیوں کو حل اور جن علمی عقدوں کو وا کیا' وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکا۔

گزشتہ سطور میں ان کے حواشی وتعلیقات کا تعارف کرایا جا چکا' اب ان کی ایک مستقل تصنیف ''الدرۃ الثمینۃ فی علم الواجب تعالیٰ'' کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے ___ یہ ان کی ایک معرکہ آرا کتاب ہے۔ اسے الرسالۃ الخاقانیہ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کی بیشتر کتابیں ان کے محسن و مربی اور قدردان' شاہ جہان بادشاہ کے نام منتسب ہیں۔ اس گراں مایہ تصنیف کا انتساب بھی برصغیر کے اسی مغل حکمران کی طرف ہے' لہذا اس کا نام الرسالۃ الخاقانیہ رکھا گیا۔ کتاب کے آخر میں مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

لکن هذا اخر ما قصدنا ایراده فی هذه الرسالة الخاقانیة۔

اس کی وجہ تالیف یہ ہے کہ فرماں روائے ایران شاہ صفی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ عباس دوم اورنگ ایران پر متمکن ہوا تو بادشاہ ہند شاہ جہان نے شاہ صفی کی تعزیت اور شاہ عباس کی تخت نشینی پر مبارک باد پیش کرنے کی غرض سے اپنے ایک امیر جان نثار خاں کی قیادت میں ایک وفدِ سفارت' ایران روانہ کیا' جس میں محمد فاروق (مشرف) اور محبّ علی (وقائع نویس) شامل تھے۔ یہ تین رکنی وفدِ سفارت ایران پہنچا تو ایرانی امراو علما سے ان کی طویل ملاقاتیں ہوئیں اور ان کے اعزاز میں مختلف علمی مجالس منعقد کی گئیں' جن میں ایرانی علما نے ان سے فلسفے کے بعض مباحث پر گفتگو کی۔ ایران کا وزیر اعظم اس زمانے میں خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ تھا' جو بہت بڑا معقولی تھا' اس نے بھی ہندوستانی علما سے معقولات کے مسائل پر اپنے نقطہ فکر کا بے تکلفی سے اظہار کیا۔ مغلیہ دور کا ہندوستان بھی علوم عقلیہ کا گہوارہ تھا اور اس ملک میں اس وقت بڑے بڑے منطقی اور فلسفی موجود

تھے۔ خود اس وفدِ سفارت کے ارکان میں محمد فاروق مشرف اور محبّ علی وقائع نویس فلسفہ وحکمت کے فاضل کامل تھے اور معقولات پر عبور میں ان کو بڑا غرہ تھا۔ مگر ایرانی وزیر اعظم نے ان پر ایسے سوالات کیے کہ یہ حیران رہ گئے۔ مثلاً اس نے کہا کہ امام غزالی نے قدم عالم، علم واجب تعالی اور نفی حشرِ اجساد کے بارے میں ابونصر فارابی اور ابن سینا کی تکفیر کی ہے۔ لیکن بعض علما ان مسائل میں تاویل سے بھی کام لیتے ہیں۔ فرمائیے آپ کی کیا رائے ہے۔؟

سفارت ہند کے ارکان، ایرانی وزیر کے ان فاضلانہ سوالات کا تسلی بخش جواب نہ دے سکے، جس سے علوم عقلیہ میں علمائے ہند کی عالمی شہرت کو دھچکا لگا۔ شاہ جہان ان دنوں کابل میں مقیم تھا۔ اس علمی ہزیمت کی خبر سن کر وہ متاثر تو ضرور ہوا، مگر وہ اتنی جلدی ایرانی علما کے مقابلے میں ہندوستانی علما کی شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے اپنے وزیر علامی سعد اللہ خاں سے کہا کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو خط لکھا جائے کہ وہ مذکورہ بالا مسائل ثلاثہ سے متعلق ایک مختصر مگر جامع رسالہ لکھ کر شاہی دربار میں پیش کریں۔

سعد اللہ خاں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دس پندرہ دن کے اندر اندر رسالہ لکھنے کی فرائش کی، مگر مولانا نے خط پڑھتے ہی قلم ہاتھ میں پکڑا اور صرف ایک ہفتے میں ایسا عمدہ رسالہ قلم بند کر دیا جو مذکورہ مسائل پر پوری طرح حاوی تھا اور اپنے دامنِ صفحات میں ایسی جامعیت لیے ہوئے تھا، جو ایک ضخیم کتاب میں بھی مشکل سے پائی جاتی ہے۔

الدرۃ الثمینہ یا الرسالۃ الخاقانیہ دو ابواب پر منقسم ہے۔

باب اول علم باری تعالی سے متعلق اور اس مسئلے کی تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے۔ یہ باب تین ابحاث پر محیط ہے۔ پہلی بحث اثبات باری تعالی کے بارے میں ہے۔ دوسری بحث میں کیفیت علم باری کی وضاحت سے تعرض کیا گیا ہے اور تیسری بحث میں علم باری تعالی کی عمومیت معرض بیان میں لائی گئی ہے۔

کتاب کا یہ حصہ نہایت علمی اور گہرا ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک فلسفہ وحکمت کی روشنی میں اثبات باری تعالیٰ، کیفیت علم باری تعالی اور عمومیت علم باری تعالی کے اہم مسئلے کی توضیح کی گئی ہے۔

کتاب کے باب ثانی میں مولانا عبدالحکیم نے دوسرے مسائل یعنی حشر ونشر اجساد اور حدوث وقدوم عالم کو موضوع بحث ٹھہرایا ہے۔ اس سلسلے میں ابونصر فارابی اور ابن سینا کی تکفیر کے بارے میں امام غزالی کی رائے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ بعض دیگر فلاسفۂ اسلام اور اصحاب علم کے نظریات بھی بیان کیے ہیں۔ اس ضمن میں محقق دوانی اور امام رازی کی رائے بھی نقل کی ہے۔ بعد ازاں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

اقول تکفیرهم بانکار الحشر الجسمانی حق لانه ممانطق به الکلام المجید۔

(میں کہتا ہوں کہ حشر اجساد سے انکار کی بنا پر ان کی تکفیر ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ

وہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں خود قرآن مجید ناطق ہے۔)

اسی طرح نفی قدم عالم سے متعلق بھی قرآن مجید سے استدلال کرتے ہیں' اور فرماتے ہیں کہ یہ نظریات خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔

## بعض دیگر تصانیف:

ان تصانیف وحواشی کے علاوہ ڈاکٹر زبید احمد اور منشی محمد الدین فوق کی کتابوں سے مولانا عبدالحکیم کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتا چلتا ہے۔

دلائل التجدید: یہ رسالہ حضرت مجدد الف ثانی کے دعویٰ تجدید کی تائید اور اثبات کے موضوع پر ہے۔ اس میں مولانا نے مستحکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا دعویٰ صحیح ہے اور یہ دور مجدد الف ثانی کا متقاضی ہے اور وہ شیخ احمد سرہندی ہیں۔

حاشیہ علیٰ شرح تہذیب: منطق کی مشہور کتاب شرح تہذیب پر مولانا سیالکوٹی کا حاشیہ

القول المحیط: علم منطق کے بارے میں ایک رسالہ۔

سیالکوتی علی التصورات: یہ بھی علم منطق میں ہے۔

زبدۃ الافکار۔

حواشی علی الکشاف۔

حواشی علی الحسامی۔

## مسجد اور مدرسہ وغیرہ:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ابتدائی دور غربت اور تنگ دستی کا تھا' لیکن شاہ جہان سے رابطہ پیدا ہو جانے کے بعد ان کے حالات بالکل بدل گئے تھے اور وہ امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہ جہان ان کے علم و فضل سے انتہائی متاثر اور ان کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ اس نے ان کو اچھی خاصی جاگیر عطا کی۔ کئی مرتبہ نقد روپے اور انعام واکرام سے نوازا۔ سونے سے تلوایا اور پھر ان کے ہم وزن رقم جو چھ ہزار روپے بنتی تھی' ان کی خدمت میں پیش کی۔ چنانچہ سولھویں سال جلوس (۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) کے واقعات میں محمد صالح کنبو لکھتا ہے۔

جامع فضائل وہبی وکسبی مولانا عبدالحکیم سیالکوتی را بہ زر وزن کردہ' شش ہزار روپیہ ہم وزن آں گنج ہنر بدو مرحمت نمودند ❶۔

(یعنی (شاہ جہان نے) جامع فضائل وہبی وکسبی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو سونے سے تلوایا اور پھر اس

---

❶ عمل صالح۔ ج ۲' ص ۳۴۹۔

کے ہم وزن چھ ہزار روپے ان کو عنایت کیے۔)

مولانا ذوالفقار احمد کی روایت کے مطابق شاہ جہان نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو دو مرتبہ ترازو میں تولا اور جو روپیہ ان کے تول میں آیا' وہ انہی کو عطا کر دیا۔ ہر تول میں چھ ہزار روپے آئے۔ متعدد گاؤں بھی ان کو شاہ جہان نے جاگیر میں دیے❶۔

مولانا سیالکوٹی نے یہ روپیہ بڑے اچھے کاموں میں خرچ کیا۔ اپنے مکان کے قریب ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور ساتھ ہی مسجد تعمیر کی۔ اس مدرسے میں وہ خود درس دیتے تھے اور ہند اور بیرون ہند کے علما وطلبا ان سے علم حاصل کرتے تھے۔ ان کے قیام اور مصارف کے مولانا خود ہی کفیل تھے۔ ان کی تعمیر کردہ مسجد اب بھی سیالکوٹ کے محلّہ میانہ پورہ میں موجود ہے۔ منشی محمد الدین فوق کے حسب تصریح لفظ ''میانہ'' پنجابی زبان میں مسجد کے ملا' امام' خطیب اور میاں کے لیے بولا جاتا ہے۔ چونکہ مدرسہ اور مولانا کے قیام کی وجہ سے طلبائے علم وہاں رہتے تھے' لہٰذا اس جگہ کا نام ''میانہ پورہ'' مشہور ہو گیا' اور یہ نام مولانا کے زمانے ہی سے چلا آ رہا ہے❷۔

لالہ امین چند نے بھی یہی لکھا ہے۔

ان (مولانا عبدالحکیم) کا مدرسہ بڑا نامی گرامی تھا' چنانچہ اس موضع کا نام' میانہ پورہ' انہی کے باعث مشہور ہے❸۔

مفتی غلام سرور قریشی بھی یہی بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ محلّہ مولانا عبدالحکیم ہی کی وجہ سے (میانہ پورہ کے نام سے) مشہور ہے' اور اسے مولانا نے شاہ جہان کے عہد میں آباد کیا تھا❹۔

منشی محمد الدین فوق لکھتے ہیں۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی مسجد کے قریب کچھ زمین خالی پڑی ہوئی تھی' (مشہور اہل حدیث عالم) مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی مرحوم کے والد مستری قادر بخش مرحوم نے کمیٹی سے خرید کر یہ جگہ مسجد کے نام وقف کر دی۔ ۱۹۱۹ء میں اس زمین کو صحن مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع کی گئی۔ ایک فوارہ اور حوض بھی تیار کیا گیا جو پانی سے لبریز رہتا تھا۔

مولانا نے مسافروں کی سہولت کے لیے ایک بہت بڑی کارواں سرائے اور حمام بھی تعمیر کرائے۔ منقول ہے کہ انگریزوں نے ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں اس عمارت کو خیراتی شفاخانے میں بدل دیا تھا❺۔ موجودہ سول ہسپتال' اسی خیراتی شفاخانے اور ڈسپنسری کی عمارت میں بنایا گیا ہے۔

❶ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب۔ص ۱۹۸' ۱۹۹۔
❷ مولانا عبدالحکیم' سوانح۔ص ۴۴' ۴۵۔
❸ تواریخ سیالکوٹ۔ص ۲۹۴۔
❹ تاریخ مخزن پنجاب۔ص ۲۵۵۔
❺ سوانح۔ص ۴۵۔

مولانا عبدالحکیم نے ایک شان دار باغ بھی بنایا تھا اور اس کے اردگرد مضبوط فصیل تعمیر کی تھی۔ منشی محمد الدین فوق کا بیان ہے۔

''راقم الحروف ۱۹۲۰ء میں وہاں گیا۔ ایک دو آموں کے درخت نظر آئے۔ ایک کنواں جاری تھا اور اس کے ساتھ کچھ مزروعہ اراضی تھی۔ اس جگہ مولانا کی قبر بھی ہے۔ پوچھا مولانا کا باغ کہاں ہے؟ جواب ملا یہی باغ ہے، جہاں تم کھڑے ہو اور جہاں یہ کھیت نظر آرہے ہیں۔ اب نہ باغ ہے، نہ فصیل نہ کوئی عمارت۔''

مولانا نے سیالکوٹ میں ایک خاصا بڑا تالاب بھی تعمیر کرایا تھا۔ کہا جاتا ہے، اس تالاب کی تعمیر پر مولانا نے لاکھوں روپے خرچ کیے تھے اور اس میں براہ راست دریائے چناب سے ایک نہر کے ذریعے پانی لانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس سے ملحق کچھ عمارتیں، برجیاں اور پل وغیرہ بھی تھے۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں یہ سب کچھ برباد ہو گیا ___ اس تالاب کے سلسلے میں لالہ امین چند کے یہ الفاظ قابل ذکر ہیں۔

یہ وہی تالاب ہے کہ جو مولوی عبدالحکیم کے زمانے میں بنوایا تھا مگر مدت سے اٹ گیا تھا۔ اب بعد غدر جناب مسٹر پرنسپ صاحب بہادر کے ایما سے باہتمام سید قائم علی صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ چودھریانِ شہر نے تیار کرایا اور کچھ روپیہ سرکار نے بھی عطا کیا۔ گویا کل اس شہر میں یہی ایک تالاب ہے ❶۔

بعدازاں ایک زمانہ آیا کہ یہی تالاب سیالکوٹ کے مقامی بجلی گھر کے پانی کے ذخیرے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

سیالکوٹ میں مولانا عبدالحکیم کی تعمیر کردہ عیدگاہ بھی ہے جو اب تک موجود ہے۔ اس میں شہر کے لوگ عید کی نماز پڑھتے ہیں اور اس کا انتظام مقامی انجمن اسلامیہ کے سپرد ہے۔ اس عیدگاہ کے چار دروازے تھے اور ہر دروازے پر بلند مینار تعمیر کیے گئے تھے۔ مرورایام سے دیوار اکثر جگہ سے شکستہ ہو گئی۔ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں بعض مخیّر لوگوں نے روپیہ اکٹھا کیا اور عیدگاہ کی مرمت کرائی گئی ❷۔

## وفات:

مولانا عبدالحکیم نے ۱۶ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ/۲۳ دسمبر ۱۶۵۶ء کو وفات پائی اور سیالکوٹ میں مدفون ہوئے ❸۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تاریخ وفات میں قدرے اختلاف ہے۔ بختاور خاں کا بیان ہے۔

دوازدہم ربیع الاول سنہ ہزار و شصت و ہفت در سیالکوٹ : ملت نمود ❹۔

❶ تواریخ سیالکوٹ۔ص ۲۹۴۔
❷ سوانح۔ص ۴۶۔
❸ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والارب۔ص ۱۹۸، ۱۹۹۔
❹ مرآۃ العالم۔ ورق ۴۹۲ ب۔

(۱۲/ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو سیالکوٹ میں وفات پائی۔)

غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی دو تصانیف میں دو تاریخ ہائے وفات بیان کی ہیں۔ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں۔

دواز دہم ربیع الاول (۱۰۶۷ء) سبع وستین والف طومارِ حیات پیچیدہ و در سیالکوٹ فون گردید ❶۔

(۱۲/ربیع الاول ۱۰۶۷/ ۱۹/دسمبر ۱۶۵۶ھ کو ان کی کتاب حیات لپیٹی گئی اور وہ سیالکوٹ میں مدفون ہوئے۔)

سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں۔

توفی فی الثامن عشر من شهر ربيع الاول سنة سبع و ستين والف و دفن بسالكوت❷-

(۱۸/ربیع الاول ۱۰۶۷ھ/ ۲۵/دسمبر ۱۶۵۶ء کو انتقال کیا اور سیالکوٹ میں دفن کیے گے۔)

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی یہی تاریخ وفات تحریر کی ہے۔ یعنی ۱۸ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ/ ۲۵/ دسمبر ۱۶۵۶ء ❸ اسماعیل پاشا ❹ اور خیر الدین زرکلی نے بھی یہی تحریر کیا ہے ❺۔ مولوی رحمان علی نے سنِ وفات تو ۱۰۶۷ھ ہی لکھا ہے البتہ تاریخ ۱۶ ربیع الاول (تاریخ شانزدہم ربیع الاول /۲۳/ دسمبر ۱۶۵۶ء) تحریر کی ہے ❻۔

لیکن محمد اسلم پسروری ان کی تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول اور سال وفات ۱۰۶۷ھ/ ۱۹/ دسمبر ۱۶۵۶ء لکھتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں۔

آں قدوۂ افاضل دواز دہم ربیع الاول سن ہزار وشصت وہفت کہ اول جلوس عالم گیری در سیالکوٹ رحلت نمود۔

حضرت نواب صدیق خاں رحمہ اللہ بہت آگے چلے گئے ہیں۔ وہ ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۸۶ء لکھتے ہیں۔

توفی فی سنته ۱۰۹۷ھ / ۱۶۵۹ء ودفن ببلده❼-

---

❶ مآثر الکرام۔ ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

❷ سبحۃ المرجان۔ ص ۶۶۔

❸ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۱۱۔

❹ ہدیۃ العارفین۔ ج ۱، ص ۵۰۴۔

❺ اعلام المولفین۔ ج ۴، ص ۵۵۔

❻ تذکرۂ علمائے ہند۔ ص ۱۱۰۔۱۱۱۔

❼ ابجد العلوم۔ ص ۹۰۲، ۹۰۳۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی رقم طراز ہیں۔

توفی فی نیف و ستین الف ❶۔

یعنی ۱۰۶۰ھ کے قریب فوت ہوئے۔

مولوی فقیر محمد جہلمی کے بقول ان کی وفات ۱۰۶۸ھ یا ۱۰۹۷ھ/ ۱۶۵۷ء یا ۱۶۸۶ء میں ہوئی ❷۔

محمد صالح کنبو نے ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء سن وفات لکھا ہے۔

در سال ہزار وشصت و ہفت ہجری متوجہ دارالبقا گردید ❸۔

(یعنی ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔)

دوسری جگہ محمد صالح کنبو نے شاہ جہان کے اکتیسویں سال جلوس (۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء) کے حالات میں بالکل واضح الفاظ میں لکھا ہے۔

ہژدہم ربیع الثانی بعرض اشرف رسید کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کہ شرح فضل و کمالاتش را دفتری جداگانہ باید' ایں مکان راحل اقامت خود ندانستہ' دوازدہم ماہ مذکور رہگرائی عقبیٰ گردید ❹۔

(۱۷ ربیع الثانی (۱۰۶۷ھ/ ۲۳ جنوری ۱۶۵۷ء) کو بادشاہ (شاہ جہان) کو اس بات کی اطلاع پہنچی کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے' جن کے فضل و کمال کی وضاحت کے لیے ایک الگ دفتر کی ضرورت ہے' اس دنیا میں اقامت گزیں رہنا اپنے لیے مناسب نہ جانا' وہ ۱۲ ماہ مذکور (ربیع الثانی) کو دار عقبی کی طرف روانہ ہو گئے۔)

ہمارے نزدیک محمد صالح کنبو کی روایت زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے۔ کیوں کہ یہ مولانا سیالکوٹی کے معاصر ہیں اور ان کی بدرجہ غایت تکریم کرتے ہیں۔ اپنی تصنیف عمل صالح میں ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

حبر محقق' تحریر مدقق' سر آمد دانشوران واجب التعظیم۔

محمد صالح کنبو' مولانا ممدوح کی بے حد قدر کرتے اور بہترین الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ رقم طراز ہیں۔

بالجملہ آں صاحب فضائل صوری و معنوی حق عظیم بر سائیر ارباب فضائل ثابت کردہ' در سال ہزار و شصت و ہفت ہجری متوجہ دارالبقا گردید ❺۔

---

❶ طرب الاماثل بتراجم الافاضل - ص ۲۲۳' ۲۲۴۔

❷ حدائق الحنفیہ - ص ۴۱۴' ۴۱۵۔

❸ عمل صالح - ص ۳' ص ۲۹۵۔

❹ ایضاً' ص ۲۰۵

❺ عمل صالح - ص ۳' ص ۲۹۵۔

(یعنی مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے جو صوری و معنوی خوبیوں کے حامل تھے، تمام اصحاب علم اور ارباب فضل پر اپنا حق فوقیت ثابت کر دیا، ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء کو عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔)

حافظ عبدالرحمٰن امرتسری ہندوستان کی سیاحت کو نکلے تو سیالکوٹ بھی گئے۔ اپنے سیاحت نامہ سے سیالکوٹ کا ذکر کرتے ہوئے، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی شخصیت، ان کے علم و فضل اور ان کے مدفن کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ درج ذیل ہیں۔

''ہسپتال سے دو سو گز کے فاصلے پر مشہور فاضل مولوی عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی کا مقبرہ ہے۔ موجودہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بڑی شان و شوکت کی عمارت تھی۔ مگر اب بالکل شکستہ ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں ایک زبردست عالم اور صاحب تصانیف گزرے ہیں۔ آپ نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم کے ہم سبق تھے۔ عراق، شام اور استانبول کی متعدد درس گاہوں میں مجھے آپ کی تصانیف داخل درس دیکھنے کا موقع ملا۔ اگرچہ نواب سعد اللہ خاں کو ہندوستان کی وزارت کا رتبہ حاصل تھا۔ مگر ہندوستان سے باہر بلاد اسلامیہ میں علمی حیثیت سے جو شہرت مولوی عبدالحکیم صاحب کو حاصل ہوئی، اسے کوئی ہندوستانی مصنف حاصل نہیں کر سکا۔ آپ کا انتقال ۱۰۶۷ھ۔ ۱۶۵۶ء میں اسی جگہ (سیالکوٹ میں) ہوا[1]۔''

**تلامذہ:**

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے تصنیف و تالیف اور شروح و حواشی کی گرم بازاری کے ساتھ ساتھ تمام عمر ہنگامۂ تدریس بپا کیے رکھا اور متعدد فحول علما نے ان سے اخذ علم کیا، اختصار کے ساتھ ان میں سے چند حضرات کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

## قاضی عبدالرحیم مراد آبادی:

قاضی عبدالرحیم بن عبدالرشید بہاری ثم مراد آبادی اپنے عصر کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ فاضل کبیر اور دیارِ ہند کی نامور شخصیت تھے۔ نو سال سے زائد عرصہ مولانا سیالکوٹی کی خدمت میں رہے اور علم و فضل کی نعمت عظمیٰ سے بہرہ مند ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مراد آباد کی مسندِ قضا پر متعین کیے گئے۔ طویل مدت تک اس خدمت پر مامور رہے اور ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان سے بہت سے علما نے حصول علم کیا۔ قاضی صاحب مرحوم کا حلقہ تلمذ مشاہیر علما پر مشتمل تھا۔

## ملا عصمت اللہ سہارن پوری:

تذکرہ یاغستان کے مصنف نے ملا عصمت اللہ سہارن پوری کا شمار مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تلامذہ میں کیا ہے۔ عالم کبیر، فاضل جلیل اور معروف فقیہ تھے۔ درس و تدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ آخر عمر میں نابینا ہو

[1] سیاحت ہند (یعنی ہندوستان کا ہفت سالہ سفر نامہ)۔ ص ۵۹، ۶۰۔ مطبع رفاہ عام سٹیم لاہور۔ طبع اول ۱۹۰۹ء

گئے تھے مگر بقول صاحب ''تذکرہ علمائے ہند''۔

در باطن چشم بصیرتش روشن بود ❶۔

(ان کے باطن میں چشم بصیرت روشن تھی۔)

انھوں نے کافیہ کی شرح ''الفوائد الضیائیہ'' (یعنی شرح جامی) پر حاشیہ لکھا اور شرح خلاصہ الحیات تحریر کی بہت سے علما وطلبا کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

## مولوی محمد احمد قنوجی:

مولانا سیالکوٹی کے تلامذہ کی طویل فہرست میں مولوی محمد احمد قنوجی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم تھے۔ عمر بھر تعلیم و تدریس میں مصروف رہے۔ کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں منطق کی کتاب صدرا کا حاشیہ لائق تذکرہ ہے۔

## ملا عبدالوہاب پسروری:

عہد شاہ عالم کے مشہور عالم اور فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم پسروری کے جدامجد ملا عبدالوہاب پسروری بھی مولانا سیالکوٹی کے شاگردوں میں شامل تھے۔ معروف فاضل اور عظیم المرتبت بزرگ تھے۔ محمد اسلم پسروری نے اپنی تصنیف فرحت الناظرین میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ملا عبدالوہاب پسروری شاہ جہانی عہد کے عالم تھے اور شاہ جہان ان کے علم و فضل سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس نے کئی مرتبہ ان کو وظائف و مناصب سے نوازا اور علامی نواب سعد اللہ خاں کی سعی و کوشش سے اپنے بیٹوں کے نام دو گاؤں شاہ جہان کی طرف سے قبول کیے۔ بعد میں شاہ جہان نے دو مزید دیہات کا اضافہ کر کے یہ تعداد چار تک بڑھا دی تھی۔ یہ دیہات کافی عرصہ ان کے خاندان کے تصرف میں رہے، مگر سکھوں کے دورِ ہنگامہ خیز میں ان کے قبضے سے نکل گئے۔

ملا عبدالوہاب پسروری نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے فقہ واصول اور معانی و بیان کی کتابیں پڑھیں اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام عمر درس علوم دینی میں صرف کر دی۔ ان سے بہت سے علما وطلبا نے استفادہ کیا۔

## مولوی محمد معظم:

مولوی محمد معظم بن احمد صدیقی موضع بنّہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے تحصیل کی اور علوم دینیہ میں اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے۔ قرآن مجید مع تفسیر بیضاوی کے ان کو حفظ

❶ تذکرۂ علمائے ہند۔ ص ۱۴۰۔

تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے بہادر شاہ نے ان کو ان کے وطن بٹنہ کا قاضی مقرر کیا اور چند گاؤں بطور انعام عطا کیے۔ عمر بھر مسند تدریس اور منصب قضا پر متعین رہے۔ صاحب تصانیف بھی تھے۔ قرآن مجید کی تفسیر معرض تحریر میں لائے تھے، مگر وہ سکھوں کے دورِ استیلا میں نذر آتش کر دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں مثنوی مولانا روم کی شرح لکھی تھی۔

## ملا عبدالعزیز عزت اکبر آبادی:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگردوں میں ایک عالم دین ملا عبدالعزیز عزت اکبر آبادی تھے۔ یہ مولانا عبدالرشید کے بیٹے تھے، جن کا شمار اکابر علما میں ہوتا تھا۔ ملا عبدالعزیز عزت عنفوان شباب ہی میں حصول علم سے فارغ ہو کر درس وافادہ میں مصروف ہو گئے تھے اور اپنے وطن اکبر آباد (آگرہ) میں مسند تدریس پر فائز تھے۔ ان کی علمی خوبیوں کی بنا پر اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں اکثر ان کا تذکرہ رہتا اور بادشاہ ان کی تعریف کرتا۔ ان کے بعض رسائل ومسودات بھی بادشاہ کی نظر سے گزرے تھے، جنھیں دیکھ کر وہ ان سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے ان کو دربار میں طلب کر کے ''مورد انواع عاطفت'' فرمایا اور ''منصب عمدہ وخدمت عرضِ مکرر'' کا امتیاز بخشا۔ عالم گیر ان کا بہت احترام کرتا تھا اور اس کی ''توجہات روز افزوں'' ان کو حاصل تھیں ❶۔

ملا عبدالعزیز شاعر بھی تھے اور عزت تخلص کرتے تھے۔ مرأۃ العالم میں بختاور خاں کا بیان ہے کہ عالم گیر اپنی تخت نشینی کے اٹھارویں سال میں حسن ابدال میں اقامت پذیر تھا۔ ملا عبدالعزیز عزت اکبر آبادی بھی اس کے پاس موجود تھے۔ جب وہ بادشاہ سے اجازت لے کر لاہور پہنچے تو مندرجہ ذیل غزل لکھ کر بادشاہ کو حسن ابدال بھیجی۔

زِ درد دل چہ نگارم کہ جوش بے تابیست　　زشوق جاں چہ نویسم کہ نامہ سیمابیست
شب فراق خیال کہ ریخت خون دلم　　کہ باز اشک گلابی و دیدہ عنابیست
چگونہ شرح دہم حال دل کہ بے تابم　　زیاد تاب رخش دل کتان ومہتابیست
نشستہ ایم دریں بحرٗ تا خدا کند　　بکشتی کہ زیک قطرہ آب گردابیست
نماند صورت رازِ دلم نہاں عزت　　کہ دیدہ صفحۂ تصویر رنگ بیخوابیست

بختاور خاں نے اس غزل کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

گوہرایں اشعار عربی وفارسی وہندی کہ ازاں محیط فضل بساحل ادائی ورنگینی مضمون رسیدہ ہمہ آبدارو آویزۂ گوش مستعدان روزگار است ❷۔

❶ ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین۔ص ۷۷۔ (اگست۔نومبر ۱۹۵۳ء)

❷ مرأۃ العالم ورق ۴۹۴ الف۔

## ملا محمد افضل جون پوری:

ملا محمد افضل جون پوری، اپنے عصر کے علامہ زمان وافتخار زمانیاں تھے۔ فنون درسیہ میں مہارت رکھتے تھے، درسیات میں جو فضل وکمال ان کو حاصل تھا، وہ اس عہد کے علمائے جون پور میں اور کسی کو حاصل نہ تھا۔ معاصرین میں نہایت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور لوگوں کے دل ان کی عزت سے معمور تھے۔ جون پور سے لاہور آئے اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حلقۂ درس میں شمولیت کی۔ کئی سال ان کی خدمت میں رہے اور علوم مروّجہ سے فارغ ہو کر اپنے وطن جون پور کو مراجعت کی۔ جون پور میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس سے بے شمار تشنگانِ علوم نے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ یہ ہندوستان میں جہاں گیر کا عہد تھا۔ وہ ان کی بہت تکریم کرتا تھا، اور انھیں ''استاد الملک'' کے خطاب سے نوازا تھا۔ مدرسہ شاہی میں تدریس کے فرائض بھی ان کے سپرد تھے۔ ان کے لیے جاگیر بھی مقرر کی تھی ❶۔ ملا محمد افضل کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن کا تذکرہ ان کے اصل مقام پر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

## چندر بھان برہمن:

مولانا سیالکوٹی کے شاگردوں کی طویل فہرست میں عہد شاہ جہانی کا ایک ممتاز ہندو شاعر وادیب چندر بھان تھا جو برہمن تخلص کرتا تھا اور چندر بھان برہمن کے نام سے معروف تھا۔ وہ لاہور کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنی تصنیف ''چہار چمن'' کے تیسرے چمن میں اپنی زندگی کی بعض تفصیلات درج کی ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا تلمیذ ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس نے ابتدائی تعلیم مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے حاصل کی تھی۔ اس کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

چہار چمن، تحفۃ الانوار، گلدستہ، نگار نامہ، تحفۃ الفصحا، مجموعۃ الفقراء، منشآت، دیوان فارسی۔ باختلاف روایات چندر بھان برہمن نے ۱۰۷۳ھ یا ۱۰۷۵ھ میں وفات پائی ❷۔

## میر سید اسماعیل بلگرامی:

میر سید اسماعیل بلگرامی کا تذکرہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے کیا ہے اور ان کی فراوانی علم وفضل کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

❶ ماہ نامہ ''ثقافت'' لاہور۔ بابت جون ۱۹۶۷ء۔ بحوالہ تذکرۂ علمائے جون پور (قلمی) ۔ از خیر الدین محمد الہ آبادی ۔ ورق ۱۹ الف۔

❷ ... بھان کے حالات کے لیے دیکھیے: عمل صالح ۔ ج ۳، ص ۳۳۶ تا ۳۳۸ و ص ۳۴۳، ۳۴۴۔

سید از فحول علما و جہابذہ فضلا است، و بہ دو واسطہ شاگرد امیر فتح اللہ شیرازی۔ در عقلیات برہان ساطع بود و در نقلیات حجت قاطع۔ جم غفیر دانش آموزان را کامل و مکمل ساخت۔ و بر حاشیہ علامہ دوانی بر تہذیب المنطق حاشیہ مدون مستعدانہ نوشت، و باوصف علو مرتبہ دانش بسیار کوچک دل بزرگ ہمت بود و ید فیض رسانی طولے داشت، و علم موسیقی ہندی خوب می دانست و از مہرہ دقائق ایں فن می زیست ❶۔

(یعنی سید اسماعیل بلگرامی کا شمار فحول علما اور نامور فضلا میں ہوتا ہے۔ وہ دو واسطوں سے امیر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے۔ علوم عقلیہ میں برہان ساطع اور علوم نقلیہ میں حجت قاطع تھے۔ انھوں نے علما کی بہت بڑی جماعت کو علم و فضل میں کامل و مکمل کیا۔ علامہ جلال الدین دوانی کے حاشیہ تہذیب المنطق پر عمدہ حاشیہ لکھا۔ علم میں مرتبہ بلند پر فائز ہونے کے باوجود بہت نرم دل اور باہمت بزرگ تھے۔ ان کا دستِ فیض رسانی بہت لمبا تھا۔ ہندی علم موسیقی پر خوب عبور رکھتے تھے اور اس کی فنی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔)

سید اسماعیل بلگرامی نے سب سے پہلے مولانا عبدالسلام دیوی کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اکثر متداول کتبِ درسیہ کی تحصیل کی۔ اس کے بعد مزید تحصیل کے لیے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حصولِ علم کی اجازت چاہی۔ مولانا معذرت خواہ ہوئے اور فرمایا۔

از ہجوم طلبا گنجائش وقت علیحدہ نیست، مگر آنکہ سماعت سبق فلاں شخص اختیار افتد ❷۔

(طلبائے علم کے ہجوم کی وجہ سے علیحدہ وقت کی تو گنجائش نہیں ہے، البتہ (ایک طالب علم کا نام لے کر فرمایا۔) فلاں شخص کے سبق میں شمولیت کر کے سماعت کر سکتے ہو۔)

سید اسماعیل نے اسی کو مغتنم جانا اور خاموشی کے ساتھ سماعت درس کرنے لگے۔ دوران سبق کوئی بات نہ کرتے اور چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے۔ اسی طرح ایک مدت گزر گئی۔ ایک روز خود ہی استاد نے پوچھا۔

مدتہا گزشت۔ گاہے حرفے از شما سر بر نہ زد ❸۔

(عرصہ گزر گیا، تمھاری زبان سے ایک حرف بھی کبھی سننے میں نہیں آیا۔)

سید نے عرض کیا، موجود صورت میں تو سماعت ہی کو کافی سمجھوں گا۔ البتہ۔

اگر وقتے علیحدہ قسمت فقیر مقرر شود بقدر استعداد حرف تواں زد۔

(اگر فقیر کو علیحدہ وقت عطا فرمایا جائے تو بقدر استطاعت کچھ عرض کروں۔)

---

❶ مآثر الکرام، دفتر اول۔ ص ۲۲۳۔

❷ مآثر الکرام۔ دفتر اول۔ ص ۲۲۳۔

❸ ایضاً۔ ص ۲۲۴۔ ۱۲۵۱۴

مولانا نے فرمایا‘ ان دنوں عصر اور مغرب کے درمیان فرصت ہے‘ تمھارے سبق کے لیے یہی وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ دوسرے روز مستقل درس اور بحث کا آغاز کیا گیا۔ سلسلۂ گفتگو شروع ہوا تو شام ہوگئی۔ نماز مغرب سے فارغ ہو کر پھر مصروف درس ہو گئے‘ تا آنکہ عشا کی نماز کا وقت آ گیا۔ جب مولانا نے دیکھا کہ ”سررشتۂ سخن“ ختم ہونے کے آثار کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں تو فرمایا کل صبح صبح آ جاؤ۔ دوسرے تمام اسباق موقوف کر کے پہلے ہم اسی مسئلہ زیر بحث کی تحقیق کریں گے۔

دوسرے روز صبح کے وقت لائق شاگرد پھر مولانا کی خدمت میں پہنچا۔ دیگر تمام طلبائے مدرسہ بھی موجود تھے‘ چاشت سے دوپہر تک بحث ہوتی رہی اور متواتر تین روز تک سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔ لیکن بحث کے سمٹنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو مولانا نے ہونہار تلمیذ سے فرمایا۔

بارے حل ایں مقام برشما ہم بہ نوئی ظاہر شد؟

(مسئلہ زیر بحث کا کوئی حل خود تم پر بھی ظاہر ہوا؟)

لائق شاگرد نے عرض کیا۔

یکے از محشیان دریں محل حاشیہ بہ قلم آوردہ‘ و حاشیہ کہ از تحریرات خودش بود برآوردہ۔

(فلاں حاشیہ نویس نے اس بارے میں یہ لکھا ہے‘ اور ساتھ ہی اپنا تحریر کردہ حاشیہ بھی استاد محترم کی خدمت میں پیش کر دیا۔)

استاد نے شاگرد کا یہ حاشیہ دیکھا تو۔

جواہر تحسین افشاند و فرمود مطلب حاشیہ بسیار دقیق و نازک واقع شدہ۔ اما عبارت خالی از اطناب نیست۔

(بہت خوش ہوئے‘ تحسین کی اور فرمایا‘ حاشیے کا مطلب بہت دقیق اور پیچیدہ ہے۔ مگر اصل عبارت بھی اطناب سے خالی نہیں ہے۔)

پھر شاگرد سے دریافت کیا۔

تحصیل شما از کجاست؟

(تم نے کہاں تحصیل علم کی ہے۔؟)

عرض کرد کہ از خدمت مولوی عبدالسلام دیوہ۔!

(عرض کیا دیوہ کے مولوی عبدالسلام کی خدمت میں رہ کر۔)

مولانا عبدالسلام دیوی چونکہ مولانا سیالکوٹی کے معاصر تھے اور علوم و فنون کے بہت ماہر بھی تھے‘ اس لیے قدرتی طور پر سید اسماعیل کا یہ جواب سن کر مولانا کے دل میں شبہ گزرا کہ ممکن ہے‘ مولانا عبدالسلام دیوی نے

ان کے امتحان کی غرض سے اپنے اس شاگرد کو ان کے پاس بھیجا ہو۔ اور اس خیال کا اظہار سید موصوف سے کر بھی دیا۔ لیکن سید صاحب نے حلفاً کہا۔

ایں امر را اصلاً دخلی نیست، محض بہ ارادہ استفادہ در جناب عالی رسیدہ ام ❶۔

(اس معاملے میں قطعاً کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ میں تو محض استفادے کی غرض سے جناب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا ہوں۔)

میر غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ میر سید اسماعیل بلگرامی نے بقیہ تمام مروّجہ کتب درسیہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی ہی سے پڑھیں اور انہی کے حلقہ تلمذ میں رہ کر سارے مدارج علمی طے کیے۔

سید اسماعیل، بلگرام کے رہنے والے تھے، عمر بھر مسند تدریس پر فائز رہے اور ہنگامہ درس وافادہ میں زندگی بسر کردی۔ ''وروزگارے بہ تعلیم وتدریس گزراند ❷۔'' کثیر التعداد علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۴/ شوال ۱۰۸۸ھ کو بروز شنبہ وفات پائی ❸۔

## اولاد:

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے نامور فرزند مولانا عبداللہ تھے، جن کا لقب لبیب تھا۔ یہ اپنے جلیل القدر والد کی طرح بہت بڑے صاحب علم وفضل اور متدین ومتقی بزرگ تھے۔ اپنے اخلاق وفضائل اور اوصاف وکمالات کی وجہ سے لوگوں میں ''امام وقت'' مشہور تھے۔ اس ضمن میں لالہ سجان رائے بٹالوی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

از افزونی حسن اخلاق ورہنمائی خلائق ایں بزرگ را امام وقت گفتندے ❹۔

(یعنی (مولانا عبداللہ لبیب) بے پناہ حسن اخلاق کے حامل ہونے کی وجہ سے اور لوگوں کو رشد وہدیت کی تلقین کرنے کے باعث، عوام انھیں امام وقت گردانتے تھے۔)

مولانا عبداللہ لبیب نے معقولات ومنقولات کا علم اپنے والد مکرم سے حاصل کیا تھا اور حدیث رسول ﷺ کی تحصیل شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند شیخ نور الحق دہلوی سے کی تھی ❺۔

❶ مآثر الکرام۔ دفتر اول۔ ص ۲۲۴۔

❷ ایضاً۔

❸ ایضاً۔ ص ۲۲۵۔

❹ خلاصۃ التواریخ۔ ص ۷۳۔

❺ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۵۳۔

مغل حکمران اورنگ زیب عالم گیر مولانا عبداللہ لبیب کے علم و فضل کی فراوانی سے بہت متاثر تھا اور ان کی بے حد تکریم کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۰۸٦ھ/ ۱٦۵۷ء میں لاہور آیا تو مولانا ممدوح سے ملاقات کا متمنی ہوا' اور انتہائی اعزاز و اکرام سے انھیں سیالکوٹ سے لاہور بلایا گیا۔ بادشاہ نے ان سے مل کر بہت خوشی کا اظہار کیا اور وہ تمام اعزازات جو ان کے والد مولانا عبدالحکیم کو حاصل تھے' ان کے لیے برقرار رکھے اور ان میں کچھ اضافہ بھی کیا۔ خلعت خاص' دو سو اشرفیاں اور ایک ہاتھی دے کر انھیں رخصت کیا۔

ایک روایت کے مطابق اورنگ زیب نے انھیں اجمیر بلایا اور اجمیر کی صدارت عظمیٰ پیش کرنا چاہی۔ مگر بقول بختاور خاں مولانا نے یہ کہہ کر بادشاہ کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ

الحال سنین عمر بستین رسیدہ' وقت ترک نوکری است نہ اختیار نوکری۔

(اب جب کہ عمر ساٹھ سال کو پہنچ گئی ہے' یہ ترک نوکری کا وقت ہے' نہ کہ نوکری اختیار کرنے کا۔)

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے ایک خط کے ذریعے مولانا عبداللہ لبیب کو یہ پیش کش کی تھی۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا۔

ان الزمان زمان الفراق-

(کہ اب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔)

مرأۃ العالم میں بختاور خاں کا بیان ہے کہ مولانا عبداللہ لبیب' گوشہ نشین عالم دین تھے اور اربابِ حکومت سے الگ تھلگ رہتے تھے۔

بحفظ کلام مجید وقلتِ اختلاط بارباب دول ورغبت طبع بانزاو گوشہ نشینی بر والد ماجد خود مزیت داشت۔

(یعنی وہ قرآن مجید کے حفظ اور اصحاب حکومت سے عدم رغبت و قلت اختلاط کے اوصاف سے متصف تھے اور ارباب دولت سے ملنے کے بجائے علیحدگی و گوشہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔ اور اس سلسلے میں اپنے والد (مولانا عبدالحکیم) پر فوقیت رکھتے تھے۔)

اس عظیم المرتبت عالم نے اورنگ زیب عالم گیر کے چھبیسویں سال جلوس میں ۱۰۹۴ھ/۱٦۸۳ء کو وفات پائی۔ ان کے حالات اس کتاب کے اصل مقام پر بیان کیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

---

● نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۵۳-

## ۲-مولانا عبدالحکیم کشمیری

مولانا عبدالحکیم' مولانا عبدالکریم کشمیری کے بیٹے تھے۔علوم عقلیہ ونقلیہ کے فاضل تھے۔طریقت سے بھی تعلق رکھتے تھے اوراس سلسلے میں کشمیر کے نامور عالم دین شیخ معین الدین نقشبندی کشمیری کے فیض یافتہ تھے۔''تذکرہ علمائے ہند'' میں انھیں عہد عالم گیری کے عالم بتایا گیا ہے ❶۔

## ۳-مولانا عبدالحی بلگرامی

مولانا عبدالحی بن ابوالفتح بن عبدالدائم عثمانی بلگرامی' بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں کے علما سے علم حاصل کیا۔ پھر اپنے والد گرامی شیخ ابوالفتح کی مسند علم پر متمکن ہوئے۔فقہ' اصول فقہ اور علوم عربیہ کے جید عالم تھے۔خلاصۃ الفقہ کے نام سے ایک مختصر سی کتاب بھی تصنیف کی جس میں حدیث اور فقہ کی روشنی میں سفر سے متعلق مسائل بیان کیے گئے ہیں ❷۔

## ۴۔مفتی عبدالحی سنبھلی

مفتی عبدالحی سنبھلی' اپنے علاقے اور عہد کے کبار علما میں سے تھے۔اپنے علم وفضل کی بنا پر سنبھل کے منصب افتا پر متمکن ہوئے اور عمر بھر اس منصب پر فائز رہے۔علوم دینیہ سے متعلق بعض مفید کتابوں کے مصنف تھے ❸۔

## ۵۔شیخ عبدالخالق سہارن پوری

شیخ عبدالخالق بن عبدالستار بن عبدالکریم انصاری سہارن پوری' سہارن پور میں پیدا ہوئے۔قرآن مجید حفظ کیا اور شیخ رکن الدین بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی سے تجوید سیکھی۔ پھر باقی علوم کی تحصیل کی۔ان کا شمار اپنے دور کے فقہ' قرات اور تجوید کے ماہرین میں ہوتا تھا۔۷رجب ۱۰۲۰ھ/ ۵رستمبر ۱۶۱۱ء کو وفات پائی ❹۔

## ۶۔مولانا عبدالدائم گوالیاری

مولانا عبدالدائم بن عبدالحی بن عبدالغنی عباسی گوالیاری کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا جو فقہ' اصول فقہ اور علوم عربیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔اصول فقہ کے بارے میں ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کا نام ''اساس الاصول''

❶ تاریخ کشمیر اعظمی-ص ۱۶۹-تذکرۂ علمائے ہند-ص ۲۶۹-نزہۃ الخواطر-ج ۵' ۲۱۲-

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۱۲ بحوالہ شرائف اشرفی-

❸ کمال محمد سنبھلی کی ''اسراریہ'' دیکھیے-اس میں ان کی تصنیفات کا ذکر ہے-نزہۃ الخواطر-ج ۵' ص ۲۱۳

❹ نزہۃ الخواطر-ج ۵' ص ۲۱۳ بحوالہ مراۃ جہاں نما-

ہے۔ یہ کتاب انھوں نے مغل حکمران شاہ جہاں کے عہد میں تصنیف کی تھی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ رام پور (ہندوستان) کے کتب خانہ حامدیہ میں موجود ہے ❶۔

## ۷۔ مفتی عبدالرحمٰن کابلی

مفتی عبدالرحمٰن کابلی شیخ وقت اور عالم کبیر تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں، آگرہ میں فوج کے منصب قضا پر متعین تھے۔ پیکر صدق و صفا اور صاحب ورع وتقویٰ بزرگ تھے۔ بے حد عاقل وفہیم تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے حلقہ ارادت میں داخل تھے۔ حضرت مجدد آگرہ تشریف لے جاتے تو ان کے ہاں ضرور آمدورفت رکھتے ❷۔

## ۸۔ شیخ عبدالرحمٰن سنبھلی

شیخ عبدالرحمٰن نقشبندی سنبھلی شیخ صالح اور فقیہ عصر تھے۔ شیخ تاج الدین سے اخذ طریقت کیا اور طویل عرصے تک ان کی صحبت میں رہے۔ خواجہ باقی باللہ سے بھی کسب فیض کیا۔ علم ومعرفت میں یگانہ روزگار تھے۔ اپنے شیخ کے حکم سے سنبھل کی مسند مشیخت پر فائز ہوئے اور خلق کثیر کو فیض پہنچایا۔ تقویٰ وعزیمت میں ہمیشہ اپنے شیوخ کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ ۷ شوال ۱۰۶۷ھ/ ۹ رجولائی ۱۶۵۷ء کو سنبھل میں وفات پائی ❸۔

## ۹۔ قاضی عبدالرحیم مرادآبادی

قاضی عبدالرحیم بن عبدالرشید بہاری مرادآبادی بہت بڑے فاضل، اپنے دور کے شیخ اور مشہور عالم تھے۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے کسب علم کیا اور نو سال سے زائد عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ پھر مرادآباد کے منصب قضا پر مامور کیے گئے اور ساتھ ہی طویل مدت تک وہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ سعداللہ بلگرامی اور بہت سے اہل علم شامل ہیں ❹۔

## ۱۰۔ مفتی عبدالرحیم سندھی

مفتی عبدالرحیم بن عثمان بن یوسف صالح بدینی سندھی، شاہ جہان کے عہد میں ٹھٹھہ کے مفتی تھے۔ اپنے زمانے کے شیخ، عالم اور فقیہ تھے ❺۔

---

❶ نزہۃ الخواطر۔ ج۵، ص۲۱۳۔

❷ زبدۃ المقامات۔ ص۳۵۴، ۳۵۵۔ نزہۃ الخواطر ج۵، ص۲۱۴۔

❸ نزہۃ الخواطر۔ ج۵، ص۲۱۵، ۲۱۶۔ بحوالہ اسراریہ۔

❹ نزہۃ الخواطر۔ ج۵، ص۲۱۸۔

❺ تحفۃ الکرام۔ ص۶۸۵۔ نزہۃ الخواطر۔ ج۵، ص۲۱۸۔

## ۱۱- مولانا عبدالرزاق بانڈی کشمیری

مولانا عبدالرزاق بانڈی کشمیری' دیار کشمیر کے عالم و فاضل اور ذکی و فطین بزرگ تھے۔ ملا فاضل کے خواہر زادہ تھے' جنھوں نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے بعض حواشی پر تنقید کی ہے۔ مولانا عبدالرزاق کشمیری معقولات میں بے حد تیز تھے اور اس کے تمام گوشوں پر پوری نظر رکھتے تھے۔ شرح تجرید کا حاشیہ سپرد قلم کیا' جس کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ میری اس تالیف کو سمجھنا تو کجا بڑے بڑے عالم اس کو پڑھ بھی نہیں سکتے۔ شاہ جہان بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا اور کابل کے مدرسے میں منصب تدریس پر متعین کر دیا۔ اس اثنا میں کئی راتیں کتاب محاکمات کا رد لکھتے رہے' جس سے ذہن و دماغ پر اتنا شدید بوجھ پڑا کہ خلل دماغ کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہ کیفیت یہاں تک بڑھی کہ ایک مرتبہ حلق پر چھری مار لی' شاگردوں کو پتا چلا تو دوڑ کر آئے اور کپڑا باندھ کر زخم بند کیا۔ پھر اس کا علاج کرایا اور اللہ نے شفا عطا کی۔ بعد ازاں مدرسہ کابل کی تدریس سے مستعفی ہو کر واپس کشمیر آ گئے تھے۔ کشمیر ہی میں وفات پائی ❶۔

## ۱۲- مولانا عبدالرشید کشمیری

ارض کشمیر کے یہ عالم دین' مولانا عبدالرشید کشمیری زرگر کے عرف سے معروف تھے۔ عالم کبیر' علامۂ عصر' شیخ وقت اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر تھے۔ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اس زمانے کا کشمیر علم و فضل کا مرکز تھا اور متعدد مقامات پر علمائے کشمیر کی مسانید تدریس بچھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ مولانا عبدالرشید ان کی خدمت میں گئے اور شیخ محمد بن افضل بن حیدر چرخی' ملا سلطان مانجو' قاضی عبدالرحیم اور دیگر اساتذۂ کشمیر سے تحصیل کی۔ طبیعت میں تصوف و طریقت کا شوق پیدا ہوا تو اس دور کے ایک کشمیری صاحب طریقت بزرگ شیخ محمد علی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفاضہ کیا۔ بعد ازاں خود درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور علما کی بہت بڑی جماعت ان کے علم و فضل سے مستفید ہوئی۔ عمر کے آخری دور میں سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں برہان پور کی فوجی چھاونی میں قاضی عساکر مقرر ہو گئے تھے۔ بے حد شیریں کلام تھے۔ مدلل اور پرزور تقریر کرتے تھے۔ اس کشمیری نژاد عالم دین نے برہان پور شہر میں وفات پائی ❷۔

## ۱۳- قاضی عبدالرشید دہلوی

گیارھویں صدی ہجری میں دہلی علمی لحاظ سے بڑا بارونق شہر تھا۔ اس میں علما کی کثیر تعداد جمع تھی' جن

❶ تاریخ کشمیر اعظمی-ص ۱۴۴-تذکرہ علمائے ہند-ص ۲۶۹-حدائق الحنفیہ-ص ۴۲۸-نزہۃ الخواطر-ج ۵' ص ۲۱۸' ۲۱۹-

❷ تاریخ کشمیر اعظمی-ص ۱۷۷-نزہۃ الخواطر-ج ۵' ص ۲۲۰' ۲۲۱-تذکرہ علمائے ہند-ص ۲۶۹-

میں قاضی عبدالرشید دہلوی بھی شامل ہیں۔ یہ اپنے دور اور علاقے کے شیخ، فقیہ اور صوفی بزرگ تھے۔ شیخ عبدالعزیز بن حسن چشتی دہلوی کے احفاد میں سے تھے۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی سے اخذ طریقت اور کسب علم کیا تھا۔ الہ آباد میں تین سال ان کی خدمت میں رہے۔ پھر سنبھل کے منصب قضا پر مامور کیے گئے۔ قضا کی نازک اور اہم ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ سنبھل میں درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ متعدد اہل علم نے ان سے استفادہ کیا۔ فقط صاحب قال ہی نہ تھے، صاحب وجد وحال بھی تھے۔ جب درس حدیث کے دوران حال کی کیفیت غالب آ جاتی تو بے ساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور پھر روتے روتے گھگھی بندھ جاتی ❶۔

## ۱۴- شیخ عبدالستار برہان پوری

سرزمین برہان پور نے جن علما و فضلا کو جنم دیا، ان میں ایک شیخ عبدالستار بن عیسی بن قاسم بن یوسف ہیں، جنھیں عبدالستار سندھی بھی کہا جاتا ہے۔ عالم و فقیہ اور شیخ و زاہد تھے۔ فضل و کمال میں شہرت رکھتے تھے۔ برہان پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد شیخ عیسی سے تعلیم کا آغاز کیا۔ مروّجہ کتب درسیہ کی تحصیل انہی سے کی۔ ریاضی کی بعض کتابیں علامہ شکر اللہ شیرازی سے پڑھیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ ممدوح فارس سے آئے تھے اور برہان پور میں مقیم تھے۔ برہان پور میں کئی سال تک علامہ شکر اللہ شیرازی نے افاضہ و افادہ کی محفل گرم کیے رکھی۔ شیخ عبدالستار زہد و قناعت اور عفت و توکل میں بہت مشہور تھے۔ متواضع اور کثیر الفوائد عالم دین تھے۔ اپنے والد مرحوم سے اخذ طریقت بھی کیا اور اس سلسلے میں طویل عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ والد کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر متمکن ہوئے ❷۔

## ۱۵- مفتی عبدالسلام دیوی

مفتی عبدالسلام دیوی، موضع دیوہ کے رہنے والے تھے، جو ہندوستان کے صوبہ یوپی میں اعمال لکھنؤ میں واقع ہے۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے: عبدالسلام بن ابوسعید بن حب اللہ بن احمد بن عبدالرحیم بن احمد فیاض بن محمد اعظم حسینی کرمانی دیوی۔ مفتی عبدالسلام دیوی، معقول اور منقول کے جامع تھے۔ نہایت ذکی اور ذہین عالم دین تھے۔ دیوہ کے مقام پر پیدا ہوئے جو اس دور میں لکھنؤ کے نواح میں معروف قریہ تھا۔ اب تک اس کو علم و تصوف کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اپنے قصبے اور علاقے کے نامور علما سے علم حاصل کیا۔ پھر عازم لاہور ہوئے۔ اس زمانے میں لاہور میں مفتی عبدالسلام لاہوری کی مسند تدریس آراستہ تھی، ان کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور حصولِ علم کیا۔ یہاں تک کہ فقہ، اصول فقہ اور کلام میں اپنے اقران و معاصرین سے فوقیت لے

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۲۱- بحوالہ الاسراریہ۔

❷ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار- ص ۵۶۰، ۵۶۱- نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۲۲-

گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد طویل عرصے تک لاہور ہی میں مسند تدریس پر فائز رہے۔ پھر شاہ جہان بادشاہ کی فوج میں منصب افتا پر متمکن ہوئے۔ ایک مدت تک اس منصب پر مامور رہے۔ بعد ازاں کبرسنی کی بنا پر اس منصب سے معزول ہو گئے اور لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ لاہور میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، جس سے بہت سے لوگ مستفید ہوئے۔

مفتی عبدالسلام دیوی، صاحب تصنیف بھی تھے۔ ان کی تصانیف و حواشی سے پتا چلتا ہے کہ وہ تفسیر، فقہ، منطق اور علم کلام میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف میں یہ کتابیں شامل ہیں۔

حاشیہ علیٰ حاشیۂ خیالی، شرح منار الاصول، حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ شرح الصحائف، حاشیہ علی ہدایۃ الفقہ، شرح تہذیب المنطق اور حاشیہ علی التحقیق۔

مولانا عبدالسلام دیوی کی تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی ''اکسیر'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء کو وفات پائی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ''بادشاہ نامہ'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء کو زندہ تھے ❶۔

عمل صالح کے مصنف صالح محمد کنبو نے بھی شاہ جہان کے دسویں سال جلوس میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس سال جلوس کا سن ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء ہے۔ ۱۰۴۶ھ میں سخت قحط پڑا تھا، جس میں لوگ بے حد تکلیف میں مبتلا ہوئے اور اشیائے صرف کی قیمتیں بہت بڑھ گئیں۔ شاہ جہان نے علمائے کرام، بزرگان دین اور اصحاب فضل و کمال سے دعا کی درخواست کی۔ چنانچہ نماز استسقا پڑھی گئی جس کے نتیجے میں بڑی بارش ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے قحط کی مصیبت دور فرما دی۔ جن حضرات سے بادشاہ نے دعا اور نماز استسقا کی درخواست کی تھی، ان میں سید جلال، قاضی محمد اسلم، مفتی عبدالسلام، شیخ مجیب علی سرہندی، مظہر بدائع اور شیخ ناظر شامل تھے ❷۔ یعنی ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں مفتی عبدالسلام دیوی زندہ تھے۔

بہر حال مفتی موصوف گیارھویں صدی ہجری کے ہندی علما میں اپنے علم و فضل اور نیکی و صالحیت کے اعتبار سے اونچے مرتبے کے حامل تھے ❸۔

## ۱۶۔ مفتی عبدالسلام لاہوری

گیارھویں صدی ہجری میں لاہور کو اہل علم اور اصحاب فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ عہد

❶ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۳۔

❷ عمل صالح۔ ج ۲، ص ۲۰۹۔

❸ ملاحظہ ہو عمل صالح۔ ج ۳، ص ۳۰۰۔ بادشاہ نامہ۔ ج ۱، ص ۳۴۲، ۳۴۳۔ مآثر الکرام۔ ج ۱، ص ۲۲۵، ۲۲۶۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۲، ۲۲۳۔ تذکرۂ علمائے ہند۔ ص ۲۶۹۔

برصغیر میں تین عظیم مغل حکمرانوں جلال الدین اکبر' جہاں گیر اور شاہ جہان کا عہد تھا۔۔اس عہد میں لاہور میں جن علما و فضلا کی علمی سرگرمیوں اور تدریسی کوششوں کا سلسلہ زوروں پر تھا' ان میں مفتی عبدالسلام لاہوری کا نام نامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ مفتی عبدالسلام لاہوری کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے؟ کب پیدا ہوئے؟ ان کے والد کا کیا نام تھا؟ تذکرہ نگاران سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ اپنے دور کے علامہ اور بہت بڑے فاضل تھے۔ کثرت درس و افادہ میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ صلاح و تقوی کے زیور سے آراستہ اور بلند مرتبے کے حامل تھے۔

تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق مفتی عبدالسلام نے نوے (۹۰) سال عمر پائی' کم و بیش ساٹھ سال تک لاہور میں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا اور ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء کو فوت ہوئے۔ اس حساب سے ان کا سال ولادت ۹۴۷ھ بنتا ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے ہندوستان کے تقریباً آٹھ بادشاہوں کا زمانہ پایا۔ یعنی (۱) ظہیر الدین بابر (۲) نصیر الدین ہمایوں (۳) شیر شاہ سوری (۴) سلیم شاہ سوری (۵) عادل شاہ سوری (۶) جلال الدین اکبر (۷) نور الدین جہاں گیر اور (۸) شاہ جہان کا ____ آخری تین بادشاہوں کا زمانہ تو ان کی بھرپور تدریسی ہنگامہ آرائیوں کا تھا۔

## اساتذہ:

مفتی عبدالسلام لاہوری نے اپنے دور کے مشاہیر اساتذہ اور نامور فضلا سے استفادہ کیا' ان بزرگوں کا تعارف ذیل کی سطور میں کرایا جاتا ہے۔

۱۔ میر فتح اللہ شیرازی: یہ وہ بزرگ ہیں' جنھیں بیجاپور کے حکمران عادل شاہ نے بڑی کوشش سے شیراز سے دکن بلایا اور اپنے دربار سے منسلک کیا۔ اس کے قتل کے بعد وہ جلال الدین اکبر کی دعوت پر فتح پور سیکری آگئے تھے اور دربار اکبری سے انسلاک اختیار کر لیا تھا۔ معقولات میں اپنے عہد کے منفرد اہل علم تھے۔ منقولات میں بھی دست رس رکھتے تھے۔ حکمت و فلسفہ' منطق و ہیئت' ہندسہ و ریاضی' نجوم و رمل' حساب و طلسمات' نیرنجات اور جراثقال کے ماہر تھے۔ علاوہ ازیں عربی ادب' تفسیر اور حدیث پر نظر تھی۔ یہ وہی ماہر معقولات ہیں' جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر تمام علوم عقلیہ' یعنی منطق و فلسفہ اور حکمت وغیرہ پر مشتمل کتابیں اس دنیا سے ناپید ہو جاتیں تو وہ اپنے حافظے کے زور سے از سر نو ان علوم کو زندہ کر سکتے تھے۔ میر فتح اللہ شیرازی نے علامہ جلال الدین محقق دوانی' میر صدر الدین شیرازی' میر غیاث الدین منصور' میرزا جان میر اور دیگر علمائے متاخرین کی تصانیف کو علمائے ہند سے متعارف کرایا اور اس ملک کی درس گاہوں کے نصاب میں داخل کرایا[1]۔ اکبر ان کی انتہائی

[1] مآثر الکرام دفتر اول' ص ۲۲۸' ۲۲۹۔

تکریم کرتا تھا۔ اس نے ان کو ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء میں قیام لاہور کے زمانے میں امین الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔ مالی معاملات اور پیمائش زمین کے سلسلے میں وہ بے شمار معلومات رکھتے تھے۔ راجہ ٹوڈرمل بھی اس علم کا ماہر تھا۔ اکبر نے ٹوڈرمل کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ اس ضمن میں جو قدم اٹھانا چاہے' میر فتح اللہ شیرازی کے حکم سے اٹھائے۔ میر فتح اللہ شیرازی نے ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء کو کشمیر سے اکبر کی واپسی کے زمانے میں ماندو جان کے مقام پر وفات پائی اور کوہ سلیمان میں مدفون ہوئے۔

۲۔ شیخ سعداللہ لاہوری: یہ عہد اکبری کے مستند اور نامور علما میں سے تھے۔ ایک عرصے تک لاہور میں مسند تدریس پر متمکن رہے۔ انھیں تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔

۳۔ قاضی صدرالدین جالندھری لاہوری: یہ مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کے شاگرد تھے۔ تبحر اور فاضل بزرگ تھے۔ عہد اکبری میں لاہور کے منصب قضا پر بھی متعین رہے۔ بعد میں صوبہ گجرات کے علاقہ بھڑوچ کے قاضی مقرر ہوئے۔ انھوں نے ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کو وفات پائی۔

۴۔ شیخ اسحاق بن کاکو: یہ بھی مفتی عبدالسلام لاہوری کے اساتذہ میں سے تھے۔ جامع جمیع علوم' متوکل علی اللہ' متورع اور صوفی بزرگ تھے۔ ہمیشہ مشغول عبادت رہتے [1]۔

## مسند تدریس اور تلامذہ:

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مفتی عبدالسلام لاہوری نے لاہور میں مسند تدریس آراستہ کی اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ اپنے عہد میں وہ بے نظیر مدرس اور عدیم المثال عالم تھے۔ انھوں نے تقریباً ساٹھ سال تک علوم و فنون کی تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور بہت سے تشنگان علوم نے ان سے اپنی علمی تشنگی بجھانے کا سامان فراہم کیا۔ کچھ عرصہ افواج شاہی میں مفتی کے فرائض بھی انجام دیے۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا تھا۔ برصغیر پاک و ہند سے باہر بھی اہل علم میں ان کی علمی شہرت پہنچ چکی تھی اور وہ ان سے بہت متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ مشہور ماہر معقولات قاضی محمد اسلم ہروی کے بھتیجے میرک شاہ خراسان سے ہندوستان آئے تو لاہور میں مفتی عبدالسلام کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور کتب متداولہ کا اعادہ کیا۔ مفتی ممدوح کے فیوض علمی سے بہرہ اندوز ہوئے اور سند فراغت حاصل کرنے کے بعد سلطنت مغلیہ کے اہم مناصب پر فائز ہوئے' بالآخر منازل ترقی طے کرتے ہوئے عہد اورنگ زیب میں صدر کل یا صدر الصدور کے منصب بلند پر پہنچے۔ شیخ میرک ہروی نے ۱۰۷۱ھ/ ۱۶۶۱ء کو وفات پائی۔

شیخ محبّ اللہ بہاری بھی مفتی عبدالسلام لاہوری کے فیض یافتگان میں سے تھے۔ شیخ محب اللہ بہاری

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۳' ص ۱۵۱۔

برصغیر کے اصحاب تصوف میں منفرد حیثیت کے حامل تھے اور اس ضمن میں بعض ممتاز افکار کے مالک ____! انھوں نے ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

شاہ جہان کے وزیر اور معروف عالم علامی سعد اللہ تمیمی چنیوٹی بھی ان کے تلمیذ تھے۔

قاضی عبدالسلام دیوی بھی مفتی عبدالسلام کے شاگرد تھے۔ یہ مضافات لکھنو کے ایک مقام دیوہ سے حصول علم کے لیے لاہور آئے تھے۔ جلیل القدر عالم دین تھے۔ معقولات و منقولات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ طویل عرصے تک مفتی ممدوح کے حلقۂ درس میں شریک رہے اور ان سے مستفید ہوئے۔ شاہ جہانی دور میں افواج شاہی کے مفتی مقرر ہوئے۔ لیکن استاد کی طرح بالآخر لاہور میں درس و تدریس کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا اور تا حین حیات یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔

شیخ محمد میر عمری سیوستانی بھی مفتی عبدالسلام کے تلامذہ میں سے تھے۔ وہ ۹۵۷ھ/ ۱۵۵۰ء کو سیوستان میں پیدا ہوئے اور اپنے مرشد شیخ خضر سیوستانی کے حکم سے لاہور آئے اور مفتی عبدالسلام کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ جس زمانے میں شیخ محبّ اللہ بہاری لاہور آکر مفتی عبدالسلام کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے' اس زمانے میں علامی سعد اللہ چنیوٹی اور شیخ محمد میر بھی مفتی ممدوح سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یہ لاہور کے مشہور بزرگ ہیں جو میاں میر کے نام سے معروف ہیں۔ ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء کو لاہور میں فوت ہوئے۔

مفتی ممدوح کے ایک لڑکے بھی تھے جن کا نام شیخ محمد مراد تھا۔ یہ بھی صاحب فضل اور ذی علم بزرگ تھے۔ عالم شاہ کے عہد تک زندہ تھے۔ جب شاہ عالم بادشاہ نے خطبہ جمعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ ''وصی'' کے لفظ کا اضافہ کرنے کا حکم دیا تو شیخ محمد مراد ان علما میں سے تھے' جنھوں نے اس حکم پر عمل کرنے سے صاف الفاظ میں انکار کر دیا تھا اور بادشاہ سے کہا تھا کہ اس کا یہ فرمان غلط اور نا قابل تسلیم ہے۔ اس کی پاداش میں بادشاہ نے ان کو قید کر دیا تھا۔

## حاشیہ بیضاوی:

مفتی عبدالسلام لاہوری عمر بھر درس و تدریس میں مشغول رہے' تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہیں کی۔ آخر عمر میں بیضاوی پر حاشیہ تحریر کیا۔ بختاور خاں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

درآخر عمر کہ پسر خود را بیضاوی درس می گفت و حاشیہ بر بیضاوی نوشت می فرمود' سخنان بسیار بر کتب متداولہ داشتم و بر اہل فضل عرض کردہ بودم' و در معرض قبول افتادہ بود' لیکن از کثرت درس فرصت نیافتم کہ در قید تحریر در آورم ❶۔

---

❶ مرآة العالم۔ ص ۵۳۵۔

(عمر کے آخری دور میں جب اپنے بیٹے کو بیضاوی پڑھاتے تھے اور بیضاوی پر حاشیہ تحریر فرما رہے تھے، فرمایا کرتے کہ میں نے کتب متداولہ پر بہت سی باتیں اپنی یادگار چھوڑی اور اہل علم کے سامنے پیش کی ہیں اور انھیں بارگاہ اصحاب فضل میں شرف قبولیت عطا ہوا ہے، مگر کثرتِ درس کے ہنگاموں سے فرصت نہ ملنے کی وجہ سے میں انھیں ضبط تحریر میں نہیں لا سکا۔)

لیکن عمر کے آخری دور میں جب حواس مختل ہو گئے اور قوت حافظہ ختم ہو گئی تو اس پر اظہار افسوس کرتے تھے کہ کیوں اپنے افکار علمی کو معرض کتابت میں نہ لائے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان کا یہ تاثر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔:

الحال کہ ضعف قویٰ مستولی گشت وقوت حافظہ رو بہ انحطاط آورد، ہمہ از خاطر برآمد۔ برفقدان ایں صور ذہنی تاسف می نمود ❶۔

(اب جب کہ قوائے جسمانی پر کمزوری غالب آ گئی ہے اور قوت حافظہ انحطاط پذیر ہو گئی ہے، تمام چیزیں ذہن سے نکل گئی ہیں۔ اس ذخیرۂ علم کے ذہن سے نکل جانے پر انھیں سخت افسوس ہوتا ہے۔)

مفتی عبدالسلام چونکہ ہمہ وقت درس وافادہ میں مصروف رہتے تھے، اس لیے تصنیف وتالیف کی طرف عنان توجہ مبذول نہ کر سکے۔ ان کی تصانیف میں ایک تفسیر بیضاوی کے حاشیہ کا پتا چلتا ہے، جو انھوں نے آخر عمر میں اپنے بیٹے محمد مراد کی تعلیم کے زمانے میں لکھا تھا۔

## کیا نافع المسلمین انھی کی تصنیف ہے؟

اس کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی میں فارسی زبان میں مسائل فقہ پر مشتمل ایک کتاب موجود ہے، جس کا نام ''نافع المسلمین'' ہے۔ اس کے دیباچے میں مصنف کتاب نے اپنا نام عبدالسلام بن عبدالعزیز لاہوری لکھا ہے۔ اپنے موضوع کی یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ اس میں مختلف فقہی مسائل کے اس انداز میں جواب دیے ہیں جس انداز میں ایک مفتی دیتا ہے۔ عربی میں بھی کثرت سے بعض باتیں بیان کی گئی ہیں۔ غیر فقہی مسائل و معارف کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ اس میں مندرج ہے۔ اس کتاب کا ایک مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں بھی موجود ہے ❷۔

ایشیاٹک سوسائٹی کے مرتبِ فہرست نے اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ ''نافع المسلمین'' انھی مفتی عبدالسلام لاہوری کی تصنیف ہے، اور عبدالسلام بن عبدالعزیز لاہوری سے یہی مراد ہیں۔ قیاس یہی چاہتا ہے کہ یہ انھی کی تصنیف ہو گی۔

❶ مآثر الکرام دفتر اول، ص ۲۲۶۔

❷ فہرست مخطوطات شیرانی۔ ج ۳، ص ۳۰۶۔

تذکرہ نویسوں نے مفتی عبدالسلام لاہوری کی بے حد تعریف کی ہے اور ان کے علم وفضل کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ نظام الدین ہروی ان کا ذکر ''فحول علمائے لاہور'' کے الفاظ سے کرتا ہے۔ ❶ شاہ نواز نے انھیں مستند فاضل اور بلند مرتبت فقیہ قرار دیا ہے۔ ❷ بختاور خاں' ان کو ''از فضلائے متبحرین بود'' کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ ❸ عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے:

حاوی معقول ومنقول ملا عبدالسلام لاہوری مفتی کہ فنون ادبیہ وفقہ واصول فقہ رانیکو دانستی ❹۔''

(مفتی عبدالسلام لاہوری فنون ادبیہ' فقہ اور اصول فقہ میں خوب مہارت رکھتے تھے اور معقول ومنقول پر حاوی تھے۔)

صالح محمد کنبوان کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

جامع المعقول والمنقول ملا عبدالسلام لاہوری کہ در فنون تفسیر وفقہ ثانی ونظیر نداشت ❺۔

(معقول ومنقول کے جامع ملا عبدالسلام لاہوری جن کا علوم تفسیر وفقہ میں کوئی ثانی اور نظیر نہ تھا۔)

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی رقم طراز ہیں:

الشیخ الفاضل العلامة المفتی عبدالسلام الحنفی اللاهوری احد کبار العلماء، لم یکن له نظیر فی عصره فی کثرة الدرس والافادة❻۔

(شیخ' فاضل' علامہ' مفتی عبدالسلام حنفی لاہوری' کبار علما میں سے تھے۔ اپنے عصر میں کثرتِ درس وافادہ میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔)

مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

ملا عبدالسلام لاہوری' شاگرد میر فتح اللہ شیرازی فقیہ ومفسر بود ❼۔

(ملا عبدالسلام لاہوری' جو میر فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے' اپنے عہد کے مفسر اور فقیہ تھے۔)

مولوی فقیر محمد جہلمی ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

ملا عبدالسلام لاہوری' عالم اجل' فاضل اکمل' فقیہ جید' مفسر متقن بود ❽۔

---

❶ طبقات اکبری۔ ج ۲' ص ۴۶۹۔

❷ مآثر الامرا۔ ج ۳' ص ۵۱۸۔

❸ مرآۃ العالم۔ ص ۵۳۵۔

❹ بادشاہ نامہ۔ ج ۱' ص ۳۴۲۔

❺ شاہ جہان نامہ۔ ج ۳' ص ۳۸۳۔

❻ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۲۳۔

❼ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۲۰۔

❽ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۰۶۔

(ملا عبدالسلام لاہوری، عالم اجل، فاضل اکمل، فقیہ جید، مفسر متقن تھے۔)

لاہور کے اس جلیل القدر عالم دین اور مفسر وفقیہ نے کم وبیش ساٹھ سال تک لاہور میں غلغلۂ تدریس بلند کیے رکھا اور اس طویل عہد میں بے شمار ہندی وغیر ہندی علمانے ان سے استفادہ کیا۔ ان کی وفات ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء کو ہوئی اور نوے (۹۰) برس عمر پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

## ۱۷- قاضی عبدالسلام برہان پوری

قاضی عبدالسلام سندھی برہان پوری، ارض سندھ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائی۔ بعض کتب درسیہ شیخ عباس بن جلال سندھی سے پڑھیں، باقی درسی کتابوں کی تکمیل حکیم عثمان بن عیسیٰ بوبکانی برہان پوری سے کی۔ شیخ وقت اور فاضل کبیر تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ برہان پور کے حکمران عادل شاہ نے ان کے فضل وکمال سے متاثر ہو کر انھیں برہان پور شہر کے منصب قضا پر مامور کر دیا تھا۔ عہدۂ قضا کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ علم فقہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ مختصر الوقایہ کی شرح سپرد قلم کی، جو روایات فقہی کی جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے ❶۔

## ۱۸- شیخ عبدالشکور جون پوری

شیخ عبدالشکور جون پوری، عالم صالح اور اپنے دور کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ شیخ مبارک بن خیر الدین جون پوری کی اولاد سے تھے۔ شیخ نور اللہ جون پوری کے بعض تلامذہ سے علم حاصل کیا، پھر شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے کسب طریقت کیا۔ شیخ عبدالشکور جون پوری ہمیشہ مسند درس وافادہ پر متمکن رہے۔ بہت سے علمانے ان سے استفادہ کیا۔ تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ مختصر الوقایہ کی شرح سپرد قلم کی، جس میں مسئلہ عشر بالعشر (دہ دردہ) بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم دین نے ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۲ھ/ یکم جنوری ۱۶۶۲ء کو وفات پائی ❷۔

## ۱۹- شیخ عبدالشکور منیری

شیخ عبدالشکور منیری بہاری، علاقہ بہار کے شہر منیر میں پیدا ہوئے اور عرصے تک اپنے شہر کے اہل علم سے علم حاصل کرتے رہے۔ پھر عازم جون پور ہوئے جو اس زمانے میں دیار ہند میں علم وفضل کا عظیم مرکز تھا، وہاں شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری اور دیگر علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے اور کتب متداولہ کی تحصیل کی۔ پھر

❶ افکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار- ص ۳۰۶ و ۴۴۵- نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۲۵-

❷ تاریخ شیراز ہند جون پور- ص ۱۸۷- تجلی نور ج ۲، ص ۵۴- نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۲۶-

شیخ محمد رشید عثمانی سے اخذ طریقت کیا اور طویل عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں رہے، یہاں تک کہ دعوت و ارشاد کے مرتبہ بلند پر فائز ہوئے۔ شیخ ممدوح نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور انھیں سند خلافت با قاعدہ لکھ کر عطا کی۔ بعد ازاں اپنے شہر منیر چلے گئے اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔

شیخ عبدالشکور منیری بہاری، عالم و فقیہ، زاہد و قانع اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ کبھی اصحاب دولت کے دروازے پر دستک نہیں دی اور دنیا اور ارباب دنیا کی طرف کبھی دھیان نہیں کیا۔ برصغیر کے اس نامور عالم و فقیہ نے شروع جمادی الاخری ۱۰۹۵ھ/اپریل ۱۶۸۴ء کو منیر میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے [1]۔

## ۲۰۔ قاضی عبدالشکور لاہوری

قاضی عبدالشکور لاہوری، فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں یگانہ روزگار تھے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد کے علما میں سے تھے۔ عبادت گزار اور متقی عالم دین تھے۔ علما و صوفیا کی بڑی تکریم کرتے اور ان سے عقیدت سے پیش آتے۔ زیادہ وقت تلاوت قرآن، نوافل و عبادت اور اوراد و وظائف میں صرف کرتے۔ متین اور حلیم الطبع تھے۔ مستحقین اور یتامیٰ و مساکین کا بہت خیال رکھتے اور جو آمدنی ہوتی، ان پر خرچ کر دیتے۔ معاملہ فہم اور خوش اخلاق تھے۔ اکبر بادشاہ کی طرف سے علما پر ابتلا و آزمائش کا وقت آیا اور ان پر سختیاں ہونے لگیں تو بادشاہ نے بہت سے علما کو جو ملازمت شاہی میں داخل تھے، دور دراز مقامات میں منتقل کر دیا تھا، تاکہ ان کے اثر و رسوخ کے دائرے یا تو بالکل ختم ہو جائیں یا بہت ہی کم رہ جائیں، ان علما میں قاضی عبدالشکور کا نام بھی شامل ہے۔ بادشاہ نے ان کو جون پور کا قاضی مقرر کر کے بھیج دیا تھا۔ طویل عرصے تک یہ اس عہدہ پر فائز رہے۔ پھر جب بادشاہ، الہ آباد کے دورے پر گیا تو قاضی عبدالشکور بادشاہ کی خدمت میں آئے۔ اس نے ان کو اس عہدۂ قضا سے معزول کر کے ان کی جگہ قاضی زادہ رومی کو مقرر کر دیا، جو ایک بلند مرتبہ عالم دین تھے۔ اس منصب سے علیحدگی کے بعد قاضی عبدالشکور لاہوری نے ہر طرف سے منقطع ہو کر افادۂ عام کو اپنا مستقل مشغلہ قرار دے لیا اور ساری توجہ علما و طلبا کی تعلیم و تعلم پر مرکوز کر دی۔ نہایت قانع بزرگ تھے اور بہت قلیل آمدنی پر گزر بسر کرتے تھے، درس و تدریس میں انتہائی قلبی اطمینان محسوس فرماتے تھے [2]۔

## ۲۱۔ قاضی عبدالعزیز نصیر آبادی

قاضی عبدالعزیز بن فتح عالم بن محمد بن محمود شریف حسنی نصیر آبادی، امیر کبیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد بن احمد مدنی کردی کی اولاد سے تھے۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے جو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر رائے بریلی

---

[1] نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۲۶ بحوالہ گنج ارشدی۔

[2] منتخب التواریخ ج ۳، ص ۱۰۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۲۶۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۶۹

کے مضافات میں واقع ہے۔ وہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں، یہاں تک کہ فتوی و تدریس کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہو گئے۔ قابلیت کا یہ عالم تھا کہ شاہ جہان کے عہد میں اپنے بڑے بھائی ابو محمد بن محمد بن محمود نصیر آبادی کی نیابت کرتے ہوئے ان کی جگہ نصیر آباد کے منصب قضا پر متعین ہوئے۔ اپنے علاقے کے مشہور شیخ و عالم اور فقیہ تھے ❶۔

## ۲۲- شیخ عبدالعزیز الہ آبادی

شیخ عبدالعزیز الہ آبادی، فقیہ اور صالح عالم دین تھے۔ شیخ محبّ اللہ عمری کے خالہ زاد بھائی تھے۔ شیخ محبّ اللہ سے علم ظاہری اور تصوف و طریقت کی تحصیل کی، طویل عرصہ ان کی خدمت میں گزارا اور بہت استفادہ کیا۔ بعد ازاں الہ آباد سے عازم دہلی ہوئے اور وہاں شیخ باقی باللہ کے صاحب زادۂ گرامی شیخ عبداللہ سے ملاقات کی۔ دہلی ہی میں اسراریہ کے مصنف کمال محمد سنبھلی ان سے ملاقی ہوئے ❷۔

## ۲۳- شیخ عبدالغفور اجینی

شیخ عبدالغفور بن داؤد اجینی، فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں سے تھے۔ اجین کے باشندے تھے۔ اپنے عم بزرگ وار شیخ راجی محمد اجینی سے حصول علم کیا اور کافی عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ اخذ طریقت بھی انہی سے کیا۔ قرآن مجید سے قلبی لگاؤ تھا، چنانچہ پہلے قرآن حفظ کیا اور پھر اس کے مشکلات و غوامض کے حل و کشود میں مصروف ہو گئے۔ ہر سال رمضان المبارک میں قرآن مجید اپنے ہاتھ سے لکھ کر کسی قرآن خواں درویش کو دیا کرتے تھے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا سفر بھی کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ ارض حجاز سے واپس ہندوستان آئے تو اس پر نہایت افسوس کا اظہار کرتے اور دل میں واپس حجاز جانے کی شدید آرزو رکھتے تھے۔ ہر صورت اور ہر حال میں لوگوں کے کام کاج اور ان کی سفارشات اور انھیں فائدہ پہنچانے کے لیے ساعی رہتے۔ نرم دل، حلیم الطبع اور بے حد متقی عالم دین تھے۔ ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۷ء کو شہر اجین میں فوت ہوئے ❸۔

## ۲۴- قاضی عبدالغنی خاندیسی

قاضی عبدالغنی خاندیسی، فقہ و اصول اور قرأت و تجوید کے جید علما میں سے تھے۔ صوبہ خاندیس کے

❶ نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۲۸-

❷ نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۲۹- بحوالہ اسراریہ

❸ اذکار ابرار- ص ۴۱۲، ۴۱۳- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۳۰-

منصب قاضی القضاۃ پر فائز تھے۔ عالم جوانی ہی میں درس وافادہ میں مصروف ہو گئے تھے اور عرصہ دراز تک یہ اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ جب جوانی رخصت ہوگئی اور دور پیری میں داخل ہوئے تو صحیح بخاری کی شروح اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف کے مطالعہ کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ اس ہندی عالم وفقیہ نے ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۱ء کو برہان پور میں وفات پائی ❶۔

## ۲۵- شیخ عبدالفتاح چریاکوٹی

شیخ عبدالفتاح بن مبارک عباسی چریاکوٹی ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء کو چریاکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے عصر کے مشاہیر اساتذہ سے اخذ علم کیا اور اس درجہ شہرت وناموری حاصل کی کہ اس دور کے مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے گردانے گئے۔ "میراث نامہ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو فارسی نظم میں ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

خدا را شکر کز تحریر نامہ      مہذب گشت ایں میراث نامہ

اس عالم دین نے ربیع الاول ۱۰۵۷ھ/اپریل ۱۶۴۷ء کو وفات پائی ❷۔

## ۲۶- قاضی عبدالقادر پانی پتی

قاضی عبدالقادر پانی پتی ثم اجینی' پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی' قاضی محمود پانی پتی کے بیٹے تھے۔ شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی سے اخذ علم کیا۔ تصوف سے دلچسپی ہوئی تو شاہ عبدالرزاق کی خدمت میں گئے اور ان سے کسب فیض کیا۔ ان کے مرید وخلیفہ ہوئے اور متصوفین فقہا میں شمار کیے گئے۔ عالم شباب میں عازم حج ہوئے اور تین مرتبہ اس مبارک سفر پر گئے۔ ان کے سفر حج کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اثنائے سفر میں متعدد مدارس اور مراکز علم میں پہنچے اور بہت سے لوگوں سے ملاقات کی' جنگلوں اور دریاؤں کو عبور کیا مگر کسی سے کسی قسم کی نہ مدد لی' نہ روپے پیسے کی اعانت طلب کی۔ حج کے بعد اجین (مالوہ) میں سکونت اختیار کر لی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ بالآخر عزیزوں اور دوستوں کے اصرار پر مالوہ کے شہر سارنگ پور میں مقیم ہوگئے۔ سارنگ پور میں ان کے چچا منصب قضا پر فائز تھے۔ چچا کی وفات کے بعد ان کو وہاں عہدۂ قضا قبول کرنے کو کہا گیا۔ یہ عہدہ قبول تو کر لیا مگر بعد کو اس سے دست بردار ہو کر وہاں سے چلے گئے اور کسی دور دراز علاقے میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے دوستوں نے تعاقب کیا۔ واپس لائے اور دس سال بعد پھر منصب قضا پر فائز کر دیا۔

---

❶ اذکار ابرار-ص ۴۵۱-نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۳۰۔

❷ نزہۃ الخواطر-ج ۵' ص ۲۳۲۔

غرض قاضی عبدالقادر پانی پتی عابد و زاہد اور دنیا سے بے زار قسم کے عالم دین تھے۔ دنیا کی ظاہری شان و شکوہ سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہمہ وقت ذکر الٰہی اور یاد خدا میں مصروف رہتے۔ فصیح البیان تھے۔ عربی اور فارسی کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے، جنھیں تقریر و تحریر میں برمحل اور مناسب مواقع پر پڑھتے اور لکھتے۔ صوفیا کی عبارتیں بھی خوب یاد تھیں۔

قاضی ممدوح بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ علم تفسیر پر نظر رکھتے تھے۔ آیات متشابہات کی تاویلات ناسخ و منسوخ، آیات قرآن کے نزول کی تقدیم و تاخیر، مشکلات قرآنیہ کے حل و کشود، مجملات کے بیان، اعراب کی تخصیص و تعمیم اور شان نزول، قرآن کے استعارات اور حقیقت و مجاز کے عالم تھے۔ ہر جمعے کو شہر کی جامع مسجد میں تفسیر قرآن بیان فرمایا کرتے، جس میں مفسرین کے اقوال و آرا کے خوب حوالے دیتے۔ وفات کے دن بھی حسب معلوم مقررہ وقت پر سورہ مزمل کی تفسیر بیان کی۔ بعد ازاں بدن میں ایک لرزہ پیدا ہوا۔ کچھ وصیت کی اور دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ ۱۰۱۱ھ/۱۶۰۲ء کو اجین میں انتقال کیا اور مورخین نے ''قاضی زندہ دل'' کے الفاظ سے تاریخ وفات نکالی ❶۔

## ۲۷- قاضی عبدالقادر لکھنوی

قاضی عبدالقادر لکھنوی فاضل وقت اور علامہ عصر تھے۔ شیخ سلطان بن اللہ داد کی اولاد سے تھے۔ ان کے آباو اجداد میں مولانا قطب الدین محدث بن مولانا خضر محدث ایسے برگزیدہ علما و فضلا کے اسمائے گرامی تذکروں میں مرقوم ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء کو لکھنؤ میں اور ایک روایت کے مطابق کسمنڈی میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں اعمال لکھنؤ میں ایک قریہ تھا۔ عبادت گزار اور متقی بزرگ تھے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو قرآن مجید حفظ کیا اور مزید حصول علم کے لیے لاہور روانہ ہوئے۔ لاہور کو اس عہد میں مرکز علم و فضل کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں مختلف علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے اور درجہ ممتاز پر فائز ہوئے۔

قاضی عبدالقادر لکھنوی مستغنی المزاج عالم تھے۔ دنیا اور اس کے مال و اسباب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جو آمدنی ہوتی غربا و مستحقین میں بانٹ دیتے۔ ان کا معمول تھا کہ عشا کی نماز کے بعد جب تک لوگ جاگتے یہ سوتے رہتے اور جب لوگ سو جاتے تو جاگ اٹھتے۔ پھر صبح تک نماز اور وظائف و اوراد میں مشغول رہتے۔ نماز چاشت کے بعد طلبا کو درس دیتے۔ اس ہندی عالم دین نے چالیس سال تک مسند درس و افادہ آراستہ کیے رکھی اور ان کی کوشش سے اللہ نے بے شمار علما و طلبا کو دولت علم سے بہرہ ور کیا۔ ان کی وفات ۲۷ شعبان ۱۰۷۶ھ/۲۲ فروری ۱۶۶۶ء کو لکھنؤ میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ کل بیاسی سال عمر پائی ❷۔

❶ اذکار ابرار ص ۶۶۱، ۶۶۲-نزہۃ الخواطر-ج ۵، ص ۲۳۶، ۲۳۷-

❷ تذکرۂ علمائے ہند-ص ۱۲۸-نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۳۴-

# ۲۸- شیخ عبدالقادر حضرمی

شیخ عبدالقادر بن شیخ عبداللہ عیدروس حضرموتی ہندی ۲۰ ربیع الاول ۹۷۸ھ/۲۲/اگست ۱۵۷۰ء کو ہندوستان کے مشہور شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے اور ملک کے جید علما وفضلا سے تعلیم حاصل کی۔ شافعی المسلک فقیہ تھے اور اپنے دور کے نامور فاضل تھے۔ تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے۔ ان کی تصانیف میں بڑی عمدہ اور قابل قدر کتابیں شامل ہیں۔ النور السافر فی اخبار القرن العاشر بھی انہی کی تصنیف ہے جو عربی زبان میں تاریخ و رجال کی بہترین کتاب ہے اور کتب حوالہ میں سے ہے۔ اس کے حوالے ''فقہائے ہند'' کی کئی جلدوں میں متعدد مقامات میں دیے گئے ہیں اور معزز قارئین کے مطالعہ میں آچکے ہیں۔ ان کی تصانیف میں درج ذیل کتابوں کے نام تذکروں میں مرقوم ہیں:

(۱) الفتوحات القدسیه فی الخرقة العید روسیه۔ (۲) الحدائق الخضرة فی سیرة النبی و اصحابة العشره (۳) المنتخب المصطفی فی اخبار مولد المصطفی (۴) الدر الثمین فی بیان المهم من الدین۔ (۵) اتحاف الحضرة العزیزة بعیون السیرة الوجیزة۔ (٦) المنهاج الی معرفة المعراج۔ (۷) الانموذج اللطیف فی اهل بدر الشریف (۸) اسباب النجاة والنجاح فی اذکار المساء والصباح (۹) الحواشی الرشیقه علی العروة الوثیقه۔ (۱۰) منح الباری بختم البخاری۔ (۱۱) تعریف الاحیاء لفضائل الانبیاء۔ (۱۲) عقد اللآل بفضائل الآل (۱۳) بغیة المستفید بشرح تحفة المرید۔ (۱٤) النفحة العنبریه فی شرح بتین العدنیة (۱۵) غایة القرب فی شرح نهایة الطلب (۱٦) اتحاف اخوان الصفاء بشرح تحفة الظرفاء (۱۷) صدق الوفاء بحق الافاء (۱۸) النور السافر فی اخبار القرن العاشر۔ (۱۹) الزهر الباسم من روض الاستاذ حاتم (۲۰) قرة العین فی مناقب الولی عمر بن محمد باحسین۔ (۲۱) الروض الاریض والفیض المستفیض (یہ ان کے اشعار کا مجموعہ ہے۔)

شیخ عبدالقادر حضرمی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ تصوف وطریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ بہترین شاعر بھی تھے۔

اس عالم دین اور عظیم مصنف نے ۱۰۳۸ھ/۱۶۲۹ء کو احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے [1]۔

[1] تذکرہ علمائے ہند- ص ۱۲۹- حدائق الحنفیہ- ص ۴۰۶- نزہۃ الخواطر- ج ۵ ص ۲۳۵، ۲۳۶- خلاصۃ الاثر- ج ۲، ص ۴۴۰-

# ۲۹- شیخ عبدالقادر اوچی

شیخ عبدالقادر پنجاب کے شہر اچ کے باشندے اور شیخ حامد قادری اچی کے صاحب زادے تھے۔

والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی شیخ موسیٰ سے سجادہ نشینی کے مسئلے پر جھگڑا ہو گیا تھا جو کئی سال چلتا رہا۔ بالآخر مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے پاس فتح پور سیکری چلے گئے تھے۔ بڑے عالم اور متقی بزرگ تھے۔ دعوت وارشاد ان کا اصل موضوع تھا۔ اکبر کے مذہبی خیالات میں تبدیلی آئی تو اس سے دور ہٹ گئے۔ اکبر بھی ان سے خوش نہ رہتا تھا۔ ایک رات بادشاہ نے شیخ سے کوکنار (پوست) پینے کو کہا۔ شیخ نے سخت لفظوں میں انکار کر دیا' اس سے بادشاہ کا مزاج اور بھی مکدر ہو گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ رنج بادشاہ کو اس سے ہوا کہ ایک مرتبہ شیخ موصوف نے فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں نماز باجماعت سے فارغ ہو کر نفل پڑھنا شروع کر دیے۔ بادشاہ نے کہا:

شیخ نماز نفل در خانہ بگزارید۔

(شیخ نفل نماز گھر جا کر ادا کرو۔)

شیخ نہایت جرأت سے بولے:

پادشاہم! ایں ملک شما نیست کہ بحکم شما باشد۔

(بادشاہ! یہ جگہ تیری ملکیت نہیں ہے کہ تیرا حکم چلے۔ تم اس کے مالک نہیں' بادشاہ ہو۔)

اکبر کو ان الفاظ سے بڑی تکلیف پہنچی اور کہا "یہ شیخ کس قدر جاہل ہے۔" پھر حکم صادر ہوا:

چوں ملک از ما نمی خواہی در ملک ما ہم مباش۔

(اگر تم ہماری ملکیت نہیں مانتے تو ہمارے ملک میں نہ رہو۔)

شیخ اسی وقت اٹھے اور بادشاہ کی امداد واعانت کو ترک کر کے اپنے شہر اچ واپس چلے گئے۔ بھائی سے جھگڑا ختم کیا اور دعوت وارشاد میں مشغول ہو گئے۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ شیخ عبدالقادر کے ایک بھائی شیخ موسیٰ (جن سے سجادہ نشینی کے بارے میں تنازع پیدا ہو گیا تھا) پہلے ہی زہد وعبادت اور مجاہدہ ومشیخت کی زندگی ترک کر کے اکبر کے دربار میں پہنچ گئے تھے اور اس سے تعلق پیدا کر کے سپاہ گری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ فوج میں ملازم ہو گئے تھے اور پانچ صدی امیروں کی صف میں چلے گئے تھے۔ اکبر کے افکار دینی میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی تاہم شیخ موسیٰ کا یہ حال تھا کہ دربار میں اگر نماز کا وقت آ جاتا تو عین دیوان خانہ خاص وعام میں بادشاہ کی موجودگی میں خود اذان کہہ کر باجماعت نماز ادا کرتے اور کسی کو انھیں ٹوکنے یا کچھ کہنے کی جرات نہ ہوتی ____ بعد میں شیخ موسیٰ کو بادشاہ کی طرف سے ملتان میں جاگیر مل گئی تھی اور وہ وہیں منتقل ہو گئے تھے ❶۔

❶ منتخب التواریخ - ج ۳' ص ۹۱ تا ۹۳ - نزہۃ الخواطر - ج ۵' ص ۲۳۳ -

## ۳۰- شیخ عبدالقادر لاہوری

شیخ عبدالقادر بن محمد بن زین العابدین لاہوری بھی درحقیقت اوچ کے باشندے تھے۔ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام شیخ اللہ بخش تھا۔ دونوں بھائی عالم باعمل، پرہیز گار اور باکمال بزرگ تھے۔ دونوں اکبر کے دربار سے منسلک تھے۔ اکبر نے نیا مذہب ایجاد کیا تو ان کا شمار اس کے مخالفوں میں ہونے لگا۔ بادشاہ نے شیخ اللہ بخش کو صدر کا عہدہ تفویض کر کے گجرات بھیج دیا۔ انھوں نے وہاں بڑی خدمات انجام دیں۔ بادشاہ نے ان کے لیے تین صدی کے منصب کا فرمان جاری کیا، مگر اس اثنا میں وہ گجرات ہی میں وفات پا گئے۔ رہے شیخ عبدالقادر تو ان کو بادشاہ نے مکہ معظّمہ چلے جانے کا حکم دیا۔ ارض حجاز کا سفر ان دنوں بادشاہ کی طرف سے جلا وطنی کا حکم رکھتا تھا۔ ان دنوں گجرات کے نظم ونسق پر میرزا نظام الدین احمد اور خان خاناں بیرم خاں متعین تھے۔ شیخ عبدالقادر سفر حجاز کے سلسلے میں وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے سامان سفر اور زادراہ تیار کیا۔ شیخ حج وزیارت سے فیض یاب ہو کر واپس آئے تو لاہور میں مقیم ہو گئے اور زہد وافادہ کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء کو لاہور میں وفات پائی [1]۔

## ۳۱- علامہ عبدالقادر اجینی

علامہ عبدالقادر اجینی کا مولد بغداد تھا۔ والد کی وفات کے بعد چچا کی نگرانی میں چلے گئے۔ بغداد سے وارد ہند ہوئے۔ پہلے بندرگاہ گوا میں اترے، بعد میں گجرات کا عزم کیا۔ منطق وفلسفہ اور دیگر علوم مروجہ میں مہارت رکھتے تھے۔ ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں جلال الدین اکبر سے تعلق پیدا ہوا۔ بعض کتابوں پر تعلیقات وحواشی لکھے۔ ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء کو اجین میں فوت ہوئے [2]۔

## ۳۲- ملا عبدالقادر بدایونی

ملا عبدالقادر بدایونی، شیخ ملوک شاہ عمری بدایونی کے بیٹے تھے۔ شیخ ملوک شاہ کا شمار اپنے علاقے کے صالح علمائے دین میں ہوتا تھا۔ شیخ وقت مولانا حاتم سنبھلی (متوفی ۹۶۹ھ/۱۵۶۲ء) کے شاگرد تھے۔ ان سے کچھ کتابیں پڑھیں، لیکن تکمیل شیخ جلال الدین بدایونی سے کی۔ اخذ طریقت مولانا عبداللہ بدایونی سامانوی سے کیا۔ شیخ ممدوح نے ۲۷؍رجب ۹۶۹ھ/۲؍اپریل ۱۵۶۲ء کو بعارضہ اسہال آگرہ میں وفات پائی اور میت کو بساور میں لے جا کر دفن کیا گیا۔ ملا عبدالقادر نے ''جہان فضل'' تاریخ وفات نکالی۔

---

1. منتخب التواریخ- ج ۳، ص ۱۰۱
2. ؟؟ کار ابرار- ص ۵۴۸- نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۲۳۲، ۲۳۳-

معلوم ہوتا ہے‘ شیخ ملوک شاہ اچھے عالم تھے اور ان کا کتب خانہ بھی تھا۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے جو عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ جس زمانے میں وہ حصول علم کے لیے سنبھل میں مقیم تھے‘ ہیموں بقال (ہیموں بنیا) نے سر اٹھایا اور اس کا لشکر لوٹ مار کرتا ہوا بساور پہنچا۔ اس کے ظلم وتشدد سے تمام بساور لٹ کر برباد ہو گیا۔ بدایونی افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اس لوٹ مار میں والد کا کتب خانہ بھی لٹ گیا۔ اس سے دوسرے برس قحط کی مصیبت آئی۔ اس میں مخلوق خدا کی بدحالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ ہزاروں آدمی بھوک سے مر گئے۔ آدمی کو آدمی کھاتا تھا۔

شیخ ملوک شاہ کے بیٹے ملا عبدالقادر بدایونی اپنے عہد کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ دور اکبری کے مشاہیر اور نامور علما میں سے تھے۔ تاریخ و رجال‘ شعر و انشا اور فنون حکمیہ کے ماہر تھے۔ حدیث اور فقہ میں بھی دست رس رکھتے تھے۔ تاریخ میں یہ ملا عبدالقادر کے نام سے معروف ہیں اور لفظ ''ملا'' ان کے نام جز ہو گیا ہے۔ ''ملا'' اس دور میں ایک معزز لفظ تھا اور اس کا اطلاق بہت بڑے عالم اور فاضل شخص پر ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عبدالقادر بدایونی اس کے صحیح منطوق اور جائز حق دار تھے۔!

## بدایونی کی ولادت:

عبدالقادر بدایونی ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ/ ۲۱ / اگست ۱۵۴۰ء کو ہندوستان کی سابق ریاست جے پور (راجستان) کے قصبہ ٹوڈا میں شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے۔ اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں وہ شیر شاہ کے حسن انتظام اور عدل و انصاف کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ اس منصف مزاج بادشاہ کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اس ضمن میں بدایونی کے الفاظ یہ ہیں:

بحمداللہ کہ در زمان ایں چنیں ملکے کما قال النبی علیہ السلام انا ولدت فی زمان الملک العادل‘ تولد صاحب ایں منتخب در ہفدہم شہر ربیع الثانی در سنہ سبع واربعین وتسعمائۃ واقع شد ❶۔

(جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری ولادت عادل بادشاہ (نوشیرواں) کے عہد میں ہوئی۔ الحمدللہ کہ صاحب منتخب التواریخ بھی ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ کو اس بادشاہ عادل (شیر شاہ سوری) کے عہد میں پیدا ہوا۔)

بدایونی کی ابتدائی زندگی بساور میں گزری جو ٹوڈا سے شمال مشرقی جانب اٹھارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

عبدالقادر بدایونی فاروقی النسل تھے۔ ان کا خاندان مالی اعتبار سے تو آسودہ حال نہ تھا۔ البتہ دوھیال اور ننھیال دونوں صاحب علم اور دین دار گھرانے تھے اور اس نعمت خداوندی کے بے حد قدر دان تھے۔

❶ منتخب التواریخ۔ ج ۱‘ ص ۳۶۳۔

## حصول علم:

بدایونی نے سلیم شاہ سوری کے زمانے میں سنبھل جا کر سید محمد مکی سے قرآن مجید پڑھا۔ سید محمد مکی قرأتِ سبعہ کے قاری تھے۔ ان سے قرأت وغیرہ کی تکمیل کی اور خوش الحانی و تجوید سے قرآن پڑھنا سیکھا۔

بدایونی کے نانا کا نام مخدوم اشرف تھا۔ وہ عالم دین تھے اور عہد سلیم شاہ سوری میں ایک پنج ہزاری سردار فرید تارن کی فوج میں (جو علاقہ آگرہ میں بیانہ کے قریب بجواڑہ میں متعین تھا) ایک جنگی عہدے پر فائز تھے۔ ان کو اپنے نواسے (عبدالقادر) سے انتہائی محبت تھی۔ شفیق نانا نے کچھ عرصہ ذہین نواسے کو اپنے پاس رکھا اور صرف ونحو اور عربی علوم کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں۔

۹۶۱ھ/۱۵۵۴ء میں جب بدایونی بارہ تیرہ سال کی عمر کے تھے، والد مکرم (شیخ ملوک شاہ) انھیں مولانا حاتم سنبھلی کی خدمت میں سنبھل لے گئے۔ ان کے مدرسے اور خانقاہ میں انھوں نے قصیدہ بردہ یاد کیا، وظائف وغیرہ کی اجازت حاصل کی اور تبرکاً فقہ کی کتاب کنز الدقائق کے چند سبق پڑھے۔ مولانا حاتم کے حلقۂ ارادت میں بھی داخل ہوئے۔ مولانا حاتم نے اپنے استاد شیخ عزیز اللہ تلنبی کی طرف سے بھی کلاہ اور شجرہ عنایت کیے تاکہ ہونہار شاگرد علم باطنی کے ساتھ علم ظاہری سے بھی بہرہ ور ہو جائے۔

ایک بزرگ شیخ سعد اللہ نحوی بیانوی (متوفی ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء) تھے۔ بیانہ کے رہنے والے تھے، فن نحو میں اپنے دور کے امام تھے۔ اس موضوع میں کوئی ان کا حریف نہ تھا، اسی سبب سے نحوی ان کے نام کا جز ہو گیا تھا۔ سلیم شاہ سوری کے عہد میں بدایونی اپنے نانا کی معیت میں شیخ سعد اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے علم نحو کی کتاب کافیہ کے چند سبق پڑھے۔ ۹۶۶ھ میں بدایونی اور ان کے والد شیخ ملوک شاہ آگرہ گئے۔ وہاں متعدد اصحاب علم اور ارباب کمال قیام پذیر تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ قاضی ابوالمعلی بخاری تھے، ان سے بدایونی نے شرح وقایہ کا کچھ حصہ پڑھا۔ قاضی ابوالمعالی بخاری، فروع و اصول میں یگانہ روزگار تھے اور کبار فقہائے حنفیہ میں سے تھے۔ وہ ۹۶۹ھ/۱۵۶۲ء کو بعہد اکبر بادشاہ آگرہ گئے اور مسند درس بچھائی۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ کچھ کتابیں مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور تھانیسری (متوفی ۸ جمادی الاولیٰ ۹۷۶ھ/ ۲۹ راکتوبر ۱۵۶۸ء) سے پڑھیں اور ابتدائے عمر میں چند کتابوں کی تحصیل ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک ناگوری (متوفی ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۰۱ھ/ ۵ راگست ۱۵۹۳ء) سے کی۔ میر تقی بن فارغی شیرازی سے بھی بعض کتابیں پڑھیں۔ آگرہ میں مولانا مرزا سمرقندی سے شرح شمسیہ اور بعض دیگر کتابوں کی تکمیل کی۔

مولانا مرزا سمرقندی کے بارے میں بدایونی لکھتے ہیں کہ وہ انسانی شکل میں فرشتہ تھے۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے اور مدینہ منورہ سے ہو آئے تھے۔ علما وطلبا کی بہت بڑی تعداد ان سے فیض یاب ہوئی۔ منطق کی مشہور کتاب ''شرح شمسیہ'' امیر سید محمد کی تصنیف ہے، جو امیر سید علی ہمدانی کے بیٹے تھے۔ اور امیر

سید علی ہمدانی وہ بزرگ ہیں، جن کی کوششوں سے خطہ کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ بدایونی نے شرح شمسیہ کا کچھ حصہ اور تمام مختصرات مولانا مرزا سمرقندی سے پڑھی تھیں ❶۔

آگرہ میں بدایونی کو بہت سے لوگوں کی صحبت و رفاقت میں رہنے کے مواقع میسر آئے اور ہر قسم کے افراد سے ان کے تعلقات قائم ہوئے، جن میں علما، امرا، مؤرخین اور دربار اکبری کے مختلف فکر و خیال کے لوگ شامل تھے۔ ان میں نظام الدین ہروی۔ (مصنف طبقات اکبری)، غیاث الدین قزوینی، کمال الدین حسین شیرازی، ابوالفضل اور فیضی وغیرہ قابل ذکر ہیں ــــ انہی ایام میں فتح پور سیکری کے دور قیام میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے ملاقاتوں کا سلسلہ رہا اور ان کے علم و فضل اور زہد و تقوی سے بدایونی نہایت متاثر ہوئے ❷۔

## والد اور نانا کی وفات:

بدایونی اپنے والد سمیت آگرہ میں تھے کہ ۲۷؍ رجب ۹۶۹ھ/۲؍ اپریل ۱۵۶۲ء کو آگرہ میں والد انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کی بدایونی نے ان اشعار سے تاریخ نکالی:

سردفتر افاضل دوراں ملوک شاہ　　آں بحر علم، معدن احسان و کانِ فضل

چوں بود در زمانہ جہانے ز فضل ازاں　　تاریخ سال فوت وے آمد جہان فضل ❸

اس کے بعد بدایونی علاقہ سنبھل کے ایک مقام سہسوان میں تھے کہ نانا مخدوم اشرف کی وفات کی اطلاع پہنچی ❹ یعنی ایک سال میں یکے بعد دیگرے دو موتوں کے صدمے برداشت کرنا پڑے۔ ایک والد کی موت کا اور ایک نانا کی موت کا۔! نانا ان کے استاد بھی تھے اور بے حد مہربان و شفیق بھی۔! بدایونی ان کی موت سے بہت مغموم ہوئے اور حزن و ملال کی سیاہ گھٹائیں ان پر چھا گئیں۔ منتخب التواریخ میں اس سانحہ کا انھوں نے انتہائی افسوس کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

## امیر حسین خاں کی ملازمت:

۹۷۳ھ/۱۵۶۶ء میں بدایونی علاقہ اودھ کے والی امیر حسین خاں کے پاس بٹیالہ پہنچے۔ بٹیالہ وہ مقام ہے، جہاں امیر خسرو پیدا ہوئے تھے۔ یہ علاقہ امیر حسین خاں کی جاگیر میں شامل تھا۔ حسین خاں عامل

---

❶ منتخب التواریخ، ج ۳ ص ۱۱۲۔

❷ منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۱۱۳ تا ۱۱۷۔

❸ منتخب التواریخ۔ ج ۲، ص ۵۳۔

❹ ایضاً۔ ص ۶۴

سنت‘ علم پرور‘ علما دوست‘ پابند نماز با جماعت‘ ہمدرد خلائق صاحب اخلاق‘ درویش سیرت‘ پیکر جود وسخا اور متواضع امیر تھا۔ بدایونی نے اس پرہیز گار اور بہادر افغان کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے ہمایوں کی مراجعت ہند سے لے کر اکبر کے بائیسویں سال جلوس تک بڑی جاں نثاری اور وفا داری کا ثبوت دیا تھا اور تین ہزاری منصب سے سرفراز ہوا تھا۔ ۹۷۳ھ سے ۹۸۱ھ تک بدایونی اس کی جاگیر کی حفاظت و وکالت کے فرائض نہایت حسن وخوبی سے انجام دیتے رہے۔ اس اثنا میں علما و مشائخ کی مجلسیں خوب گرم رہیں اور قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صداؤں سے سیرابیٔ قلب وروح کے سامان فراہم ہوتے رہے [1]۔ اسی دوران میں ۹۷۵ھ کو وہ رخصت لے کر بدایوں گئے اور دوسری شادی کی‘ جس کا ذکر انھوں نے اگرچہ صرف ڈیڑھ سطر میں کیا ہے‘ لیکن بڑے پُر لطف انداز میں کیا ہے۔ پہلی شادی کا تذکرہ نہیں کیا۔ معلوم نہیں عقد ثانی کے وقت پہلی بیوی زندہ تھی یا وفات پاگئی تھی۔

## بیٹے اور بھائی کی وفات:

کچھ عرصہ بعد بدایونی کو اللہ نے بیٹا عطا فرمایا۔ اس کا نام عبداللطیف رکھا۔ بیٹے کی پیدائش سے نہایت خوش ہوئے‘ لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ چھوٹی عمر میں بیٹا بھی فوت ہوگیا اور چھوٹا بھائی محمد بھی وفات پا گیا۔ بدایونی اس دوہرے صدمے کا بڑے افسوس کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

چھوٹے بھائی شیخ محمد کی میں نے جان کے برابر پرورش کی تھی‘ بلکہ میں اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ بڑے اخلاق حمیدہ کا مالک تھا۔ ایک اچھے گھرانے میں اس کی شادی کی۔ کیا خبر تھی کہ اس کار خیر میں ہزاروں حزن وملال کی شر چھپی ہوئی ہے۔ اس کو ہم سے موت نے چھین لیا۔ اسی طرح نور چشم عبداللطیف جو ہنستا کھیلتا بچہ تھا‘ گود سے گور میں چلا گیا۔ وہ میری زندگی کا ہرا بھرا پودا تھا اور میں اپنے زمانے کا شہر یار تھا۔ افسوس دونوں کو زمانے کی نظر کھا گئی اور ان کی موت نے مجھے اپنے ہی شہر میں پردیسی کر دیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون [2]۔

## واقعہ عشق اور اس کی سزا:

بدایونی صاف گو مورخ ہیں‘ بعض دفعہ ایسی باتیں بھی بیان کر جاتے ہیں‘ بظاہر جنھیں لوگوں سے چھپانا چاہیے۔ اس ضمن میں نہ وہ اپنا لحاظ کرتے ہیں نہ دوسروں کا۔! اس سلسلے کا ایک واقعہ جو حسین خاں کے دوران ملازمت میں ۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء کو پیش آیا‘ اور جوان کے عشق ومحبت اور اس کے نتیجے سے تعلق رکھتا ہے‘ منتخب التواریخ میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

---

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۲‘ ص ۱۳۶۔

[2] منتخب التواریخ۔ ج ۲ ص ۱۲۶، ۱۲۷

''اس سال مجھے ایک ہولناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہوا کہ جب حسین خاں کو کانت وکولہ کی جاگیر دی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصے تک اس کی ملازمت میں وہاں رہا۔ اس صوبے کی صدارت اور فقرا کی خدمت میرے سپرد کی گئی تھی۔ قنوج کے مضافات میں مکن پور کے مقام پر حضرت بدیع الدین شاہ مدار کا مزار ہے۔ میں اس کی زیارت کے لیے وہاں گیا۔ انسان کی سرشت میں غفلت وجہل ابوالبشر آدم سے وراثت میں چلی آرہی ہے۔ میں نے بھی انسان کا کچا دودھ پیا ہے' خطا ونسیان سے بالاتر نہیں ہوں۔ میری آنکھوں پر بھی غفلت و جہالت کا پردہ پڑ گیا اور وہاں ایک خوبرو کے کرشمہ و ادا نے مجھے دام ہوس میں پھنسا دیا۔ ہوس کو عشق سمجھ بیٹھا۔ پھر جو کچھ بیتی سو بیتی۔ اس درگاہ میں مجھ سے بے ادبانہ حرکت سرزد ہوئی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کا خمیازہ مجھے اس دنیا ہی میں مل گیا۔ میرے ''معشوق'' کی قوم کے چند افراد نے حملہ کر کے مجھے زخمی کر دیا۔ میرے سر' ہاتھوں اور کندھے پر پے در پے تلوار کے نو زخم لگے۔ دوسرے زخم تو مندمل ہو گئے' لیکن سر کا زخم بہت گہرا تھا۔ تلوار ہڈی کو توڑتی ہوئی بھیجے تک پہنچ گئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ گئی تھی اور انگلی لٹکنے لگی تھی۔ زندگی کے ختم ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی' مگر خدا کا شکر ہے کہ اتنے بڑے حادثے کو برداشت کر گیا۔

''قصبہ بانگرمئو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا اور ہفتہ بھر کے اندر ہی تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اس بیماری اور مصیبت میں منت مانی کہ صحت یاب ہو جاؤں تو حج کروں گا۔ لیکن افسوس ایفائے عہد کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ غرض کچھ صحت پانے کے بعد وہاں (قصبہ بانگرمئو) کانت وکولہ گیا۔ غسل صحت کے بعد پھر دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خاں نے' خدا اسے جنت نصیب کرے' باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی۔ ان دنوں سخت سردی پڑ رہی تھی' لہٰذا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب گز [1] کا مرہم اور کھانے کو گزر کا حلوا تیار کرایا۔ میں وہاں سے بدایوں چلا گیا۔ وہاں طبیب نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پٹی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس موت کے منہ میں جا کر نکلا۔ اسی دوران میں ایک دن کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں ایک خواب دیکھا کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں۔ وہاں باقاعدہ کچہری لگی ہوئی ہے' جس میں دیوانی کارندے اور محرر کام میں مصروف ہیں۔ چوکیداروں کی ایک جماعت شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھڑیاں لیے ہوئے لوگوں کو ادھر ادھر ہٹانے اور مؤدب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھنے لگا۔ پھر کہا: ''یہ وہ شخص نہیں ہے۔'' اسی حالت میں میری آنکھ کھل گئی ___ میں نے بچپن میں جو افواہ لوگوں سے سن رکھی تھی' اس موقعے پر مجھے اس کا یقین سا ہو گیا [2]۔''

---

[1] ایک درخت کا نام ہے جو ندی کے کنارے ہوتا ہے۔ عربی میں اسے طرفا اور ہندی میں جھاؤ کہتے ہیں۔

[2] منتخب التواریخ۔ ج ۲ ص ۱۳۶ تا ۱۳۸۔

## بدایوں میں آتش زدگی:

۹۷۹ھ/۱۵۷۱ء کو بدایوں میں آتش زدگی کا حادثہ پیش آیا۔ بدایونی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اسی سال بدایوں میں آتش زدگی کا ہولناک واقعہ رونما ہوا۔ اس حادثے میں اتنے ہندو اور اتنے مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ جلی ہوئی انسانی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہت سے لوگ آگ کے خوف ناک شعلوں سے محفوظ رہنے کے لیے قلعے کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن بھڑکتی ہوئی آگ نے پیچھا نہ چھوڑا' وہاں بھی انھیں جا پکڑا۔ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے' بہت سے گر کر مر گئے' جو بچ رہے' وہ معذور اور اپاہج ہو گئے۔ آگ بجھانے کے لیے لوگ جس قدر پانی ڈالتے تھے' اس کے شعلے اور بلند ہو جاتے تھے۔ گویا پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔

بدایونی مزید لکھتے ہیں:

''میں نے اس آتش زدگی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بلکہ اس کی تپش میرے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس حادثے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ دوآبہ کا ایک مجذوب بدایوں آیا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا:

''اس شہر سے نکل جاؤ۔''

میں نے پوچھا: ''کیوں۔؟''

مجذوب نے جواب دیا: ''یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے۔''

وہ عجب رند و مست معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا۔

چہ پرسی از بداؤں و ز احوال پریشانش　　کہ آیاتِ عذاب النار نازل گشتہ در شانش [1]

## ترک ملازمت:

آٹھ برس کی رفاقت کے بعد ۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء کو بدایونی کا اپنے دوست اور دینی بھائی امیر حسین خاں سے بگاڑ پیدا ہو گیا اور بدایونی اس کی ملازمت ترک کر کے بدایوں چلے گئے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس سے بگاڑ یا اختلاف کی اصل وجہ کیا تھی۔ حسین خاں سیدھا سادا سپاہی اور مخلص مسلمان تھا۔ آقائی و ماتحتی کے تصور کو ذہن میں نہ لاتا تھا۔ اپنے مقام و مرتبہ کی پروا کیے بغیر بدایوں گیا اور بدایونی کی والدہ کی خدمت میں

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۲ ص ۱۳۸، ۱۳۹

حاضر ہوا۔ بدایونی سے معذرت کی اور ماں سے سفارش کا طالب ہوا۔ ہر چند کوشش کی کہ وہ واپس چلیں مگر نہ مانے اور اکبر کے شاہی دربار میں جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اکبر کا دربار اس زمانے میں اصحابِ علم اور اربابِ کمال کا مرکز تھا۔ خود بادشاہ اس متاعِ گراں بہا کا بہت قدردان تھا اور علما و فضلا کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ لیکن بعض اصحاب علم (مثلاً حاجی ابراہیم سرہندی وغیرہ) کا جو مجادلہ و مباحثہ میں بہت بے باک ہو گئے تھے، زور بھی توڑنا چاہتا تھا۔

## دربار اکبری میں:

بدایونی نے جب اکبر بادشاہ کے دربار میں جانے کا پختہ ارادہ کر لیا تو ۱۹۸۱ء کے ماہ ذی الحجہ کے اواخر میں بدایوں سے آگرہ پہنچے۔ وہاں جمال خاں قورچی اور حکیم عین الملک سے ملاقات ہوئی، اور انہی کے ذریعے سے دربار شاہی میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔

حکیم عین الملک بہت بڑے طبیب اور جالینوس وقت تھے۔ شیریں کلام اور خوش اخلاق تھے۔ امراض چشم میں اپنے دور کے بے نظیر معالج تھے۔ اچھے شاعر تھے اور دوانی تخلص کرتے تھے۔ اسی بنا پر انھیں حکیم دوانی بھی کہا جاتا تھا۔ علامہ جلال الدین محمد دوانی کی اولاد سے تھے۔ بادشاہ کے مصاحب و ندیم تھے اور بادشاہ ان کی قدر کرتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے علم و مطالعہ کی وسعتوں سے خوب آگاہ تھے۔ ۲۷ ذی الحجہ ۱۰۰۳ھ/ ۲۳ر اگست ۱۵۹۵ء کو فوت ہوئے۔

اسی طرح جمال خاں قورچی اکبر کے مصاحبین میں سے تھا اور پنج صدی عہدے دار تھا۔ بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخیل تھا۔ خوش مزاج اور ظریف الطبع تھا۔ وسیع القلب اور مخلص مسلمان تھا۔ بدایونی کی اقتدا میں نمازیں پڑھتا رہا تھا اور ان کے اسلوب قرأت سے بہت متاثر تھا۔ ان کی خوش الحانی کی تعریف کرتا تھا۔ ان کی علمی تقریریں کئی دفعہ سن چکا تھا اور ان کے طرز بیان کا مداح تھا۔ اس نے ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۴ء میں وفات پائی۔

ان حضرات نے بدایونی کو بادشاہ کے حضور پیش کیا اور امامت نماز پر تقرر کی سفارش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے بدایونی کو دربار شاہی سے منسلک کر لیا۔ بیستی کا منصب ملا اور فرائض امامت سپرد ہوئے۔ ہفتے کے سات دنوں میں سات امام نماز پڑھاتے تھے۔ ہر امام کے ذمے ایک دن کی امامت تھی۔ بدایونی کو بدھ کے روز کی امامت سونپی گئی۔ بدایونی رقم طراز ہیں:

اسی سال بادشاہ نے میرے خوش آواز ہونے کی وجہ سے، چہار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے سات اماموں میں داخل کیا، اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں وقت حاضری کے لیے اسے یاد کرائے۔

اس زمانے میں دربارِ اکبری میں علما کو کس عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ علم کو کیا وقعت حاصل تھی اور خود علما کا اپنا کیا انداز تھا۔ اس کے بارے میں خود بدایونی کے فارسی الفاظ کا ترجمہ پڑھیے:

''ان دنوں علم کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ پہلی ہی حاضری میں بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا' اور ہم نشینوں میں داخل کر لیا گیا۔ بادشاہی مجلس کے علما کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا نقارہ بجانے کی فکر میں رہتے تھے' کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے۔ بلکہ بحث مباحثہ کر کے اس کو نیچا دکھانے اور خود سر بلند ہونے کی تدبیروں میں لگے رہتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا۔ اللہ کی عنایت خاص سے قوتِ طبع' ذکاوتِ فکر اور فہم و جرات کے تمام سامان مہیا تھے۔ اس لیے جلد ہی ان علما میں سے اکثر پر چھا گیا۔''

بدایونی کے فارسی الفاظ ملاحظہ ہوں:

''وبعنایت الٰہی و بقوتِ طبع و ذکائے فہم و دلیری کہ لازمۂ عہد شباب بود' بر اکثرے غالب می آید ❶۔''

''جب میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا کہ بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج درست کر دے گا۔ بادشاہ چاہتا تھا کہ حاجی ابراہیم کو میدان علم میں شکست دی جائے۔''

دروقت ملازمت تعریف کردہ بودند کہ ایں فاضل بدایونی سرکوب حاجی ابراہیم سرہندی است ❷۔

چنانچہ میں نے حاجی ابراہیم سرہندی پر پے در پے سخت وار کیے اور اس کو بری طرح ہدف تنقید ٹھہرایا۔ میرا یہ انداز بادشاہ کو بہت پسند آیا اور مجھے اس کی برابر داد ملتی رہی۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے ہاں میری آمد و رفت نہ تھی۔ اس لیے وہ مجھ سے کچھ کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ مناظرے اور مباحثے کے وقت وہ میرے فریق مخالف کی حمایت کرتے تھے۔ لیکن بعد میں شیخ کی یہ پرخاش اور کبیدگی ختم ہو گئی' اور ہمارے باہمی تعلقات بڑے استوار ہو گئے۔ ان ہی دنوں ابوالفضل بھی کہ اس کے علم و عقل کا ستارہ اوج پر تھا' دربار اکبری میں باریاب ہوا' اور بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا ❸۔

دربار اکبری میں جاتے ہی بدایونی نے علمائے دربار سے بحث و مجادلے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اپنی حدّتِ فکر' تیزیٔ طبع اور حاضر جوابی کی وجہ سے بہت جلد بادشاہ اور علما و امرا سے اپنے علم کا لوہا منوالیا' اور ان کا شمار اونچے مرتبے کے اہل علم میں ہونے لگا۔ بادشاہ تو ان کے علم و فضل اور فراوانیٔ معلومات سے اس درجہ متاثر ہوا کہ ان کے شامل دربار ہونے کے بعد جب وہ پہلے سفر پر روانہ ہونے لگا تو ان کو اپنے ہمراہ کیا اور علما کی اس جماعت میں شریک کیا جو سفر میں بادشاہ کے ہم رکاب رہتی تھی۔

---

❶ منتخب التواری۔ ج ۲' ص ۱۷۲۔

❷ منتخب التواریخ۔ ج ۲' ص ۱۷۲' ۱۷۳۔

❸ ایضاً

دوران سفر میں جب بادشاہ کے سامنے بدایونی کے فکر ونظر کی مزید تہیں کھلیں اور اس کے علم وادراک کی وسعتوں کا اندازہ ہوا تو اس نے ان کو سنسکرت کی کتاب سنگھاسن بتیسی کو فارسی میں منتقل کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ آج ہی یہ کام شروع کر دو اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھاؤ۔ چنانچہ بادشاہ کے اس ارشاد پر عمل کیا گیا۔ اس نے ترجمے کا ایک صفحہ دیکھا تو نہایت خوش ہوا۔ بدایونی کے اس کام کی بہت تعریف کی اور ان کو خراج تحسین پیش کیا۔ سنگھاسن بتیسی کے ترجمے کی تفصیل آیندہ آ رہی ہے۔

جب تک بادشاہ نے اپنے آپ کو دائرۂ اسلام میں محصور رکھا اور وہ امور دینی کا پابند رہا' بدایونی کے اس سے اور اس کے بدایونی سے خوب مراسم رہے' لیکن جب سن جلوس کے تیسویں سال کے اواخر (۹۸۵ھ) اور چوبیسویں سال کے اوائل (۹۸۶ھ) میں اس نے قبائے مذہب اوتار کر بے دینی کے دریا میں غوطہ زنی شروع کی اور فکر وعمل کے جادۂ مستقیم سے انحراف کر کے غیر دینی رجحانات کو مرکز توجہ ٹھہرالیا تو بدایونی اس سے کبیدہ خاطر ہو گئے اور دونوں ایک دوسرے سے ذہنی طور پر دور دور رہنے لگے۔ مگر سلسلۂ ملازمت اور تعلق دربار قائم رہا۔

## معرکہ جہاد میں شرکت:

۹۸۴ھ کو بدایونی نے معرکہ جہاد میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کی۔ اس کی تفصیل وہ خود ہی لکھتے ہیں' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۹۸۴ھ میں اکبر بادشاہ اجمیر میں تھا۔ بدایونی بھی شریک سفر تھے۔ بادشاہ نے مان سنگھ کے زیر کمان ایک بڑا لشکر رانا کیکا سے لڑائی کی غرض سے کوکندہ اور کونبھل میر کی مہم پر روانہ کیا۔ کئی بہادر سردار اور درباری امیر فوج میں شامل تھے' جن کے خیمے اجمیر سے تین کوس تک نصب تھے۔ بدایونی نے فوج کی شان وشوکت دیکھی تو بے اختیار ہو گئے اور دل میں جذبۂ جہاد نے جوش مارا۔ سیدھے صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی کے پاس پہنچے اور جہاد پر جانے کے لیے بادشاہ سے رخصت لینے کی درخواست کی۔ مگر اس ذریعے سے بات بنتی دکھائی نہ دی تو اپنے ہم سبق وہم درس میر غیاث الدین سے ملے' جس کا لقب نقیب خاں تھا۔ یہ شخص بڑا نیک تھا اور بدایونی کا دوست۔۔! اس نے کہا:

اگر ہندو سردار ایں لشکر نمی بود نخست کسے کہ رخصت می گرفت من بودم۔

(اگر امیر لشکر ہندو نہ ہوتا تو میں خود اس مہم میں جانے کے لیے بادشاہ سے اجازت طلب کرتا۔)

نقیب خاں کی بات بظاہر وزنی معلوم ہوتی ہے' کیوں کہ سپہ سالار لشکر مان سنگھ تھا۔ مگر بدایونی کا جواب بھی نہایت معقول ہے۔ فرماتے ہیں:

ماسردار خود بندگانِ حضرت را می دانیم بر مان سنگھ وغیرہ چہ کار داریم کہ کار بہ تصحیح نیت است۔

(میں نے نقیب خاں سے کہا' ہم اپنا امیر اکبر بادشاہ کو مانتے ہیں' جو مسلمان ہے اور کفار کے مقابلے

میں فوج بھیج رہا ہے۔ مان سنگھ وغیرہ سے ہمیں کیا غرض۔ اصل شی نیت ہے' یہ درست ہونی چاہیے۔)

بہرحال بدایونی اور نقیب خاں بادشاہ کے پاس پہنچے۔ اس وقت وہ شیخ معین الدین اجمیری کے مرقد کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ نقیب خاں نے بدایونی کے شریک جہاد ہونے کے لیے عرض کیا اور سفارش کی کہ انھیں اس نیک کام میں شمولیت کی اجازت دی جائے۔

بادشاہ نے کہا:

فرمودند کہ او بعہدۂ امامت متعین است چوں می رود؟

یہ تو امامت نماز کے منصب پر فائز ہیں۔ جنگ میں کیوں کر جا سکتے ہیں؟

اس نے عرض کیا: ''جہاد کی آرزو رکھتے ہیں۔''

یہ سن کر بادشاہ نے بدایونی سے دریافت کیا: ''بہت جی چاہتا ہے۔''؟

بدایونی نے جواب دیا: ''جی ہاں۔ بہت چاہتا ہے۔''

فرمایا: ''کیوں۔؟''

عرض کیا: ''اپنے عملوں کی سیاہی کو جاں نثاری کے ذریعے دھونا چاہتا ہوں۔''

ارشاد ہوا: ان شاء اللہ تعالی خبر فتح خواہی آور۔

(ان شاء اللہ تعالی فتح کی بشارت لے کر آؤ گے۔'')

یہ کہہ کر بادشاہ نے مراقبے میں سر جھکا کر پوری توجہ سے رخصت کی فاتحہ پڑھی۔ (دعا کی) بدایونی لکھتے ہیں کہ میں نے چبوترے پر ہاتھ بڑھا کر پابوسی کا ارادہ کیا' مگر بادشاہ نے پیر اوپر کھینچ لیے۔ وہ اجازت لے کر دیوان خانے سے باہر نکلے تو بادشاہ نے پھر بلایا۔ دونوں ہاتھ بھر کر اشرفیاں عطا کیں اور خدا حافظ کہا۔ اشرفیاں گنیں تو پینسٹھ تھیں۔

بعدازاں بدایونی' جہاد پر جاتے وقت صدر الصدور شیخ عبدالنبی کی خدمت میں گئے۔ اب وہ بھی مہربان تھے۔ تاکید سے فرمایا: ''میدان جنگ میں دشمن کی فوج سے مقابلہ ہو تو مجھے دعائے خیر سے یاد رکھنا۔ حدیث نبوی کی رو سے یہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے۔ بھولنا نہیں ❶۔ بدایونی نے ''بہت اچھا'' کہہ کر شیخ سے دعا کی درخواست کی اور گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ بدایونی کا یہ سفر جہاد بڑا مبارک ثابت ہوا' اور وہی بادشاہ کے

---

❶ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے' جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن سهل بن سعد رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ- ثنتان لا يرد ان الدعاء عند النداء وعند الباس حين يلحم بعضهم بعضا- (مشکوٰۃ' باب فضل الاذان واجابۃ المؤذن فصل ثانی)

(یعنی حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو وقت کی دعا بارگاہِ خداوندی سے مسترد نہیں کی جاتی- ایک اذان کے وقت کی اور دوسری جہاد کے وقت کی' جب فوجیں برسرِ پیکار ہوں-)

پاس فتح کی خوش خبری لائے۔

اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح اور کافروں کو ہزیمت ہوئی۔ رانا بھاگ گیا۔ اس کے ایک قدآور ہاتھی کا نام ''رام پرشاد'' تھا۔ یہ ہاتھی کئی دفعہ بادشاہ نے رانا سے مانگا تھا' مگر اس نے نہیں دیا تھا۔ یہ ہاتھی بھی شاہی فوج کے قبضے میں آیا____ امرائے فوج نے باہم مشورے سے طے کیا کہ فتح کی خوش خبری کے ساتھ یہ ہاتھی بھی بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

## فتح کی خوش خبری بدایونی کے ذریعے:

اب سوال یہ درپیش تھا کہ یہ اہم کام کس کے سپرد کیا جائے جو فتح کی بشارت دینے بادشاہ کے حضور جائے۔ آصف خاں نے ملا عبدالقادر بدایونی کا نام پیش کیا اور کہا کہ یہ فقط ثواب کی غرض سے شامل جہاد ہوئے ہیں' انھی کو ہاتھی اور فتح نامہ کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھیجنا چاہیے____ یہاں بدایونی لکھتے ہیں کہ آصف خاں کی اس سفارش پر سپہ سالارِ فوج مان سنگھ نے کہا ''ابھی تو بہت سے اہم امور سرانجام دینا باقی ہیں' ان کو لشکر میں رہ کر ہر معرکے میں فوجیوں کی امامت کرنی چاہیے۔'' بدایونی نے جواب دیا۔ ''یہاں کی امامت کا اب وقت نہیں رہا۔ مجھے یہاں سے جا کر خود بادشاہ کی امامت کرنی ہے۔'' مان سنگھ اس جواب پر مسکرایا اور بہت خوش ہوا۔ اس نے تین سو سواروں کی حفاظت میں مذکورہ ہاتھی اور فتح نامہ دے کر اعزاز کے ساتھ بدایونی کو رخصت کیا اور خود بھی سیر وشکار اور مختلف مقامات پر حفاظتی چوکیاں اور تھانے قائم کرنے کے لیے بیس کوس تک ساتھ گیا۔

بدایونی نہایت تکریم کے ساتھ لشکر گاہ سے چلے اور مان سنگھ کے وطن ''انبیر'' کے راستے جو جے پور میں واقع ہے' فتح کا اعلان کرتے اور خود اپنے مولد قصبہ ٹوڈا سے ہوتے ہوئے دارالخلافہ فتح پور سیکری پہنچے۔ راستے میں جہاں جہاں سے بدایونی کا قافلہ گزرتا' لوگ بڑے احترام سے استقبال کو آتے۔ پورے اعزاز سے ٹھہراتے اور عزت سے رخصت کرتے انبیر سے پانچ کوس کے فاصلے پر تھے کہ ہاتھی دلدل میں پھنس گیا اور بڑی مشکل سے دیہات کے لوگوں نے مل کر باہر نکالا____ یہ واقعہ بدایونی نے مسرت انگیز لہجے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

انبیر میں بدایونی کا یہ قافلہ تین چار روز مقیم رہا۔ وہاں سے قصبہ ٹوڈا کے راستے جو بدایونی کی جائے پیدائش ہے' بساور گئے' جہاں ان کا پورا خاندان آباد تھا۔ فتح پور سیکری پہنچے تو مان سنگھ کے والد راجہ بھگوان داس کی وساطت سے شاہی محل میں گئے۔ بادشاہ کو کورنش بجالا کر امرائے لشکر کے عریضے اور ہاتھی پیش کیا۔ بادشاہ نے بدایونی سے کہا:

''امرا نے تمھاری تعریف لکھی ہے۔ سچ بتاؤ' کس فوج میں تھے اور کیا کارنامہ انجام دیا''؟

بدایونی نے جواب دیا: ''یہ ناچیز بادشاہوں کے حضور لرزاں وترساں سچ ہی بولنے کا عادی ہے۔ بھلا کذب بیانی کس طرح کر سکتا ہے''؟

اس کے بعد پورا واقعہ من وعن بیان کیا۔

بادشاہ نے دریافت کیا: ''تم بلا ہتھیار تھے' یا مسلح''؟

کہا: ''زرہ پہنے ہوئے اور تلوار بدست تھا''

فرمایا: ''یہ چیزیں کہاں سے ملیں''؟

عرض کیا: ''سید عبداللہ خاں سے''!

بدایونی لکھتے ہیں: بادشاہ نے میری بڑی تعریف اور تحسین کی۔ ان دنوں شہنشاہ کے سامنے ہمیشہ اشرفیوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ دونوں ہاتھ میں اشرفیاں بھر کر انھیں عنایت کیں۔ گنی تو چھیانوے (۹۶) تھیں۔

پھر پوچھا: ''شیخ عبدالنبی سے مل چکے''؟

کہا: ''راستے کی گرد وغبار جھاڑتے ہوئے' سیدھا خدمت عالی میں حاضر ہوا ہوں۔ اس حالت میں ان سے کیسے مل سکتا تھا''؟

بعد ازاں بادشاہ نے ایک عمدہ قسم کا نخودی دوشالہ بدایونی کو دیا کہ اسے لے جاؤ اور شیخ سے ملاقات کرو' اور ان سے کہو کہ یہ دوشالہ ہم نے خاص آپ کے لیے اپنے کارخانے میں تیار کرایا ہے' اسے زیب تن کیجیے۔ بدایونی دوشالہ لے کر شیخ عبدالنبی کے پاس گئے اور جو کچھ بادشاہ نے کہا تھا' بتایا۔ شیخ بہت خوش ہوئے اور بدایونی سے پوچھا:

''آپ کو رخصت کرتے وقت میں نے کہا تھا کہ دشمن سے مقابلے کے وقت مجھے دعا میں یاد رکھنا''

بدایونی نے جواب دیا: ''اس وقت میں نے یہ دعا پڑھی تھی۔

اللھم اغفر للمؤمنین و المومنات' وانصر من نصر دین محمد و اخذل من خذل دین محمد علیه الصلوة والسلام۔''

شیخ نے کہا: یہ بھی کافی ہے۔

بدایونی کے الفاظ یہ ہیں:

شیخ خوش حال شدو پرسید کہ دروقت وداع گفتہ بودم کہ ہنگامے التقائے صفین بدعائے مارایاد آوری ___ گفتم دعا۔

اللھم اغفر اللمومنین والمونات وانصر من نصر دین محمد و اخذل من خذل دین محمد علیه الصلوة والسلام خودخوانده بودیم۔ گفت ایں ہم کافی است ❶۔

❶ عربی کی اس دعا کا ترجمہ یہ ہے: اے اللہ! مومن مردوں اور مومن عورتوں کی مغفرت فرما' اور جو شخص محمد ﷺ کے دین کی [illegible] اس کی مدد فرما اور جو اس کے دین کی توہین کرتا ہے' اس کو ذلیل کر۔

## حق گوئی و بے باکی:

بدایونی حق گو اور بے باک عالم دین تھے۔ سچ کہنے میں حتی الامکان کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ اس ضمن میں دو واقعے قابل ذکر ہیں، جن سے ان کے علم و فضل کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مرزا سلیمان جو تیموری خاندان کا ایک اونچے درجے کا رکن تھا، فتح پور میں قیام پذیر ہوا۔ وہ نیک آدمی تھا اور اکبر اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ رات کو عبادت خانے بھی جاتا اور علما و مشائخ کی محفل میں بیٹھتا۔ عام طور سے اس پر وجد و حال کی کیفیت طاری رہتی تھی اور اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتا تھا۔ نماز باجماعت کا پابند تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ ایک روز میں نے نماز کی امامت کے بعد صرف دعا پڑھی، فاتحہ نہیں پڑھی۔ مرزا نے اعتراض کیا کہ ''آپ نے فاتحہ کیوں نہیں پڑھی''؟ میں نے جواب دیا: ''حضور ﷺ کے زمانۂ مبارک میں نماز کے بعد فاتحہ نہیں پڑھی جاتی تھی، بلکہ بعض روایات میں تو اس کو مکروہ بھی کہا گیا ہے ❶۔''

مرزا نے کہا:

مگر در ولایت علم و علما نہ بوند کہ می خوانند؟

(کیا ولایت (ایران) میں علم نہیں ہے یا علما نہیں ہیں کہ وہاں فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔؟'

میں نے کہا:

گفتم کہ ما را بکتاب کار است نہ بہ تقلید۔

(ہمارا تعلق تو اللہ کی کتاب سے ہے، تقلید سے نہیں ہے۔)

بادشاہ بھی اس وقت موجود تھا۔ اس نے کہا ''بحث نہ کرو، آئندہ پڑھ لیا کرو۔''

بدایونی کہتے ہیں: میں نے بادشاہ کا ارشاد مان لیا، لیکن فاتحہ پڑھنے کے مکروہ ہونے کی جو روایت مجھے معلوم تھی، وہ ان کے سامنے بیان ضرور کر دی ❷۔

سوال یہ ہے کہ ''فاتحہ'' کیا شی ہے؟ اس کے متعلق کچھ پتا نہیں چلا کہ یہ کیا ہے۔ کسی دور میں کچھ رسوم مروج ہو جاتی ہیں، اور پھر جب وہ ختم ہو جاتی ہیں تو ان کی صحیح تعریف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بدایونی نماز کے بعد وہی ادعیہ پڑھنے کے قائل تھے جنھیں ادعیہ ماثورہ کہا جاتا ہے اور جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ مرزا سلیمان ان کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھنے کے قائل تھے اور اسے فاتحہ سے تعبیر کرتے تھے، کیوں کہ علمائے روم میں اسے فاتحہ ہی کہا جاتا تھا۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اس ''فاتحہ'' کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

دوسرا واقعہ ایک برہمن کے قتل کے بعد اس دور میں پیش آیا جب بادشاہ اسلام اور احکام اسلام سے

---

❶ تفصیلات کے لیے دیکھیے: منتخب التواریخ - ج ۲، ص ۲۲۷ تا ۲۳۷

❷ منتخب التواریخ - ۲، ص ۲۱۶۔

دور رہنے لگا تھا۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے علما کی موجودگی میں بدایونی سے شاتم رسول (ﷺ) کے بارے میں استفسار کیا۔ انھوں نے نہایت جرات سے دربار میں مسئلے کی وضاحت کی ___ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قاضی متھرا قاضی عبدالرحیم نے صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے پاس یہ استغاثہ بھیجا کہ ''یہاں کے مسلمان ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے' لیکن یہاں کے ایک سرکش اور سرمایہ دار برہمن نے وہ تمام عمارتی سامان خود اٹھالیا اور مسجد کی جگہ پر اسی سامان سے ایک بت خانے کی تعمیر شروع کر دی۔ میں نے جب اس سے باز پرس کی تو اس نے لوگوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ پر سب وشتم کیا۔ اسلام کی اہانت کی اور مسلمانوں کے لیے سخت توہین آمیز الفاظ استعمال کیے۔''

ظاہر ہے' یہ معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا تھا اور ملک کے صدر الصدور کی حیثیت سے شیخ عبدالنبی کے لیے اس کی تحقیق کرنا ضروری تھا' چنانچہ شیخ نے اس برہمن کو طلب کیا' مگر وہ حاضر نہ ہوا۔ بالآخر معاملہ بادشاہ تک پہنچا تو اس نے دربار کی دو شخصیتوں ابوالفضل اور بیربر کو متھرا بھیجا۔ انھوں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ قاضی عبدالرحیم کا بیان صحیح ہے۔ واپس آ کر انھوں نے بادشاہ کو بتایا کہ متھرا کے اس برہمن نے مسجد کی جگہ بت خانہ بھی تعمیر کیا ہے' رسول اللہ ﷺ پر سب وشتم بھی کیا ہے' اسلام کے بارے میں نازیبا الفاظ بھی استعمال کیے ہیں اور مسلمانوں کی توہین بھی کی ہے۔ انھوں نے اس ہندو کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس برہمن کو تو جیل میں ڈال دیا گیا' مگر یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کر گیا کہ اس جرم کی اس کو سزا کیا دی جائے؟ اس بارے میں علما کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا اور دوسرے نے تشہیر اور جرمانے وغیرہ پر زور دیا۔ بحث زیادہ طول پکڑ گئی تو شیخ عبدالنبی نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت طلب کی اور اس پر اصرار کیا۔ بادشاہ نے صاف لفظوں میں تو اجازت نہ دی البتہ یہ کہا کہ شرعی سزاؤں کا معاملہ آپ سے متعلق ہے' ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ شیخ نے مختلف مواقع پر بادشاہ سے کئی دفعہ اس کے قتل کے بارے میں کہا۔ مگر وہ برابر یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ شرعی سزاؤں کے سلسلے میں ہم دخل نہیں دینا چاہتے' اس کا تعلق آپ کی ذات اور علم سے ہے۔ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ شاہی حرم میں ہندو عورتیں بھی تھیں' انھیں واقعہ کا پتا چلا تو وہ بادشاہ سے برہمن کی رہائی کے لیے سفارش کرنے لگیں۔ بادشاہ سب کچھ سنتا لیکن خاموش رہتا' کیونکہ اس کو شیخ کا بہت لحاظ تھا۔ نہ وہ صاف لفظوں میں اس کے قتل کی اجازت دیتا اور نہ رہائی کا حکم جاری کرتا تھا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد شیخ نے بادشاہ سے پھر برہمن کے قتل کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا کہ ہم تو آپ سے کہہ چکے ہیں کہ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں' ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بادشاہ کا یہ جواب سن کر شیخ نے برہمن کے قتل کا حکم دے دیا۔ مگر جب اسے قتل کر دیا گیا تو بادشاہ غضب ناک ہو گیا۔ ادھر شاہی حرم کی ہندو رانیوں اور دربار کے ہندو مصاحبوں نے ہنگامہ بپا کر دیا اور بادشاہ کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ آپ کی

نرمی اور مہربانی سے یہ ملا اس قدر جری اور بے باک ہو گئے ہیں کہ آپ کے حکم اور منظوری کے بغیر ہی لوگوں کو قتل کرنے لگے ہیں ــــ یہ وہ دور تھا جب بادشاہ مذہب سے دور ہوتا جارہا تھا اور علما کے خلاف اس کی نفرت کے جذبات روز بروز تیز ہوتے جارہے تھے۔ اس واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور معاملہ اس کی قوت برداشت سے باہر ہو گیا۔ چنانچہ ایک روز علما کی مجلس میں اس نے یہ مسئلہ پیش کیا اور دربار کے نئے نئے مفتیوں سے اس کے بارے میں رائے طلب کی۔ ہر ایک نے اپنی فکری اور ذہنی بساط کے مطابق اس اہم بحث میں حصہ لیا۔ کسی نے کہا' اس مقدمے میں نہ تو گواہوں پر کما حقہٗ جرح کی گئی' نہ ان کی پوری طرح تعدیل کی گئی' اور مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کیے بغیر قتل کا حکم جاری کر دیا گیا۔ کسی نے کہا' شیخ عبدالنبی اپنے آپ کو امام ابوحنیفہ کی اولاد میں شمار کرتے ہیں' حالانکہ امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ماتحت کافر اگر رسول اللہ ﷺ کے خلاف بدزبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقض عہد اور ابرائے ذمہ کا باعث نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحت سے موجود ہے۔ حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ شیخ کو اپنے جدِ امجد کے مذہب سے اختلاف کی جرات کیوں کر ہوئی ــــ غرض مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کرنا شروع کر دیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں' اس مجلس میں' جس میں یہ گفتگو ہو رہی تھی' میں بھی موجود تھا اور بادشاہ سے کچھ دور تھا۔ دوران بحث میں اچانک دور سے بادشاہ کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوا' میرا نام لے کر بلایا اور کہا:

فرمودند پیش بیا:

(آگے آؤ۔)

میں قریب گیا تو پوچھا۔

''کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ اگر ایک شخص کے قتل پر ننانوے روایتیں ہوں اور رہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو تو مفتی کو چاہیے کہ اس ایک روایت کو ترجیح دے ❶۔''

میں نے کہا: ''ہاں ایسا ہی ہے' جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

(ان الحدود والعقوبات تندرء بالشبهات۔'' میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا (کہ شبہات حدود اور سزاؤں میں کمی کر دیتے ہیں ❷۔'')

میری یہ بات سن کر بادشاہ نے افسوس کے ساتھ پوچھا: ''کیا شیخ عبدالنبی کو اس مسئلے کا علم نہ تھا۔ اس

---

❶ ایسی کوئی روایت ہمیں نہیں ملی' جس کے یہ الفاظ ہوں یا اس سے ملتے جلتے ہوں۔

❷ فقہ کی کتابوں میں عام طور پر یہی الفاظ ہیں' مگر کتب حدیث میں یہ الفاظ ہیں: اندرءوا الحدود بالشبهات۔ (شبہات پیدا ہو جائیں تو حدود میں ان سے کمی کرو۔)

نے بیچارے برہمن کو قتل کر دیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟"

میں نے کہا: "شیخ خود بڑے عالم ہیں، وہ ضرور جانتے ہوں گے۔ اس روایت کے باوجود اگر انھوں نے حکم دیا ہے تو ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔"

بادشاہ نے سوال کیا: "کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔"؟

میں نے جواب دیا: "فتنہ وفساد کی روک تھام اور عوام کی دلیری کا سدباب۔"

بدایونی لکھتے ہیں: میں نے اس سلسلے میں قاضی عیاض کی شفا کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی، بیان کی۔ لیکن حاضرین مجلس میں سے بعض خبیث النفس لوگوں نے کہا:

قاضی عیاض مالکی است سخن او در دیار حنفی سند نیست

(قاضی عیاض مالکی مسلک کے حامل ہیں۔ ان کی بات حنفی ملک میں سند نہیں ہو سکتی۔)

ان کے اس اعتراض پر بادشاہ نے مجھ سے پوچھا: "تمھارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟" میں نے کہا: "وہ یقیناً مالکی ہیں، لیکن اگر کوئی محقق اور مفتی سیاسی مصلحت کی بنا پر ان کے فتوے پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔"

بدایونی کی یہ بات وہاں موضوع بحث بن گئی اور بحث خاصی طول پکڑ گئی۔ بادشاہ اس وقت بہت غصے میں تھا۔ بدایونی اس کے غصے کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

موئے سبلت شہنشاہی را دراں وقت مردم می دیدند کہ چوں موئے شیر برخاستہ بود و از عقب سرمرا مانع از بحث می آمدند۔

(یعنی لوگوں نے دیکھا کہ شہنشاہ کی مونچھوں کے بال اس وقت شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے ___ اور حاضرین مجلس پیچھے سے میرا دامن کھینچ کر مجھے بحث سے روک رہے تھے۔)

اتنے میں بادشاہ نے جھلا کر مجھ سے کہا:

فرمودند، ایں نامعقول است کہ می گوئی۔

(تم یہ نامعقول باتیں کر رہے ہو۔)

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

"میں فوراً تسلیم بجالایا اور واپس آ کر اپنی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اس دن سے میں نے بادشاہ کی مجلس میں آگے بڑھنا اور کسی معاملے میں سبقت کرنا چھوڑ دیا اور بحث ومباحثہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بس کبھی کبھی کورنش بجالاتا اور اپنے کام میں مشغول ہو جاتا[1]۔

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۷۹ تا ۸۳۔ شاتم رسول اللہ ﷺ کی سزا کے بارے میں مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: [illegible] ہند۔ ج ۳، ص ۲۸۲ تا ۲۸۸۔

## متعہ کی بحث:

اکبر کے اکیسویں سال جلوس (۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء) کے بعض واقعات سے، جو خود بدایونی نے منتخب التواریخ میں تحریر کیے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کچھ مسائل میں اپنے علم و تحقیق کے زور سے بادشاہ کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اس زمانے میں اکبر نے سب سے پہلے یہ مسئلہ پوچھا: ''کتنی آزاد عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز ہے''؟

علما نے جواب دیا: ''چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا منع ہے۔''

اکبر نے کہا: ''ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے، جتنی عورتوں کو چاہتے، نکاح میں لے لیتے تھے، خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام، اب اس کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے؟''

اس سلسلے میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بیان کیں۔

اکبر نے پھر کہا: ''ہم نے شیخ عبدالنبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے۔''

علما نے کہا: ''ایک مجتہد ابن ابی لیلیٰ کا یہ رجحان ہے۔ بعض نے آیت مبارکہ:
فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ [1] کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز ٹھہرا دیا ہے۔ لیکن یہ تمام روایات مرجوح ہیں، ان پر عمل کرنا جائز نہیں۔''

بادشاہ نے شیخ عبدالنبی سے دریافت کرایا تو انھوں نے جواب دیا: ''میں نے جو کچھ کہا تھا، اس سے کچھ اختلافات کا اظہار مقصود تھا، اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا۔''

شیخ عبدالنبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا، اور کہا: ''اس طرح تو شیخ نے ہم سے منافقت کی، اس وقت تو کچھ اور کہا تھا۔ اب کچھ اور کہہ رہا ہے۔''

بس اسی وقت سے شیخ عبدالنبی کی طرف سے اکبر کا دل پھر گیا۔ بادشاہ کے اصرار کو دیکھ کر علما نے اختلافی روایات جمع کر کے آخر یہ فتویٰ دیا کہ:

''متعہ کی صورت میں جتنی عورتیں چاہیں، نکاح میں رکھنا مباح ہے۔''

بدایونی اس سے آگے لکھتے ہیں:

''اور یہ امام مالک کے مسلک میں جائز ہے۔ شیعہ تو اس لڑکے کو جو متعہ میں پیدا ہوا ہو، دوسرے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ حالانکہ اہل سنت کا یہ طریق نہیں ہے۔ غرض اس موضوع پر بڑی بحثیں ہوئیں۔

[1] یہ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳ ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: جو عورتیں تمہیں پسند آئیں، ان میں سے تم دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر سکتے ہو۔

میر غیاث الدین نے (جو نقیب خاں کے لقب سے ملقب تھے) امام مالک کی کتاب موطا دکھائی اور بتایا کہ اس کی تو ایک حدیث میں صراحتاً متعہ کی ممانعت کی گئی ہے۔"

اس سے آگے متعہ کے جواز و عدم جواز کے بارے میں بدایونی کی پوری عبارت کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

"ایک رات انوپ تلاؤ کے حجرے میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب، شیخ ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور ایک دو اور عالم بیٹھے تھے۔ شیخ ابوالفضل نے علما کی مخالفت کرتے ہوئے وہ روایات جو اس کے والد ملا مبارک نے جواز متعہ کے بارے میں جمع کر کے دی تھیں، بیان کیں۔ بادشاہ نے مجھے (یعنی بدایونی کو) بھی بلایا اور پوچھا:

"تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟"

میں نے عرض کیا: "اس ضمن میں ان تمام مختلف روایات اور مسالک فقہی کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہو جاتا ہے، اور وہ یہ کہ متعہ امام مالک اور علمائے شیعہ کے نزدیک بالاتفاق مباح ہے۔ امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرام ہے۔ لیکن جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا باضابطہ حکم جاری کر دے تو اسی وقت امام ابوحنیفہ کے مذہب میں بھی بالاتفاق مباح ہو جاتا ہے۔ بس یہی ایک پتے کی بات ہے، اس کے علاوہ محض قیل و قال اور بحث و جدال ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ بادشاہ کو میری یہ بات بہت پسند آئی۔ مگر قاضی یعقوب نے مجھ سے بحث شروع کر دی اور بحث بہت طول پکڑ گئی۔ میں نے ان سے کہا جو مسئلہ مختلف فیہ ہو، وہ قاضی کے حکم کے بعد متفقہ ہو جاتا ہے۔ اپنے اس دعوے پر میں نے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلے کو اور بعض دوسری مثالوں کو بطور دلیل پیش کیا۔ میں نے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا قصہ بھی بیان کیا کہ جب وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد گئے تو انھوں نے شافعی مذہب کے مطابق امام کی اقتدا میں سورہ فاتحہ پڑھی تھی۔ ان کے اس عمل کو علما نے ہدف طعن و تنقید ٹھہرایا تھا، مگر دہلی کے قاضیوں نے نہ صرف اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے موقف کی تائید کی، بلکہ اس کے مستحسن ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ جب میں نے یہ باتیں پوری وضاحت سے بیان کیں تو قاضی یعقوب کو اس کا قائل ہونا پڑا، اور بالآخر عاجز آ کر بادشاہ سے کہا:

"میں کیا کہوں، متعہ کا مباح ہونا مبارک ہو۔"

بادشاہ نے فرمایا: "اس مسئلے میں ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں، اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔"

اسی وقت قاضی حسین کو قاضی بنایا گیا اور اس نے اپنے مذہب کے مطابق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔"

اس کے ساتھ ہی بدایونی لکھتے ہیں:

"اب تمام پرانے اور بوڑھے علما، صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی، مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری اور قاضی یعقوب تک کے لیے، یہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی، اور اسی روز سے ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد اکبر نے مولانا جلال الدین ملتانی کو جو بہت بڑے عالم تھے اور جن کی مدد معاش

روک دی گئی تھی‘ آگرہ سے بلا کر تمام ممالک محروسہ کا قاضی مقرر کر دیا‘ اور قاضی یعقوب کو بنگال کے منصب قضات پر متعین کر دیا۔ اسی دن اختلافات کا دروازہ کھل گیا‘ یہاں تک کہ دین میں اجتہاد کی نوبت آ گئی ❶۔

مسئلہ متعہ پر بدایونی نے اپنی تصنیف نجات الرشید میں بھی بحث کی ہے ❷۔ اور بحث ختم کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

ماحصل ہمہ مقدمات مذکورہ ایں است کہ متعہ نزد حنفی و شافعی مطلقاً حرام و نزد مالکی و شیعی بہ اتفاق حلال است۔ باآنکہ در کتاب موطا کہ تصنیف امام مالک رضی اللہ عنہ است‘ خلاف او وارد است۔ امام اگر چہ قاضی بہر مذہب کہ باشد بر مذہب امام مالک حکم بہ جواز متعہ کند‘ نزد ہمہ بہ اتفاق جائز باشد۔ و بے ایں صورت حق آں است کہ قائل بہ حرمت آں باید بود کہ موجب دلیری عوام و خلل در نسل می شود ❸۔

(ان تمام مقدمات مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ متعہ حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک مطلقاً حرام ہے اور مالکیہ اور شیعہ کے نزدیک بہ اتفاق حلال ہے‘ اگرچہ امام مالک کی تصنیف موطا میں اس (متعہ) کے خلاف لکھا گیا ہے۔ لیکن اگر قاضی‘ بے شک وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو‘ امام مالک کے مذہب کے مطابق جوازِ متعہ کا فیصلہ دے دے تو سب کے نزدیک بہ اتفاق جائز ہو جائے گا۔ اس صورت پر عمل کیے بغیر صحیح بات یہ ہے کہ یہ حرام ہی رہے گا‘ کیوں کہ اس سے عوام میں دلیری پیدا ہوتی ہے اور نسل و نسب میں خلل پیدا ہوتا ہے۔)

اس ضمن میں بدایونی کی بالکل آخری سطریں یہ ہیں:

وایں بحث بہ تقریب استفسار خلیفہ زمان از علمائے عصر بہ تفصیل در رسالہ علاحدہ نوشتہ است۔ اگر استیعاب خواہند درآں جا بنگرند ❹۔

(یہ بحث جو خلیفہ وقت (اکبر) کے‘ اس دور کے علما سے استفسار کی صورت میں سامنے آئی‘ ایک علیحدہ رسالے میں تحریر کی گئی ہے۔ اگر تفصیل میں جانا مقصود ہو تو وہاں دیکھ لی جائے ❺۔)

دربار اکبری میں متعہ کے جواز و عدم جواز کی بحث کے سلسلے میں ہم نے بدایونی کی منتخب التواریخ کی

---

❶ منتخب التواریخ۔ ج ۲‘ ص ۲۰۷ تا ۲۱۱۔

❷ ملاحظہ ہو: نجات الرشید از ص ۴۳۴ تا ۴۳۸۔

❸ ملاحظہ ہو: نجات الرشید از ص ۴۳۸۔

❹ نجات الرشید۔ ص ۴۳۸۔

❺ بدایونی کا کوئی ایسا رسالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا‘ جس میں یہ بحث مفصل مرقوم ہو۔ منتخب التواریخ میں لکھا گیا ہے کہ نجات الرشید میں بحث کا خلاصہ موجود ہے۔ نجات الرشید میں کسی اور رسالے کا حوالہ دیا گیا ہے‘ جس کا نام مذکور نہیں۔ شاید اس رسالے سے منتخب التواریخ کی بحث مقصود ہو‘ کیونکہ یہ کتاب بادشاہ سے چھپ چھپا کر لکھی گئی تھی۔ نجات الرشید انہوں نے بادشاہ کو پیش کر دی تھی۔

پوری عبارت درج کر دی ہے اور نجات الرشید کا ماحصل پیش کر دیا ہے۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ بادشاہ کو ''اجتہاد'' کی راہ پر لگانے میں بدایونی کے غلط استدلال کا بھی حصہ ہے۔ انھوں نے جس اسلوب بیان اور علم کلام سے جوازِ متعہ کا ثبوت پیش کیا' اور اپنی قوتِ بیانیہ سے متعہ کے عدم جواز کے حامی علما کو خاموش کرایا' اس سے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس ضمن میں ملا مبارک' ابوالفضل اور بدایونی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ بدایونی نے اس کے جواز میں جو دلائل دیے ہیں' وہ سراسر غلط ہونے کے باوجود زیادہ مؤثر اور زوردار ہیں۔ بدایونی کا یہ کہنا بھی قطعی غلط ہے کہ امام مالک جوازِ متعہ کے قائل ہیں۔ پھر ان کی یہ بات بھی ہرگز قرین صحت نہیں کہ کسی ایک فقہی مسلک کے حامل قاضی کا حکم یا فیصلہ' اس کے مخالف کے لیے قابل تسلیم اور لائق عمل قرار پا جاتا ہے۔ فیصلہ وہی صحیح ہوگا جو کتاب وسنت کے مطابق ہوگا' اس کے علاوہ ہر فیصلہ غلط ہوگا' خواہ اسے کسی مسلک کا قاضی جاری کرے۔ علمی اور اصولی اعتبار سے یہ بات نا قابل اعتنا ہے کہ متنازعہ مسئلے میں کسی ایک مسلک کے قاضی کا فیصلہ' اس مسئلے کو جواز میں بدل دیتا ہے اور پھر اس پر سب کے لیے عمل کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

تعجب ہے' ایک طرف تو بدایونی لکھتے ہیں کہ امام مالک نے اپنی تصنیف مؤطا میں متعہ کی مخالفت کی ہے۔ دوسری طرف فرماتے ہیں کہ امام مالک کے پیروکار متعہ کے جواز کے قائل ہیں۔ بدایونی کا یہ تمام تر اندازِ استدلال غلط ہے۔

موطا حدیث کی شہرہ آفاق کتاب ہے۔ بعض علما کے نزدیک اسلوب وترتیب کے اعتبار سے یہ اس درجہ اونچے مرتبے کی کتاب ہے کہ صحاح ستہ میں داخل ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جو ائمہ اربعہ میں سے ایک مشہور امام ہیں اور عمل اہل مدینہ کے قائل ہیں' اس کتاب کے مرتب ومؤلف ہیں۔ انھوں نے کتاب النکاح کے ذیل میں ایک باب باندھا ہے' جامع مالا یجوز من النکاح۔ اس میں مختلف عنوانات کے تحت ان کا ذکر کیا ہے' جن سے نکاح جائز نہیں ہے۔ اسی ضمن میں نکاح المتعۃ ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں وہ سند کے ساتھ ایک حدیث درج کرتے ہیں' جس کے الفاظ یہ ہیں:

> عن علی ابن ابی طالب ان رسول الله صلی الله علیه وسلم نهی عن متعة النساء یوم خیبر و عن اکل لحوم الحمرا الانسیته[1]۔
>
> (حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر کے موقعے پر عورتوں سے متعہ کرنے اور گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔)

اس کے ساتھ ہی امام مالک نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا وہ قول بھی نقل کیا ہے' جس میں انھوں نے متعہ کرنے والے کو قابل رجم قرار دیا ہے[2]۔

[1] مؤطا امام مالک۔ص ١٩٦

[2] مؤطا' امام مالک۔ص ١٩٦۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی محدث رحمہ اللہ' اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

اتفق العلماء على تحريم المتعة وهو كالاجماع بين المسلمين وكانت مباحا في اول الاسلام ثم نسخ ❶۔

(علما کا متعہ کے حرام ہونے پر اتفاق ہے' اور یوں سمجھیے کہ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ ابتدائے اسلام میں یہ مباح تھا' بعد کو منسوخ کر دیا گیا۔)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام مالک کے نزدیک متعہ اسی طرح حرام ہے' جس طرح دوسرے مسالک اہل سنت کے نزدیک حرام ہے۔ جب مسلمانوں کا اس کی تحریم پر اجماع ہے تو مالکیہ کو اس سے مستثنیٰ کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان عليا رضى الله عنه قال لابن عباس ان النبى ﷺ نهى عن المتعة وعن لحوم الحمر الاهلية زمن خيبر ❷۔

(حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ خیبر کے زمانے میں متعہ سے اور گھریلو گدھے کے گوشت سے منع فرما دیا۔)

حرمت متعہ کے بارے میں صحیح بخاری کے الفاظ بالکل صاف ہیں۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں خاصی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس ضمن میں قاضی عیاض کے' جو مالکی مسلک کے معروف عالم ہیں' یہ الفاظ بھی درج کیے ہیں:

وقال عياض ثم وقع الاجماع من جميع العلماء على تحريمها الا الروافض ❸۔

(قاضی عیاض کہتے ہیں کہ پھر شیعہ کے سواء متعہ کی حرمت پر علما کا اجماع ہو گیا۔)

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نکاحِ متعہ کے جواز کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

واما ابن عباس فروى عنه انه اباحها وروى عنه انه رجع عن ذلك ❹۔

❶ مسوی شرح مؤطا۔ ج ۲' ص ۱۹۶۔

❷ صحیح بخاری' کتاب النکاح: باب نہی النبی ﷺ عن نکاح المتعۃ اخیراً۔

❸ فتح الباری۔ ج ۹' ص ۱۳۸' طبع مصر۔

❹ ایضاً۔

(رہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تو ان سے متعہ کی اباحت مروی ہے' اور یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔)

یعنی بعد کو متعہ کے عدم جواز کے قائل ہو گئے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی' قرطبی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

وقال القرطبی الروایات کلها متفقة علی ان زمن اباحة المتعة لم یطل و انه حرم' ثم جمع السلف و الخلف علی تحریمها الا من لایلتفت الیه من الروافض [1]۔

(قرطبی کہتے ہیں' تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ اباحت متعہ کا زمانہ طویل نہ تھا۔ اسے حرام ٹھہرا دیا گیا تھا' پھر سلف و خلف کا اس کی تحریم پر اجماع ہو گیا تھا۔ مگر شیعہ نے حرمت متعہ کی طرف التفات نہیں کیا۔)

سلف و خلف کے اس عظیم و لاتعداد گروہِ علما میں ظاہر ہے کہ امام مالک اور ان کے مسلک کو ماننے والے تمام مالکیہ شامل ہیں ____ اس ضمن میں حافظ ابن حجر مزید لکھتے ہیں کہ مالکیہ تو نکاح مؤقت کے سخت مخالف ہیں۔ وہ تو اس نکاح ہی کو باطل قرار دیتے ہیں' جو چند گھنٹوں یا چند دنوں کے لیے کیا جائے۔ ان کے الفاظ درج ذیل ہیں:

وقال ابن دقیق العید ماحکاه بعض الحنفیة عن مالك من الجواز' خطاء۔ فقد بالغ الما لکیة فی منع النکاح المئوقت' حتی ابطلوا توقیت الحل بسببه ۔ فقالوا لوعلق علی وقت لا بد من مجیئه' وقع الطلاق الاٰن۔ لانه توقیت للحل' فیکون فی نکاح المتعة ۔ قال عیاض واجمعوا علی ان شرط البطلان التصریح بالشرط [2]۔

(ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ بعض حنفیہ نے امام مالک سے متعہ کا جو جواز بیان کیا ہے' وہ غلط ہے۔ مالکیہ تو نکاح مؤقت کی ممانعت میں بڑی شدت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو اس کا مؤقت ہونا ہی اس کی حلت کو باطل ٹھہرا دیتا ہے۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر طلاق کو خاص وقت تک کے لیے معلق کر دیا جائے' جس کا آنا ضروری ہے۔ (یعنی عورت کو کہا جائے کہ کل شام کو تمھیں طلاق) تو ابھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ کیوں کہ

[1] فتح الباری۔ ج ۹' ص ۱۳۸' طبع مصر۔

[2] ایضاً۔

نکاح کو جو حلال ہے' مؤقت قرار دینا' نکاح متعہ کے حکم میں آتا ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں' اس بات پر علما کا اجماع ہے کہ نکاح کو کسی شرط کے ساتھ مشروط کرنا ہی اس کے بطلان کی دلیل ہے۔)

بہرحال اہل سنت کے کسی امام کے نزدیک متعہ جائز نہیں ہے اور ان سب کا اس کی تحریم پر اجماع ہے۔ بدایونی کا یہ نقطہ نظر بھی غلط ہے کہ جہاں کوئی عالم جائے' وہیں کے علما کے فقہی مسلک کو اختیار کرے۔

## شاہ پسندوں سے بُعد:

جس زمانے (۹۸۱ھ/۱۵۷۳ء) میں بدایونی دربار اکبری میں پہنچے اسی زمانے میں ملا مبارک کا بیٹا ابوالفضل بارگاہِ خسروی میں باریاب ہوا۔ اس سے پہلے شاعر کی حیثیت سے فیضی بھی دربار شاہی میں موجود تھا۔ اور بھی بہت سے علما کی بڑی تعداد دربار سے منسلک تھی۔ ابوالفضل بڑی تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ باپ کی علمی مدد اور خود اپنے زور ذہانت سے دربار میں نمایاں نظر آنے لگا۔ اب بادشاہ کا دل چونکہ دینی اثرات اور مذہبی رجحانات سے روز بروز خالی ہو رہا تھا' اس لیے ابوالفضل نے علما کی تذلیل اور اسلامی تعلیمات کی توہین کا برملا سلسلہ شروع کر دیا' جس میں خود بادشاہ اور اس کے ہندو مصاحب بھی دلچسپی لینے لگے۔ لیکن بدایونی خالص مذہبی جذبات کے حامل تھے اور دینی تعلیمات کا اثر ان پر پوری طرح حاوی تھا' اس لیے وہ نہ صرف ابوالفضل وغیرہ سے متاثر نہیں ہوئے' بلکہ ان کی کھل کر مخالفت کی۔ انھیں ذہنی طور پر یہ شدید احساس تھا کہ ابوالفضل جیسے لوگ تو بادشاہ کے منظور نظر ہیں اور برابر ترقی کی منزل کی طرف گامزن ہیں' لیکن وہ (بدایونی) جو اتنے بڑے عالم' علوم مروجہ کے ماہر اور بادشاہ کے امام نماز ہیں' دربار میں کم حیثیت کے مالک ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟

یہی وجہ ہے کہ بدایونی کا قلم بہت تیز ہو گیا ہے اور دربار کے ہر امیر اور عالم پر اپنی تحریر میں طنز واستہزا کے تیر چلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ چھوٹے کی قدر اور بڑے کی ناقدری سے انھیں شدید تکلیف ہوتی ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ نااہل کو آگے بڑھا دیا گیا ہے اور اہل کو پیچھے دھکیل دیا گیا ہے تو وہ سراپا احتجاج ہو جاتے ہیں اور نہایت دکھ کے ساتھ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کئی سال کسی نہ کسی طریقے سے اکبر کے دربار سے منسلک رہے لیکن نہ کبھی بادشاہ کی زیادہ خوشامد کی' نہ ہر غلط بات میں اس کی تائید کی اور نہ ان امرا و علما سے ذہنی طور پر متفق ہو سکے' جنھوں نے ہر معاملے میں بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے کو اپنے لیے فرض قرار دے لیا تھا۔

بدایونی اپنی ملازمت کے ابتدائی دور ہی میں بادشاہ اور اس کے امرا سے کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے تھے اور ان سے دور دور رہنے لگے تھے' کیونکہ وہ اپنی نیکی اور افتادِ طبع کی بنا پر اس ماحول میں جو بعض لوگوں نے پیدا کر دیا تھا' اپنے آپ کو وابستہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کئی مرتبہ طویل رخصت لے کر گھر گئے اور پھر آ گئے۔ وہ عالم دین'

ذہین وطباع اور بہترین مصنف ومترجم تھے‘ اس لیے بادشاہ کو ان کی ضرورت رہتی تھی۔ بادشاہ کو خوب معلوم تھا کہ وہ دربار کی ملازمت سے ناخوش ہیں اور اس کے پاس رہنے سے انھیں ذہنی تکلیف ہوتی ہے لیکن ان کی قابلیت کی وجہ سے وہ ان سے تعلق قائم رکھنے پر مجبور تھا۔ اس نے قاضی علی کی کوشش سے ہزار بیگھہ زمین بھی انھیں مدد معاش کے لیے دے دی تھی‘ مگر چونکہ وہ مستقل طور سے ملازمت نہیں کرتے تھے‘ لٰہذا اس میں سے بھی کچھ زمین واپس لے لی گئی۔ وہ منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں:

''میں عرصے سے ملازمت سے علیحدہ ہو کر گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ کے قیام اجمیر کے زمانے میں‘ قاضی علی نے مجھے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور میری مدد معاش کے لیے ہزار بیگھہ اراضی کا وعدہ یاد دلایا۔ بادشاہ نے کہا: ''مجھے یاد ہے کہ اس کے متعلق جاری کردہ فرمان میں ملازمت پر قائم رہنے کی شرط تھی۔'' قاضی علی نے جواب میں کہا: ''جی ہاں! بشرط خدمت ان کو زمین دی گئی تھی۔'' بادشاہ نے کہا: ''اس سے پوچھو‘ کیا کوئی ضعف و عارضہ لاحق تھا کہ اس نے ملازمت ترک کر دی۔'' قاضی خاں بدخشی نے فوراً جواب دیا: ''قسمت کا ضعف تھا۔'' اس موقعے پر تمام مقربین دربار نے سابقہ امامت کا حق سمجھ کر ___ سابقہ اس لیے کہ ان دنوں نماز باجماعت بالکل ہی ختم کر دی گئی تھی ___ (دریں ایام باجماعت واذان کہ ہر پنج وقت برائے خاطر جماعت در درباری گفتند برطرف شد ❶۔) میرے لیے سفارش کی۔ بادشاہ نے جواب دیا: ''ہم کسی کو ملازمت میں رہنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اگر یہ ملازمت نہیں کرنا چاہتا تو اس کی زمین نصف ہو جائے گی۔'' میں نے فوراً ہی یہ بات قبول کر لی جو بادشاہ کو بڑی ناگوار گزری اور میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ قاضی علی نے دوبارہ عرض کیا کہ ''آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟'' اور اس پر بڑا اصرار کیا تو فرمایا: ''شیخ عبدالنبی سے پوچھا جائے کہ یہ ملازمت کی شرط کے بغیر کتنی اراضی کا مستحق ہو سکتا ہے۔'' شیخ سے پوچھا گیا تو انھوں نے مولانا اللہ داد امروہی مرحوم کے ذریعے کہلوایا کہ ''چونکہ عبدالقادر عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمے کافی اخراجات ہیں‘ لٰہذا میں حسب الحکم اس کے لیے آٹھ سو یا سات سو بیگھہ اراضی تجویز کرتا ہوں۔'' ___ مصاحبوں اور مقربوں کا خیال تھا کہ اب کوئی اور عرض داشت (جو ملازمت ترک کر دینے کے متعلق ہو) مناسب نہیں ہے‘ وہ سب مجھے ملازمت اختیار کر لینے پر مجبور کرنے لگے۔ مجبوراً میں دوبارہ اس ملازمت کے چکر میں پھنس گیا‘ جس سے بمشکل نجات حاصل ہوئی تھی۔ یہ سب سزا اس لیے بھگتنا پڑی کہ میں نے قبل ازیں بادشاہ کے بار بار حکم دینے کے باوجود داغ کی تجویز قبول نہیں کی تھی۔

بدایونی اگرچہ دربار شاہی سے کبیدہ خاطر ہو چکے تھے اور وہاں رہنا ان کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا، بادشاہ اور بدایونی کے افکار و خیالات میں بڑا بعد پیدا ہو چکا تھا۔ تاہم ان کی قابلیت کی وجہ سے بادشاہ کو پھر ان

❶ منتخب التواریخ۔ ج۲‘ ص۲۱۴۔

کی ضرورت پڑتی تھی اور وہ آ جاتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ بڑے غور و تامل کے بعد پانچ ماہ کی رخصت منظور ہوئی۔ خواجہ نظام الدین ہروی نے (جو بدایونی کے بہت مشفق اور قدردان دوست تھے) بادشاہ سے عرض کی کہ ان کی والدہ وفات پا گئی ہیں' اہل خانہ کی تسکین و تسلی کے لیے وطن جانا ضروری ہے۔ لہٰذا رخصت عطا کی جائے۔ بادشاہ نے جانے کی اجازت تو دے دی مگر بہت ناخوش گوار انداز سے دی۔ سلام کے لیے صدر جہاں نے دو دفعہ بدایونی سے کہا۔ ''سجدہ بکن'' (بادشاہ کو سجدہ کرو)۔ یہ ان سے ہو نہ سکا تو بادشاہ نے رنجیدگی کے عالم میں کہا: ''جانے دو۔''

## بدایونی حج کی سعادت نہ حاصل کر سکے:

۹۸۵ھ/ ۱۵۷۷ء کے حالات میں بدایونی لکھتے ہیں کہ اس سال کے ماہِ رجب میں' جو خواجہ معین الدین اجمیری کے عرس کا زمانہ ہے' بادشاہ نے اجمیر کا عزم کیا۔ جب سواری ٹوڈا کے مقام پر پہنچی تو شاہ ابوتراب' جو شیراز کے اکابر سادات میں سے تھے اور سلاطینِ گجرات کے شیخ و مرشد تھے' ملاقات کے لیے آئے۔ میرٹھ کے قریب پہنچے تو بادشاہ نے شاہ ابوتراب کو حجاج کا امیر مقرر کیا اور حکم دیا کہ حاجیوں کا ایک قافلہ ترتیب دیا جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کا خواہاں ہو' اس قافلے میں شامل ہو سکتا ہے۔ گجرات کے اعتماد خاں کو کثیر رقم دے کر شاہ ابوتراب کے ساتھ جانے کا حکم جاری کیا۔ بدایونی لکھتے ہیں' میرے دل میں شوق حج نے کروٹ لی اور شیخ عبدالنبی کی خدمت میں گیا' ان سے عرض کیا کہ میرے لیے بھی بادشاہ سے حج پر جانے کی اجازت لے دیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

کیا آپ کی والدہ زندہ ہیں۔''؟

میں نے کہا: ''ہاں زندہ ہیں!''

کہا: ''آپ کا کوئی بھائی یا ایسا رشتے دار ہے جو آپ کے بعد ان کی خدمت کرتا رہے؟''

عرض کیا: ''نہیں' صرف میں ہی ان کا ذریعہ خدمت ہوں!''

فرمایا: ''اگر آپ والدہ سے اجازت لے لیں تو بہتر ہوگا۔''

غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں۔

## بیٹے کا نام بادشاہ نے رکھا:

ذہنی بُعد اور اختلاف کے باوجود بدایونی کے دل میں بادشاہ کا احترام موجود تھا۔ گھریلو معاملات میں بھی وہ اس سے مشورے کو ضروری قرار دیتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام بادشاہ سے پوچھ کر رکھا۔ لکھتے ہیں:

میں لشکر کے ساتھ ریواڑی کے ضلع میں تھا کہ وطن سے بیٹے کی ولادت کی اطلاع موصول ہوئی۔ نہایت خوشی ہوئی اور جذبات مسرت سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا' اشرفی نذر کی اور نام کے لیے عرض کیا۔'' فرمایا'' تمھارے باپ اور دادا کا کیا نام ہے؟'' عرض کی۔'' ملوک شاہ بن حامد شاہ۔'' ان دنوں ''یا ھادی'' کا وظیفہ بادشاہ کے ورد زباں تھا۔ فرمایا۔'' اس کا نام عبدالہادی رکھو۔'' حافظ محمد ابن خطیب بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے ہر چند کہا کہ نام رکھنے کے بھروسے پر نہ رہو' حافظوں کو بلاؤ اور لڑکے کی درازیٔ عمر کے لیے قرآن پڑھوا کر دعا کراؤ۔ میں نے ان کی بات کی پروانہ کی۔ آخر چھ مہینے کے بعد لڑکا فوت ہو گیا۔ خدا میرے لیے اس کے ثواب کو ذخیرہ آخرت بنائے اور اسے قیامت کے دن میرا شفیع کرے [1]۔

## دوستوں کی جدائی کا غم:

اس کے بعد وہ دور آیا کہ بدایونی شاہی مجالس سے اس قدر متنفر ہو گئے کہ بہت دور دور رہنے لگے۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کوئی ضروریات انھیں دربار میں کھینچ لاتی تھیں اور کبھی ان کی علمی قابلیت کی وجہ سے خود بادشاہ ان کو بلانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں جن درباری علما کے وہ شدید مخالف تھے' اور جن سے ان کی بحثوں کا سلسلہ دربار میں اور دربار سے باہر جاری رہتا تھا' ان میں ابوالفضل اور فیضی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ دونوں بھائی بدایونی کے علم و فضل کے بہت مداح تھے' اور بادشاہ بدایونی سے ناراض ہو جاتا تو یہ ان کی بادشاہ سے سفارش بھی کرتے تھے۔ اس کا ذکر خود بدایونی اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں کرتے ہیں:

درباری علما میں ملا نظام الدین ہروی' بدایونی کے مخلص و مشفق دوست تھے۔ اور ان کے بے حد بہی خواہ۔! بدایونی نے ان کی شفقتوں اور بادشاہ سے سفارشوں کا کئی مقام پر تذکرہ کیا ہے۔

درباری علما ایک بڑی جماعت پر مشتمل تھے اور مختلف مسائل سے متعلق ان کی مخالفانہ و موافقانہ بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بدایونی کے آخری زمانے میں ان میں سے زیادہ تر علما وفات پا چکے تھے۔ بدایونی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اس تاریخ سے اب تک کہ دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے' مباحثہ و مجادلہ کرنے والوں کی اس جماعت میں جو سو سے زیادہ افراد پر مشتمل تھی' محقق و مقلد کوئی بھی تو نظر نہیں آتا ہے۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب ڈال چکی ہے۔ اللہ کا یہ فرمان بلاشبہ صحیح ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ وہ محفلیں اجڑ گئیں ہیں' اور ایک میں سوگوار رہ گیا ہوں۔ جب ان کی یاد آتی ہے تو میری غم زدہ آنکھیں حیرت و افسوس کے ساتھ خون کے

---

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۲' ص ۲۵۲۔

آنسو روتی ہیں، اور دل نالہ وفریاد کرنے لگتا ہے۔ کاش! وہ لوگ کچھ دن اور زندہ رہتے کہ بہر نوع اس قحط الرجال میں ان کا وجود بڑا غنیمت تھا۔ اب کس سے بات کریں۔ مبادلۂ خیالات کا لطف تو ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ اب مجھ ناکارہ وافتادہ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان کی جدائی کے داغ سے جلتا اور دل ہی دل میں آہ وفریاد کرتا رہوں:

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند　　دریائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنگ شراب در مجلس عمر　　یکہ لحظہ زما پیشترک مست شدند

## علمی وتصنیفی خدمات:

بدایونی کی علمی وتصنیفی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ انھوں نے دربار اکبری میں آنے سے پہلے بھی تصنیفی خدمات انجام دیں، دربار میں آنے کے بعد اکبر کے حکم سے بھی ترجمہ وتالیف میں نام پیدا کیا اور پھر زندگی کے آخری وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اکبر سے انسلاک کے بعد انھوں نے بادشاہ کے حکم سے سب سے پہلے سنگھاسن بتیسی کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ۹۸۲ھ کے ماہ صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے فتح بنگالہ کے ارادے سے کوچ کیا۔ اس سفر میں بدایونی بھی اکبر کے ساتھ تھے۔ واپسی پر ۶ جمادی الاولیٰ ۹۸۲ھ/ ۲۱ر اگست ۱۵۷۴ء کو شاہی لشکر جون پور پہنچا اور ایک مہینا تین دن وہاں مقیم رہا۔ ۹ جمادی الاخری کو دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ اس سفر میں بادشاہ کے سامنے بدایونی کی علمی قابلیت کے مزید جوہر کھلے، اور ان کی وسعت معلومات کا پتا چلا تو وہ اور بھی متاثر ہوا۔ جمادی الاخریٰ ہی کی کسی تاریخ کو جب قافلۂ شاہی کا نزول شیر گڑھ کے قصبے میں ہوا تو بادشاہ نے بدایونی کو شرف مخاطبت سے نوازا اور حکم دیا کہ سنگھاسن بتیسی کا فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ کتاب بتیس کہانیوں پر مشتمل ہے، جو مالوہ کے راجہ بکرماجیت کے حالات سے متعلق ہیں۔ اصل کتاب سنسکرت زبان میں ہے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کر کے اسے طوطی نامہ کے اسلوب پر نظم ونثر میں ترتیب دیا جائے اور ایک ورق کا ترجمہ نمونے کے طور پر آج ہی پیش کیا جائے۔ ایک صاحب علم برہمن کو بھی مدد کے لیے مقرر کیا۔ چنانچہ بدایونی نے اسی دن پہلی کہانی کا ایک ورق ترجمہ کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے بہت تعریف کی۔ کتاب کا ترجمہ مکمل ہو گیا تو اس کا نام ''نامہ خردافزا'' رکھا۔ یہ اس کا تاریخی نام ہے۔ کیونکہ کتاب میں اس کا تصنیفی اور تاریخی پس منظر بھی شامل ہے۔ بادشاہ نے کتاب پسند کی اور کتب خانہ شاہی میں داخل ہوئی۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے جو بدایونی نے منتخب التواریخ میں چھتیسویں سال جلوس (۹۹۹ھ/ ۱۵۹۱ء) کے واقعات کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ شاہی کتب خانے سے ''نامہ خردافزا'' کا نسخہ گم ہو گیا تھا، سلیمہ سلطان نے اس سلسلے میں بدایونی کو کئی دفعہ یاد فرمایا اور بدایوں میں ان کو بلانے کے لیے قاصد بھیجے۔ مگر وہ کچھ ایسی

الجھنوں میں گرفتار تھے کہ نہ جا سکے۔ آخر بادشاہ نے حکم دیا کہ بدایونی کی مدد معاش موقوف کر دی جائے اور اسے زبردستی بدایوں سے دربار میں لایا جائے۔ لیکن اس موقعے پر مرزا نظام الدین احمد نے دوستی کا حق ادا کیا۔ ابوالفضل نے بادشاہ سے سفارش کی اور ہر بار یہی کہا کہ کوئی مشکل ضرور درپیش ہوگی' جس کی وجہ سے وہ نہیں آ سکے اور بدایوں میں بیٹھے ہیں:

۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء کو دکن کا ایک پڑھا لکھا برہمن شیخ بھاون دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے اسلام قبول کر کے بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے بدایونی کو حکم دیا کہ ''اتھربن بید'' کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ یہ ہندوؤں کا چوتھا وید ہے اور اس کے بعض احکام اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ترجمے کے سلسلے میں ایک پنڈت کی خدمات بھی بدایونی کے سپرد کیں۔ کام شروع کیا گیا تو کتاب کی بعض نہایت پیچیدہ عبارتیں سامنے آئیں' جنھیں بدایونی بھی سمجھنے سے قاصر تھے اور ان کی صحیح تعبیر وہ پنڈت بھی نہیں کر پاتا تھا۔ جب یہ مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے یہ کام پہلے تو فیضی کے سپرد کیا اور بعد کو حاجی ابراہیم سرہندی کو اس پر مامور فرمایا۔ لیکن وہ بھی اس کا بہتر ترجمہ نہ کر سکے۔

اس چوتھے وید (اتھربن بید) کے احکام میں ایک حکم یہ ہے کہ جب تک ایسی عبارت' جس میں کئی لام آتے ہیں' مثلاً لا الٰہ الا اللّٰہ نہ پڑھی جائے' نجات نہیں ہوگی۔ ایک حکم میں چند شرائط کے ساتھ گائے کا گوشت مباح قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ میت کو دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جلانے سے روکا گیا ہے۔

اس وید کے یہ احکام بحث میں بیان کر کے شیخ بھاون نے ہندوستان کے بہت سے برہمنوں کو لاجواب کر دیا تھا اور اسی سے متاثر ہو کر اس نے اسلام قبول کیا تھا۔

۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

بادشاہ ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء میں پنجاب کا دورہ کر کے دہلی پہنچا۔ وہاں سے اجمیر گیا اور عرس میں شامل ہوا۔ دوسرے دن آگرہ کا قصد کیا۔ صبح کے وقت ٹوڈا میں منزل ہوئی' تو میں بساور سے استقبال کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ حاضر ہو کر اپنی تصنیف ''کتاب الاحادیث'' پیش خدمت کی۔ یہ کتاب فضیلت جہاد اور تیر اندازی کے اجر و ثواب کے موضوع سے متعلق ہے۔ کتاب کتب خانہ شاہی میں داخل ہوئی۔

۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کو بادشاہ نے کہا کہ ہجرتِ رسول اکرم ﷺ پر ہزار سال پورے ہو چکے ہیں۔ اب تاریخ کی ایک ایسی کتاب لکھی جائے' جس میں گزشتہ ہزار سال کے تمام شاہان اسلام کے واقعات و حالات درج ہوں اور تاریخ کی یہ کتاب دوسری کتب تواریخ کے غلط واقعات کی ناسخ اور تردید کناں ہو۔ اس کا نام ''تاریخ الفی'' رکھا جائے اور اس میں ''سن'' کے ساتھ بجائے لفظ ''ہجری'' کے ''رحلت'' کا لفظ لکھا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے لے کر اس زمانے (یعنی ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء) تک کے حالات معرضِ تحریر

لانے کے لیے سات اشخاص کو مامور کیا گیا' جن میں ایک ملا عبدالقادر بدایونی تھے۔ بدایونی کو جن سنین کے واقعات ضبطِ کتابت میں لانے کا کام سپرد ہوا' ان میں خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات بھی تھے۔ ایک شب یہ مسودہ بادشاہ کے ملاحظہ میں تھا۔ جب بادشاہ پڑھتے پڑھتے حضرت عمر کے حالات کے ضمن میں کوفہ شہر کی تعمیر' قصر امارت کے انہدام' حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی حضرت ام کلثوم سے حضرت عمر کے نکاح اور شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے بڑے بڑے بچھوؤں کے نکلنے کے واقعات پر پہنچا تو ان مندرجات پر بحث شروع کر دی اور خاصی ردوقدح کی۔ آصف خاں ثالث یعنی مرزا جعفر نے اس بحث میں بادشاہ کی تائید کی جو بالکل غلط تھی۔ البتہ ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی نے ان واقعات کو صحیح قرار دیا اور تاریخی حیثیت سے مبنی بر صحت ٹھہرایا۔ اس موقعے پر اکبر نے بدایونی سے ان واقعات کے ماخذ کے بارے میں بھی سوال کیا اور پوچھا کہ ''تم نے یہ حالات کہاں سے لیے ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''میں نے کچھ اپنی طرف سے بنا کر تو نہیں لکھا' جو کچھ کتابوں میں پڑھا ترتیب دے دیا۔'' اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانے سے روضۃ الاحباب اور سیرت کی کچھ کتابیں منگوائیں اور نقیب خاں سے کہا کہ وہ تحقیق کر کے ان واقعات کی صحت و عدم صحت کے بارے میں بادشاہ کو مطلع کرے۔ کتابیں دیکھ کر اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور بدایونی کو بادشاہ کی بے جا گرفت سے نجات حاصل ہوئی۔

بہرحال مختلف لوگوں نے اور بعد میں آصف خاں نے ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء تک کے حالات ''تاریخ الفی'' میں جمع کیے۔ پھر ۱۰۰۰ھ کو بادشاہ نے لاہور میں بدایونی کو اس کے تمام مسودات کے مقابلے' تصحیح اور سنین میں جو تقدیم و تاخیر ہوگئی تھی' اس کو درست کرنے کا حکم دیا۔ ایک سال تک بدایونی یہ کام کرتے رہے۔ انھوں نے اس اثنا میں پہلی دو جلدیں مکمل کیں' تیسری جلد کا کام آصف خاں کے سپرد کیا گیا۔ آئین اکبری میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ اس کتاب کا دیباچہ اس (ابوالفضل) نے لکھا۔

۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کے واقعات میں ایک اہم واقعہ ''مہا بھارت'' کے ترجمے کا ہے جو پہلی مرتبہ اکبر کے عہد میں فارسی میں ہوا۔ ''مہا بھارت'' ہندوؤں کی ایک قدیم مذہبی کتاب ہے۔ اس کا سن تصنیف تو صحیح طور سے معلوم نہیں' البتہ اس کے مصنف کا نام پنڈت دیاس جی ہے۔ یہ کتاب قدیم ہند کے واقعات' آریوں کے عقائد' ان کے طرز حکمرانی' معاشرت' سماجی حالات' متعدد قصوں' عجیب و غریب کہانیوں' نصیحتوں' اخلاق و آداب' علوم و معتقدات' ہندو مذہب کے رسوم و عقائد اور اس کے نہج عبادات کا مکمل مرقع ہے' اور اس ضمن کی تمام تفصیلات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کرشن جی کے اپدیش کا جو ''بھگوت گیتا'' کے نام سے مشہور ہے' مآخذ یہی کتاب ہے۔ کورو پانڈوؤں کی جنگ کا اصل ماخذ بھی ''مہا بھارت'' ہی ہے۔ یہ جنگ دہلی کے قریب کوروکشیتر کے مقام پر لڑی گئی تھی' جس میں کرشن جی کی مدد سے ارجن نے کوروؤں کو شکست دی تھی۔ بعض ہندوؤں کا کہنا ہے کہ اس

کتاب میں جنگ کے جو کوائف درج ہیں، وہ ساڑھے چار ہزار سال پیشتر وقوع پذیر ہوئے تھے۔ بعض کے نزدیک ان پر اسی ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ہندو اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو عبادت سمجھتے ہیں اور ان کے مذہبی نقطہ نظر سے اس کے تمام مندرجات قابل اعتماد اور لائق اعتنا ہیں۔

بدایونی اکبر پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بادشاہ کو مہابھارت کے ترجمے کا خیال اس لیے آیا کہ انہی دنوں اس نے شاہنامہ باتصویر لکھوایا تھا، اور امیر حمزہ کا قصہ بھی سترہ جلدوں میں باتصویر مرتب ہو کر پندرہ برس کے عرصے میں تیار ہوا تھا۔ اس پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا۔ قصہ ابو مسلم اور جامع الحکایات وغیرہ بھی کئی بار سُن اور لکھوا چکا تھا۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ یہ سب فرضی قصے، شاعری کی باتیں اور شاعروں کی تراشیں ہیں۔ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یوں ہی ان کتابوں کو شہرت حاصل ہو گئی ہے۔ البتہ ہندی کتابیں جو عبادت گزار عقل مند لوگوں نے لکھی ہیں، وہ صحیح واقعات پر مشتمل ہیں اور بالکل درست ہیں۔ ہندوؤں کی عبادات و اعتقادات اور مذہب کا سرچشمہ اور ماخذ بھی یہی ہیں، لہٰذا کیوں نہ اپنے نام سے ان کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کرا دیا جائے۔ یہ واقعات اب تک فارسی میں بیان نہیں ہوئے۔ قارئین کے لیے یہ دلچسپ بھی ہوں گے اور نئے بھی۔ پھر جیسا کہ مقدمۂ کتاب میں درج ہے، ان میں دین و دنیا کی سعادت بھی ہے اور ذریعہ شان و شوکت بھی۔ اس سے اموال و اولاد میں بھی اضافہ ہو گا۔

چنانچہ ان امور کے پیش نظر خود بادشاہ نے بھی ذاتی طور پر ان کے لیے وقت دینے کا فیصلہ کیا اور ہندو پنڈتوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ ''مہابھارت'' کی تعبیر و ترجمانی میں تعاون کریں۔ پہلے تو بادشاہ نے یہ کیا کہ نقیب خاں کی مدد سے رات کو اس کے مضامین سمجھتا رہا اور اس کے معنی فارسی میں لکھواتا رہا۔ پھر تیسری شب بدایونی کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ نقیب خاں کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کریں۔ اس کے بعد بدایونی لکھتے ہیں:

''تین چار مہینے میں اس مجموعہ خرافات کے اٹھارہ فنون میں سے، جن میں اٹھارہ ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے، صرف دو فن (پرب) لکھے جا سکے۔ نہ معلوم مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا تھا کہ اس ترجمے سے پالا پڑا، اور بادشاہ کے طرح طرح کے اعتراضات سننے اور برداشت کرنا پڑے۔ اس کام میں بجز طعن و تعریض کے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ بعد میں ایک حصہ ملا شیری اور نقیب خاں نے مکمل کیا اور ایک حصے کی حاجی سلطان تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد فیضی کو اس کی نظم و نثر مرتب کرنے کا حکم دیا۔ وہ دو فن (پرب) سے آگے نہ پڑھ سکا۔ پھر حاجی سلطان تھانیسری نے دو حصے اور لکھے اور جو فرو گزاشتیں پہلی دفعہ رہ گئی تھیں، انھیں درست کیا۔ اس طرح کتاب کے سو جز کھینچ کھچا کر مکمل ہوئے۔ بادشاہ کو اصل کتاب اور ترجمے کی مطابقت میں کچھ ایسا اصرار تھا کہ مکھی کا داغ (نقطہ مگس) بھی چھوٹنے نہ پائے۔''

بدایونی اس ضمن میں طنز کے تیر چلاتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"حاجی سلطان تھانیسری کو اس شدید محنت و مشقت کا کیا صلہ ملا؟ کچھ عرصے بعد کسی بہانے انھیں بھکر کی طرف جلاوطن کر دیا گیا___ مہابھارت کا ترجمہ بتانے والوں میں سے اکثر کورو اور پانڈو سے جا ملے ہیں اور جو باقی اس دنیا میں رہ گئے ہیں، خدا ان کو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے۔ مجھے بھی اللہ تعالیٰ اس معاملے میں معافی عطا فرمائے۔"

اس سے آگے رقم طراز ہیں:

"اکبر نے اس ترجمے کا نام "رزم نامہ" رکھا اور دو باتصویر نسخے تیار کرائے۔ جب یہ تیار ہو گئے تو امرا کے نام حکم جاری کیا گیا کہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں۔ ابوالفضل نے اس کفر نامے پر دو جز کا خطبہ لکھا۔"

بختاور خاں نے "مرأة العالم" میں لکھا ہے کہ ملا صاحب کو خدمت مذکور کے صلے میں ایک سو پچاس اشرفی اور دس ہزار تنکہ سیاہ انعام ہوئے [1]۔

جلوس سلطانی کے چالیسویں سال (۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء) کے واقعات بیان کرتے ہوئے "مہابھارت" کے ترجمے کے سلسلے کا بھی بدایونی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

اس سال کے رجب کی ۹ رتاریخ کو نوروز تھا، اور جلوس سلطانی کے چالیسویں سال کا آغاز ہوا تھا۔ نوروز سے دو دن پہلے بادشاہ نے بدایونی کو دیوان خاص و عام کے جھروکے میں بلایا اور براہِ راست بدایونی سے کہنے کے بجائے ابوالفضل کو مخاطب کر کے فرمایا:

"ہم تو عبدالقادر کو صوفی مشرب نوجوان سمجھتے تھے، لیکن اس نے اپنے آپ کو ایسا متعصب فقیہ ثابت کیا ہے کہ کوئی تلوار اس کی رگ تعصب کو کاٹ نہیں سکتی۔"

ابوالفضل نے پوچھا: "کس کتاب میں اس نے کوئی ایسی بات لکھ دی ہے کہ آپ اس کے متعلق اس رائے کا اظہار فرماتے ہیں۔"

اکبر نے کہا: "اسی "رزم نامہ" یعنی "مہابھارت" میں کل رات ہم نے اس کی ایک تحریر پر نقیب خاں کو بھی گواہ بنایا ہے۔"

ابوالفضل نے کہا: "اس سے غلطی ہو گئی۔"

اس وقت آگے بڑھ کر بدایونی نے وضاحت کی۔ "کم ترین تو فقط ایک مترجم ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ جو کچھ ہندی کے عالموں نے ترجمانی کی تھی، میں نے اس کا اسی طرح ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف سے میں نے کچھ بڑھایا ہو تو یقیناً میں قصوروار ہوں۔"

---

[1] دربار اکبری۔ ص ۴۵۰۔

ابوالفضل نے بھی اس کی تائید کی اور بادشاہ خاموش ہو گیا۔

بدایونی لکھتے ہیں: ''بادشاہ کے اس اعتراض کا سبب یہ تھا کہ (مہا بھارت کے ترجمہ) ''رزم نامہ'' میں میں نے ایک حکایت نقل کی تھی کہ ایک پنڈت نے عالم نزع میں حاضرین کو نصیحت کی کہ انسان کو چاہیے کہ غفلت و جہالت کو ترک کر کے سب سے پہلے اپنے صانع حقیقی (خالق حقیقی) کو پہچانے' علم و حکمت کا راستہ اختیار کرے اور علم بے عمل پر جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا' بھروسا نہ کرے۔ حسن عمل کو اختیار کر کے تاحدِ امکان جھگڑوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے اور اس بات پر کامل یقین رکھے کہ ہر فعل کی باز پرس ہو کر رہے گی۔ اس موقعے پر میں نے یہ مصرع لکھ دیا تھا۔

ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد

''بس یہ عبارت اور مصرع تھا جو بادشاہ کو کھٹکا اور اس نے اس کو منکر نکیر کے سوال جواب' حشر و نشر' آخرت کے حساب اور میزان پر محمول کیا۔ یہ بات چونکہ اس کے عقیدۂ تناسخ کے خلاف تھی' جس کے سوا وہ کسی چیز کو صحیح نہیں سمجھتا تھا' لہٰذا اس نے مجھ پر ملا پن اور متعصب فقیہ کا الزام لگایا۔''

اس سے آگے بدایونی رقم طراز ہیں:

''یہ بات چل نکلی اور مجھے اچھا موقع مل گیا۔ چنانچہ میں نے مقربانِ شاہی کو اچھی طرح سمجھانا شروع کیا کہ ہندوستان کے تمام لوگ نیکی اور بدی کے اچھے اور برے انجام کے قائل ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو ایک محرر جو بندوں کے اعمال زندگی بھر لکھتا رہتا ہے' اس کی نیکی اور بدی کے تمام اندراجات بادشاہِ عدل کے پاس لے جاتا ہے' اور پھر نیکی اور بدی کی کمی بیشی کے مطابق اس کا بارگاہ عدل سے بدلہ دیا جاتا ہے' اسی کے نتیجے میں اس کو جنت یا دوزخ میں ڈالا جاتا ہے۔''

۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء میں بادشاہ نے بدایونی کو ہندوؤں کی مشہور کتاب ''رامائن'' کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ کہتے ہیں' یہ کتاب تصنیف کے لحاظ سے ''مہا بھارت'' سے بھی پہلے کی ہے' جو بالمیک رشی کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی مقدس اور قدیم کتابوں میں اس کا بڑا درجہ ہے۔ پچیس ہزار اشلوک پر مشتمل ہے۔ ہر اشلوک پچیس حروف کا ہے۔ کتاب اودھ کے راجہ رام چندر کی داستان ہے' جسے عام طور پر رام کہا جاتا ہے۔ ہندو اس کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں اور قدرت الٰہی کا ظہور سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں اس کی کہانی یہ ہے کہ لنکا کے جزیرے پر راون نام کا ایک دیو حکومت کرتا تھا' جس کے دس سر تھے۔ وہ رام کی بیوی سیتا پر عاشق ہو گیا اور اسے اغوا کر کے لنکا لے گیا تھا۔ رام نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرے کا رخ کیا۔ بے شمار بندروں اور ریچھوں کا لشکر تیار کیا اور سمندر پر چار کوس کا پل باندھا۔ بعض بندروں کے بارے میں تو یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ اس فاصلے کو ایک ہی چھلانگ میں طے کر گئے تھے اور بعض پل پر سے چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ بدایونی لکھتے ہیں: ''غرض ایسی بہت سی خرافات اس کتاب میں درج ہیں۔'' وہ مزید لکھتے ہیں: ''بہر حال رام

چندر ایک بندر پر سوار ہو کر اس پل پر سے گزرا اور ایک ہفتے تک جنگ کر کے راون کو اس کے اہل وعیال سمیت قتل کر دیا اور لنکا کا جزیرہ اپنے بھائی کے حوالے کر کے اپنے شہر واپس آ گیا۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام چندر نے ہندوستان پر دس ہزار سال حکومت کر کے وفات پائی ـــــ ظاہر ہے ''رامائن'' کے یہ مندرجات صحیح نہیں ہیں، محض افسانہ اور خیالی داستانیں ہیں۔''

اس سے آگے لکھتے ہیں:

''ماہ جمادی الاولی ۹۹۷ھ/ مارچ ۱۵۸۹ء میں، میں نے رامائن کا ترجمہ مکمل کر کے بادشاہ کو پیش کیا۔ یہ ترجمہ چار سال میں ختم کیا تھا اور اس کے دو نسخے مرتب کیے تھے۔ ترجمے کے آخر میں یہ شعر لکھا تھا:

ماقصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند　　جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا اور پوچھا: ''ترجمہ کتنے اجزا میں مکمل ہوا۔؟'' میں نے عرض کیا'' پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر اجزا میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس اجزا میں۔'' بادشاہ نے حکم دیا کہ ''مصنفوں کے دستور کے مطابق اس کا دیباچہ بھی لکھ دو۔'' دیباچے کی چونکہ زیادہ ضرورت نہ تھی، اس لیے میں ٹال گیا۔ اب میں اپنے نامہ سیاہ سے جو میرے نامہ اعمال کی طرح داغ دار ہے، خدا کی پناہ چاہتا ہوں، لیکن نقل کفر، کفر نیست، پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ کتاب جو میں نے کراہتاً بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو کر لکھی ہے، میرے لیے لعنت کا باعث نہ بن جائے۔ اللہ ہی مجھے معاف کرے اور اپنی پناہ میں رکھے۔''

رامائن کے ترجمے کا بدایونی کو کیا صلہ ملا؟ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

انہی دنوں (۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء میں) بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمے کا کچھ صلہ مجھے دیا جائے۔ چنانچہ ایک دن ـــــ میرا نام لے کر کہا: ''یہ نوجوان بدایوں کا رہنے والا ہے، اس کی مدد معاش ہم بغیر کسی قصور کے جان بوجھ کر بساور سے منقطع کر کے بدایوں میں مقرر کر دیتے ہیں ـــــ''

۹۹۹ھ/ ۱۵۹۱ء میں بادشاہ نے بدایونی کو ''تاریخ کشمیر'' کو سادہ و آسان فارسی زبان میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ ''تاریخ کشمیر'' سنسکرت کی کتاب ''راج ترنگنی'' کا ترجمہ ہے۔ ''راج ترنگنی'' کشمیر کے ایک حکمران سلطان زین العابدین کے عہد میں لکھی گئی تھی۔ اس کے مصنف کا نام کلہانا ہے۔ بعد ازاں اکبر کے حکم سے علاقہ کشمیر کے قصبہ شاہ آباد کے ایک عالم ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے جو فاضل بزرگ اور جامع معقول ومنقول تھے، اس کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ بعد میں اکبر کے حکم سے بدایونی نے اس کو سادہ اور آسان فارسی زبان میں لکھا۔ یہ کام دو مہینے میں مکمل ہوا۔ آخر میں یہ شعر تحریر کیا:

درعرض یک دو ماہ بتقریب حکم شاہ　　این نامہ شد چو خط پری پیکراں سیاہ

یہ نسخہ کتب خانہ شاہی میں داخل کیا گیا اور پھر باقاعدہ ایک ایک جز کی صورت میں بادشاہ کے سامنے پڑھا گیا۔

اسی زمانے (۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء) میں حکیم ہمام نے شہاب الدین عبداللہ یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء) کی تصنیف ''معجم البلدان'' کی بادشاہ کے سامنے بہت تعریف کی اور تجویز پیش کی کہ اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ کتاب بڑی عجیب وغریب حکایات اور مفید معلومات ومضامین پر مشتمل ہے۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی اہل علم کو جمع کر کے اس کے مختلف اجزا ان میں تقسیم کیے۔ بدایونی کے حصے میں دس جز آئے۔ ان اجزا کا ترجمہ انھوں نے ایک مہینے میں کر دیا اور سب سے پہلے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔

اس حسن خدمت کو ذریعہ بنا کر بدایوں جانے کے لیے درخواست کی' جو منظور ہوئی۔

۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں بدایونی نے ''نجات الرشید'' تصنیف کی۔ یہ کتاب حالت سفر میں لکھی گئی جو قرآن' حدیث اور فقہ کی روشنی میں شعائر اسلام اور بعض دینی مسائل پر مشتمل ہے۔ تصوف کے کچھ مسائل بھی اس میں شامل ہیں۔ بزرگانِ دین کے بعض واقعات بھی درج کتاب ہیں۔ کتاب کے بعض مضامین سے اختلاف کی گنجائش ہے' تاہم بڑی محنت سے لکھی گئی ہے۔ اچھی ضخیم کتاب ہے اور بہت سے معلومات پر محیط ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کئی مہینے سے دربار سے غیر حاضر تھے' اس لیے بادشاہ ان سے خفا تھا۔ خفگی کیوں کر دور ہوئی؟ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

سینتیسویں سال جلوس (۱۰۰۰ھ/۱۵۹۲ء) کے حالات میں بدایونی لکھتے ہیں کہ میں ماہ ذی الحجہ میں بدایوں سے حسب الحکم لشکر میں حاضر ہو گیا۔ بھمبر میں منزل ہوئی تو حکیم ہمام نے عرض کیا:

''عبدالقادر کورنش بجالانا چاہتا ہے۔''

بادشاہ نے پوچھا: ''وہ وعدے کے خلاف کتنا عرصہ غیر حاضر رہا؟''

حکیم نے جواب دیا: ''پانچ مہینے!''

بادشاہ نے پوچھا: ''غیر حاضری کی کیا وجہ تھی؟''

لوگوں نے کہا: ''بیمار ہو گیا تھا۔''

تصدیق کے لیے بدایوں کے اکابر وعما کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ لیکن جب بادشاہ نے یہ تمام کاغذات پڑھ لیے تو فرمایا:

''بیماری مسلسل پانچ مہینے تک نہیں رہتی ____ '' اور مجھے کورنش بجالانے کی اجازت نہیں دی۔

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں:

اب میں شرمندہ ورنجیدہ اور غم زدہ ہو کر شہزادہ دانیال کے لشکر میں' جسے رہتاس میں متعین کیا گیا تھا جا کر ٹھہر گیا' اور رسول اللہ ﷺ پر درود وصلوۃ بھیجتا رہا۔ اس اثنا میں قصیدہ بردہ کا وظیفہ کر کے اور خدا سے گڑگڑا کر دعائیں کیں جو بالآخر فضل خداوندی سے قبول ہوئیں۔ میرے پہنچنے کے پانچ ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور پہنچا تو بادشاہ نے میری طرف عنانِ توجہ اور نظر عنایت فرمائی اور ایک ضخیم کتاب ''جامع رشیدی'' کے ترجمے کے

لیے خلوتِ شاہی میں میر نظام الدین احمد کے ساتھ میرا نام بھی میری غیبوبت میں تجویز فرمایا' اور مجھے حاضری کا حکم ہوا۔ اس طرح کشمیر سے واپسی کے بعد ۱۷ ربیع الثانی ۱۰۰۰ھ/۲۲ رجنوری ۱۵۹۲ء کو کورنش کی اجازت دی گئی۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر کی۔ بادشاہ نے بڑی مہربانی فرمائی اور ساری خفگی آسانی سے رضامندی میں بدل گئی۔ بادشاہ نے ابوالفضل کے مشورے سے بدایونی کو جامع رشیدی کے انتخاب و ترجمہ کا حکم دیا۔ انھوں نے اس انتخاب میں عباسی' مصری اور اموی خلفا کے شجرے کو جس کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ اور پھر ان سے درجہ بدرجہ تمام انبیا اور آدم علیہ السلام تک جا کر منتہی ہوتا ہے' عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب اور ترجمے کتب خانہ شاہی میں داخل کیا۔

جلوس سلطانی کے چالیسویں سال (۱۰۰۳ھ/ ۲۹ رمئی ۱۵۹۵ء) کے رمضان المبارک کی آخری تاریخ) کو بادشاہ نے ابوالفضل سے کہا' کہ اگرچہ فاضل بدایونی اجمیر کی خدمت بھی خوب کر سکتا ہے' مگر ہم ترجمے کے لیے اسے اکثر کتابیں دے دیتے ہیں' یہ خوب لکھتا ہے اور ہمارے خاطر خواہ لکھتا ہے۔ اسے جدا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ابوالفضل نے بھی اور دیگر امرا نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اسی دن بادشاہ نے بدایونی کو حکم دیا کہ کشمیر کے بادشاہ سلطان زین العابدین نے جس افسانہ ہندی کا بحرالاسما کے نام سے فارسی میں ترجمہ کرایا تھا اور اس کا بیشتر حصہ باقی رہ گیا تھا' اس کی تکمیل کرو۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحرالاسما' سنسکرت کی ایک کہانی ''کتھا ساگر'' کا ترجمہ ہے)۔ چنانچہ یہ کام شروع کر دیا گیا اور اس کتاب کی آخری جلد کا ترجمہ' جو ساٹھ اجزا کی ضخامت کو محیط تھا' پانچ مہینے میں مکمل ہو گیا۔ اس اثنا میں بادشاہ نے ایک شب خواب گاہِ خاص میں اپنے تخت کے قریب بدایونی کو بلایا اور تمام رات صبح تک ہر باب کی حکایتیں سنتا رہا۔ پھر حکم دیا کہ بحرالاسماء کی پہلی جلد کا ترجمہ' جو سلطان زین العابدین نے کرایا تھا' قدیم اور غیر متعارف فارسی زبان میں ہے' اس کو مروجہ اور مانوس فارسی زبان میں منتقل کر دو اور اپنے اس ترجمے کے مسودے کو حفاظت سے رکھو۔ بدایونی نے حسب الحکم یہ کام شروع کر دیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر نہایت مہربانی سے دس ہزار تنکہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔ بدایونی کہتے ہیں۔ میں نے کہا ''ان شاء اللہ یہ کتاب ان ہی دو تین مہینے میں بحسن و خوبی مرتب ہو جائے گی۔''

بدایونی کی ایک نہایت اہم اور معروف تصنیف ''منتخب التواریخ'' ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۱ء میں لکھنا شروع کی تھی۔ اس میں سبکتگین کے عہد سے لے کر ۱۰۰۴ھ/ ۱۵۹۶ء تک کے شاہان ہند کے حالات (کہیں قدرے مفصل اور کہیں مجمل) مرقوم ہیں۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے حالات اس میں بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اکبر کے مذہبی افکار پر کھل کر بحث کی ہے اور اس کو سخت الفاظ میں نشانہ تنقید بنایا ہے۔ اس دور کے علما و مشائخ' اکبر کے ندما و مصاحبین اور دربار کی شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور جن لوگوں نے بادشاہ کو گمراہی کے راستے پر لگایا اور جن افراد نے اس سلسلے میں اس کی تائید یا مخالفت کی' ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

پھر اس ضمن میں جن لوگوں نے بادشاہ سے کسی قسم کی مراعات حاصل کیں اور جن کو مخالفت کی وجہ سے کسی نوع کی سزائیں دی گئیں ان کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ اس میں نہ بادشاہ کی کوئی بات مخفی رکھی ہے اور نہ اس کے مویدین و مخالفین کے بارے میں کسی قسم کی رعایت سے کام لیا ہے۔ جو بات دیکھی یا سنی حوالہ قرطاس کر دی۔ اس باب میں جو واقعہ بیان کرتے ہیں' سخت طنزیہ انداز میں کرتے ہیں۔ محرم ۱۰۰۴ھ/ستمبر ۱۵۹۵ء میں کچھ لوگ اکبر کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ ان ایام کے واقعات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''انہی دنوں چند اشخاص' اخلاص چہارگانہ کے مریدوں میں داخل ہوئے۔ داڑھیوں کی صفائی کی۔ ان میں بعض تو ایسے عالم تھے کہ اپنے آپ کو فاضل اجل سمجھتے تھے۔ بعض خرقہ پوش خاندانی مشائخ تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد ہیں' اور یہ کہ ان کے شیخ طریقت کا ارشاد ہے کہ بادشاہ ہند سے لغزش ہوئی ہے' تم ہی جا کر ان کو بچا سکو گے وغیرہ وغیرہ۔'' بدایونی ایسے لوگوں کا خوب مضحکہ اڑاتے ہیں' اور لکھتے ہیں۔ ''موتراش چند'' ان کی تاریخ نکلی۔

لیکن اپنے جن رفیقوں اور ساتھیوں پر وہ بھرپور طنز کرتے ہیں' ان کی وفات اور دائمی جدائی پر انتہائی افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کاروان حیات کے پرانے رفقائے سفر کے خیمے اس دنیا سے اکھڑ رہے ہیں اور موت ان کو ایک ایک کر کے اس عالم فانی سے ہمیشہ کے لیے دوسرے جہان میں لے جا رہی ہے تو قلم دریائے غم کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے اور انتہائی افسردہ دلی کا شکار ہو جاتے ہیں ــــ ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۵ء کے اواخر میں لکھتے ہیں:

''دو اور قلبی دوست دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شیخ یعقوب کشمیری صرفی جو بادشاہ سے رخصت لے کر وطن گئے تھے' وہیں موت کی آغوش میں چلے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یاراں ہمہ رفتند و درِ کعبہ گرفتند　　ماست قدم بر درِ خمار بماندیم
از نکتہ مقصود نشد فہم حدیثے　　لا دین ولا دنیا بیکار بماندیم

''۲۷ ذی الحجہ کو حکیم عین الملک بھی سفر آخرت اختیار کر گئے [1]۔''

اپنے ہم صحبت لوگوں کی موت پر حزن و ملال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سبحان اللہ! دیکھتا ہوں کہ تمام دوست احباب اس رفاقت و صحبت سے بے راز ہو کر ایک ایک کر کے منزلِ آخرت کو روانہ ہو گئے اور جو باقی ہیں' وہ روانہ ہو رہے ہیں۔ ہم اسی سیاہ دلی اور پریشان حالی میں انجام سے غافل ہو کر بے ہودگی میں عمر برباد کر رہے ہیں:

---

[1] حکیم عین الملک بادشاہ کی طرف سے راجی خاں کے پاس ایلچی بن کر گئے۔ وہاں سے ہنڈیہ گئے جو ان کی جاگیر تھی۔ وہیں وفات پائی۔ حکیم صاحب اور جمال خاں قورچی کی وساطت سے بدایونی دربارِ اکبر میں پہنچے تھے۔

اے دل چو آگہی کہ فنا درپے بقاست | ایں آرزوے دور و دراز از پے چراست
بار وز گار عہد تو بستی، نہ روزگار | پس ایں نفیر چیست کہ ایام بے وفاست

''محرم ۱۰۰۴ھ/ستمبر ۱۵۹۵ء میں حکیم حسن گیلانی نے بھی وفات پائی۔ نہایت درویش نہاد، مہربان اور مخلص آدمی تھے:

بے خار اگر گلے میسر بودے | ہر دم بہ جہاں لذت دیگر بودے
زیں کہنہ سرائے زندگانی مارا | خوش بودے، اگر نہ مرگ بردر بودے

اسی سال ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ/۵ر اکتوبر ۱۵۹۵ء کو فیضی نے انتقال کیا۔ اس کی موت کا ذکر بدایونی جن فارسی الفاظ میں کرتے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے۔

ملک الشعرا شیخ فیضی متعدد بیماریوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مثلاً ضیق النفس، استسقاء ورم، خونی قے وغیرہ کئی امراض نے اس کو گھیر رکھا تھا۔ چھ مہینے تک وہ ان امراض کی سختیاں برداشت کرتا رہا۔ آخر ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ/ ۵ر اکتوبر ۱۵۹۵ء کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فیضی کو کتوں کے ساتھ بڑا انس تھا اور وہ رات دن کتوں میں گھرا رہتا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ سکرات موت کے وقت اس کے منہ سے کتے کی آواز نکل رہی تھی۔ فیضی اسلام کا قطعی منکر اور بے دینی کا سخت حامی تھا۔ چنانچہ مرنے سے پہلے تک وہ ایک عالم شریعت سے بیہودہ اور کافرانہ باتیں کرتا رہا۔ اس کی تاریخ وفات ہے ___ ''وے فلسفی وشیعی و دہری'' ___ ایک دوسرے تاریخ ہے ___ ''قاعدہ الحاد شکست'' ___ فیضی کے نزع کے وقت بادشاہ سلامت آدھی رات کو اس کے پاس گئے اور اس کا سر اپنے ہاتھوں میں تھام کر آوازیں دیں کہ ''شیخ جیو، ہم حکیم علی کو ساتھ لے کر آئے ہیں، تم آخر بات کیوں نہیں کرتے۔'' لیکن فیضی اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جب دوبارہ بادشاہ نے آواز دی تو اپنی پگڑی زمین پر گرا دی۔ اس کے بعد شیخ ابوالفضل کو تسلی دے کر بادشاہ وہاں سے چلا گیا۔ اسی وقت خبر ملی کہ وہ جاں نثار رخصت ہو گیا۔

چند روز بعد حکیم ہمام بھی دنیا سے منہ موڑ گئے۔ ان سے دوسرے روز کما لائے صدر بھی رخت سفر باندھ گئے۔ بدایونی لکھتے ہیں، ان کی موت واقع ہوتے ہی دونوں کے گھروں پر بادشاہی پہرے دار بیٹھ گئے اور مال خانے مقفل کر دیے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے مردے بھی کفن کے کپڑے کے محتاج ہو گئے۔

یہ جلال الدین اکبر کے جلوس تخت کا چالیسواں سال ہے اور یہیں تک کے حالات منتخب التواریخ میں مرقوم ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف سے بدایونی جمعہ کے روز ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ کو فارغ ہوئے۔ کتاب ختم کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔ اردو ترجمہ:

''میرے سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور اجنبی کا دامن پکڑنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون

کے ہر قطرے کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا۔ نہ معلوم میرے بعد آنے والے اس نقش زاغ پا کو دیکھ کر کیا کہیں گے اور کیا رائے قائم کریں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا۔

مرا تو عہد شکن خواندۂ و می ترسم
کہ باتو روزِ قیامت ہمیں عتاب رود

تاہم مجھے توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری یہ تمام تر آفرین و نفرین شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی طرف داری کے لیے ہے۔۔۔۔ اگر دوسروں کو بھی دینی خدمت کا درد اسی طرح دامن گیر ہو جائے اور وہ میرا احتساب کرنا چاہیں تو بسم اللہ، میں ان پر قربان، جو میرے عیوب سے مجھے آگاہ کریں۔ ورنہ وہ شرم سے گریبان میں منہ چھپالیں۔

''اصل میں دیکھا جائے تو میرا یہ بلند پرواز و تیز منقار قلم علامت قرب قیامت کے دابۃ الارض کی مانند ہے، جو اس آخری زمانے کے لوگوں کی پیشانیوں پر ''یہ مسلم''۔۔۔۔ ''وہ کافر'' کے نشان لگاتا گیا، اور کسی کو رحمت کا مستحق اور کسی کو لعنت کا سزاوار ٹھہراتا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی عرب کے مشرکوں اور قریش کے سرداروں پر لعنت بھیجی ہے۔۔۔۔

''ارباب تصنیف و اصحاب تالیف کا یہ طریقہ ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتاتے ہیں، اور اپنی تصنیف کو کسی نہ کسی کے نام منسوب کر کے اپنے اغراض و منافع کی راہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روش کے خلاف کسی طمع اور توقع کے بغیر اپنے سے بعد میں آنے والوں کے لیے ایک تحفہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے دور کے حالات و حقائق سے آگاہ ہونے کے متمنی ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں:

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں برخاک
ازاں گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک

''اس انتخاب (یعنی منتخب التواریخ) کی ترتیب کا بنیادی سبب یہی ہے کہ موجودہ زمانے میں احکام دین میں جس طرح تغیر و تبدل کیا جا رہا ہے، اس کی گزشتہ ہزار سال میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہر وہ شخص جو دو حرف لکھنے پڑھنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ اصحاب اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کی بنا پر یا دیگر فاسد اغراض کی وجہ سے حق پوشی سے کام لینے لگا ہے اور دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے، باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات و لغویات کو خیرات و حسنات ثابت کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ (البقرہ:۱۶)

(یہی وہ لوگ ہیں، جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لے لی ہے، لیکن ان کی یہ

تجارت فائدہ مند نہ ہوگی)

''یہ وہ باطل امور اور خرافات و لغویات ہیں کہ آئندہ نسلوں کے لوگ انھیں دیکھ کر سخت تذبذب اور تردد میں پڑ جائیں گے' اس لیے میں نے جو کہ ان معاملات سے بخوبی آگاہ ہوں بلکہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں' ضروری سمجھا کہ اپنے ان مشاہدات و روایات کو' جو چشم دید حقائق پر مبنی ہیں' کسی قسم کے ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں ہیں' قلم بند کر دوں۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

تاکہ یہ چیز میری سابق بے ہودہ نگاری کا کفارہ ہو جائے اور اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے:

مگر صاحب دلے روزی برحمت
کند در کار ایں مسکیں دعائے

مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ یہ مسودہ ایک بیاض کی حیثیت رکھتا ہے' جس میں چند معلومات درج کر دی گئی ہیں۔ اس پر مستقل تصنیف یا تالیف کے بھاری بھرکم نام کا اطلاق نہیں ہو سکتا ___ اب تو اللہ سے دعا اور مناجات کا وقت ہے اور بس۔

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردم بگوہر شناس

___ ''میں نے بروز جمعہ ۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۰۰۴ھ/ ۱۳ر فروری ۱۵۹۶ء کو اپنے راہوارِ قلم کی باگیں کھینچ لیں اور جو کچھ لکھا گیا اسی کو کافی سمجھا۔ بطور تعمیہ یہ قطعہ تاریخ کہا گیا ہے۔:

شکر للہ کہ باتمام رسید
منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ زدل جستم گفت
انتخابی کہ ندارد ثانی

منتخب التواریخ کی تصنیف کے ٹھیک دس سال بعد ۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۴ھ/ ۱۴ر اکتوبر ۱۶۰۵ء کو جلال الدین اکبر کا انتقال ہوا۔ لیکن خود بادشاہ کو یا اس کے کسی مصاحب اور درباری کو اس کتاب کا علم نہیں ہو سکا۔ اس عرصے میں یہ مسودہ بالکل محفوظ صورت میں بدایونی کے وارثوں کے قبضہ و تحویل میں رہا۔ جہاں گیر کے عہد میں اس کتاب نے شہرت پائی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بقول یہ کتاب جہاں گیر'' بادشاہ نے بھی دیکھی ❶۔'' اور ایک حکم کے ذریعے بدایونی کی اولاد اور وارثوں کو گرفتار کر کے دربار میں طلب کیا اور فرمان جاری کیا کہ بدایونی

❶ دربار اکبری۔ ص ۴۶۱۔

نے اس کتاب میں میرے باپ (اکبر) کو بدنام کیا ہے' لہٰذا اس کے بیٹے اور دیگر متعلقین کو قید میں ڈالا جائے اور اس کا گھر لوٹ لیا جائے۔ لیکن بدایونی کی اولاد نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم خورد سال تھے' ہمیں اس کتاب اور اس کے مندرجات کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ چنانچہ جہاں گیر نے کتب فروشوں سے بھی مچلکے لیے کہ وہ کتاب نہ خریدیں گے نہ بیچیں گے۔ جہاں گیر کی اس خفگی اور سختی کی وجہ سے اس عہد یا اس کے متصل بعد تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

البتہ خافی خاں جس نے شاہ جہان سے محمد شاہ تک کا زمانہ دیکھا ہے' تعجب کے ساتھ لکھتا ہے کہ جہاں گیر بادشاہ کے اس تشدد کے باوجود دارالخلافہ میں کتب فروشوں کی دکانوں پر سب سے زیادہ بدایونی کی کتاب ہی نظر آتی ہے۔

## شاعری:

ملا عبدالقادر بدایونی شاعر بھی تھے اور قادری تخلص کرتے تھے' ان کی بعض نظمیں محمد حسین آزاد نے دربارِ اکبری میں نقل کی ہیں۔ مرثیے بھی درج کیے ہیں۔ اپنے چھوٹے بھائی شیخ محمد کی وفات پر انھوں نے جو مرثیہ لکھا' وہ بڑا موثر اور درد میں ڈوبا ہوا ہے' لیکن بقول آزاد: ''ملا صاحب کی زبان میں نظم کا ڈھب ایسا نہیں جیسا نثر کا۔''

## دورِ اکبری کا آئینہ:

ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ کو دور اکبری کے آئینے کی حیثیت حاصل ہے' جس میں اس زمانے کے تمام واقعات کو بخوبی دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ بدایونی کے یہ حالات ان کی اسی تصنیف سے لیے گئے ہیں۔ یہ حالات کسی ایک جگہ مرقوم نہیں بلکہ ضخیم فارسی کتاب کے مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ہیں' جو جمع کر کے ان صفحات میں پیش کر دیے گئے ہیں۔ ان کا تذکرہ اگرچہ ان کے عہد سے بہت بعد کی بعض دیگر کتابوں میں موجود ہے مگر نہایت مختصر اور مجمل صورت میں [1]۔

تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جس شخص نے عہد اکبری کے واقعات اس درجہ مفصل طور سے بیان کیے اور اس دور کے علما و فضلا کو اتنی تفصیل سے بعد میں آنے والوں سے متعارف کرایا اور ان کی علمی' مذہبی' دینی اور درباری زندگی کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا' اس کا صحیح تعارف کرانے اور اس کے سوانح ضبط تحریر میں لانے کی کسی کو توفیق نہ ہوئی ___ بدایونی دور اکبری کا چشم دید گواہ اور عینی شاہد ہے' لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اس کی اس کتاب کے

[1] مثلاً دیکھیے: مآثر الکرام' دفتر اول- ص ۳۷ تا ۳۹- تذکرۂ علمائے ہند- ص ۱۲۷- دربار اکبری- ص ۴۱۹ تا ۴۶۲- نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۳۷ تا ۲۴۰-- اردو دائرہ معارف اسلامیہ' دانش گاہ پنجاب' لاہور- ج ۴' زیر لفظ بدایوانی- ص ۱۴۳' ۱۴۴- ...یات شیخ عبدالحق محدث دہلوی- ص ۲۴۵ تا ۲۴۷-

مندرجات کی صحت کو مشکوک ٹھہرایا جائے ___ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں علم و علما کے اعتبار سے جلال الدین اکبر کا عہد نہایت زرخیز تھا۔ اکبر کے مذہبی افکار سے قطع نظر (جو ایک خاص دور سے تعلق رکھتے ہیں) یہ ماننا پڑے گا کہ جتنا علمی اور ثقافتی کام اس عہد میں ہوا اور کسی بادشاہ کے عہد میں نہیں ہوا' اور برصغیر کی قدیم کتابوں کے جس قدر تراجم اس زمانے میں ہوئے' اور کسی زمانے میں نہیں ہوئے۔ بدایونی کی منتخب التواریخ جہاں اکبر کے مذہبی افکار و رجحانات کی وضاحت کرتی ہے' وہاں اس دور کی علمی' تہذیبی اور ثقافتی خدمات کی بھی پوری طرح عکاس ہے، عہد جہاں گیری اور اس عہد کے مابعد کے مؤرخین اور تذکرہ نویسوں نے بدایونی کا ذکر نہ کر کے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا' اور یہ ان کی خاص مصلحتوں کا نتیجہ ہے' ورنہ اس کی یہ کتاب تو جہاں گیر کے عہد ہی میں کتب فروشوں کی دکانوں پر آ گئی تھی۔

## وفات:

اسی سال یعنی ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء کو بدایونی نے کتاب ختم کی اور اسی سال کے آخر میں خود ان کی اپنی کتابِ حیات ختم ہو گئی۔ بدایونی نے کل ستاون برس عمر پائی اور اس مختصر عمر میں لیل و نہار کی بے شمار گردشوں کا مشاہدہ کیا اور بہت سے تغیر و انقلاب سے دوچار ہوئے۔ علم و تصنیف اور ترجمے کا بہت کام کیا۔ اپنے وطن ___ بدایوں ___ سے انھیں بڑا پیار تھا۔ بار بار رخصت لے کر وطن جاتے۔ انھیں معلوم تھا کہ بادشاہ ان کی رخصتوں پر ناراض ہوتا ہے مگر وہ اس کی پروانہ کرتے۔ زندگی کے آخری دنوں میں بھی وطن گئے' وہیں وفات پائی اور وہیں پیوند خاک ہو گئے:

آخر گل اپنی خاک درمیکدہ ہوئی پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بدایونی بڑے باکمال آدمی تھے۔ کمال خوب صورتی سے انھوں نے یہ کتاب لکھی اور عمدہ انداز سے اس میں اپنے معاصرین کا تذکرہ کیا' اور ان کی موت پر قلم کے ذریعے خون کے آنسو بہائے۔ لیکن افسوس ہے' بدایونی کی شان کے مطابق کسی نے ان کا افسوس نہ کیا۔ وہ اپنی کتاب میں مُردوں کو زندہ کر گئے' مگر ان کے عہد میں یا اس سے کچھ بعد خود ان کا تذکرہ کسی نے اس اسلوب سے نہ کیا کہ جس سے ان کی خوبیاں اجاگر ہو سکیں۔ حالات نے نہ ان کی زندگی میں ان کا ساتھ دیا' نہ ان کے بعد کچھ عرصے تک ان سے توافق کی کوئی صورت پیدا ہو سکی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمال و عمدگی کو عام طور پر وہ درجہ نہیں دیا جاتا' جس کا وہ درحقیقت مستحق ہوتا ہے۔ بدایونی نے بلاشبہ شہرت پائی لیکن موت کے کچھ عرصہ بعد! حالات آہستہ آہستہ ایسے قالب میں ڈھلے کہ اس دور کی صحیح تصویر کو سامنے لانے کے لیے صرف انہی کی کتاب ___ منتخب التواریخ ___ کو بنیادی اور اصل مآخذ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

## بدایونی کا مدفن اور اولاد:

ملا عبدالقادر بدایونی بدایوں کے قریب مدفون ہیں۔ ان کے مدفن اور اولاد کے بارے میں آج سے سو برس پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں خوشگو کے تذکرے کے حوالے سے لکھا تھا:

(بدایونی) باغ انبہ واقع عطاپور نواح بدایوں میں دفن ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس وقت یہ نام اور مقام ہوں گے۔ اب شہر سے دور ایک کھیت میں تین چار قبریں ہیں' ان پر تین چار درخت آم کے ہیں' اور یہ ملا کا باغ کہلاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ انہی میں ملا صاحب کی قبر بھی ہے۔ غالبًا خوشگو کے بعد یہ مقام کبھی ملا کا باغ بھی کہلایا ہوگا۔ عطاپور اور باغ انبہ کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ البتہ جس محلے میں ان کے گھر تھے' اب بھی لوگوں میں زبان زد ہے' اور پتنگی ٹیلہ کہلاتا ہے۔ سید بارہ میں ہے' مگر ٹیلہ یا گھر کا اثر آثار کچھ نہیں۔ وہاں کے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ (ملا عبدالقادر بدایونی کی) اولاد کا سلسلہ ایک بیٹی پر ختم ہو گیا تھا اور اس کی نسل خیرآباد علاقہ اودھ میں باقی ہے [1]۔

ملا عبدالقادر بدایونی کے واقعات سے متعلق ضروری مواد ان صفحات میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے اور بھی بعض باتیں ان کی تصنیف منتخب التواریخ میں مرقوم ہیں' مگر خوف طوالت سے انھیں ترک کر دیا گیا ہے۔

# ۳۳- شیخ عبدالقادر بخاری اکبر آبادی

شیخ عبدالقادر بخاری اکبر آبادی' اپنے عصر کے فاضل کبیر اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اکبر آباد (آگرہ) میں ان کا درس و افادے کا سلسلہ جاری تھا۔ طریقت و تصوف سے بھی تعلق تھا اور مشائخ قادریہ میں سے گردانے جاتے تھے۔ ان سے علما و مشائخ کی ایک بڑی جماعت نے استفادہ و استفاضہ کیا: ۱۰۵۰ھ/ ۱۶۴۰ء کو اکبر آباد میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے [2]۔ اسلامی ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم و فقیہ کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

# ۳۴- مفتی عبدالقدوس امروہی

مفتی عبدالقدوس بن عبدالغفور بن عبدالملک حسینی امروہی' ہندوستان کے صوبہ یو۔ پی کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ عالم باعمل تھے۔ ان کے والد مفتی عبدالغفور امروہی بھی عالم دین تھے۔ مفتی عبدالقدوس نے علم فقہ کی تحصیل انہی سے کی' اور ان کی وفات کے بعد ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کو مسند افتا پر متمکن

---

[1] دربار اکبری- ص ۱۶۴-

[2] خزینۃ الاصفیا- ص ۱۵۲- نزہۃ الخواطر- ج ۵ ص ۲۴۰-

ہوئے۔ ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ غالباً وفات بھی اسی سال ہوئی، اسی سال ان کے بیٹے مفتی محمد شاہد ان کی جگہ مسند افتا پر بیٹھے ❶۔

## ۳۵-ملا عبدالکریم پشاوری

ملا عبدالکریم بن اخوند درویزہ پشاوری، شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ واعظ اور مبلغ علمائے دین میں سے تھے۔ طریقت سے بھی تعلق تھا اور اس سلسلے میں شیخ علی غواص ترمذی سے فیض یافتہ تھے، ان کے والد اخوند درویزہ بھی ان ہی سے مستفیض تھے۔ جامع طریقت وحقیقت تھے۔ ان کے والد اخوند درویزہ پشاوری بھی بہت بڑے عالم تھے۔ ❷ دادا کا نام اخون گدا تھا، یہ بھی عالم تھے، لیکن ملا عبدالکریم تو علم وفضل میں اونچے مرتبے کے حامل تھے۔ خلاصۃ البحر میں انھیں ''محقق افغانستان'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ ان کے والد بزرگ وار اخوند درویزہ کی تصنیفات میں سے ایک کتاب مخزن الاسلام ہے، اس کے دو باب جو حقائق ومعارف سے متعلق ہیں، انہی ملا عبدالکریم پشاوری کے تصنیف کردہ ہیں۔ ان ابواب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ صاحب دل بزرگ تھے، اونچے ذوق وشوق کے حامل اور روحانی مرتبے پر فائز تھے۔ والد محترم کی طرح ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ تھے اور انہی کی طرح شعر بھی کہتے تھے۔ اشعار میں انھوں نے اخوند کریمیہ کا لقب اختیار کیا ہے، اور زیادہ تر اسی لقب سے مشہور ہیں۔

ملا عبدالکریم پشاوری اپنے والد اخوند درویزہ کی طرح بہت بڑے مبلغ وواعظ بھی تھے۔ انداز وعظ وتبلیغ موثر اور میٹھا تھا۔ باپ کی طرح ان سے بھی بے شمار لوگوں نے فیض حاصل کیا اور تعلیم دین سے آراستہ ہوئے۔ گیارھویں صدی ہجری میں افغانوں میں انھوں نے اسلام کی بے حد تبلیغ کی اور لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو احکام دین سے روشناس کرایا۔ عہد شاہ جہانی میں یہ دونوں باپ بیٹا ـــــ اخوند درویزہ اور ملا عبدالکریم پشاوری ـــــ افغان قبائل میں اسلام کے نامور داعی اور دین حق کے مبلغ تھے۔

ملا عبدالکریم پشاوری نے ۱۰۷۲ھ کو وفات پائی اور یوسف زئی علاقے میں مدفون ہوئے ❸۔

## ۳۶-مولانا عبدالکریم سلطان پوری لاہوری

گیارھویں صدی ہجری میں برصغیر کے دوسرے بلاد وامصار کی طرح لاہور بھی علم وفضل کا مرکز تھا۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۴۱۔ بحوالہ نخبۃ التواریخ۔

❷ تفصیل کے لیے دیکھیے: فقہائے ہند۔ ج ۴، ص ۱۶۵ تا ۱۷۵۔

❸ تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۳۱۔ حدائق الحنفیہ۔ ص ۴۱۷۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۴۲۔ خزینۃ الاصفیا۔ ص ۴۷۹۔ ادبیات سرحد۔ ص ۱۵۳۔ رود کوثر۔ ص ۴۱۹۔ معارج الولایت۔ ج ۲، ص ۱۳۶۔

اس میں جن علمائے کرام کے درس و افادہ کا سلسلہ جاری تھا' ان میں مولانا عبدالکریم بن عبداللہ بن شمس الدین سلطان پوری لاہوری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ یہ درحقیقت سلطان پور کے رہنے والے' جو مشرقی پنجاب کے علاقہ کپورتھلہ میں ایک قصبہ ہے۔ بعد کو لاہور چلے گئے تھے' اس لیے دونوں شہروں کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ سلطان پوری بھی کہلائے اور لاہوری بھی۔!

مولانا عبدالکریم سلطان پوری' دسویں صدی ہجری کے مشہور عالم مولانا عبداللہ سلطان پوری کے صاحب زادہ گرامی قدر تھے۔ مولانا عبداللہ نے ہندوستان کے چار عظیم الشان بادشاہوں ____ نصیرالدین ہمایوں' شیر شاہ سوری' سلیم شاہ سوری اور جلال الدین اکبر ____ کا زمانہ پایا تھا۔ ان بادشاہوں کے نزدیک ان کو بڑی عزت و منزلت حاصل تھی اور ان کے عہد میں یہ صدر الاسلام اور شیخ الاسلام کے منصب رفیع پر فائز رہے تھے۔ بہت بڑے عالم اور ملک کی عظیم شخصیت تھے۔ جلال الدین اکبر کے عہد میں ان کو زوال ہوا' اور اسی عہد میں انتقال کیا ❶۔

مولانا عبدالکریم سلطان پوری نے کتب درسیہ اپنے والد بزرگ وار مولانا عبداللہ سلطان پوری سے پڑھیں اور طریقت کے منزلیں شیخ نظام الدین بن عبدالشکور تھانیسری کی خدمت میں رہ کر طے کیں۔ مولانا عبدالکریم لاہوری اپنے والد کی وفات کے بعد لاہور میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے لاہور میں یہ فقہ و اصول کے جید عالم اور علوم عربیہ کے ماہر استاد تھے۔ شیخ وقت اور صالح بزرگ تھے۔ دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ پہلی مرتبہ اپنے والد مولانا عبداللہ سلطان پوری کے ساتھ' دوسری مرتبہ ان کی وفات کے بعد۔!

تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ فصوص الحکم کی فارسی زبان میں شرح لکھی۔ ایک رسالہ ''اسرار العجیبہ'' کے نام سے سپرد قلم کیا جو افکار و اشغال پر مشتمل ہے۔

مولانا عبدالکریم سلطان پوری لاہوری نے ۲۷؍ رجب ۱۰۴۵ھ/ ۲۷؍ دسمبر ۱۶۳۵ء کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

# ۳۷۔ مفتی عبدالکریم گجراتی

عبدالکریم بن محب الدین بن علاء الدین خرقانی نہروالی گجراتی مفتی بہاء الدین ابوالفضائل مکی' دوشنبہ کے روز ۱۹ شوال ۹۶۱ھ/ ۱۷؍ ستمبر ۱۵۵۴ء کو علاقہ گجرات کے شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ یہ درحقیقت نہروالا

---

❶ ان کے حالات میں تفصیل کے لیے دیکھیے: فقہائے ہند- ج ۳۔

❷ [illegible] الاصفیا- ص ۴۷۰' ۴۷۱- تذکرہ علمائے ہند- ص ۱۳۱- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۴۳-

کے باشندے تھے، جو صوبہ گجرات کا ایک شہر ہے۔ ان کا گھر نہروالا میں علم وفضل کا مرکز اور طریقت وتصوف کا گہوارہ تھا۔ ان کے جد امجد علامہ علاؤ الدین نہروالی دسویں صدی ہجری کے اعیان ہند میں سے تھے۔

مفتی عبدالکریم اپنے والد گرامی شیخ محب الدین کے ساتھ مکہ مکرمہ گئے اور وہیں نشوونما پائی۔ بڑے ہوئے تو اپنے عم محترم مفتی قطب الدین نہروالی سے وابستہ ہوگئے۔ ان سے علم فقہ کی تحصیل کی اور بعض دیگر علوم کی کتابیں پڑھیں۔ شیخ عبداللہ سندھی اور علامہ شہاب الدین احمد ابن حجر ہیثمی سے صحیح بخاری پڑھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان کے علمی جوہر چمکے اور حلقہ اہل علم میں اپنے عصر کے منفرد عالم اور صاحب فضل وکمال قرار پائے۔ اسی وجہ سے ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء کو مکہ مکرمہ کی مسند افتا پر متمکن ہوئے۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء کے لگ بھگ منصب خطابت بھی ان کے سپرد ہوا، اور مکہ معظمہ کے مدرسہ سلطانیہ مرادیہ کے ناظم بھی مقرر کیے گئے۔

مفتی عبدالکریم گجراتی صاحب تصنیف بھی تھے۔ انھوں نے بعض نہایت عمدہ کتابیں لکھیں، جن میں صحیح بخاری کی شرح بھی شامل ہے، جو ''النہر الجاری علی البخاری'' کے نام سے موسوم ہے۔ افسوس ہے، لائق شارح یہ کتاب مکمل نہ کر پائے۔ دوسری اہم کتاب "الاعلام باعلام بيت الله الحرام" ہے۔ یہ اس موضوع سے متعلق تاریخ کی ایک مختصر سی کتاب تھی جو ان کے چچا مفتی قطب الدین محمد نہروالی نے سپرد قلم کی تھی، مفتی عبدالکریم نے اس میں بہترین اضافے کیے اور بہت سی عمدہ باتیں شامل کیں۔ اس کے بعد اس نام سے یہ کتاب اہل علم کے سامنے آئی۔ یہ کتاب کتب حوالہ میں سے ہے اور اپنے موضوع میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی تصنیف سے وہ یک شنبہ کے روز ۱۹ر شعبان ۱۰۰۰ھ/ ۲۱ر مئی ۱۵۹۲ء کو فارغ ہوئے۔

مفتی عبدالکریم گجراتی کو تحقیق مسائل اور فہم و ادراک میں امام کی حیثیت حاصل تھی۔ حافظہ تیز اور ذہن اخاذ تھا۔ زبان میں بے حد اثر تھا۔ تحمل اور نرمی سے بات کرتے تھے۔ مطالعے کا دائرہ وسیع تھا۔ فقہ کے عالم، اس کے احکام وقواعد سے باخبر اور مسائل فقہ میں مختلف ائمہ کی آرا اور اختلافی گوشوں سے آگاہ تھے۔

ادب میں دسترس رکھتے تھے اور اس کے نکات وغوامض کی زلف گرہ گیر کو سلجھانے اور اس کی باریکیوں کی عقدہ کشائی میں اپنے دور کے معروف عالم تھے۔ اخبار ووقائع، احوال علما اور تاریخ ورجال پر بھی نظر تھی اور اس سلسلے کے بے شمار واقعات مستحضر تھے۔ گفتگو کرتے اور زبان کو حرکت دیتے تو مسائل کی پیچیدہ گرہیں کھلتی چلی جاتیں۔

اس ہندی عالم نے چہار شنبہ کے روز ۱۵ر ذی الحجہ ۱۰۱۴ھ/۱۳ر اپریل ۱۶۰۶ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور قبرستان جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے [1]۔

---

[1] خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر۔ ج ۳، ص ۸۔ نیز دیکھیے: الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۴۴، ۲۴۵۔

## ان کے استاد مفتی قطب الدین محمد نہر والی لاہوری:

مفتی عبدالکریم گجراتی کے حالات کی مناسبت سے یہاں ان کے استاد محترم مفتی قطب الدین محمد کے حالات بھی درج کیے جاتے ہیں' جو عثمانی سلاطین کے محبوب عالم دین تھے۔ ان کے حالات پروفیسر ظہور احمد اظہر (اورینٹل کالج لاہور) نے ماہنامہ ''المعارف'' لاہور (بابت جون ۱۹۷۰ء) میں تحریر کیے تھے' وہیں سے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

لاہور کے مردم خیز خطے نے عربی زبان اور اسلامی علوم کے جن نامور فضلا کو جنم دیا' ان میں سے ایک مولانا مفتی قطب الدین محمد لاہوری بھی تھے۔ وہ علوم الحدیث کے نامور' ثقہ اور مستند امام اور اسلامی تاریخ اور علوم اسلامیہ کے جلیل القدر عالم ہونے کے علاوہ عربی ادب کے ماہر اور ایک عمدہ شاعر بھی تھے۔ مفتی صاحب کا شمار بجا طور پر امام حسن صغانی لاہوری اور اس قبیل کے دیگر جلیل القدر علما و فضلا میں کیا جا سکتا ہے' جو لاہور میں پیدا ہوئے اور پھر علوم و معارف کی تلاش میں دیار عرب گئے اور عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کی تاریخ میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

مفتی قطب الدین محمد ۹۱۷ھ (۱۵۱۱ء) میں لاہور میں پیدا ہوئے ❶ اور یہیں اپنے والد مولانا ابوالعباس علاء الدین احمد نہر والی سے عربی و اسلامی علوم کی متداول کتابوں کی ابتدا کی۔ پھر ان کے ہمراہ حجاز چلے گئے' جہاں ایک طویل مدت تک ان کا خاندان مکہ مکرمہ میں تدریس اور افتا کے اعلیٰ منصب پر فائز رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کا خاندان خالص عربی خاندان تھا جو عدن سے ہجرت کر کے بلاد گجرات میں وارد ہوا اور وہاں کے مشہور شہر نہر والا میں مقیم ہو گیا تھا۔ ان کے بزرگوں کے نام یہ ہیں۔ مفتی قطب الدین محمد بن علاء الدین احمد بن شمس الدین محمد بن محمود قاضی خاں بن بہاء الدین بن یعقوب بن اسماعیل بن علی بن القاسم بن محمد بن ابراہیم بن اسماعیل حنفی خرقانی لاہوری ثم مکی' جو القطب النہر والی یا قطب الدین نہر والی کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔ مفتی قطب الدین محمد کے پردادا شیخ محمود الملقب بہ قاضی خاں قاضی کے منصب پر فائز تھے' پھر نا معلوم اسباب کی بنا پر ان کے والد لاہور آ گئے' اور یہاں سے حجاز چلے گئے تھے ❷۔

یوں تو مفتی قطب الدین کے آبا و اجداد علم و فضیلت کے مالک تھے ہی مگر ان کے والد کو یہ خصوصی شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے عہد کے ثقہ اور مستند محدث تھے۔ اسی طرح ان کی والدہ ماجدہ خسران بنت شیخ شمس الدین محمد بن عمرو الانصاری الشافعی بڑی زاہدہ و پاک دامن خاتون تھیں اور اپنے عہد کے ثقہ راویان حدیث میں شمار ہوتی تھیں ❸۔

❶ نزہۃ الخواطر- ج ۴' ص ۲۸۶- فہرس الفہارس- ج ۲' ص ۳۰۲-

❷ نزہۃ الخواطر- ج ۴' ص ۲۸۶- فہرس الفہارس- ج ۲' ص ۳۰۲- نیز دیکھیے: Huart A History of Arabic Literature, P 377

❸ فہرس الفہارس- ج ۲، ص ۳۰۰

مفتی قطب الدین کے والد علاء الدین احمد بن محمد نہر والی ثم مکی اپنے عہد کے جلیل القدر محدث اور عالم تھے۔ صاحب فہرس الفہارس نے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں '' خاتمۃ المحدثین و مفتی المسلمین ❶ کے القاب سے یاد کیا ہے۔ وہ ۸۷۰ھ/۱۴۶۶ء میں نہر والہ صوبہ گجرات میں پیدا ہوئے اور اپنے عہد کے علماء سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ پھر نہر والہ سے لاہور آئے اور یہاں سے حجاز تشریف لے گئے' جہاں انھوں نے شیخ عزالدین عبدالعزیز اور دیگر علمائے حجاز سے حدیث کی سند لی اور ایک مدت تک مکہ میں احمد شاہ گجراتی کے مدرسے میں تدریس کے منصب پر فائز رہے۔ مفتی قطب الدین نے خود اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ بیت اللہ کے جوار میں قیام کے دوران ان کا یہ معمول تھا کہ یوم النحر کو جمرۃ العقبہ میں رمی کرنے کے بعد فوراً مکہ آ جاتے۔ حطیم میں بیت اللہ کے سامنے بیٹھ جاتے۔ طواف کرنے والوں کو دیکھتے جاتے اور نماز مغرب تک اسی حالت میں بیٹھے رہتے۔ پھر مغرب کی نماز کے بعد سعی کرتے اور منی کو لوٹ جاتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ہر سال اولیاء اللہ میں سے کوئی نہ کوئی حج کو ضرور آتا ہے۔ وہ اس موقعے پر سب سے افضل کام کرے گا اور وہ ہے یوم النحر کے شروع میں طواف زیارت کرنا۔ میں اسی لیے یہاں بیٹھ جاتا ہوں تاکہ میں ان میں سے کسی کو طواف کرتے ہوئے دیکھ لوں یا ان کی نظر مجھ پر پڑے جو میرے لیے برکت اور سعادت کا باعث ہو ❷۔ شیخ علاء الدین آخر عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ مگر انھوں نے پھر بھی یہ معمول ترک نہ کیا۔ ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء میں ان کی وفات ہوئی۔ بقول صاحب 'نزہۃ الخواطر' وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے ❸۔

ایسے والدین کے ہاں جو بچہ پیدا ہوگا' اس کے علم و زہد اور تقوی و فضیلت کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ مفتی قطب الدین نے اپنے والدین کے علاوہ دیار عرب کے دوسرے جلیل القدر فضلا سے علوم اسلامیہ کی سند لی جن میں شیخ احمد محب الدین بن محمد العقیلی النویری المکی' شہاب الدین احمد بن موسی المغربی المصری' زین الدین علی القرمانی' جمال الدین محمد الخرقانی' عبدالعزیز بن جمال الدین العباسی القطبی الشافعی' شیخ عبدالحق سنباطی المصری' محمد بن محمد بن عبدالرحمن' الحطاب المالکی اور شیخ عبدالرحمن بن علی الربیع الشیبانی الزبیدی شامل ہیں ❹۔

مفتی قطب الدین کے اساتذہ میں سے ایک حافظ نورالدین ابوالفتوح احمد بن عبداللہ الطاؤسی

---

❶ فہرس الفہارس-۲:۳۰۲-

❷ الاعلام بالاعلام بیت اللہ الحرام-

❸ نزہۃ الخواطر-ج ۴' ص ۲۶

❹ تفصیل کے لیے دیکھیے: نزہۃ الخواطر- ج ۴ ص ۲۸۵- النور السافر- ص ۲۱۲' ۲۳۶- البدر الطالع-۱:۳۳۶- الاعلام- ۷:۲۸۷- شذرات الذہب-۸:۲۸۵-

الشیرازی الخرقانی بھی ہیں، جو معمر محدثین یعنی طویل عمر پانے والے محدثین میں سے تھے اور خراسان کے ان صوفیا کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جو ''طائفہ طاؤسیہ خرقانیہ'' کہلاتا تھا ❶۔ حافظ ابوالفتوح نامور صوفی اور محدث تھے۔ انھوں نے شیخ بابا یوسف ہروی سے حدیث سنی تھی جو ''سہ صدہا'' یعنی تین سو سالہ کے لقب سے مشہور تھے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کا تذکرہ اکثر ملتا ہے۔ مفتی قطب الدین لاہوری نے حافظ ابوالفتوح سے اپنے والد کے واسطے سے بھی روایت کی ہے اور براہ راست بھی۔ انھیں اس طریق اسناد حدیث پر بڑا فخر تھا، کیونکہ اس طرح وہ تساعی حدیث کا راوی ہونے کا شرف حاصل کرتے ہیں اور تساعی حدیث وہ ہے جس میں ایک محدث اور آنحضرت ﷺ کے درمیان آٹھ واسطے ہوں اور نواں وہ خود محدث ہو۔ اس سند کا متصل سلسلہ یوں ہے: قطب الدین محمد لاہوری عن الحافظ ابی الفتوح عن شیخ یوسف ہروی عن محمد بن شاد بخت الفارسی عن یحییٰ بن عمار الختلانی عن محمد بن یوسف الفربری عن محمد بن اسماعیل البخاری صاحب الجامع الصحیح ❷۔

مفتی صاحب نے تحصیل علوم کی خاطر مصر کا سفر بھی کیا تھا۔ اس سفر کے دوران انھوں نے جلال الدین سیوطی کے تلامذہ سے اکتساب فیض کیا۔ اسی طرح قاضی زکریا انصاری اور حافظ عبدالحق سنباطی سے بھی حدیث کی سند حاصل کی۔ یہ دونوں حافظ ابن حجر عسقلانی کے مشہور شاگرد تھے ❸ سفر مصر کے دوران مفتی قطب الدین کو ایک اور اہم شخصیت سے ملاقات اور اجازت روایت کا شرف حاصل ہوا اور وہ تھے المتوکل الثالث محمد بن یعقوب العباسی جو بنوعباس کے ان برائے نام خلفا میں سب سے آخری خلیفہ تھے جو سقوط بغداد کے بعد مصر کے مملوکوں کے زیر اثر ایک مدت تک مسند خلافت پر فائز رہے اور بالآخر سلطان سلیم ثانی کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے تھے۔ یہ محمد بن یعقوب خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ ادیب، عالم اور اچھے شاعر بھی تھے ❹۔

مفتی صاحب نے اپنے سفر مصر اور عباسی خلیفہ متوکل ثالث محمد بن یعقوب سے اپنی ملاقات کے کوائف اپنی کتاب الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ❺ میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''سلطنت عثمانیہ کے عہد تک اس عباسی خلافت کا نام باقی رہا اور خلیفہ یعقوب جس کا نام المستمسک باللہ تھا، سلطان سلیم خاں عثمانی کے عہد تک زندہ تھا۔ اگرچہ بوڑھا ہو گیا تھا اور بینائی جاتی رہی تھی۔ مستمسک باللہ

---

❶ دیکھیے: فہرس الفہارس-۲:۴۲۷، ۳۰۴-

❷ نزہۃ الخواطر-۴:۲۸۶-فہرس الفہارس-۲۹۹-الامم-ص ۴ بعد

❸ شذرات الذہب-۸:۱۷۹-فہرس الفہارس-۲:۳۰۰-

❹ تاریخ ابن ایاس-۴:۱۴۰-الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام-ص ۱۸۴-

❺ ۱۹۰ بعد-

۹۶۷ھ/۱۵۶۰ء میں فوت ہو گیا تو اس کے بعد اس کا بیٹا محمد بن یعقوب جانشین مقرر ہوا اور متوکل علی اللہ لقب اختیار کیا۔ سلطان سلیم نے جب مصر فتح کر کے چرکسی مملوکوں کا خاتمہ کر دیا تو متوکل کو اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ سلطان کی وفات کے بعد متوکل کو مصر آنے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء میں اپنی وفات تک وہ مصر میں مقیم رہا۔ مفتی قطب الدین کے بقول متوکل عالم و فاضل اور شاعر تھا۔ اس کے یہ دو شعر ہیں۔

لم یبق من محسن یرجی ولا حسن　　ولا کریم الیہ مشتکی الحزن

وانما ساد قوم غیر ذی حسب　　ماکنت او ثران یمتد بی زمنی

(نہ کوئی محسن باقی رہا جس سے کہ اچھائی کی امید ہو سکے اور نہ کوئی شریف باقی رہا ہے جس سے کہ رنج والم کا شکوہ کر سکیں۔

اب تو حال یہ ہے کہ غیر شریف لوگ سردار بن گئے ہیں، اس لیے مجھے ہرگز گوارا نہ تھا کہ میری عمر لمبی ہو۔)

خلفیہ سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مفتی صاحب لکھتے ہیں [1] ''۹۴۳ھ/ ۱۵۳۷ء میں جب میں حصول علم کی خاطر مصر گیا تو میں ان (متوکل ثالث) سے بھی ملا اور ان سے بہت کچھ اخذ کیا۔ اس زمانے میں مصر میں بڑے بڑے عالم و فاضل لوگ موجود تھے اور مشائخ کرام کی برکات بھی وہاں عام تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے مصر ایک دلہن ہے جو آفتاب و مہتاب اور ستاروں کے جھرمٹ میں رواں ہے:

ثم انقضت تلک السنون و اھلھا　　فکانھا و کانھم احلام

(پھر وہ زمانہ بھی بیت گیا اور اہل زمانہ بھی۔ اب یوں لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔)

مفتی قطب الدین ترکوں کے محبوب عالم دین تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ترکوں کے دلوں میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے خلوص و محبت کے جو جذبات پائے جاتے ہیں، ان کا ایک بہت بڑا سبب ہمارے علمائے دین تھے، جنھوں نے ہر مرحلے پر عثمانی ترکوں کی امداد و حمایت کو اپنے ایمان کا جزو سمجھا۔ ہر مشکل میں ان کے ساتھ رہے اور ان کی زبانی، قلمی اور مالی معاونت کرتے رہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ ''ہندی'' علما جو ترکی خلافت کے زمانے میں حرمین میں جا کر مقیم ہو گئے اور سلاطین آل عثمان کی خیر خواہی اور فتح و نصرت کے لیے ہر وقت دست بدعا رہے۔ مفتی قطب الدین بھی علما کے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ترکوں کے دلوں میں جو قدر و منزلت پنہاں تھی، اس کا اندازہ امام شوکانی ایسے جلیل القدر محدث اور مورخ کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے مفتی قطب الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھے ہیں: ''ترکوں کے ہاں انھیں بہت بڑی عزت اور منزلت حاصل تھی۔ ترک زعما و قائدین میں سے جب بھی کوئی حج کو آتا تو ان سے ملے بغیر واپس نہ لوٹتا۔ وہ مفتی صاحب کے مقابلے میں اور کسی عالم کو پسند نہ کرتے تھے۔ اور انھیں بڑے بڑے عطیات

[1] الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ ص ۱۸۵۔

سے نوازتے تھے۔ وہ ان گراں قدر عطیات سے نفیس قسم کی کتابیں خریدتے اور ضرورت مندوں کو دیتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس جو ذخیرۂ کتب جمع ہو گیا تھا شاید ہی کسی اور عالم کے پاس ہو ❶۔"

خود مفتی صاحب کو ترکوں سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہو سکتا ہے: ❷ "حق و صداقت کی تلواریں صرف چار ہیں۔ ان کے علاوہ ہر تلوار آتش جہنم کے قابل ہے۔ ایک وہ شمشیر رسالت جو مشرکین کے خلاف اٹھی۔ دوسری وہ شمشیر صدیقی جو مرتدین و مانعین زکوۃ کے خلاف نیام سے باہر آئی۔ تیسری شمشیر علوی جو باغیوں کی سرکوبی کے لیے بے نیام ہوئی۔ چوتھی شمشیر حق وہ ہے جو مسلمانوں کا قصاص لینے کے لیے نیام سے نکالی جائے اور آل عثمان کی تلواریں ان چار اصناف سے باہر نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ روز اول سے آج تک کفار و مشرکین کے خلاف مصروف جہاد ہیں۔ ملحدوں اور باغیوں کے سر کچل رہے ہیں۔ اور دین اسلام کے شعائر اور مسلمانوں کی حفاظت و دفاع میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی سلطنت کا سایہ مسلمانوں پر عام کرے۔ ان کے ذریعے اہل سنت کی تائید کرے اور ان کے سبب تمام ملحدین و مرتدین کا قلع قمع ہو۔ تمام فرق اسلامیہ کو یہ دعا کرنی چاہیے کیوں کہ یہ سلاطین آل عثمان اسلام کے ستون، دین متین کو قائم کرنے والے اور دنیا میں اسے عام کرنے والے ہیں۔ اس سلطنت شریفہ کے لیے دعا کرنا اصل میں تمام اہل اسلام کے لیے دعا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کو عزت و سربلندی بخشنے اور سیدنا محمد ﷺ کے پیغام کی نصرت و امداد کرنے کے مترادف ہے۔"

ترک سلاطین سلیمان اعظم، سلطان سلیم خاں ثانی اور سلطان مراد خاں سے مفتی صاحب کے تعلقات رہے اور ان کی طرف سے انھیں وقتاً فوقتاً انعامات ملتے رہے۔ ۹۴۳ھ/۱۵۳۷ء میں جب وہ استنبول گئے تو سلیمان اعظم کے دربار میں باریابی حاصل ہوئی ❸۔ سلطان مراد خاں سے تو ان کے بڑے گہرے روابط تھے۔ اس نے اپنے عہد سلطنت میں بیت اللہ کی تعمیر و اصلاح کی طرف توجہ دی۔ مکہ معظمہ میں ایک اسلامی درس گاہ قائم کی اور مفتی صاحب کو مسند صدارت کا اعزاز بخشا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے ذاتی ملابس میں سے دو قیمتی شالیں ہدیتہً بھیجیں اور ایک سو دینار مقرر کیے ❹۔

ترک وزرائے اعظم میں سے ایاس پاشا، سنان پاشا، لطفی پاشا اور علی پاشا کے ساتھ مفتی قطب الدین صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ ۹۴۳ھ/۱۵۳۷ء میں جب انھیں استنبول کا پہلا سفر پیش آیا تو ایاس پاشا اس وقت سلیمان اعظم کا وزیر اعظم تھا، اور مفتی صاحب کے والد مولانا احمد علاء الدین سے خط و کتابت رکھتا تھا۔ استنبول میں قیام کے دوران اس نے مفتی صاحب کی بڑی قدر و منزلت کی اور خلیفہ سے ان کی ملاقات

---

❶ البدر الطالع-۲: ۵۷-

❷ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام-ص ۳۸۸-

❸ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام-ص ۲۹۹-

❹ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام-ص ۴۱۶-

بھی کرائی۔ ❶ سنان پاشا تو مفتی صاحب کا محبوب رہنما تھا۔ اس نے کئی ایک ممالک فتح کیے تھے، جن میں تونس اور یمن بھی شامل تھے۔ ❷ لطفی پاشا بہت بڑا فقیہ اور عالم تھا۔ ۹۴۹ھ/۱۵۴۳ء میں جب وہ حج کے لیے آیا تو مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی اور ترکی زبان میں اپنی کتاب شرح فقہ اکبر انھیں دکھائی اور ساتھ ہی درخواست کی کہ اس شرح کو فارسی اور عربی زبانوں میں ڈھال دیا جائے۔ مفتی صاحب نے یہ کام بطیب خاطر انجام دیا اور انعام سے نوازے گئے۔ ❸ ۹۶۵ھ/۱۵۵۸ء میں جب مفتی صاحب دوسری مرتبہ استنبول گئے تو اس وقت علی پاشا وزیر اعظم تھا۔ ملاقات کے دوران اس نے مفتی صاحب کو اپنی بعض فتوحات کے واقعات سنائے۔ اس پر انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ جس طرح قدیم سے مسلم سلاطین کی فتوحات کو تاریخ میں محفوظ کیا جاتا رہا ہے اس طرح ان عثمانی فتوحات کو بھی ایک کتاب میں محفوظ کر دینا ضروری ہے کیونکہ گردش ایام کے ساتھ یہ واقعات انسانی یادوں سے محو ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ عربی دیوان الانشا کے سربراہ مولانا علی چلپی الحمیدی کو اس کام پر مامور کیا گیا مگر مفتی صاحب کو افسوس ہے کہ یہ کام تکمیل پذیر نہ ہو سکا ❹۔

مفتی قطب الدین ایک مدت تک مکہ مکرمہ میں درس و تدریس اور روایت حدیث میں مشغول رہے۔ مکہ مکرمہ میں احمد شاہ والی گجرات کے قائم کردہ مدرسہ میں انھوں نے پڑھا بھی اور پڑھایا بھی۔ وہ سلیمان اعظم کے مکہ مکرمہ میں قائم کردہ مدرسہ سلیمانیہ میں بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور جب سلطان مراد خاں کا زمانہ آیا تو اس نے جہاں ان کے مشاہرے میں اضافہ کیا وہاں مکہ مکرمہ کا مفتی اعظم بھی مقرر کیا۔ اپنی وفات تک وہی یہ دونوں فریضے انجام دیتے رہے۔ مفتی صاحب کی وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شوکانی ❺ نے ان کی تاریخ وفات ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ان کی تاریخ وفات اس جملے سے نکلتی ہے: "قدمات قطب الدين اجل علماء مكة۔" النور السافر کے مصنف نے بھی تاریخ وفات یہی لکھی ہے۔ ❻ ڈاکٹر زبید احمد ❼ اور جرجی زیدان ❽ نے بھی اسی کا تتبع کیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء میں جب سلطان مراد نے اہل مکہ کے لیے انعامات و عطیات ارسال کیے تو مفتی صاحب کو اپنے ذاتی توشہ

---

❶ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ص ۲۹۹۔

❷ ایضاً۔ص ۳۶۶۔

❸ ایضاً۔ص ۳۰۰۔

❹ ایضاً۔ص ۳۰۴۔

❺ البدر الطالع۔۲:۵۸۔

❻ النور السافر۔ص ۳۸۳۔

❼ Contrribution of India to Habic Literature. p.444

❽ تاریخ اداب اللغۃ العربیۃ۔۳:۳۳۳۱۔ دیکھیے فہرس الفہارس ۲:۳۰۲۔

خانے میں سے دو شالیں بھی ارسال کی تھیں اور اس کا ذکر کرتے ہوئے مفتی صاحب نے اپنی تاریخ مکہ (الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ص۴۱۶) میں اس بات کو مفصل طور پر بیان کیا ہے اور صاحب نزہۃ الخواطر (۴:۲۸۹) نے بھی اس بیان پر اعتماد کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مفتی قطب الدین لاہوری کی وفات ۹۹۷ھ/ ۱۵۸۹ء میں ہوئی ❶۔

مفتی صاحب کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ دسویں صدی ہجری میں جو عظیم محدثین ہوئے ہیں' ان میں مفتی قطب الدین لاہوری ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اس دور میں حدیث کی جو اعلیٰ سند انھیں نصیب تھی' وہ اور کسی عالم کو حاصل نہ تھی۔ اور جو طریقہ انھوں نے حدیث کی روایت کا اخذ کیا وہ ابن حجر کی نظروں سے بھی اوجھل تھا اور اس پر مفتی قطب الدین کو بجا طور پر فخر تھا ❷۔ ان سے علما کی جس کثیر تعداد نے حدیث اخذ کی ہے' ان میں مولانا عبداللہ بن سعد اللہ لاہوری ثم مدنی' احمد الشناذی' محمد ابن العجل اور نورالدین ابن مطیر ایسے جلیل القدر محدثین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مراکش' تونس' الجزائر' مصر' عراق' شام' حجاز' ترکی' یمن اور برصغیر پاک و ہند کے بے شمار علما نے ان سے علم حدیث کی سند حاصل کی ❸۔

اس میں شک نہیں کہ مفتی قطب الدین کی اصل شہرت زیادہ تر ایک جلیل القدر محدث اور بلند پایہ فقیہ کی حیثیت سے تھی' لیکن بایں ہمہ وہ عربی زبان کے اچھے شاعر بھی تھے۔ اگرچہ ان کی شاعری نعت رسول (ﷺ)' ترک سلاطین اور وزرا کی مدح و ستائش اور بعض دوستوں کے مرثیوں تک محدود تھی' مگر ان کی شاعری میں فصاحت و بلاغت اور لفظی اسلوب کے محاسن کے ساتھ معانی و افکار کی گہرائی اور ندرت کی چاشنی بھی موجود ہے۔ اس بات کا احساس خود مفتی صاحب کو بھی تھا۔ چنانچہ ترکوں کی فتوحات کے متعلق اپنی تاریخ البرق الیمانی فی فتح العثمانی کا آغاز انھوں نے اپنے ایک قصیدے سے کیا ہے۔ اس قصیدے کا ذکر وہ ایک جگہ ان الفاظ میں کرتے ہیں ❹۔

> وكنت صدرت ذلك التاريخ بقصيدة طنانة من نظمي الطنان' سادت بها الركبان و تلقتها بالقبول ادباء علماء البلدان احببت ايرادها ههنا لبلاغتها عندعلماء البيان و فصحاء اللسان' تسابق الفاظها و معانيها لى الآذان والا ذهان تسابق افراس الرهان يعد كل

---

❶ دیکھیے الاعلام ۶:۲۳۴۔ از خیرالدین زرکلی۔

❷ فہرس الفہارس ۲:۳۰۱۔

❸ تفصیل کے لیے دیکھیے: الامداد۔ ص۵۷۔ الامم۔ ص۴۔۵۔ قطف الثمر۔ ص۱۳۔ اتحاف الاکابر۔ ص۶۱۔ نزہۃ الخواطر۔ ج۴:۲۸۶ بعد۔ فہرس الفہارس ۲:۲۹۹ بعد

❹ الاعلام باعلام بیت اللہ۔ ص۳۶۶۔

بيت منها بديوان و تسحب كل كلمة منها اذيال البلاغة على سحبان۔

(میں نے اپنی اس کتاب تاریخ کا آغاز اپنے ایک پرشکوہ قصیدے سے کیا ہے۔ یہ وہ قصیدہ ہے جسے قافلے لے کر دنیا کے ہر گوشے میں پہنچے اور جسے ہر جگہ کے ادبا و علما نے شرف قبولیت بخشا ہے۔ میں نے اس قصیدے کو یہاں نقل کرنا پسند کیا ہے کیونکہ علمائے بیان اور فصحائے لسان کے ہاں یہ بلند درجہ رکھتا ہے اور اس کے الفاظ گوش و ہوش کی طرف یوں سبقت کرتے ہیں جس طرح میدان مقابلہ میں دوڑنے والے گھوڑے۔ اس قصیدے کا ہر شعر دیوان کا درجہ رکھتا ہے اور ہر لفظ سحبان وائل کی بلاغت کو مات کرتا ہے۔)

اس قصیدے میں سلطان سلیم خاں کی مدح کے ساتھ سنان پاشا کو یمن کی فتح پر خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ مطلع یہ ہے۔

لك الحمد يا سوى فى السر والجهر
على عزة الاسلام والفتح والنصر

(اے خدا خفیہ و علانیہ حمد و ستائش تیرے ہی لیے ہے کہ تو نے اسلام کو عزت، فتح اور نصرت عطا کی۔)

سلطان سلیم کی مدح میں یہ دو شعر قابل ذکر ہیں:

شهنشاه سلطان الملوك جميعهم — "سليم" كريم اصله اطيب النجر
عماد يلوذ المسلمون بظله — وسد منيع الانام من الكفر

(شہنشاہ یعنی دنیا کے تمام بادشاہوں کا بادشاہ سلیم جو بڑا کریم النفس ہے اور پاک نہاد ہے وہ ایک ستون ہے جس کے سایہ میں مسلمان پناہ لیتے ہیں اور ایک محفوظ بند ہے جو لوگوں کو کفر سے بچاتا ہے۔)

مفتی صاحب کے اشعار منتشر شکل میں موجود ہیں اور زیادہ تر ان کی اپنی تصانیف البرق الیمانی اور الاعلام میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے اشعار کے منتخب نمونے دیے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ عبدالقادر بن عبداللہ عیدروس (صاحب النور السافر) نے تو ان کے کلام کے بڑے نادر نمونے جمع کر دیے ہیں [1]۔

مفتی قطب الدین لاہوری نے کوئی ایک درجن کے قریب تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے ایک مکہ مکرمہ کی مفصل و مکمل تاریخ ہے۔ اس میں ضمنی طور پر کئی اہم تاریخی حوادث بھی قلم بند کر دیے گئے ہیں جو ایک نہایت ہی قیمتی تاریخی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا نام الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ہے اور یہ دو مرتبہ چھپ چکی ہے۔ دوسری اہم کتاب ترکوں کے غزوات و فتوحات کی تاریخ ہے اور اس کا نام ہے 'البرق الیمانی فی الفتح العثمانی' جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی اور اس کا خلاصہ چھپ چکا ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ مفتی

[1] النور السافر۔ ص ۳۸۳۔

صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں اور ابھی تک تحقیق و اشاعت کی منتظر ہیں۔ (۱) منتخب التاریخ فی التراجم (۲) ابتہاج الانسان (۳) التماثل و المحاضرۃ بالابیات المفردۃ النادرۃ (۴) گراز الاسماء (۵) تحفۃ الاصحاب ونزہتہ ذوی الالباب (۶) الہدایۃ الرحمانیۃ الی طریقۃ السادۃ الخرقانیۃ (۷) تاریخ فتح تونس (۸) الفوائد النیۃ فی الرحلۃ المدینۃ والرومیۃ ❶۔

## ۳۸۔ شیخ عبداللطیف سندھی

شیخ عبداللطیف بدینی سندھی' فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے فاضل تھے۔ اچھے شاعر بھی تھے۔ ہر چھ ماہ بعد سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے دربار میں جاتے اور اس کی خدمت میں ایک خاص قسم کی نرم ونفیس چٹائیوں کا جوڑا بطور تحفہ پیش کرتے۔ اس کے بدلے میں بادشاہ کی طرف سے بڑا اعزاز پاتے' جو ان کے علمی وقار کے مطابق ہوتا۔ ان کی حیثیت بادشاہ کے قابل احترام دوست کی تھی۔ جب بوڑھے ہو گئے تو اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے اس دوست کی کبرسنی اور ضعیفی کی بنا پر ان کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا تا کہ وہ اپنے وطن میں سکون کی زندگی بسر کریں اور کسی کی احتیاج باقی نہ رہے ❷۔

## ۳۹۔ شیخ عبداللہ سندیلوی

شیخ عبداللہ سندیلوی' ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر سندیلہ کے باشندے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن بہلول بن چاند بن جنید بن محمد بن برہان الدین بن عزالدین محمود بن نجم الدین احمد بن شمس الدین عثمان ہروی سندیلوی۔ شیخ عبداللہ نماز عصر کے وقت دوشنبہ کے روز ۱۲ ربیع الثانی ۹۰۴ھ/ ۲۷ نومبر ۱۴۹۸ء کو علاقہ اودھ کے شہر سندیلہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی نو سال کے بچے تھے کہ مخدوم شیخ صفی ساقی پوری کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے' اور سولہ سال کی عمر کو پہنچے تو حصول علم کا شوق دل میں موجزن ہوا' جو انھیں صوبہ یوپی کے ایک علمی مرکز گوپا مئو لے گیا۔ وہاں شیخ اللہ داد بن سعد اللہ عثمانی گوپاموی کی مسند تدریس آراستہ تھی' ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور ان سے صرف ونحو کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ گوپا مئو سے بدایوں گئے اور بدایوں سے دہلی کا عزم کیا۔ دہلی میں شیخ معزالدین بخاری کے ہاں سکونت اختیار کی۔ وہاں مدرسہ دہلی میں لب الارشاد اور کافیہ کا درس لیا۔ دہلی سے حصار کا رخ کیا' وہاں مولانا برہان الدین ملتانی سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر ان کے ساتھ ہی گجرات روانہ ہو گئے اور اکثر علوم کی کتابیں اور تفسیر قرآن انہی سے پڑھیں۔ شرح

---

❶ ماہنامہ ''المعارف'' لاہور بابت ماہ جون ۱۹۷۰ء۔ مضمون پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

❷ تحفۃ الکرام۔ ص ۴۸۳۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۴۸۔

مواقف، شرح مقاصد اور ریاضی کے کچھ رسالوں کی تکمیل کے لیے مولانا وجیہ الدین علوی گجراتی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ ہدایۃ الفقہ، اصول بزدوی اور عضدی شیخ مبارک گوالیاری سے پڑھیں۔ حدیث اور اصول حدیث کا علم شیخ عبدالاول حسینی دولت آبادی سے حاصل کیا۔ فصوص اور اس کی شروح کی سند شیخ مصطفیٰ رومی نے لی۔

شیخ عبداللہ سندیلوی نے چوبیس سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم کی تحصیل سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد اخذ طریقت کا شوق پیدا ہوا تو شیخ محمد غوث شطاری گوالیاری کی خدمت میں گئے۔ شیخ محمد غوث نے اس کی سند اجازت ان کو ذی الحجہ کے مہینے میں ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء کو گجرات میں مرحمت فرمائی۔ دو سال تک وہ اس مسند پر فائز رہے اور مسترشدین کو فیض پہنچاتے رہے۔ بعد ازاں حرمین شریفین کا قصد کیا اور پانچ سال مدینہ منورہ میں اقامت گزین رہے۔ ان کی زندگی کے یہ پانچ سال زہد و عبادت اور معاملات دنیا سے علیحدگی وانزوا میں گزرے۔ اس اثنا میں وہ ہر سال سعادت حج سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ پانچ سال کے قیام حجاز کے بعد مراجعت فرمائے ہند ہوئے اور احمد آباد میں اقامت اختیار کی۔ وہاں شادی کی اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی باقاعدگی سے شروع کر دیا جو پندرہ سال احمد آباد میں جاری رہا۔ پھر گوالیار چلے گئے اور تمام امور سے منقطع ہو کر قناعت و عفاف اور توکل و استغنا کی زندگی بسر کرنے لگے۔ کبھی امرا و اغنیا کے دروازے پر نہیں گئے اور نہ کسی دینوی معاملے میں کسی سے ملنے کی ضرورت محسوس کی۔

شیخ عبداللہ سندیلوی کے بیٹے شیخ عبدالنبی سندیلوی اکبر آبادی تھے، جو عالم و فاضل بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے والد گرامی ____ شیخ عبداللہ سندیلوی ____ کے ملفوظات اپنی کتاب جامع الکلم میں درج کیے ہیں۔

شیخ عبداللہ سندیلوی کی تصانیف یہ ہیں: سراج السالکین، کنز الاسرار فی اشغال الشطار، شرح رسالہ غوثیہ، اورادِ صوفیہ، انیس المسافرین، اسرار الدعوۃ، رسالۃ الصوفیہ۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالم نے ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۰۱۰ھ/ ۹ر دسمبر ۱۶۰۱ء کو آگرہ میں وفات پائی [1]۔

## ۴۰۔ سید شیخ عبداللہ حضرمی

سید شیخ عبداللہ حضرمی کا نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن حسین بن محمد بن علی بن احمد بن عبداللہ بن محمد بافقیہ حسینی حضرمی۔ یہ شافعی المسلک فقیہ تھے اور اپنے عصر کے کبار علمائے دین اور مشاہیر فضلائے کرام میں سے تھے۔ تریم میں پیدا ہوئے، عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو قرآن مجید حفظ کیا اور قرأت کی مشہور کتاب جزری زبانی

[1] اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) ۔ ص ۴۵۴ تا ۴۵۷۔ نزہۃ الخواطر ۔ ج ۵، ص ۲۴۹، ۲۵۰۔

یاد کی۔ اپنے والد گرامی ___ شیخ حسین ___ سے فقہ کی مروجہ کتابیں پڑھیں۔ علم حدیث اور علوم ادبیہ کی اکثر کتابوں کے لیے شیخ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب الدین کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ فقہ کی بعض کتابوں کی تحصیل شیخ عبدالرحمٰن بن علوی بافقیہ سے کی۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد اساتذہ سے اخذ علم اور کسب فیض کیا۔ متعدد مشائخ سے تصوف کی تعلیم حاصل کی اور اس سلسلے میں بلند مرتبے کو پہنچے۔ بعد ازاں علوم ادبیہ میں بالخصوص مہارت پیدا کی اور اس ضمن میں بڑی شہرت پائی۔ اپنے نواح کے علما و مشائخ سے استفادہ کے بعد عازم ہند ہوئے۔ اس سفر میں بہت سے ارباب فضل اور اصحاب کمال ان کے ساتھ تھے۔ پھر ''کنور'' شہر کا قصد کیا۔ وہاں سید کبیر بن محمد بن عمر بافقیہ اور دیگر اصحاب علم کی مسند درس آراستہ تھی' ان سے اخذ علم کیا۔ اس اثنا میں ان کی علمی قابلیت کے جوہر چمکے اور شہرت کا دائرہ وسیع ہوا۔ وہاں کے وزیر عبدالوہاب کو ان کی وسعت علم کا پتا چلا تو ان سے بھی ملاقات کی۔ یہ شیخ عبداللہ کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ وزیر عبدالوہاب ان کے علم و فراست سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی اور وزارت میں اپنا معاون مقرر کیا۔ شیخ عبداللہ نے مسند تدریس بچھائی اور علما و طلبا کی ایک جماعت ان کے گرد جمع ہوگئی۔ اب ان کی شہرت اس نواح کے مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور مسلمانوں نے ان کی علمی و تدریسی قابلیت سے بہت استفادہ کیا۔ شیخ موصوف بڑے حاضر جواب اور مناظر تھے۔ تحقیقی مباحث میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر پاتا تھا۔

شیخ عبداللہ کئی کتابوں کے مصنف اور شارح بھی تھے۔ مثلاً شرح الاجرومیہ' شرح الملحہ' ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں نظم و نثر میں کئی عمدہ رسالے تصنیف کیے۔

عابد و زاہد' راسخ العقیدہ' عالی ہمت اور صاحب صلاح و تقویٰ بزرگ تھے۔ زبان میں بڑا اثر تھا۔ میٹھے اور پیارے انداز سے بات کرتے' ہر لفظ میں دل میں اتر جاتا' حسن اخلاق کے حامل اور عذوبت کلام کے مالک تھے۔ ہمیشہ خوش رہتے اور ہر شخص پر احسان کرتے' بے حد سخی تھے' کھلے دل سے لوگوں پر خرچ کرتے اور استعمال کی قسم قسم کی چیزیں انھیں عنایت فرماتے' شان دار محل میں رہتے اور عمدہ گھوڑے پر سوار ہوتے۔ لوگوں کو فائدہ پہنچانے میں مشہور تھے' وقت کا زیادہ حصہ طلبا کو علم سکھانے میں صرف کرتے۔ رات کو بھی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ غرض یہ شافعی المسلک فقیہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وفات کے وقت منصب وزارت پر فائز تھے [1]۔

## ۴۱- شیخ عبداللہ حضرمی

یہ ایک اور سید شیخ عبداللہ حضرمی ہیں جن کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن زین بن محمد بن عبدالرحمٰن بن زین ابن محمد مولیٰ عبدید حضرمی۔ یہ بھی مسلکاً شافعی تھے اور اپنے دور کے اجل فقیہ تھے۔

[1] خلاصۃ الاثر۔ ج ۳' ص ۳۹۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۵۰' ۲۵۱۔

ان کا مولد تریم ہے۔ کچھ بڑے ہوئے تو پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر طلب علم کی طرف متوجہ ہوئے اور جزری، عقیدہ غزالیہ، اربعین نوویہ ملحہ، قطر اور الارشاد حفظ کیں، اور یہ تمام محفوظات اور حفظ شدہ کتابیں اس زمانے کے فاضل علما کو سنائیں۔ قاضی احمد بن حسین سے علم فقہ حاصل کیا اور ایک عرصے تک ان کی خدمت میں حاضر رہے، یہاں تک کہ ان سے تکمیل کی منزلیں طے کیں اور بہت سے علمی فوائد و فیوض حاصل کیے اور متعدد علوم پڑھے، مثلاً تفسیر اور حدیث کی تحصیل انہی سے کی۔ کچھ علوم شیخ ابوبکر عبدالرحمٰن سے پڑھے۔ ان کے بھائی شیخ محمد ہادی سے حدیث اور تصوف کا علم حاصل کیا۔ ان کے مشائخ و اساتذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، جن میں شیخ عبدالرحمٰن بن محمد عیدروس اور شیخ عبدالرحمٰن بن علوی بافقیہ وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

شیخ عبداللہ حضرمی نہایت قوی الحافظہ اور بے حد ذہین عالم و فقیہ تھے۔ علوم مروجہ کا کوئی گوشہ ان کے حافظے کی گرفت سے باہر نہ تھا۔ علم فقہ میں ان کے اقران و معاصرین میں سے کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا۔ ان کی علمی جامعیت، دینی حزم و احتیاط اور تحقیقی حیثیت کے پیش نظر ان کے کئی اساتذہ و مشائخ نے انھیں افتا و تدریس کی اجازت دے دی تھی۔ وہ مسند درس پر متمکن ہوئے تو تشنگانِ علوم کی ایک بڑی تعداد نے ان سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ وہ فروع و اصول میں بدرجہ غایت عبور رکھتے تھے، بڑے محقق اور زیرک عالم تھے، لیکن ان کا علم ان کی عقل پر حاوی تھا۔ یعنی وہ کوئی ایسی بات نہ کرتے جو علم و تحقیق کے ترازو پر پوری نہ اترتی ہو۔ خلافیات کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر تھی اور اپنے دور کے بہت بڑے مناظر تھے۔ چنانچہ بعض اہم اور پیچیدہ مسائل کی توجیہ و تعبیر میں ان کے اور اس عصر کے ایک اور عالم و شیخ، قاضی عبداللہ بن ابوبکر خطیب کے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا، نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں کے درمیان مناظرے اور مباحثے کا سلسلہ شروع ہو گیا، جو کافی عرصے تک جاری رہا اور یہ مناظرے اور مباحثے بسا اوقات دن کے علاوہ رات کو بھی منعقد ہوتے۔

شیخ عبداللہ حضرمی، دینی معاملات پر عمل کرنے میں نہایت سخت تھے۔ رشد و ہدایت اور صلاح و تقوی میں بہت مشہور تھے۔ ریا اور دکھاوے سے متنفر تھے۔ بصیرت قلبی سے بہرہ ور تھے۔ حلیم الطبع اور نرم طبیعت تھے۔ دنیوی منافع اور اس کے ساز و سامان سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ جلیل القدر شافعی المسلک فقیہ اپنے وطن تریم سے ہندوستان آئے۔ یہاں کے علما و صوفیہ کے فیوض سے اپنا دامن بھرا، اور جو کچھ استفادہ یا استفاضہ کر سکتے تھے، کیا۔ چنانچہ سید عمر بن عبداللہ باشیبان کے بابِ عالی پر علوم تصوف اور ادب کے حصول کے لیے دستک دی اور پھر انہی سید عمر بن عبداللہ باشیبان نے ان سے علوم شرعیہ حاصل کیے۔ بعد ازاں سید عمر نے ان سے اپنے یہاں قیام کرنے کی درخواست کی، اور وہ عرصے تک ان کے ہاں مقیم رہے۔ اس اثنا میں بہت سے ہندی اصحابِ تحقیق نے ان سے اخذ علم کیا۔

وہاں سے بیجاپور کا عزم کیا۔ بیجاپور میں شیخ ابوبکر بن حسین بافقیہ کی مسند رشد و صلاح بچھی ہوئی تھی،

ان سے علوم طریقت و حقیقت کی تحصیل فرمائی۔ پھر وہیں درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ بیجا پور ہی میں وفات پائی۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس اجل شافعی فقیہ کی تاریخ ولادت و وفات کا علم نہیں ہو سکا ❶۔

## ۴۲- مولانا عبداللہ لبیب سیالکوٹی

مولانا عبداللہ بن مولانا عبدالحکیم بن شمس الدین سیالکوٹی' ارض ہند کے مشاہیر اور ممتاز علما میں سے تھے۔ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے' گھر میں علم کی نہر جاری تھی' اس سے خوب سیراب ہوئے۔ ان کے والد گرامی قدر مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ہنگامۂ درس و تدریس زوروں پر تھا اور دور دراز کے علما و طلبا کی بہت بڑی جماعت ان کے حلقۂ درس میں شامل تھی۔ مولانا عبداللہ بھی اس میں شریک ہو گئے اور باپ کی فراوانیٔ علم سے خوب استفادہ کیا۔ مولانا عبدالحکیم نے متعدد درسی کتابوں پر انھی کے لیے حواشی تحریر کیے۔ علم حدیث شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے فرزند ارجمند اور گیارھویں صدی ہجری کے مقتدر عالم دین مفتی نورالحق دہلوی سے حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود سلسلۂ درس جاری کیا' جس سے بے شمار طالبان علم کے سینے علم کی روشنی سے منور ہوئے۔ کتابیں تصنیف کیں' کئی درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے اور اس باب میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ ہند اور بیرون ہند میں اپنے فضل و کمال میں بڑی شہرت پائی اور خلق کثیر کو علوم مروجہ کے مختلف گوشوں سے بہرہ مند کیا۔

مولوی رحمان علی ان کے علم و ادراک کی وسعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

ملا عبداللہ سیالکوٹی بن ملا عبدالحکیم بگردآوری علوم از پدر فائق برآمدہ ❷۔

(مولانا عبداللہ سیالکوٹی وسعت علوم میں اپنے باپ مولانا عبدالحکیم سے فوقیت رکھتے تھے۔)

محمد صالح کنبو' جو شاہ جہان کے دور کا مورخ ہے' مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تذکرے میں ان کے بیٹے مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے خلف الصدق مولانا عبداللہ سیالکوٹی ہیں' جو تمام علوم کے جامع' مکارم اخلاق کے حامل' بہترین اوصاف کے مالک' عمدہ خصائل سے بہرہ ور اور لائق ستائش عادات و اطوار سے متصف ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:

مولانا عبداللہ خلف الصدق آں حضرت است کہ جامع جمیع علوم است و صاحب مکارم اخلاق و کرایم اغراق و محاسن شمائل و محامد خصائل ❸۔

---

❶ خلاصة الاثر- ج ۳' ص ۴۰- نزہۃ الخواطر- ج ۵' ص ۲۵۱ تا ۲۵۳-

❷ تذکرۂ علمائے ہند- ص ۲۶۸-

❸ عمل صالح (شاہ جہان نامہ) ج ۳' ص ۹۵-

مغل حکومت کے آخری دور (بارھویں صدی ہجری) کے مصنف محمد اسلم پسروری (جو ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء میں زندہ تھے۔) اپنی مشہور تصنیف فرحت الناظرین میں شان دار الفاظ میں مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر کرتے ہیں۔ محمد اسلم پسروری خود بھی عالم تھے اور ان کے پردادا ملا عبدالوہاب پسروری (متوفی ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء) بھی بہت بڑے عالم، پرہیز گار، جامع معقول ومنقول اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگرد تھے۔ محمد اسلم پسروری کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

ملا عبداللہ، علمائے عصر کے سردار ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے فرزند تھے۔ علوم کی تحصیل، مشکلات کے حل، دقائق کی تحقیق اور حقائق کی تشخیص جس طرح ہونی چاہیے، اسی طرح وہ اس میں مشغول ہوئے۔ قرآن مجید کے حفظ اور صلاح وتقوی نے ان کے فضائل وکمالات میں اضافہ کر دیا تھا۔ ترک تعلق، گوشہ نشینی اور ارباب دول سے کم آمیزی میں وہ اپنے باپ (ملا عبدالحکیم) سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کی تصانیف میں حاشیہ ہدایہ بہت مشہور ہے۔

جس زمانے میں عالم گیر (بادشاہ) لاہور کے معاملات میں مشغول تھا، اس نے ملا (عبداللہ) کو نہایت اعزاز واحترام سے طلب کیا، اور وہ مدد (معاش) جو ان کے والد (ملا عبدالحکیم) کے لیے مقرر تھی، اس سے زیادہ سرخیل علما (ملا عبداللہ) کے لیے مقرر فرمادی [1]۔

سلطان اورنگ زیبؒ عالم گیر، مولانا عبداللہ سیالکوٹی کی انتہائی تکریم کرتا تھا، جس کا اندازہ سلطان کے وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ''مآثر عالم گیری'' میں ان کے لیے استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے تین مقامات پر مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر کیا ہے، اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک اورنگ زیب کے انیسویں سال جلوس میں، دوسرے پچیسویں سال جلوس میں اور تیسرے چھبیسویں سال جلوس میں۔!

سلطان اورنگ زیب عالم گیر کا انیسواں سال جلوس ۱۰۸۶ھ/ ۱۶۷۵ء میں پڑتا ہے۔ اس سال بادشاہ نے حسن ابدال کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس نے ۱۵ شوال ۱۰۸۶ھ/ ۲۳ دسمبر ۱۶۷۵ء کو حسن ابدال سے کوچ کیا۔ وہاں سے چل کر پہلا قیام کالا باغ میں ہوا۔ کالا باغ سے روانہ ہو کر ۵ ذیقعدہ کو لاہور پہنچا اور باغ فیض بخش میں نزول اجلال ہوا۔ اب تک بادشاہ کی مولانا عبداللہ سیالکوٹی سے ملاقات نہ ہوئی تھی، کیوں کہ مولانا موصوف امرا وسلاطین سے ملنے اور ان کے دربار میں جانے کے عادی نہ تھے۔ بادشاہ کو مولانا کے علم وفضل کی وسعت کا علم ہو چکا تھا اور وہ علم وعلما کا بے حد قدر دان بھی تھا۔ لہٰذا اس کے دل میں مولانا سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا، اور پیغام بھجوایا کہ وہ لاہور میں اسے ملاقات کا موقع دیں۔ یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ بادشاہ علم پرور کے قیام لاہور کے دنوں میں یہ ملاقات کئی مرتبہ ہوئی اور بادشاہ ان کے علم وفضل اور تقوی وتدین سے بہت متاثر ہوا۔ وطن واپس جاتے وقت انھیں انعام واکرام اور خلعتِ خاص سے بھی نوازا۔ محمد ساقی مستعد خاں اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

[1] فرحت الناظرین (شخصیات) اردو ترجمہ۔ ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

قدوۃ الافاضل مولوی عبداللہ سیالکوٹی پسر ملا عبدالحکیم مرحوم کہ فقر را بہ افضل ہم نشین دارد و مکارم اخلاق را با محامد آداب قرین۔ تاحال بہ ملاقات تمام حسنات خلاصہ مکوّنات خرسندی نیندوختہ بود۔ از حسن ابدال احکام شوق پیام بنام آں اعزِ انام رفتہ بود کہ بعد تشریف شریف بہ لاہور از وطن بدانجا بیاید۔ مولوی پیش از ورودِ لشکر دو سہ روز بہ لاہور رسید و چند مرتبہ بہ ادراک صحبت فیض خاصیت احتیاط اندوز گردید۔ خلعت و دو صد مہر و مادہ فیل یافتہ بہ اعزاز و احترام تمام بہ مسکن خود مرخص شد ❶۔

(یعنی ملا عبدالحکیم مرحوم سیالکوٹی کے بیٹے مولوی عبداللہ سیالکوٹی جو علما و فضلا کے سردار تھے اور فقر و درویشی کی زندگی بسر کرتے تھے' اخلاق و اعمال کے اعتبار سے ان کا اسلوب حیات ایک بہترین نمونہ تھا۔ وہ ابھی تک بادشاہ عالی مقام کی ملاقات کے شرف سے سرفراز نہ ہوئے تھے۔ بادشاہ نے اس معزز و محترم عالم کے نام حسن ابدال سے پیامِ شوقِ ملاقات بھیجا کہ لاہور پہنچنے پر وہ اپنے وطن (سیالکوٹ) سے تشریف لا کر اس سے ملاقات کریں۔ چنانچہ مولوی عبداللہ لشکر شاہی کے ورودِ لاہور سے دو تین روز پہلے ہی یہاں پہنچ گئے اور چند مرتبہ خدمت شاہی میں حاضر ہو کر صحبت فیض اثر سے بہرہ اندوز ہوئے۔ بادشاہ نے ان کو خلعت خاص' دو سو اشرفیاں اور مادہ فیل عطا فرما کر وطن جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔)

دوسری جگہ محمد ساقی مستعد خاں نے مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر عالم گیر کے پچیسویں سال جلوس (۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء) کے واقعات بیان کرتے ہوئے بالکل آخر میں کیا ہے۔ آخر شعبان ۱۰۹۲ھ/۳ر ستمبر ۱۶۸۱ء کو مولانا عبداللہ سیالکوٹی نے اپنے ایک شاگرد کو جو واقعہ نگار تھا' شرف اسلام کے لیے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ بادشاہ نے اس کی طرف خصوصیت سے عنانِ توجہ مبذول فرمائی' اور وہ اپنی وفا شعاری و حسن کارکردگی کی بنا پر بادشاہ کا منظور نظر ہوا۔ یہاں تک کہ امورِ خانہ اس کے سپرد کیے گئے۔ الفاظ یہ ہیں:

واقعہ نگار از شاگردان اسوہ فضلا ملا عبداللہ سیالکوٹی' روز مبارک یک شنبہ کہ بوساطت مومی الیہ بشرف اسلام تحصیل سعادت نمودہ' بایں نام خاص اختصاص گرفتہ منظور نظر تربیت است' بمشرفیٔ ابتیاع خانہ مقرر شد ❷۔

---

❶ مآثر عالم گیری۔ ص ۱۴۸' ۱۴۹۔

❷ مآثر عالم گیری۔ ص ۲۲۰۔ مآثر عالم گیری کے لفظ ''بشرف اسلام'' سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا یہ واقعہ نگار شاگرد غیر مسلم ہوگا' جس کو مشرف بہ اسلام ہونے کے لیے انھوں نے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور پھر وہ اپنے عمل و کردار کی وجہ سے بادشاہ کے نزدیک انتہائی قابل اعتماد قرار پا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ''بشرف اسلام'' کتابت کی غلطی ہو' اصل لفظ ''بشرف سلام'' (بغیر الف) ہو۔ اسے سلام نیاز مندانہ کے لیے مولانا نے بادشاہ کے حضور بھیجا ہو۔ اردو ترجمہ دیکھا تو وہاں بھی ''شرف اسلام'' ہی مرقوم ہے۔ اس پوری عبارت کا ترجمہ یہ ہے:
ایک واقعہ نگار ملا عبداللہ سیالکوٹی کا شاگرد یک شنبہ کے روز اپنے استاد گرامی کے واسطے سے شرف اسلام کے لیے حاضر ہوا۔ جہاں پناہ نے اس شخص کو اخلاص کیش کا خطاب عطا فرما کر مشرف ابتیاع خانہ مقرر فرمایا۔ قبلہ عالم اس کے حال پر بے حد توجہ فرماتے ہیں۔ (اردو ترجمہ۔ ص ۲۴۱)

اورنگ زیب عالم گیر کے درباری وقائع نگار محمد ساقی مستعد خاں نے مآثر عالم گیری میں تیسرے مقام پر مولانا عبداللہ سیالکوٹی کا ذکر جلوس عالم گیری کے چھبیسویں سال (۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء) کے واقعات بیان کرتے ہوئے کیا ہے۔ یہ ۳۰ ر رجب ۱۰۹۳ھ/ ۲۵ ر جولائی ۱۶۸۲ء کی تاریخ ہے' جب بادشاہ کو مولانا کی وفات کی اطلاع دی گئی۔ ان کی وفات کی خبر سن کر بادشاہ بڑا مغموم ہوا' اور اس فاضل نواز و معارف پرور شاہ ہند نے مولانا کے چاروں بیٹوں اور ان کی پاک باز بیوہ کے نام ان کو الگ الگ خلعتِ تعزیت روانہ کیے اور وظائف میں اضافہ فرمایا۔ اس موقع پر محمد ساقی مولانا مرحوم کے علم و فضل کی کھل کر وضاحت کرتا ہے اور یہ واقعہ بھی بیان کرتا ہے کہ بادشاہ نے اپنے مقرب خاص بختاور خاں کے ذریعے خود اپنے قلم سے اس مضمون کا خط لکھ کر مولانا سے درخواست کی تھی کہ وہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمہ اللہ کی خانقاہ کی صدارت کا عہدہ قبول فرمالیں' مگر انھوں نے کبرسنی کی بنا پر معذرت کر دی۔ اس سلسلے کی پوری عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔

''جہاں پناہ کے حضور معروضہ پیش ہوا کہ فاضل اجل' عارف اکمل ملا عبداللہ بن ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے رحلت فرمائی۔ شہریار فاضل نواز و بادشاہ معارف پرور نے ملائے مرحوم کے ہر چہار پسر اور ان کی زوجہ عفیفہ کے لیے خلعت تعزیت ارسال فرما کر ان کے وظائف میں بھی اضافہ فرمایا۔ حضرت ملائے مذکور اپنے زمانے کے مشہور فاضل و عارف اور جامع شریعت و طریقت تھے۔ عمر کے آخری دور میں ملا صاحب پر جذبہ فقر غالب آ گیا تھا اور دنیا کے ساتھ آخرت کے بھی سرمایہ دار ہو گئے تھے۔ قبلہ عالم (بادشاہ ہند اورنگ زیب عالم گیر) اپنی پایہ شناسی سے اس طرح کے جامع فضل و کمال حضرات کی ہمیشہ قدردانی فرماتے ہیں۔ جہاں پناہ نے اجمیر کے زمانۂ قیام میں ارادہ فرمایا کہ حضرت ملا عبداللہ کو اجمیر کی خدمت صدارت عطا فرمائیں۔ چنانچہ قبلہ عالم نے اپنے قلم خاص سے فرمان تحریر فرما کر بختاور خاں کے حوالے کیا' جو مقرب سلطان ہے اور اپنی فقر دوستی کی وجہ سے ہمیشہ عرفا اور بادشاہ کے درمیان (ملاقات اور خط و کتابت کا) ذریعہ بنتا ہے۔ بادشاہ نے یہ فرمان تحریر کر کے بختاور خاں کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ ملا صاحب کو یہ فرمان روانہ کر کے خود ذاتی طور پر بھی خط کے ذریعے اس خدمت کے قبول کرنے کی درخواست کرے۔

''ملا عبداللہ کو (بادشاہ کا) فرمان اور (بختاور خاں کا) خط وصول ہوئے' اس بے نیاز عارف نے جواب میں بختاور خاں کو لکھا کہ:

زمان فراق است۔ نہ اوان تحصیل شہرہ درآفاق۔ بہ امتثال حکم جہاں مطاع بحضور کرامت ظہوری رسد۔

(یعنی یہ کوچ کا زمانہ ہے' نہ کہ دنیا میں شہرت و ناموری حاصل کرنے کی خواہش کا وقت۔ تاہم بندہ بادشاہ کے حسب الحکم حاضر ہوتا ہے۔)

مولانا مرحوم کا یہ خط بادشاہ کو دکھایا گیا تو

بندگانِ حضرت را ایں حرف از آں ممتاز دانشوراں پسند افتاد۔

(بادشاہ کو اس ممتاز عالم دین کا جواب بہت پسند آیا۔)

فاضل مرحوم اپنی تحریر کے مطابق اجمیر تشریف لے گئے اور اثنائے قیام اجمیر میں کئی مرتبہ بادشاہ سے ملے۔ بعد ازاں بادشاہ سے وطن واپس جانے کی اجازت طلب کی' اور وطن (سیالکوٹ) پہنچنے کے چند ماہ بعد دار آخرت کو روانہ ہو گئے۔ اللھم اغفر لہ۔

کوتاہی امل بہ ہمیں عقدہ بند بود　　　افسانہا بہ بستن مژگان تمام شد❶

مولانا عبداللہ سیالکوٹی نے چند کتابیں تصنیف کیں اور متعدد درسی کتابوں پر حواشی تحریر کیے' مثلاً التصریح علی التلویح، یہ اصول فقہ کی کتاب ہے۔ انھوں نے ابتدائے کتاب سے مقدمات رابعہ تک اس پر حواشی لکھے۔ تفسیر سورہ فاتحہ اور حقائق التوحید کے بارے میں اورنگ زیب عالم گیر کے کہنے سے ایک رسالہ تحریر کیا۔

برصغیر کے اس نامور و ممتاز عالم وفقیہ نے ماہ رجب ۱۰۹۳ھ/ جولائی ۱۶۸۲ء میں وفات پائی۔

## ۴۳- خواجہ عبداللہ دہلوی

خواجہ عبداللہ دہلوی' حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد شہیر حضرت خواجہ عبدالباقی (باقی باللہ) نقشبندی کابلی دہلوی کے چھوٹے لڑکے تھے، جو اپنے والد گرامی کی وفات سے تقریباً دو سال پہلے ۶ ر رجب ۱۰۱۰ھ/ ۲۱ ر دسمبر ۱۶۰۱ء کو پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی خواجہ عبیداللہ دہلوی (جو حضرت خواجہ باقی باللہ کی دوسری بیوی سے تھے) چار مہینے کے تھے۔ خواجہ عبداللہ کی ولادت پر عظیم المرتبت باپ نے اظہار مسرت میں متعدد اشعار کہے اور بیٹے کی صالحیت وتقویٰ کے لیے اللہ سے دعائیں مانگیں۔ خواجہ عبداللہ نے اپنے والد کے مرید خاص شیخ حسام الدین دہلوی (متوفی صفر ۱۰۴۳ھ/ اگست ۱۶۳۳ء) کی نگرانی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ابتدائی درسی کتابیں شیخ شاکر محمد اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے پڑھیں۔ پھر عازم سرہند ہوئے۔ وہاں حضرت مجدد الف ثانی کا درس وتدریس اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری تھا' ان سے کچھ کتابیں پڑھیں اور فیض طریقت حاصل کیا۔ خاصی مدت ان کی صحبت میں رہے اور بڑا استفاضہ کیا۔ پھر دہلی واپس گئے' وہاں شیخ حسام الدین اور شیخ اللہ داد نے شرف اجازہ سے نوازا۔ بعد ازاں خواجہ ممدوح نے خود درس وافادہ کی مسند آراستہ کی۔

خواجہ عبداللہ دہلوی عالم کبیر' شیخ وقت' نامور فاضل اور مشہور صوفی تھے اور خواجہ خرد کے عرف سے معروف تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے بھائی خواجہ عبیداللہ دہلوی (یعنی خواجہ کلاں) کی نسبت حضرت مجدد سے زیادہ استفادہ کیا اور ان سے علم کلام کی بعض کتابیں' مثلاً شرح مواقف وغیرہ اور صوفیا کے بعض رسائل پڑھنے کا موقع ملا۔ خود فرماتے ہیں کہ انھیں حضرت مجدد سے ''اجازت عمل طریقہ واجازت تعلیم ہا'' حاصل تھی۔ کئی مرتبہ

❶ [illegible] عالم گیری- ص ۲۲۸ تا ۲۳۰-

شیخ مجدد سے ملاقات کے لیے دہلی سے سرہند گئے۔ ایک دفعہ لاہور میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت مجدد ان سے بہت الطاف فرماتے تھے۔ اس ضمن میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

ایں فقیر چند مرتبہ از وطن مالوف بخدمت ایشاں در سرہند و یک بار در لاہور مشرف شدہ و ہر بار چندگا درخدمت بسر بُردہ۔ الطاف بسیاری فرمودند' و امیدواری چنانست کہ آں الطاف سبب نجاتِ اخروی گردد۔ اجازتِ عمل طریقہ و اجازت تعلیم ہا نیز فرمودند' و بشارت ہامی دادند۔

(یعنی یہ فقیر کئی مرتبہ اپنے وطن دہلی سے ان کی خدمت میں سرہند گیا اور ایک دفعہ لاہور جا کر شرف زیارت سے بہرہ یاب ہوا۔ ہر مرتبہ کافی عرصہ ان کی خدمت میں رہا۔ وہ مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ امیدوار ہوں کہ یہی الطاف و مہربانی نجات اخروی کا باعث ہوگی۔ اجازت طریقہ وعمل اور کئی قسم کی تعلیمات سے نوازا اور کئی بشارتیں بھی دیں۔)

خواجہ عبداللہ کے مزاج میں وجد و حال کی کیفیت زیادہ تھی' اس لیے کسی کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرنے سے گریز کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ان کے والد شاہ عبدالرحیم دہلوی' خواجہ عبداللہ کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور وہ ان پر مہربانی بھی فرماتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے ان سے حاشیہ خیالی کے چند سبق بھی پڑھے تھے۔ لیکن جب انھوں نے خواجہ سے بیعت کے لیے درخواست کی تو طرح دے گئے اور فرمایا' مجھ سے بعض بے قاعدگیوں کا صدور ہوا ہے' لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے علاقہ بیعت کی وجہ سے آپ کو کوئی ضرر پہنچے اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ حضرت آدم بنوری کے کسی خلیفہ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو جائیں۔

خواجہ عبداللہ دہلوی تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی بہرہ مند تھے۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی اور بعض کتب درسیہ پر تعلیقات و حواشی سپرد قلم کیے۔ ایک کتاب زاد المعاد لکھی' شیخ حسام الدین کے مناقب میں ایک رسالہ تحریر کیا۔ میراث کے موضوع سے متعلق بھی ایک رسالہ تصنیف فرمایا۔ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ پر تعلیقات لکھیں۔ اور بھی کئی وسائل لکھے اور کتابیں تالیف کیں۔ ان کا یہ تصنیفی کام تقریباً محفوظ ہے۔ بقول شیخ محمد اکرام ''شاید ان کا مکمل مجموعہ انڈیا آفس لائبریری (ذخیرہ دہلی) میں موجود ہے۔''

اس صوفی عالم وفقیہ نے بدھ کے روز ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۴ھ/ ۱۵ دسمبر ۱۶۶۳ء کو وفات پائی ❶۔

## ۴۴۔ مولانا عبداللہ سنبھلی

مولانا عبداللہ سنبھلی کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالعظیم بن منور بن منصور بن شیخ عبداللہ بن عثمان حسینی مودودی امروہی ثم سنبھلی' شیخ صالح اور عالم وفقیہ تھے۔ تصوف اور معرفت الٰہیہ میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ شیخ تاج الدین نقشبندی سنبھلی کی اولاد سے تھے ❷۔

❶ زبدۃ المقامات۔ ص ۶۶ تا ۷۰۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵۔ ص ۲۵۵۔ رود کوثر ص ۲۱۳ تا ۲۱۵۔

❷ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵' ص ۲۵۴۔ بحوالہ نخبۃ التواریخ۔

## ۴۵- مولانا عبداللہ برہان پوری

مولانا عبداللہ برہان پوری کا سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالنبی بن نظام الدین بن محمد ماہ بن صفی الدین عمری چشتی گجراتی ثم برہان پوری، گیارھویں صدی ہجری کے متقی اور پرہیز گار ہندی عالم وفقیہ تھے۔ صاحب فضل وکمال اور صاحب دعوت وارشاد تھے۔ ۲۹ محرم ۱۰۹۸ھ/۵ دسمبر ۱۶۸۶ء کو برہان پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

## ۴۶- قاضی عبداللہ بیجاپوری

قاضی عبداللہ گجراتی بیجاپوری، اپنے دور کے شیخ اور صاحب علم وفضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ کے متبحر علما میں سے تھے۔ علامہ وجیہ الدین گجراتی سے اخذ علم کیا اور عرصے تک باقاعدہ ان سے فیض یاب ہوتے رہے۔ پھر بیجاپور تشریف لے گئے۔ وہاں کی مسند قضا پر متمکن ہوئے اور مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ بیجاپور میں مدفون ہیں ❷۔

## ۴۷- علامہ عبداللہ چلپی رومی

علامہ عبداللہ رومی، دیار ہند کے مشہور صاحب علم تھے اور چلپی کی نسبت سے معروف تھے۔ بہت بڑے عالم اور فاضل وقت تھے۔ علوم ظاہری اور معارف باطنی سے بہرہ ور تھے۔ صوفیا کے اونچے طبقے کی اصطلاحات سے پوری طرح باخبر تھے۔ دراصل روم (ترکستان) کے باشندے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں وارد ہند ہوئے اور فقیرانہ ہیئت میں دہلی میں رہنے لگے۔ شاہ جہان کے وزیر علامی سعد اللہ خاں تھے، جو خود بھی صاحب علم و فضل تھے اور اصحاب علم کے انتہائی قدردان بھی تھے۔ انھیں علامہ عبداللہ چلپی کے بارے میں پتا چلا تو ان سے ملاقات کی اور ان کی ضروریات کے کفیل ہوئے۔ علامی سعد اللہ خاں ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ انھوں نے ان کا باقاعدہ وظیفہ بھی مقرر کیا جو اپنی جیب خاص سے انھیں دیتے تھے۔ شاہ جہان کو علامہ عبداللہ چلپی کی علمی وسعت کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں تو اس نے ان کا یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ چونکہ علامہ عبداللہ چلپی جلیل القدر عالم تھے، بہت دور کے ملک روم (ترکی) سے ہندوستان آئے تھے اور فقیروں اور درویشوں کی سی سادہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لیے شاہ جہان ان سے بہت متاثر ہوا۔ پھر وہ چونکہ ذاتی طور پر علما وفضلا کا قدردان تھا اور صوفیا کی دل سے تکریم کرتا تھا، اس لیے بھی علامہ چلپی کا احترام اس کے دل میں جاگزین ہو گیا تھا۔

---

❶ تاریخ برہان پور۔

❷ حدیقۃ الاولیا۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵، ص ۲۵۷۔

شاہ جہان کی جگہ اس کا لائق و عالم بیٹا اورنگ زیب عالم گیر تخت ہند پر بیٹھا تو وہ بھی علما کی قدرو منزلت میں باپ کا صحیح جانشین ثابت ہوا۔ اس نے علامہ چلپی کو اور بھی اعزاز و قبولیت سے نوازا۔ اس زمانے میں اورنگ زیب کی کوشش اور حکم سے فتاویٰ ہندیہ جسے فتاوی عالم گیری کہا جاتا ہے' عربی زبان میں زیر ترتیب تھا' اور علمائے ہند کی ایک بڑی جماعت جو اجلا فقہا پر مشتمل تھی' سرکاری طور سے اس اہم خدمت پر متعین تھی۔ نیک اطوار بادشاہ نے علامہ چلپی کو فتاویٰ ہندیہ کے فارسی ترجمے پر مامور کیا۔

بہرحال علامہ عبداللہ چلپی رومی' تمام مروجہ علوم وفنون پر گہری نظر رکھتے تھے۔ حکمت وتصوف کے موضوع سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کی یہ ایک نادرۂ روز گار شخصیت تھے ❶۔

## ۴۸۔ شیخ عبدالمجید امروہی

شیخ عبدالمجید بن معروف بن خداوند بن گلاب بن یحییٰ علوی امروہی' ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ بڑے ہوئے تو حصول علم کی غرض سے نارنول کا عزم کیا۔ وہاں شیخ نظام الدین بن اللہ داد بن عبدالکریم نارنولی کے مدرسے میں حاضری دی اور کتب درسیہ پڑھیں۔ شیخ نظام الدین نارنولی سے اخذ طریقت بھی کیا اور کافی مدت ان سے منسلک رہے۔ تحصیل علم وطریقت کے بعد اپنے شہر امروہہ تشریف لے گئے اور وہاں کی مسند مشیخت پر فائز ہوئے۔

شیخ عبدالمجید امروہی اپنے عصر کے عالم وفقیہ اور زاہد و عابد بزرگ تھے۔ ان سے بہت سے تشنگان علوم نے استفادہ کیا' جن میں ان کے برادر کبیر فیض اللہ بھی شامل ہیں۔ شیخ عبدالمجید نے "الذکر الاعلی فی شرح اسماء اللہ الحسنی" کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف کی' جس میں اللہ تعالی کے اسمائے حسنی کی شرح کی گئی ہے۔ اس عالم دین نے ۱۱ ربیع الثانی ۱۰۴۶ھ/۲ر ستمبر ۱۶۳۶ء کو امروہہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے ❷۔

## ۴۹۔ مولانا عبدالمجید لاہوری

مولانا عبدالمجید بن مفتی محمد لاہوری' عالم وفقیہ' عبادت گزار اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ لاہور کے

❶ انفاس العارفین ص ۵۳۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۵۸' ۲۵۹۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۴ بزم تیموریہ ص ۲۴۳۔ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ (جنوری ۱۹۴۷ء) ص ۵۲ تا ۵۴۔

❷ نخبۃ التواریخ۔ نزہۃ الخواطر۔ ج ۵۔ ص ۲۵۹۔

اس جلیل القدر عالم نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو عربی زبان میں ایک خط لکھا تھا' جس میں روح اور نفس کے تعلق کی وجہ' ان کے عروج ونزول کی کیفیت اور روح اور جسدی اعتبار سے فنا اور بقا کے بارے میں سوال کیا تھا' حضرت مجدد نے ان کو اس کا جواب لکھا تھا❶۔

## ۵۰-خواجہ عبدالمنعم احراری

خواجہ عبدالمنعم دیار ہند کے مشہور بزرگ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے پوتے تھے' اس لیے عبدالمنعم احراری کی نسبت سے معروف ہوئے۔ والد کا اسم گرامی خواجہ عبداللہ تھا۔ نہایت نیک' شیخ وقت اور فقیہ تھے۔ اس دور کے کبار اور مشاہیر ہندی مشائخ میں گردانے جاتے تھے۔ مغل حکمران شاہ جہان ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ سلیم پور کے نواح میں کئی گاؤں اس نے بطور جاگیر ان کو عطا کیے تھے۔ یہ اپنی اسی جاگیر میں رہتے تھے' اور وہیں ان کا سلسلہ فیض جاری تھا۔ ان سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔ انداز کلام نہایت پیارا اور موثر تھا۔ جس شخص نے اس عالم دین کی صحبت اختیار کر لی' وہ کندن بن گیا انھوں نے ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کے لگ بھگ وفات پائی❷۔

## ۵۱-مولانا عبدالمومن لاہوری

مولانا عبدالمومن لاہوری کی کنیت ابوالمراد تھی۔ والد کا نام محمد اور دادا کا نام طاہر تھا۔ صالح اور پرہیز گار عالم تھے۔ حدیث' فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ان کا ایک مختصر رسالہ ہے جو اپنے اندر بڑی لطافت لیے ہوئے ہے۔ اس کا نام القصر المتین من الحصن والحصین ہے۔ اس کی تصنیف سے وہ جمعہ کی رات ۲۹ جمادی الاولی ۱۰۰۴ھ/ ۱۸ر جنوری ۱۵۹۶ء کو آگرہ میں فارغ ہوئے۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

الحمد لله احمد الله على ماهدانا و ماكنا لنهتدى لو لا ان هذنا الله❸-

## ۵۲-مولانا عبدالنبی اکبر آبادی

مولانا عبدالنبی اکبر آبادی' گیارھویں صدی ہجری کے دیار ہند کے نامور شیخ' فاضل کبیر اور معارف الہیہ میں مشہور تھے۔ شیخ عبداللہ سندیلوی ثم اکبر آبادی کے فرزند تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا عبدالحی انصاری لکھنوی نے اپنی تصنیف ''طرب الاماثل بتراجم الافاضل'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

---

❶ نزہۃ الخواطر- ج۵ص۲۵۹

❷ زبدۃ المقامات-ص۲۷۶-

❸ [illegible]ۃ الاصفیا-نزہۃ الخواطر-ج۵'ص۲۶۰-

۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں مجھے مولانا عبدالنبی کی کتاب فواتح الانوار شرح لواح الاسرار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ کتاب خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ اس کے آخر میں مولانا ممدوح نے اپنی تصانیف کی ایک فہرست درج کی ہے' جن کے نام یہ ہیں۔ ذریعتہ النجاۃ شرح المشکوۃ' شرح الفصوص وشرح ترجمہ الفصوص' مختصر الفوائح المسمی بالروائح شرح اللوائح' شوارق اللمعات شرح اللمعات' شرح خلاصتہ العشق' شرح جام جہاں نما' شرح الغیبہ' شرح شرح نخبتہ الفکر' شرح معماء لمیر حسین' شرح الجواہر الخمسہ' شرح کلید مخازن' شرح تحفتہ حل الوودود' شرح علی حاشیتہ السید علی العضد ی المسمی بفیض الخبیر' رسالہ فی تعریف الفقر' رسالہ کشف الجواہر' رسالہ فی اسم الذات' رسالہ لطائف العشر فی حقیقتہ البشر' رسالہ فی المعراج' رسالہ فی شرح خیر الاسماء عبداللہ وعبدالرحمٰن' رسالہ کنوز الاسرار فی اشعار الشطار' جوامع کلم الصوفی' مقامات العارفین' فتوحات المغیبہ' حدائق الانشا' رسالہ فی الناسخ والمنسوخ المسمی دستور المفسرین' بحر الکرم شرح عین العلم' حاشیہ علی شرح الجامی من مبحث الحال الی المجرورات' سواطع الالہام شرح تہذیب الکلام' شرح حدیث معراج المومنین' شرح حدیث ''کنت کنزا مخفیا'' رسالہ دستور السعادہ فی بیان الولایہ' فیض القدوس منتخب نقد النصوص' مطالع الانوار الخفی شرح اجوبتہ الولی' جواہر الاسرار' شرح فصوص الفارابی' فیض الملک المبین شرح حق الیقین' حاشیہ علی نقد النصوص' لوامع الانوار فی مناقب السادۃ الاطہار' رسالہ فی السماع' رسالہ فی جواب اسئلتہ الفاضل النارنولی' شرح جواب ابن سینا' جو کہ ابوالخیر مولانا ابوسعید کے مکتوب کے جواب میں لکھا۔ مواہب الٰہی شرح اصول ابراہیم شاہی' شرح ارشاد النحو للقاضی شہاب الدین دولت آبادی' روح الارواح شرح الحکمتہ الاشراقیہ' رسالہ فی ایمان فرعون' رسالہ فی خلوات الوجود' رسالہ ناسخ التناسخ' شرح حضرات الخمس وغیرہ۔ ان کی تصانیف میں سے کشف الانوار شرح جواہر الاسرار فارسی میں ہے' جو علم دعوت سے متعلق ہے۔ اس میں شیخ محمد غوث گوالیاری کی جواہر خمسہ کے جوہر ثالث کی شرح کی گئی ہے۔ کتاب کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ منك العون فی الا بتداء والانتھاء یا کریم ❶۔

## ۵۳- مفتی عبدالنبی کشمیری

مفتی عبدالنبی کشمیری' مشہور عالم وفقیہ مفتی یوسف کشمیری کے بیٹے تھے۔ شیخ وقت اور اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ ان کا شمار اپنے علاقے اور زمانے کے کبار فقہائے حنفیہ میں ہوتا تھا۔ خلافیات میں ماہر اور فقہی مسالک میں اختلافی رجحانات و آرائے ائمہ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ علم فقہ اپنے والد گرامی مفتی یوسف کشمیری سے حاصل کیا اور اس میں خوب مہارت پیدا کی اور اس درجہ کمال کو پہنچے کہ روایات فقہی کی جزئیات وافتا کے استخراج میں یگانہ روزگار ہوئے۔ ان کی بالغ نظری اور فقہی عظمت کا موافق ومخالف سب نے لوہا مانا ہے ❷۔

---

❶ طرب الاماثل بتراجم الافاضل- ص ۲۲۷ تا ۲۲۹- نزہتہ الخواطر- ج ۵' ص ۲۶۱' ۲۶۲- تذکرہ علمائے ہند' ص ۱۳۴' ۱۳۵-

❷ حدائق الحنفیہ ص ۴۲۸- تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۴۸- نزہتہ الخواطر ج ۵' ص ۲۶۲-

# ۵۴- شیخ عبدالواحد مندسوری

شیخ عبدالواحد مندسوری کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالواحد بن محمد بن عبدالکریم بن ابراہیم بن نعمت اللہ بن سالار بن وحیدالدین یوسف چندیری مندسوری۔ شیخ عبدالواحد مندسوری نے بعض درسی کتابیں سید عبدالاول شیرازی کے شاگرد شیخ محمد سے پڑھیں۔ باقی کتب درسیہ کی تحصیل مشہور فاضل شیخ مبارک گوالیاری سے کی۔ ذکرواذکار کے مختلف طریقے بھی ان سے اور شیخ عبداللہ بن بہلول شطاری اکبرآبادی سے سیکھے' یہاں تک کہ ان حضرات کی تعلیم وصحبت سے تمام علوم مروجہ بالخصوص دعوت وتبلیغ اور فقہ وتصوف میں درجۂ بلند کو پہنچے۔ صاحب وجد وحال بھی تھے۔ دنیا اور اس کے مال ومتاع سے بے نیاز رہتے تھے۔ ''تارک الماء'' مشہور تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ستائیس سال پانی نہیں پیا تھا___ ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء کے آخر میں گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی شطاری ان سے ملے۔ ایک رات ان کے ہاں رہے اور تصوف وطریقت کے سلسلے میں باتیں ہوئیں۔ ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء کو فوت ہوئے ❶۔

برصغیر پاک وہند کے بعض بزرگوں کے حالات میں اس قسم کے واقعات بھی بیان کیے جاتے ہیں کہ انھوں نے اتنے سال پانی نہیں پیا تھا' اتنے سال کھانا نہیں کھایا تھا' اتنے سال کنویں میں الٹے لٹکے رہے تھے' ان کی آنکھوں میں اس قدر جلال تھا کہ آدمی اس کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو جاتا یا مر جاتا تھا' وہ کئی کئی مہینے متواتر روزے رکھتے تھے' ایک ایک رات میں ہزار ہزار نفل پڑھ لیتے تھے' ایک دن میں قرآن مجید ختم کر لیتے تھے اور ساتھ ہی دیگر عبادات ___ فرائض وسنن ___ بھی ادا کرتے تھے' وغیرہ وغیرہ۔ یاد رہے' اس قسم کی مشقتیں اور تکلیفیں اسلام ہرگز کسی کو دینا نہیں چاہتا۔ اسلام دین سہل ہے۔ تکلف اور مشقت کا مذہب نہیں ہے۔ پھر ان میں سے بعض چیزیں خلاف شرع ہیں اور بعض بالکل ناممکن ہیں۔ وہ پاک باز حضرات اس نوع کی باتیں کس طرح کر سکتے تھے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان ناممکن الوقوع امور کو ''کرامات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ سب سے بڑی اور اصل کرامت خود اسلام اور اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ جو چیزیں شرعاً ناجائز ہیں یا جن کا عمل میں آنا ناممکن ہے' ان کو ان ہستیوں کی طرف منسوب کرنا نہ اسلام کی کوئی خدمت ہے اور نہ اس سے ان بزرگوں کی شان میں اضافہ ہوتا ہے' بلکہ اس سے ان کی ذات گرامی اور خود اسلام پر جو ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا' نقد وتنقید کی راہیں کھلتی ہیں۔ کوئی مان سکتا ہے کہ پورے ستائیس سال تک پانی نہ پیا جائے اور انسان زندہ رہے۔ خود رسول اللہ ﷺ تو پیاس اور بھوک کے وقت ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگ لیتے تھے' یہ حضرات علمائے کرام جو نبی ﷺ کے اطاعت گزار تھے' کیوں کر بھوک پیاس میں رہنے کو دینی حکم تصور کر سکتے تھے۔

---

❶ اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) - ص ۴۸۷ - نزہۃ الخواطر - ج ۵' ص ۲۶۴' ۲۶۵-

# ۵۵- شیخ عبدالوہاب متقی مکی

شیخ عبدالوہاب متقی مکی، دسویں اور گیارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ہندی عالم و فاضل، محدث وفقیہ اور صاحب ورع وتقوی بزرگ تھے۔ ۹۰۲ھ/ ۱۴۹۷ء کو ہندوستان کے علاقہ مالوہ کے قدیم دارالسلطنت مانڈو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ ولی اللہ تھا۔ شیخ ولی اللہ کا شمار مانڈو کے اعیان و اکابر اور روسا و امرا کے طبقے میں ہوتا تھا۔ لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا اور انقلاب وتغیر کی ایسی لہریں چلیں کہ انھیں مانڈو کی سکونت ترک کر کے برہان پور جانا پڑا، اور پھر اسی شہر کو اپنا وطن ٹھہرالیا۔ برہان پور میں اللہ نے انھیں اسی عزت و احترام اور اکرام وشہرت سے نوازا جس سے وہ زمانہ ماضی میں اپنے قدیم وطن مانڈو میں سرفراز تھے۔ برہان پور جانے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی زمانے میں شیخ ولی اللہ کی اہلیہ محترمہ (شیخ عبدالوہاب کی والدہ ماجدہ) بھی وفات پا گئیں۔ یعنی شیخ عبدالوہاب کم سنی ہی میں والدین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے اور ایک یتیم بچے کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔

جب ان کے والد (شیخ ولی اللہ) نے مانڈو سے ترک وطن پر مجبور ہو کر برہان پور کی راہ لی تو اس سفر بے چارگی میں عبدالوہاب ان کے ساتھ تھے۔ اس میں ان کو بہت سی مشکلات سے گزرنا اور اثنائے راہ میں کئی قسم کے مصائب و آلام سے دو چار ہونا پڑا۔ اس کا ذکر ان کے شہرہ آفاق شاگرد و مرید شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے استاد کی زبانی اپنی تصنیف اخبار الاخیار میں کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

یک بارے در صغر سن ہمراہ والد خود بتقریب بعضے حوادث کہ در دیار مندو حدوث یافتہ بود دربیابانہا افتادہ وراہ گم کردہ بودیم، وہیچ چیز از جنس وطعام وشراب ہمراہ نماند، گرسنگی بر ما غلبہ کردہ۔ چنانچہ عادت اطفال باشد کہ در گریہ آمدیم، والد دل داری می داد و می گفت کہ صبر کن طعام در پیش است ❶۔

(یعنی مانڈو میں کچھ حوادث سے دو چار ہو جانے کی وجہ سے، میں ایک مرتبہ بچپن میں والد کے ساتھ جنگلوں میں تھا کہ ہم راستہ بھول گئے۔ کھانے پینے کی کوئی چیز پاس نہ تھی، بھوک کی شدت بڑھی، تو بچوں کی عادت کے مطابق، میں نے رونا شروع کر دیا۔ والد نے تسلی دی اور فرمایا صبر کر، کھانا آ گیا ہے۔)

## فقر و تجرید کی راہ پر:

والد اور والدہ کی وفات کے بعد اللہ نے شیخ عبدالوہاب کی دست گیری کی اور وہ طلب حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فقر و تجرید کی راہ کو اپنایا اور سفر و سیاحت کی زندگی اختیار کر لی۔ نواح گجرات، علاقہ دکن کے اطراف و اکناف، سیلون، لنکا اور جزائر سراندیپ میں گھومنے پھرنے لگے۔ اس دوران میں ان کا معمول یہ تھا کہ

❶ اخبار الاخیار- ص ۲۶۹

تین دن سے زیادہ کہیں قیام نہ کرتے، البتہ تحصیل علم کی غرض سے یا مشائخ وصلحا سے استفادے کی خاطر بقدر ضرورت کہیں اقامت پذیر ہو جاتے ـــــ لیکن اس اثنا میں کس مقام پر کس عالم دین سے استفادے کی منزلیں طے کیں؟ کس شیخ اور صاحب طریقت کے باب عالی پر استفاضے کے لیے دستک دی، اور کہاں کتنا عرصہ ٹھہرنے کے مواقع میسر آئے؟ افسوس ہے اس کی تفصیلات ہماری نظر سے نہیں گزریں۔ ہمارا زیادہ تر اعتماد اس سلسلے میں ان کے تلمیذ رشید شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار پر ہے۔ انھوں نے ان کے ان اسفارِ دشت وصحرا کا صرف ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، بعض واقعات بھی بیان کیے ہیں، مگر تفصیلات سے تعرض نہیں فرمایا۔ لہذا اگر قارئین گرامی قدر کو اس ضمن میں تشنگی کا احساس ہو تو ہم ان سے معذرت کرتے ہوئے عرض کریں گے کہ اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ لیکن جیسا کہ واقعات کے تسلسل سے پتا چلتا ہے، بلاشبہ وہ علم وفضل کی اچھی خاصی مقدار سے متمتع تھے اور حسن خط کی صفت سے بھی متصف تھے۔ ان کے والد بھی چونکہ عالم دین تھے، ان سے بھی انھوں نے آغاز عمر میں ضرور استفادہ کیا ہوگا۔ وہ انھیں بعض بزرگوں کی صحبت اختیار کرنے اور مواقع میسر آنے کی صورت میں ان سے فیض حاصل کرنے کی بھی تلقین کرتے تھے، مثلاً شیخ علی متقی سے استفادہ واستفاضہ کی تلقین انہی نے کی تھی۔

## ورودِ مکہ مکرمہ اور شیخ علی متقی سے حصولِ فیض:

دیار ہند کے مختلف مقامات کی سیاحت اور صحرا نوردی کے بعد شیخ عبدالوہاب نے مکہ معظّمہ کا عزم فرمایا۔ اس وقت شیخ ممدوح کا عنفوانِ شباب تھا، عمر بیس سال سے کم تھی اور چہرہ ابھی موئے لحیہ سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ شیخ محدث کے الفاظ میں:

> وہم در عنفوان شباب کہ سال عمر بہ بست نہ رسیدہ بود و ملتحی نہ شدہ بودند کہ بمکہ معظّمہ آمدند ❶۔

(یعنی شیخ کی جوانی کا عالم تھا، قافلہ عمر بیس سال کی منزل میں داخل نہ ہوا تھا اور داڑھی کے بال نہ اگے تھے کہ مکہ معظّمہ تشریف لے گئے۔)

مکہ معظّمہ میں اس دور میں دیار ہند کے مشہور عالم وفاضل اور معروف بزرگ شیخ علی متقی کی مسند علم وعرفان آراستہ تھی اور حلقہ اصحاب نظر وفکر میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ شیخ عبدالوہاب کے والد گرامی سے بھی ان کی ملاقات وشناسائی تھی۔ انھیں شیخ عبدالوہاب کی آمد کی اطلاع ملی تو خود ان کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے تشریف لائے اور کمال شفقت سے اپنے ساتھ قیام کرنے کی استدعا کی۔

> پیش ایشاں آمدند و مہربانی ہا نمودند و استدعائے صحبت فرمودند ❷۔

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۶۹۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۲۶۹۔

(ان کے ہاں آئے۔ بڑی مہربانیوں سے نوازا اور اپنے ہاں رہنے کی درخواست کی۔)

یہ الفاظ واضح کرتے ہیں کہ شیخ علی متقی اپنی بے پناہ مقبولیت اور وسعت علم و معارف کے باوصف جس نوجوان (عبدالوہاب) کے پاس آئے، وہ کوئی معمولی درجے کا نہ تھا' بلکہ کم عمری ہی میں اس نے معرفت و طریقت کے بہت سے اہم مراحل طے کر لیے تھے۔ پھر جب شیخ علی متقی نے شیخ عبدالوہاب کی تحریر دیکھی اور یہ معلوم ہوا کہ وہ انتہائی خوش خط بھی ہیں تو اصرار کیا کہ وہ ضرور ان کے ہاں تشریف لے جائیں اور ان کی کتابوں کی کتابت و تصحیح کی خدمت انجام دیں' کیوں کہ اس زمانے میں وہ اپنی کئی تصانیف کی کتابت کرانا چاہتے تھے اور بعض مسودات کو بہترین خط میں لکھوانے کی فکر میں تھے۔ لیکن اس پہلی مجلس میں تو شیخ عبدالوہاب نے کمال بے نیازی سے ان کی یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا' البتہ بعد کو ان کے ہاں قیام پر رضا مند ہو گئے۔

ایشاں بہ مقتضائے استغنائے ذاتی و بے نیازی کہ مسافراں راہ و مجرداں را می باشد' در مجلس اول اجابت دعوت شیخ نہ کردند و گفتند کہ ان شاء اللہ تعالی بہ بینم' تا نصیب چیست۔ در آخر بہ مشاہدۂ فضل و کمال و استقامت احوال حضرت شیخ اختیار صحبت نمودند۔ و سابقًا والد بزرگ وار ایشاں نیز وصیت کردہ بود کہ اگر ترا توفیقِ سلوکِ راہِ حق دست دہد' ملازمت شیخ علی متقی و امثال ایشاں اختیار کنی' و از صحبت فلاں و امثال دی۔ و یکے از شیخانِ زمانہ را نام بردند کہ بہ دعوت اسما و تسخیر ملوک مشہور بود' پرہیز نمائی ❶۔

(شیخ عبدالوہاب نے اپنے اس ذاتی استغنا اور کمال بے نیازی سے کام لیتے ہوئے' جو مسافروں اور مجردوں کا خاصہ ہے' پہلی مجلس میں شیخ علی متقی کی دعوت قبول نہ کی' اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ ان شاء اللہ دیکھتے ہیں' قسمت میں کیا لکھا ہے۔ لیکن بالآخر شیخ کے علم و فضل اور استقامت حال کا مشاہدہ کر کے ان کی خدمت میں قیام کی منظوری دے دی۔ علاوہ ازیں انھیں اپنے والد (شیخ ولی اللہ) کی یہ وصیت بھی یاد تھی کہ اگر تمھیں راہِ حق کے سلوک کی توفیق میسر آئے تو شیخ علی متقی اور ان کی طرح کے بزرگوں کی صحبت ضرور اختیار کرنا' اور فلاں فلاں بزرگوں کی معیت و ملازمت سے استفادہ کرنا____ ان بزرگوں کے ساتھ ایک ایسے بزرگ کا نام بھی لیا تھا' جو دعوتِ اسما میں معروف اور تسخیرِ ملوک کے سلسلے میں مشہور تھا' اس کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس شخص کی صحبت سے پرہیز رکھنا۔)

شیخ عبدالوہاب پیکر زہد و عبادت تھے اور صالحیت' پاک بازی اور تقوے میں بہت معروف تھے۔ ان کا خط نستعلیق نہایت خوب صورت تھا' لیکن شیخ علی متقی نے انھیں خط نسخ میں مشق کرنے کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ وہ اس خط میں حسن و زیبائی پیدا کریں' کیونکہ قرآن مجید اسی خط میں ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے اور صلحائے امت کی عادت و روش بھی یہی رہی ہے کہ وہ خط نسخ میں لکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالوہاب نے خط نسخ میں بھی بہت

❶ اخبار الاخیار۔ص ۲۶۹۔

جلد مہارت حاصل کر لی اور پھر اسی خط میں شیخ علی متقی کی تصانیف و تالیفات کی کتابت اور تصحیح و مقابلے میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے شیخ کی متعدد کتابوں کو زیورِ کتابت سے آراستہ کیا۔ بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔

برائے شیخ کتابت بسیار کردند بحدے کہ تصور آں از حیطۂ حصر خارج بود ❶۔

(انھوں شیخ علی متقی کی اتنی بہت سی کتابوں کو کتابت کا جامہ پہنایا کہ ان کو حیطۂ شمار میں لانا حدِ امکان سے باہر ہے۔)

کتابت کے بارے میں شیخ عبدالوہاب متقی کا کمال یہ تھا کہ وہ نہایت زود نویس بھی تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ علی متقی نے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل اپنی ایک کتاب انھیں دی۔ اس کی کتابت انھوں نے بارہ راتوں میں مکمل کر دی۔ وہ ایک ہزار شعر ایک رات میں لکھ لیتے تھے۔ اس کے علاوہ دن کو شیخ کی دوسری کتابوں کی کتابت کرتے تھے۔ بہر حال شیخ علی متقی کی زیادہ تر کتابوں کی ترتیب اور اصلاح و تصحیح شیخ عبدالوہاب متقی کی سعی مسلسل سے تکمیل پذیر ہوئی۔

واکثر ترتیب واصلاح توالیف شیخ بر دست ایشاں بود۔

شیخ عبدالوہاب متقی مکہ معظمہ میں دوسرے اصحاب تصانیف کی کتابوں کی تصحیح و کتابت بھی کرتے تھے اور ان دیارِ پاک میں ان کے اخراجات کا یہی ذریعہ تھا۔ اس زمانے میں ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں شدید قحط پڑا' اور لوگ فقر و فاقہ کی زد میں آ گئے تو ان دونوں استاد اور شاگرد کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑا۔ ان دنوں شیخ عبدالوہاب ایک دوسرے صاحب علم کی کتابوں کی کتابت کرتے تھے اور اس سے جو اجرت حاصل ہوتی' اس سے ان دونوں بزرگوں کی گزر بسر کا سلسلہ چلتا تھا۔ قحط سالی کے ان ایام میں سب سے ارزاں چیز ایک سبزی تھی جو بڑے بینگن کی قسم کی تھی۔ یہ اسے سستے داموں خرید لیتے اور اس میں تھوڑا سا نمک ڈال دیتے' جس سے وہ اچار کی شکل میں بدل جاتی۔ پھر تھوڑی تھوڑی مقدار میں یہ بزرگ اسے روزانہ تناول کرتے۔

شیخ عبدالوہاب متقی' اپنے مرشد شیخ علی متقی کے بے حد فرماں بردار تھے' ہر آن ان کی خدمت میں مصروف رہتے اور دنیا کی کسی بات کو شیخ علی متقی کی بات پر ترجیح نہ دیتے۔ شیخ علی متقی بھی ان کا بڑا احترام کرتے اور اپنا بھائی قرار دیتے تھے۔ فرمایا کرتے:

وبرادر کہ درراہِ خدایافتیم عبدالوہاب بود ❷۔

(میں نے اللہ کی راہ میں ایک بھائی پایا ہے جو عبدالوہاب ہے۔)

یہ دونوں بزرگ اصحابِ ثروت اور مال دار لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے ہاں آمدو

---

❶ اخبار الاخیار۔ص ۲۶۹۔

❷ اخبار الاخیار۔ص ۲۷۰۔

رفت سے پرہیز کرتے تھے۔انھوں نے یہ بات دل میں عقیدے کی طرح بٹھالی تھی کہ مال و دولت پر فقرو درویشی کو بہرحال ترجیح حاصل ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے تعلق رکھنے والوں کو دنیا داروں کی مصاحبت ومجالست سے ہر صورت میں بچنا چاہیے۔ شیخ علی متقی نے شیخ عبدالوہاب کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرتے وقت اس بات کا اقرار لیا تھا اور فرمایا تھا کہ عالم فقر کو عالم دولت پر مقدم گرداننا اور یہ بات دل میں ہمیشہ جمائے رکھنا۔اس ضمن میں شیخ عبدالوہاب کے الفاظ یہ ہیں:

چوں شیخ مارا مریدی ساختند اول از مابہ تفضیل فقر برغنا اقرار گرفتند وگفتند بریں اعتقاد باشید و مانیز ہم بریں عقیدہ ایم۔ بعدازاں دست بیعت بما دادند ❶۔

(جب شیخ مجھے اپنے دائرۂ ارادت میں داخل فرمانے لگے تو پہلے یہ اقرار لیا کہ دولت پر فقر کو فضیلت حاصل ہے، اور فرمایا یہ عقیدہ دل میں ہمیشہ مستحکم رکھنا۔ اس پر اقرار و وعدہ کے بعد بیعت کے لیے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ چنانچہ میرا اب تک یہی عقیدہ ہے۔)

شیخ عبدالوہاب نے جمادی الاولیٰ ۹۶۳ھ/ مارچ ۱۵۵۶ء کو شیخ علی متقی کی بیعت کی، اور پھر ان کی وفات، یعنی ۶ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ/ ۸ر نومبر ۱۵۶۷ء تک پورے بارہ سال ان کی خدمت و مصاحبت میں رہے۔ جب وہ شیخ علی متقی کی خدمت میں گئے، اس وقت شیخ علی متقی کی عمر تقریباً چونسٹھ سال تھی۔

شیخ علی متقی سے ان کی گرویدگی و شیفتگی اس انتہا کو پہنچی اور وہ ان کے زہد و تقوی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بالآخر انہی کے رنگ میں رنگے گئے، اور استاد و مرشد کے لقب ــــ ''متقی'' ــــ سے ملقب ہوئے اور پھر یہی لقب استاد کی طرح ان کے نام کا بھی مستقل جز بن گیا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

قیام مکہ مکرمہ کے دوران شیخ عبدالوہاب متقی کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ علم وعمل میں مشغول رہے۔ افادۂ طلبا، غربا وفقرا کی امداد، مخلوق خدا کو نصیحت و موعظت اور زہد وعبادت کی تلقین ان کا شب و روز کا معمول تھا۔ مصر، شام اور یمن کے علمائے عظام اور اصحابِ تقویٰ سے ان کے تعلقات اس نوعیت کے تھے کہ یہ سب لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

## صوفیا کی تصانیف کے بارے میں شیخ کا نقطہ نظر:

شیخ عبدالوہاب متقی معتدل مزاج صوفی اور عالم دین تھے۔ بعض فقہا کی طرح وہ صوفیا پر طعن و تشنیع کرنے کے عادی نہ تھے، نہ ان کی تصانیف کو ہدف تنقید ٹھہراتے اور نہ ان کے افکار و خیالات کی تردید کرتے۔ اس ضمن میں وہ خاموشی کو ترجیح دیتے تھے۔ مثلاً ابن العربی کی فصوص الحکم یا اس قسم کی دیگر کتابوں کے بارے میں وہ کسی کو کوئی رائے نہ دیتے تھے۔ نہ اس نوع کی کتابیں خود پڑھتے، نہ کسی کو پڑھاتے اور نہ ان کے مطالعہ

❶ اخبار الاخیار-ص ۲۷۰-

سے کسی کو منع فرماتے۔ البتہ اگر کوئی پوچھتا تو کہتے کہ پہلے اپنا عقیدہ طریق اہل سنت کے مطابق درست اور پختہ کر لو' پھر بے شک ہر قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ فرمایا کرتے' حقائق و اسرار سے متعلق کتابوں کے ان مشکل مقامات پر' جو عقل و فہم کی گرفت میں نہ آ سکیں اور ان کی کوئی معقول توجیہ حیطہ فہم میں نہ آ سکے' پریشان ہونے اور رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ دل میں کوئی وسوسہ ڈالنے اور خلجان پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسے مقامات پر بالکل نہ رکیے اور بلا تکلف آگے نکل جایے۔ پھر ایک موقعے پر شیخ عبدالوہاب نے جو پتے کی بات کہی' وہ یہ ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی درج ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

نہ آنکہ اعتقاد را ابتدا از ہمیں کتب راست کنند۔ واز ہر کس ہر چہ بشنوند تابع شوند' می فرمودند باید کہ ہر چہ بہ شنوند اگر چہ سخن باطل باشد زود بہ انکار و تعصب پیش نیا یند' اول خود بہ شنوند کہ چہ می گوید' و بفہم سخن نیک دررو ند کہ قائل آں چہ مقصود دارد۔ بعد ازاں اگر توانند آن را موافق حق سازند' وگرنہ رد کنند۔ واگر ایں را نہ توانند از سر آں بگزرند' و خلل در عقیدہ خود نہ یندازند ❶۔

(یعنی اس قسم کی کتابوں کے مندرجات سے اپنے عقیدے کو درست کرنے کا آغاز کرنا یا اصلاح عقائد کا ذریعہ ٹھہرانا مناسب نہیں۔ ہر شخص کی بات سن کر' اس سے تاثر پذیری اچھی چیز نہیں ہے۔ جو شخص جو بات کہتا ہے' اس کو غور سے سنو۔ از راہ تعصب' عجلت سے کام لے کر اسے باطل قرار نہ دو۔ پہلے پوری بات سن لو' اس میں سے جو موافق حق ہو' اسے قبول کر لو' باقی رد کر دو۔ اور اگر تم اپنے اندر قوت برداشت نہیں پاتے تو اس قسم کے لوگوں کی باتیں سننے ہی کی ضرورت نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اپنے عقیدے میں کسی نوع کا خلل نہ پیدا ہونے دو۔)

شیخ عبدالوہاب متقی کے نزدیک راہِ سلوک پر قدم زن ہونے کے لیے ابن العربی کے افکار و خیالات اور فصوص الحکم کے اندراجات سے رہنمائی حاصل کرنا شرطِ اول نہیں ہے۔ بلکہ عمل و کردار کو سنوارنا اور عاملین سنت کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔ وہ عقیدے کی اصلاح اور باطن کی پاکیزگی کے لیے بنیادی ذریعہ سنت پر عمل کی دیواریں استوار کرنے کو قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھتا ہے' اس نے اسلام قبول کر لیا ہے' مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہے' باقاعدہ نماز ادا کرتا اور روزے رکھتا ہے' اسلام کے اوامر و نواہی کو مانتا اور اسے ذریعۂ نجات ٹھہراتا ہے' اس کے قول و عمل کا وہی معیار اور پیمانہ ہے جو کتاب و سنت کی رو سے صحیح ہے' تو اس پر اگر ذوق و حال اور جذب و ادراک کی کیفیت طاری ہو جائے اور اس سے ایسی چیزوں کا صدور ہو جائے جو اس کیفیت میں بعض دفعہ صادر ہو جاتی ہیں تو اسے مطعون نہیں ٹھہرانا چاہیے' اس کی تکفیر نہیں کرنا چاہیے۔ اور اسے ملحد نہیں قرار دینا چاہیے ____ البتہ اس کے برعکس جو شخص ارکان اسلام پر عامل نہیں

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۱۔

ہے، وہ اگر چہ کتنا بھی مدعی توحید ہو اور ادراک وسلوک اور ذوق وحال کے کتنے بھی نکات بیان کرتا ہو اور اس سے دوچار ہونے کا دعوے دار ہو، وہ پکا ملحد اور بے دین ہے۔ اس کی باتوں سے فوراً انکار کر دینا چاہیے۔ وہ یقیناً منکر اسلام اور مخالف کتاب وسنت ہے ❶۔

## سماع اور قوالی کے بارے میں شیخ کا فرمان:

شیخ عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہ سماع اور قوالی کو ناجائز قرار دیتے تھے۔ اپنے کسی مرید کو اس کی اجازت نہ دیتے، اور اس باب میں ان مشائخ کی، جو قوالی کے جواز کے قائل ہیں، سختی سے تردید کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں ان کے اس نقطہ نظر کو خصوصیت سے اجاگر کیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں مشائخ کرام اور بزرگان دین کے بارے میں یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ وہ قوالی کو جائز سمجھتے، بلکہ بعض حالات میں ضروری قرار دیتے ہیں، اس لیے ہم شیخ محدث دہلوی کی پوری فارسی عبارت درج کرنا چاہتے ہیں، تاکہ اس ضمن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان سے خصوصیت سے سماع کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ یہ عبارت جو شیخ محدث کے استفسار اور شیخ عبدالوہاب متقی کے جواب پر مشتمل ہے، مندرجہ ذیل ہے، اس کے نیچے اس کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔

وطریقہ ایشاں در سماع نیز نزدیک ہمیں طریق است۔ از مرید بہ تعمل آں راضی نیستند و بر فعل مشائخ منکر اند۔ ایں فقیر عرض کرد کہ در دیار ما ایں رسم سماع عجائب متعارف شدہ است، واگر کسے از وے اجتناب کند براہ انکار رود و راہتمامہ خلق مخالف باید شد، وہمہ مردم بوی از مرآں بدمے شوند، وبہ مخالف مشائخ او را اتہام کنند، کسے چہ کار کند۔ فرمودند اگر احیاناً با یاراں موافق واہل معنی وہم سرگاہی غزلے یا جگرے شنیدہ شود باکے نیست۔ عرض کردم کہ آں جا اجتماعہا کنند واہل ونااہل وفاسق وصالح واز ہر جنس مردم جمع شوند وچنیں وچناں کنند، براں وجہے کہ در دیار ہندوستان مشاہدہ فرمودہ باشند، ایں چہ حکم است۔ فرمودند ایں چنیں خود اصلاً جائز نہ باشد ونباید کرد، واجتناب ازاں از واجبات وقت طالب حق است۔ دریں صورت قطعاً مساہلہ ومسامحہ نہ کردند ❷۔

(سماع وقوالی کے بارے میں بھی ان کا یہی طریق تھا، (یعنی جس طرح وہ ارکان اسلام کی پابندی نہ کرنے والے صاحب ذوق وحال کو ملحد وبے دین گردانتے تھے، اسی طرح قوالی کے دلدادہ لوگوں کو بھی غیر دینی راہ پر گام فرسا قرار دیتے تھے) وہ اپنے کسی مرید کو سماع کی اجازت نہ دیتے تھے اور اس ضمن میں مشائخ کے عمل کی نکیر فرماتے تھے۔ (شیخ عبدالحق محدث دہلوی کہتے ہیں) ایک مرتبہ میں نے ان سے عرض کیا کہ ہمارے ملک (برصغیر ہندوستان) میں رسم قوالی عجیب طریقے سے متعارف اور عام ہو گئی ہے۔ اگر کوئی شخص قوالی سننے سے

---

❶ اخبار الاخیار، ص ۱۷۱۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۱۷۲، ۲۷۲۔

انکار یا پرہیز کرتا ہے تو سب لوگ اس کی مخالفت پر اتر آتے ہیں' اسے برا مانتے ہیں اور مشائخ کا حوالہ دے کر اسے متہم ٹھہراتے ہیں۔ آپ فرمائیے' ایسے موقعے پر کوئی کیا کرے۔؟ فرمایا۔ اگر کبھی ہم خیال اصحاب جمع ہوں' یا اصحاب معنی کا مجمع ہو اور ہم مشرب دوست مل بیٹھے ہوں تو پھر قوالی میں مقررہ شدہ شرائط کے ساتھ کوئی غزل سنی جائے تو مضائقہ نہیں۔ اس پر میں (عبدالحق دہلوی) نے عرض کیا کہ ہندوستان میں قوالی کے بارے میں یہ قاعدہ رواج پذیر ہے کہ مجلس قوالی میں ہر قسم کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں' جن میں اہل و نا اہل اور فاسق و صالح افراد موجود ہوتے ہیں' اور جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا' ادھر ادھر کی ہر قسم کی باتیں کرتے ہیں' ایسی مجلسِ قوالی کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ جواب میں فرمایا' ایسی مجلس قوالی قطعاً جائز نہیں۔ طالب حق کے لیے ضروری ہے کہ اس سے پرہیز کرے۔ جب کبھی ایسی صورت حال پیدا ہو تو اس میں ہرگز مسامحت یا چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔ (یعنی اس میں خود بھی شامل نہیں ہونا چاہیے اور دوسروں کو بھی شامل ہونے سے روکنا چاہیے۔)

قوالی کے عدم جواز کے سلسلے میں شیخ عبدالوہاب متقی کے یہ الفاظ بالکل صاف ہیں' ان میں کسی قسم کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

## شادی:

اپنے مرشد واستاد شیخ علی متقی کی زندگی میں شیخ عبدالوہاب انہی کی خدمت میں رہے اور ان کی کتابوں کی ترتیب و تصحیح اور نقل و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے علاوہ مطالعہ کتب' تعلیم و تعلم اور ذکر و شغل کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں انھوں نے شادی نہیں کی۔ شیخ کی وفات کے بعد بھی وہ عرصے تک مجرد رہے۔ جب عمر چالیس اور پچاس سال کے درمیان پہنچی تو شادی کی۔ شادی سے پہلے کتابت و تصحیح اور نذرانوں وغیرہ کی جو رقم ان کے پاس تھی' وہ سب فقرا و مستحقین میں تقسیم کر دی۔ البتہ اپنے ذاتی استعمال کے کپڑے' کچھ غلہ اور کتابیں پاس رکھیں۔ شادی کے بعد اہل و عیال کے حقوق کا ہر لحہ خیال رکھا اور دیگر حقوق پر انھیں ترجیح دی۔ اس کے ساتھ ہی فقرا' غربا اور مستحقین کی مدد میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہندوستان کے جو لوگ ارضِ حجاز میں جاتے' ان کی بے حد امداد کرتے' ان کے لیے کھانا' ضروری سامان' لباس اور رقم وغیرہ کا بھی کھلے دل سے انتظام فرماتے۔

## علم و فضل:

شیخ عبدالوہاب متقی گیارھویں صدی ہجری کے جلیل القدر ہندی عالم تھے' حافظے کا یہ عالم تھا کہ لغت کی مشہور کتاب قاموس انھیں زبانی یاد تھی۔ حدیث' فقہ اور علم فلسفہ کی اکثر کتابیں ازبر تھیں۔ عربی ادبیات کے ماہر تھے۔ برسوں حرم شریف میں حدیث' فقہ' عربی ادب اور کتب فلسفہ کا درس دیتے رہے۔ مشکل سے مشکل مسائل کی پیچیدہ گرہیں فوراً کھول دیتے۔ اللہ نے انھیں بے شمار خوبیاں عطا فرمائی تھیں۔ بڑھاپے میں ضعف

بصارت کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا' اور خانہ نشین ہو گئے تھے۔ تاہم کسی نہ کسی صورت میں افادے کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ان کے علم وفضل کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ ہمہ گیر عالم دین تھے اور ہر موضوع کی کتابوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔

وی تواں گفت کہ دریں زمان بدانش ایشاں درعلوم شرعیہ کم تر کسے خواہد بود ❶۔

(یعنی کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانے میں (شیخ عبدالوہاب متقی) جیسا علوم شرعیہ کا ماہر کوئی کم ہی ہو گا۔)

## حصول علم ہی درحقیقت ذکر الٰہی ہے:

شیخ عبدالوہاب متقی فرمایا کرتے تھے کہ علم' غذا کی مانند ہے' جس کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ اس کا نفع عام ہے۔ علم کی مثال دوا سے بھی دی جاسکتی ہے' جو ایک ذریعہ علاج ہے۔ یعنی جس طرح جسمانی امراض کا علاج دوا کے ذریعے کیا جاتا ہے' اسی طرح روحانی اور قلبی بیماریوں کا علاج علم کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ طالب کو چاہیے کہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر عالم خلوت میں فراغت قلب اور حضورِ خاطر کرے۔ بالخصوص رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں اور ذی الحجہ کے عشرۂ اول میں خلوت گزیں ہو کر ذکر وشغل اور عبادت میں مصروف رہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ باقی دنوں میں حصولِ علم میں مشغول اور پڑھنے پڑھانے میں منہمک رہے۔ کچھ لوگوں نے شیخ ممدوح سے سوال کیا کہ مشائخ جو اس بات کی ترغیب دیتے رہے ہیں کہ ہمیشہ اور ہر آن ذکر الٰہی میں مشغول رہنا چاہیے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اس سوال کا انھوں نے نہایت عمدہ جواب دیا فرمایا:

ہر کہ باعمل خیر مشغول است' دائم درذکر است' نماز گزاردن ذکر است' وتلاوت قرآن ذکر است' درسِ علومِ دینیہ ذکر است۔ وہ ہر چہ عمل خیر است' ذکر است' ایں دائم است ❷۔

(جو شخص امور خیر میں مشغول ہے' وہ درحقیقت ہمیشہ ذکر الٰہی میں رہتا ہے۔ نماز ادا کرنا ذکر ہے' تلاوت قرآن ذکر ہے' علوم دین کا درس وتدریس ذکر ہے' اور ہر اچھا کام جس پر دوام کیا جائے' ذکر ہے۔)

آگے چل کر فرمایا:

روش سلف متقدمین ہمیں ست کہ تثبت بہ انواع اعمالِ خیر وتہذیب اخلاق ونشرِ علوم می کردند ❸۔

---

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۲۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۲۔

❸ ایضاً۔

(ہمارے اسلاف کا یہ طریقہ رہا کہ ہمیشہ ہر قسم کے اچھے کاموں مثلاً تہذیب اخلاق اور اشاعت علوم وغیرہ میں مصروف رہتے۔)

شیخ عبدالوہاب متقی حصولِ علم کی ہمیشہ ترغیب دیتے رہے اور ان کے نزدیک درحقیقت یہی ذکر الٰہی ہے' اس سے روگردانی ان کے نقطہ نظر کے مطابق صحیح نہیں۔ اس ضمن میں ان کے یہ الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں:

علم ازاں قبیل نیست کہ ہیچ کس ترک آن فرمایند سعی وتصحیح نیت باید کرد ❶۔

(یعنی علم وہ شے نہیں ہے' جسے ترک کر دیا جائے۔ بلکہ یہ وہ دولت بے بہا ہے' جس کے ذریعے بہتر امور کی انجام دہی کے لیے جدوجہد کی جائے اور قلب ونیت کے زاویوں کو صحیح سمت پر رکھا جائے۔)

ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ جس انداز سے بعض درویش دعوتِ حق دیتے ہیں' یہ وصول حق کا طریقہ ہے یا نہیں۔؟

فرمایا ممکن ہے' یہ بھی ایک طریقہ ہو' لیکن اس قسم کے داعیان حق بہتر اور عمدہ اخلاق کے حامل نہیں ہوتے۔ ان میں سے اکثر کج خلق ہوتے ہیں' جو لوگوں کی طرف سے پہنچائی گئی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو! غلط آدمی جلد ہی مکافاتِ عمل کی زد میں آ جاتا ہے اور برے کام کا بدلہ پا لیتا ہے۔ داعیانِ حق کو خوش اخلاق اور شائستہ مزاج ہونا چاہیے' اور اس دل گردے کا مالک ہونا چاہیے کہ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والے مصائب و آلام کو برداشت کر سکے ❷۔

## مشائخ کے مروجہ انداز ذکر کے بارے میں:

شیخ عبدالوہاب متقی نے اس ذکر الٰہی کے بارے میں بھی اظہار رائے کیا ہے' جو مشائخ وصوفیا ایک خاص انداز سے حلقہ باندھ کر کرتے ہیں اور جو متعدد مقامات میں اب رواج پا گیا ہے۔ اس مروّجہ اسلوبِ ذکر کے بارے میں وہ وضاحت سے کہتے ہیں کہ یہ سنت نبوی ﷺ سے ثابت نہیں ہے' تاہم بعض صوفیا کا یہ ایک طریقہ ہے' جسے وہ مستحسن قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ کے الفاظ یہ ہیں:

ایں کیفیت حلقہ ذکر وبعضے اوضاع وانواع ذکر کہ درویشاں می کنند' اگرچہ آں راسندے صحیح درسنت نبوی ﷺ نیست' اما از مستحسنات مشائخ است ❸۔

---

❶ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۲۔

❷ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۳۔

❸ اخبار الاخیار۔ ص ۲۷۳۔

(یعنی حلقہ باندھ کر ذکر الٰہی کی ان کیفیتوں اور اس سلسلے کی بعض ان شکلوں کی جو درویشوں اور صوفیوں میں رواج پذیر ہیں' رسول اللہ ﷺ کی سنت میں تو کوئی صحیح سند موجود نہیں ہے' مگر یہ مشائخ کا ایک اسلوب ہے جو ان کے مستحسنات میں سے ہے۔)

## ہندو جوگی کا قبول اسلام:

شیخ ممدوح کا انداز تبلیغ اسلام بڑا حکیمانہ تھا اور ان کی ہر بات میں ایک خاص اثر تھا۔ ان کی صحبت سے بے شمار مسلمانوں نے اسلام میں رسوخ حاصل کیا اور متعدد غیر مسلم حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں ایک ہندو جوگی کا ذکر بھی اخبار الاخیار میں مرقوم ہے۔ اس کے قبول اسلام کا واقعہ جن فارسی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے' ان کا ترجمہ یہ ہے:

ایک دن جنگم جوگی کی ریاضت وتصوف کا تذکرہ شیخ عبدالوہاب متقی کی مجلس میں ہوا تو فرمایا کہ دوران سیاحت میں ہماری بھی ایک جوگی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بہت ریاضتیں کرتا اور خوارقِ عادات کا اظہار کرتا تھا۔ مجھ سے وہ کہا کرتا تھا کہ میرے پاس سونے کا ایک قلعہ ہے۔ تم (عبدالوہاب) اگر میرے ساتھ ریاضت کرو تو میں تمھیں اس طلائی قلعے کے اندر لے جاؤں گا۔ شہر کے مرد وزن کا ہجوم اس کے پاس رہتا' وہ لوگ ہر قسم کے تحفے تحائف' کھانے پینے کی مختلف چیزیں اور نقدی کی صورت میں مال و دولت اس کو پیش کرتے' لیکن وہ جوگی کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھتا۔ اسی وقت سب چیزیں لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔ میں نے اس کو اسلام کی کچھ باتیں سنائیں تو اس نے بڑے شوق اور توجہ سے سنیں۔ چونکہ اس نے طلائی قلعہ دکھانے کا کئی بار مجھ سے وعدہ اور تذکرہ کیا تھا' لہٰذا میں نے خاص طور پر اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ مگر وہ ایفائے عہد نہ کر سکا اور پریشان سا رہنے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری یہ بات سننے کے بعد اپنے روزمرہ کے جوگی گری کے معمولات میں مشغول ہو جاتا تھا۔ بالآخر اس نے اسلام قبول کر لیا اور میرے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا[1]۔

## ریاضت اور ترک سوال کا دور:

شیخ عبدالوہاب متقی ابتدائے عمر میں جب کہ وہ بیس سال کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے' شدید ریاضتوں کے عادی تھے۔ وہ جنگل میں نکل جاتے اور ریاضت میں مشغول ہو جاتے۔ ان کی زندگی کا یہ وہ دور تھا جب انھوں نے اپنے چند ساتھیوں سمیت سخت سے سخت ضرورت کے موقعے پر بھی ترک سوال اور کسی سے کوئی چیز نہ مانگنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس ضمن میں اخبار الاخیار کے حوالے سے شیخ ممدوح کے دو واقعے ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

[1] اخبار الاخیار۔ص ۲۷۷۔

ایک مرتبہ درویشوں کی ریاضت، ترک سوال اور غذا و خوراک سے دامن کشاں رہنے کے سلسلے میں شیخ عبدالوہاب متقی نے اپنا ایک واقعہ یوں بیان کیا کہ ایک زمانے میں ہماری غذا کی یہ کیفیت تھی کہ ہم دو آدمی تھے ہم میں سے کوئی ایک قصائی کی دکان سے وہ ہڈیاں اٹھا لاتا، جنھیں قصائی گوشت اتار کر پھینک دیتا تھا۔ پھر کھیتوں میں جا کر گیہوں کے تنکے چن کر لاتا۔ ہم ان ہڈیوں اور گیہوں کے تنکوں کو اچھی طرح پانی سے دھو کر اور ان کی مٹی اتار کر دیگچے میں ابال لیتے اور پھر اس شوربے کا ایک ایک پیالہ پی لیتے۔ اردگرد کے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ ہماری غذا یہ ہے تو وہ ہمارے لیے انواع و اقسام کے کھانے لانے لگے، مگر ہم وہاں سے چلے گئے تاکہ لوگ ہمیں کچھ نہ دے سکیں۔ اس کے بعد ہم نے یہ معمول بنا لیا کہ تین دن سے زیادہ کہیں قیام نہ کرتے تھے ❶۔

ان کا ایک اور واقعہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ان کے ایک دوست کی زبانی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

فقیر از یکے از یاران ایشاں شنیدہ است کہ می گفت، یک بارے در ایام قحط در مسجدے با یک یارِ دیگر نشستہ بودند۔ در یک گوشہ مسجد ایشاں مشغول بودند و در گوشہ دیگر آں یار دیگر۔ و قرار دادہ بودند کہ با یک دیگر سخن نہ کنند و از کسے طعام نہ طلبند۔ بست روز بریں حالت گزشتہ بود کہ ہیچ چیز از طعام نہ خوردہ بودند۔ شخصے حلوا فروش طعام درمیان ایں دو کس می نہاد و می رفت۔ ہیچ کدام از ایشاں آں طعام را نہ خورد۔ چوں مکرر شد دیگر آں مرد حلوائی لقمہ می کرد و در دہان ایشاں می نہاد و می خوردند ❷۔

(یعنی شیخ عبدالوہاب متقی کے ایک دوست نے انھیں (شیخ عبدالحق محدث کو) بتایا کہ ایک مرتبہ زمانہ قحط میں شیخ عبدالوہاب اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک مسجد میں مقیم تھے۔ مسجد کے ایک گوشے میں یہ (عبدالوہاب) اور دوسرے گوشے میں وہ (ان کا دوست) عبادت الٰہی میں مصروف تھے۔ دونوں نے باہم عہد کر رکھا تھا کہ نہ آپس میں ہم کلام ہوں گے اور نہ کسی سے کھانے کو کچھ طلب کریں گے۔ بیس دن اسی طرح گزر گئے، کسی نے کھانا نہ کھایا۔ اکیسویں دن ایک حلوا فروش نے دونوں کے درمیان کھانا رکھا اور چلا گیا۔ لیکن دونوں نے اس میں سے کچھ نہ کھایا۔ پھر دوسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ یہاں تک کہ تیسری مرتبہ اس حلوائی نے خود اپنے ہاتھ سے لقمے بنا کر دونوں کو کھلائے۔)

یہاں قدرتی طور سے یہ سوال سطح ذہن پر ابھرتا ہے کہ کیا یہ طریق عبادت اور نہج ریاضت اسلامی اسلوب عبادت سے ہم آہنگ ہے؟ ذکر و سلوک کا یہ مشقت انگیز انداز قرآن و سنت سے ثابت ہے؟ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے اس کی تائید ہوتی ہے؟ آثار صحابہ یا عمل صحابہ (رضوان اللہ علیہم) سے یہ منقول ہے؟

❶ اخبار الاخیار۔ص ۲۷۷۔

❷ اخبار الاخیار۔ص ۲۷۸۔

تابعین و تبع تابعین کے خیر القرون میں اس کا کہیں سراغ ملتا ہے؟ ائمہ حدیث وفقہ نے اس نہجِ عبادت کی تصریح کی ہے اور اسے قرینِ صواب اور مطابق قرآن و حدیث قرار دیا ہے؟۔ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے۔ مگر ہم یہاں اس بحث سے تعرض نہیں کرنا چاہتے۔ صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ طریق عبادت بہت بعد کی ایجاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا عمل تو یہ تھا کہ آپ بھوک پیاس کے وقت کھانے پینے کی چیزیں کسی دوسرے شخص سے مانگ لیتے تھے۔ صحابہ کرام بھی اپنی ضروریات کا اظہار بے تکلفی سے ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ ان کے بعد وہ بزرگان دین بھی جنھیں سلف صالحین کے مقدس لقب سے ملقب کیا جاتا ہے' اشیائے ضروریہ کے آپس میں لین دین میں نہ صرف کوئی قباحت محسوس نہ کرتے تھے' بلکہ اس کو نیکی سمجھ کر ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ حدیث وفقہ کے اس پورے ذخیرے میں جو آج باقاعدہ مرتب و مدون شکل میں ہمارے سامنے ہے' کہیں اس قسم کی عبادت کا پتا نہیں چلتا' جو بعض مشائخ وصوفیا سے منقول ہے۔

لیکن ان صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کے اس طرز عبادت میں علیحدگی وانزوا' امور دنیا سے بے تعلقی اور اصحاب دولت سے انقطاع کا جو پہلو موجود ہے' وہ بہرحال فائدے سے خالی نہیں۔ اس میں ان کی خود اپنی ذاتی ضروریات سے بے نیازی' اونچا پن' بے پناہ قوتِ برداشت' حرص و آز دنیوی سے کنارہ کشی اور اربابِ سلطنت سے بے اعتنائی کا بہت ہی بلند تصور پایا جاتا ہے۔ پھر اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں جہاں جاذبِ نظر اور باعث کشش بے شمار بوقلموں چیزیں ہر سو پھیلی ہوئی ہیں' اللہ کے نیک بندوں کا ایک ایسا گروہ موجود ہے' جس نے مفادات عاجلہ کو ترک کر کے اپنے آپ کو صرف اللہ کے حوالے کر رکھا ہے۔ ان کا تمام وقت ذکر الٰہی میں گزرتا ہے اور وہ ہر طرف سے منقطع ہو کر عبادت الٰہی کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔

## شیخ کا موقف:

یہ بحث اس وقت ہمارے دائرۂ موضوع سے خارج ہے۔ ضمناً چند باتیں نوک قلم پر آ گئی ہیں۔ اس موقعے پر ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اکثر مروّجہ معمولات میں شیخ عبدالوہاب متقی کا موقف اپنے اندر اعتدال و توازن لیے ہوئے تھا۔ وہ محض اختلاف عمل کی بنا پر کسی پر فتویٰ لگانے کے عادی نہ تھے' اگرچہ وہ خود وجد و حال اور جذب و سلوک کی بعض ان کیفیات کے مخالف تھے جو صوفیا کے ایک طبقے میں پائی جاتی ہیں' تاہم ان کے صدور کو وہ الحاد و زندیقیت کی حد تک نہیں لے جاتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان صوفیا کو ملحد قرار دیتے تھے جو عمل کے اعتبار سے طریق اہل سنت سے ہٹے ہوئے ہوں اور خلاف اسلام امور کے مرتکب ہوتے ہوں۔ پھر وحدت الوجود کے وہ شدید مخالف تھے' جب کہ اس دور کے اکثر صوفیا و مشائخ اس کے حامی تھے۔ وہ شیخ محمد غوث گوالیاری کے بھی مخالف تھے' کیوں کہ وہ وحدت الوجود کے حامی تھے اور اسی بنا پر شیخ عبدالوہاب

کے والد شیخ ولی اللہ مانڈوی نے ان کی صحبت سے ان کو گریزاں رہنے کی وصیت کی تھی۔ شیخ عبدالوہاب نے ابن العربی کی کتابوں کے بارے میں بعض مواقع پر سکوت اختیار کیا ہے اور بعض مواقع پر لوگوں کو ان کے مطالعہ سے منع بھی کیا ہے۔

سکوت ان اہل علم کے لیے اختیار فرمایا ہے، جن کا مطالعہ وسیع ہو اور وہ عقائد اہل سنت میں راسخ ہوں، خلاف شرع امور سے ان کے متاثر ہونے کا کوئی اندیشہ نہ ہو ____ اور منع ان لوگوں کو کیا ہے جو ابھی تصوف و سلوک یا علم کی ابتدائی منزل میں ہوں، عقیدہ وفکر کے اعتبار سے زیادہ پختگی اور رسوخ کے حامل نہ ہوں، اور ان کے دوائر مطالعہ بھی محدود ہوں۔

## حلقہ تلامذہ:

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا، شیخ عبدالوہاب بیس سال سے بھی کم عمر میں مکہ مکرمہ پہنچ گئے تھے۔ یہ ماہ جمادی الاولیٰ ۹۶۳ھ/ مارچ ۱۵۵۶ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں وہاں ایک بہت بڑے ہندوستانی عالم شیخ علی بن حسام الدین متقی گجراتی قیام فرما تھے۔ ان سے سلسلۂ ارادت استوار کیا، علم ومعرفت سے بہرور ہوئے اور ان سے اور وہاں کے دیگر علما ومشائخ سے سند حدیث حاصل کی۔ بارہ سال یعنی شیخ علی متقی کی وفات (۲/ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ/ ۴/ نومبر ۱۵۶۷ء) تک ان کی خدمت میں رہے۔

مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب متقی نے خود بھی درس وافادہ کا سلسلہ شروع کیا، جس سے علما ومشائخ کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے اصحاب علم اور ارباب ورع وتقویٰ ان سے بہت متاثر تھے۔ وہ ان کی اصلاحی اور تبلیغی سرگرمیوں سے بھی اثر پذیر تھے، زہد واتقا کی وجہ سے بھی ان کی قدر کرتے تھے اور علوم ومعارف میں مہارت کی بنا پر بھی وہ ان کے مداح تھے۔

شیخ عبدالوہاب متقی کے ارشد اور مشہور تلامذہ ومعتقدین میں سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اسم گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہے۔ وہ ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۸ء کو حجاز پہنچے اور ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۱ء تک وہاں مقیم رہے۔ تقریباً یہ تمام عرصہ شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں گزرا۔ علم کی تکمیل کی اور احسان وسلوک کی راہوں سے آشنا ہوئے۔ شیخ متقی سے مشکوۃ کا درس لیا، کچھ اور کتابیں بھی پڑھیں۔ صحیح مسلم کی قرأت کی اجازت بھی لی۔ پھر فرمایا۔

اکنوں عزیمت ہندوستان بکنید۔

(اب ہندوستان جانے کا عزم کرو۔)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے قیام مکہ مکرمہ کے دوران شیخ عبدالوہاب متقی سے بڑا استفادہ کیا اور علم حدیث کا زیادہ تر درس انہی سے لیا۔ اس کا تذکرہ خود شیخ عبدالحق اپنی کتاب تالیف قلب الالیف میں ان الفاظ

میں کرتے ہیں اور اپنے عظیم القدر استاد کی بے حد تعریف فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

تمامہ کتب احادیث وسائر علوم دینیہ از علمائے آں عالی مقام علیہم رحمتہ اللہ الملک العلام خصوصاً از حضرت شیخ اجل واکرم اوحد واعدل عبدالوہاب متقی قدس اللہ روحہ واوصل الینا فیوضہ وفتوحہ بہ تلقین ذکر وایثار خلوت و برکت مشرف وفائز شد و نعمتہا و بشارتہا از خدمت وے در حصول انوار و آثار نتائج وثمرات برکت والتزام مقام صدق واستقامت در نشر علوم دینی وحصول مواہب یقینی مشرف ومبشر گشتہ برجوع وعود بوطن مالوف مامور ومکلف شد۔

(یعنی تمام کتب احادیث اور علوم دینیہ حجاز کی مقدس سرزمین کے علمائے کرام سے حاصل کیے۔ بالخصوص حضرت شیخ عبدالوہاب متقی قدس اللہ روحہ سے ذکر الٰہی وغیرہ کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوا۔ ان کی صحبت بابرکت سے بہت سی نعمتیں حاصل کیں اور حصول انوار و برکات اور علوم دینی کی نشر واشاعت میں استقامت کے بارے میں کئی قسم کی بشارتیں سننے کے بعد وطن مالوف (ہندوستان) کو واپس لوٹا۔)

### وفات:

بہر حال شیخ عبدالوہاب متقی اس برصغیر کے جلیل القدر عالم دین، عظیم المرتبت محدث وفقیہ اور نامور سالک وصوفی تھے۔ وہ چھتیس سال مکہ مکرمہ میں اقامت گزیں رہے اور اتنی ہی مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء کو اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ [1]۔

## ۵۶- قاضی عبدالوہاب گجراتی

قاضی عبدالوہاب احمد آبادی گجراتی ''مجمع البحار'' کے مصنف شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹنی کی اولاد سے تھے، اور اپنے زمانے کے شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں اپنے مولد ''مونگی پٹن'' کے جو احمد نگر کے نواح میں واقع تھا، قاضی مقرر ہوئے اور مدت تک اس منصب پر فائز رہے۔ جب عالم گیر بلاد دکن کا والی مقرر ہو کر آیا تو اس سے قرب وتعلق پیدا ہو گیا، پھر ملک کی زمام حکومت اس کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں ہندوستان کی مسند قاضی القضاۃ پر مامور کیا۔ اورنگ زیب عالم گیر ان کی بہت توقیر کرتا اور ان پر اعتماد کرتا تھا۔ وہ اس ملک کے عظیم المرتبت قاضی القضاۃ تھے۔ ان سے پہلے کوئی قاضی ان کے درجے کو نہیں پہنچا____ ان کی ہیئت وشخصیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تمام امرائے مملکت ان سے لرزتے

[1] شیخ عبدالوہاب متقی کے حالات کے لیے دیکھیے: اخبار الاخیار- ص ۲۶۹ تا ۲۷۸- خزینۃ الاصفیا ج ۱، ص ۱۳۸ تا ۱۴۰- تاریخ برہان پور ص ۱۲۰- حدائق الحنفیہ ص ۳۹۲ تا ۳۹۴- تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۳۹- تذکرۂ اولیائے ہندو پاکستان ص ۳۶۸ تا ۳۷۰- رود کوثر ۳۵۲، ۳۵۳- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۶۶، ۲۶۷- حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۰۲ تا ۱۱۱-

تھے۔ شرعی احکام کے اجرا اور فیصلوں کے نفاذ میں نہایت سخت تھے۔ صدق و دیانت اور صالحیت میں منفرد حیثیت کے مالک تھے، مگر اس کے باوجود لوگ ان پر رشوت ستانی کا الزام بھی لگاتے تھے ــــ ان کی وفات ۱۸ رمضان ۱۰۸۶ھ/ ۲۶ رنومبر ۱۶۷۵ء کو دہلی میں ہوئی ❶۔

## ۵۷- ملا عبدالوہاب پسروری

ملا عبدالوہاب پسروری، فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم انصاری پسروری کے جدِّ امجد تھے۔ اپنے عہد کے مشہور فاضل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ عقل و دانش، تبحر علمی اور کثرت معلومات میں مشہور تھے۔ ضرورت مندوں کے کام آتے اور لوگوں کے کام کاج کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کرتے چھوٹے بڑے کے سامنے کسر نفسی اور تواضع ان کی عادت تھی۔ اکثر متداول کتابیں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی سے پڑھیں، جن کا سلسلہ درس ان کے زمانے میں زوروں پر تھا۔ علم فقہ، اصول فقہ اور معانی میں دست گاہ رکھتے تھے۔ متوکل علی اللہ اور فقیر منش تھے۔ علوم دینی کی نشر و اشاعت ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ مغل حکمران شاہ جہان کئی مرتبہ ان کی خدمت میں گیا اور انھیں مناصب و وظائف سے نوازنا چاہا۔ بالآخر شاہ جہان کے وزیر علامی سعد اللہ خاں کی کوشش سے جو خود بھی بہت بڑے عالم دین اور علم پرور تھے، ملا عبدالوہاب نے اپنے بیٹوں کے لیے دو گاؤں بطور جاگیر قبول کیے۔ بعد ازاں بادشاہ نے ان کے بیٹوں کو چار گاؤں عطا کیے، جو سکھوں کے ہنگامے تک ان کے قبضے میں رہے۔ ملا عبدالوہاب پسروری نے ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء میں انتقال کیا ❷۔

صاحب ''فرحت الناظرین'' محمد اسلم پسروری نے اپنی اس کتاب کے ایک اور مقام پر ان کا ذکر ''قاضی عبدالوہاب پرسروری'' کے عنوان سے کیا ہے اور سال وفات ۱۰۸۶ھ لکھا ہے۔ مصنف کے فارسی الفاظ یہ ہیں۔

قاضی عبدالوہاب پرسروری ❸، جدِ ماجد راقم، عالم تبحر، جامع معقول و منقول چندے بقضائے لشکر عالم گیر قیام داشت، پیوستہ باستفادہ و افادہ طلبائے علم می ورزد و سلسلۂ ارادت خود در قادریہ داشت۔ ۱۰۸۶ھ در ماہ رمضان فوت شد ❹۔

---

❶ مآثر الامراج ۱، ص ۲۳۲ تا ۲۳۸- ج ۳، ص ۴۹۳- منتخب اللباب ص ۲۱۶، ۲۴۷- مآثر عالم گیری ص ۱۴۴- یاد ایام ص ۷۷، ۷۸- بزم تیموریہ- ص ۲۴۷ تا ۲۴۹- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۱۱، ۱۱۲- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۶۷، ۲۶۸

❷ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۱۰، ۱۱۱-

❸ اس زمانے میں ''پسرور'' کو ''پرسرور'' لکھتے تھے-

❹ [illegible]ت الناظرین ورق ۷۷ لباب، نسخہ بوڈلین لائبریری-

(یعنی قاضی عبدالوہاب پسروری راقم (مصنف فرحت الناظرین) کے جد بزرگ وار' تبحر عالم اور علوم معقول و منقول کے جامع تھے۔ کچھ عرصہ اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے لشکر میں منصب قضا پر مامور رہے۔ طلبائے علوم کو تدریس و افادہ ان کا مشغلہ تھا۔ تعلق ارادت سلسلہ قادریہ سے تھے۔ ماہ رمضان المبارک ۱۰۸۶ھ (نومبر ۱۶۷۵ء) میں فوت ہوئے۔)

## ۵۸- شیخ عبدالوہاب قدوائی راج گیری

شیخ عبدالوہاب قدوائی راج گیری نواب منعم خاں' فاضل کبیر اور شیخ وقت تھے۔ علوم نحو و صرف' علم لغت' اصول اور کلام میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان مضامین سے متعلق بہت سی کتابوں کے مصنف تھے' جن میں علم صرف کی مفتاح الصرف' علم کلام کی بحر المذاہب اور عقائد کی کتاب الصدرہ شامل ہیں۔ ان کی کتاب بحر المذاہب کا ایک قلمی نسخہ رام پور (ہندوستان) کے کتب خانہ حامدیہ میں موجود ہے' جو ۱۰۲۹ھ/۱۶۲۰ء کا مکتوبہ ہے [1]۔

## ۵۹- خواجہ عبیداللہ دہلوی

خواجہ عبیداللہ دہلوی' حضرت خواجہ عبدالباقی نقشبندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے لڑکے تھے۔ یہ وہی خواجہ عبدالباقی ہیں جو خواجہ باقی باللہ کے لقب سے معروف ہیں' اور گیارھویں صدی ہجری کے دیار ہند کے مشہور بزرگ اور حضرت مجدد الف ثانی کے مرشد ہیں۔

حضرت خواجہ باقی باللہ ۵ ذی الحجہ ۹۷۱ھ/۱۴ رجولائی ۱۵۶۴ء کو کابل میں پیدا ہوئے۔ والدین نے محمد رضی الدین نام رکھا۔ لیکن بڑے ہو کر باقی باللہ' یا محمد باقی باللہ یا عبدالباقی کے اسمائے گرامی سے شہرت پائی۔ والد کا نام قاضی عبدالسلام تھا' جو اپنے علاقے کے اہل علم میں سے تھے۔ انھوں نے لائق بیٹے کی تعلیم و تدریس کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انھیں ملا صادق حلوائی کی خدمت میں بھیجا گیا۔ ملا حلوائی اس عہد اور علاقے کے نامور فاضل اور بہترین شاعر تھے۔ وہ درحقیقت سمرقند کے باشندے تھے۔ حج بیت اللہ کو گئے اور واپس آئے تو اکبر کا چھوٹا بھائی مرزا حکیم جو اس وقت کابل کا حکمران تھا' انھیں کابل لے آیا اور وہاں انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خواجہ باقی باللہ بھی کابل آ گئے اور ملا حلوائی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد جب وہ کابل کی سکونت ترک کر کے ماوراء النہر تشریف لے گئے تو خواجہ باقی باللہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

خواجہ باقی باللہ نے علوم مروّجہ بڑی تیزی سے حاصل کرنا شروع کیے۔ ان کے اعزہ و اقارب حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر متعین تھے اور چاہتے تھے کہ خواجہ بھی تکمیل علم کے بعد کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائیں' لیکن

[1] ابجد العلوم ص ۹۳۴- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۶۸-

تعلیم ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ان کی طبیعت زہد و عبادت اور طریقت و تصوف کی طرف منعطف ہو گئی۔ چنانچہ افغانستان اور ماوراء النہر کے بعض صوفیا و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہو کر تزکیہ نفس میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں عالم جوانی میں برصغیر پاک و ہند کا رخ کیا اور دہلی میں اقامت اختیار کی۔ جلد ہی ان کے تقویٰ و تصوف کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس زمانے میں اس ملک پر جلال الدین اکبر دادِ حکمرانی دیتا تھا۔ برصغیر کے بہت سے علما و فضلا' متعدد مشائخ و صوفیا اور کچھ امرا و وزرا ان کے حلقۂ بیعت و ارشاد میں داخل ہوئے۔ دیارِ ہند کے اس عظیم صوفی اور صاحب طریقت بزرگ نے صرف چالیس سال عمر پائی اور ۲۵ جمادی الاخری ۱۰۱۲ھ/ ۲۰ نومبر ۱۶۰۳ء کو دہلی میں انتقال کیا۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی دو بیویوں سے دو بیٹے تھے' جو ان کی وفات سے دو سال پیشتر تقریباً چار مہینوں کے فرق سے پیدا ہوئے۔ بچوں کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد حضرت خواجہ نے اپنے جلیل القدر مرید حضرت مجدد الف ثانی کی عنان توجہ اس طرف مرتکز کرائی کہ مجھ پر ضعف بدن غالب آگیا ہے اور امید حیات کم رہ گئی ہے۔ آپ ان خرد سال بچوں کا خیال رکھیں۔ ان لڑکوں میں سے ایک کا نام جو بڑے تھے' عبید اللہ تھا' اور دوسرے کا نام عبداللہ۔!

عبید اللہ' یکم ربیع الاول ۱۰۱۰ھ/ ۲۰ / اگست ۱۶۰۱ء کو پیدا ہوئے' اور ان کا نام سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ خواجہ عبید اللہ احرار کے نام پر رکھا گیا۔ یہ اپنے دوسرے بھائی خواجہ عبداللہ سے کچھ دن عمر میں بڑے تھے' اس لیے خواجہ کلاں کے عرف سے معروف ہوئے۔ ان کی ولادت پر خواجہ باقی باللہ نے بے حد خوشی کا اظہار کیا' ان کی ولادت' اذان اور نام کے بارے میں کئی اشعار لکھے۔ شیخ حسام الدین کی نگرانی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ان سے اور شیخ اللہ داد دہلوی سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا۔ تکمیل علم کے بعد اپنے دور کے علما و فقہا اور مشائخ میں شمار ہوئے۔ علم تاریخ اور علم انساب میں بھی بہرۂ کامل رکھتے تھے۔ تصوف و طریقت سے بھی بہت شغف تھا اور علم انشا میں بھی قدرت حاصل تھی۔ مطالعہ کتب ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ تصنیف و تالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ایک کتاب احوال صحابہ و تابعین سے لے کر اپنے دور کے مشائخ تک کے حالات میں لکھی۔ ''احوال صحابہ و تابعین و تبع تابعین و مشائخ دین تاوقت خود نوشتہ۔'' مجدد الف ثانی کے لڑکے شیخ محمد معصوم سرہندی کے نام حقائق و معارف کے سلسلے میں کچھ مکتوب تحریر کیے۔

لیکن ان کی یہ کتابیں اب کہیں نہیں ملتیں۔ شیخ محمد اکرام افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں۔

''ان کتابوں میں سے ہمیں ایک بھی دست یاب نہیں ہوئی۔ لیکن انڈیا آفس لائبریری (ذخیرۂ دہلی) میں خواجہ کلاں کی ایک اہم تصنیف ''مبلغ الرجال'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ چھوٹے سائز کے ۱۱۸ اوراق ہیں۔ اس کا مقصد تصنیف اس انتشار کو رفع کرنا تھا جو ''آرائے اہل فکر و نظر و اقوال کشف و شہود'' کی وجہ سے ''معرفت حقیقت

عالم'' کے متعلق پیدا ہو گیا تھا۔ کتابچے کا کافی حصہ قرامطہ و ملاحدہ کے بیان میں ہے۔ اکبر ابوالفضل اور شیخ مبارک پر بڑی نکتہ چینی کی ہے۔ بعض صوفیا کی تصانیف اور ان صوفیا کی' جو قلت ادراک کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے' شکایت کی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کا ذکر اپنے والد کے ''اعظم الخلفا'' کے الفاظ سے کیا ہے۔''

خواجہ عبیداللہ دہلوی نے تریسٹھ سال عمر پا کر ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۰۷۳ھ/ ۱۹ر دسمبر ۱۶۶۲ء کو دہلی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا ❶۔

# ۶۰- علامہ عثمان بوبکانی سندھی

علامہ حکیم عثمان بن عیسیٰ بن ابراہیم صدیقی بوبکانی سندھی' اعمال سیوستان کے ایک گاؤں ''بوبکان'' میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائی۔ بعد ازاں حصول علم کی غرض سے عازم گجرات ہوئے۔ وہاں فقہ' اصول فقہ اور علوم عربیہ کی تحصیل قاضی محمود مورپی اور علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی سے کی۔ منطق اور فلسفہ کے لیے شیخ حسین بغدادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء کو برہان پور کا قصد کیا۔ یہ وہ دور تھا' جب کہ وہ علوم مروجہ' یعنی فقہ واصول' علوم عربیہ' منطق و فلسفہ اور طب وغیرہ میں مہارت پیدا کر چکے تھے۔ برہان پور اور اس نواح کا امیر اس زمانے میں محمد شاہ فاروقی تھا۔ وہ ان سے انتہائی احترام سے پیش آیا۔ ان کی فراوانیٔ علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں تدریس و افتا کی مسند پیش کی' جس پر یہ ستائیس سال متعین رہے۔ اس دوران میں ان سے بہت سے اہل علم نے استفادہ کیا' جن میں قاضی نصیر الدین بن سراج محمد برہان پوری (متوفی ۱۰۳۱ھ /۱۶۲۲ء) قاضی عبدالسلام سندھی' شیخ صالح سندھی اور شیخ یوسف بنگالی کے داماد شیخ سکھ جی شامل ہیں۔ گلزار ابرار کے مصنف محمد غوثی مانڈوی کا شمار بھی ان کے حلقہ تلامذہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ان سے علم ہیئت اور حکمت و فلسفہ کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ علامہ حکیم عثمان سندھی جہاں معقولات و منقولات کے بہت بڑے عالم تھے اور علوم شرعیہ میں دست گاہ رکھتے تھے' وہاں نہایت متقی اور زاہد و عابد بھی تھے۔ ان کے علم و فضل اور ورع و تقویٰ کی بنا پر لوگوں کے دل میں ان کی بے حد منزلت تھی۔ ان کے معتقدین کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ مشتبہات سے پرہیز کرتے' اور نماز نہایت اہتمام اور سکون سے پڑھتے۔ مشتبہات سے دامن کشاں رہنے اور احتیاط کا یہ عالم تھا کہ پورے چالیس سال کسی کے گھر سے کھانا نہیں کھایا کہ مبادا کوئی ناجائز چیز حلق سے نیچے اتر جائے۔

قلم و قرطاس سے بھی تعلق تھا۔ صحیح بخاری کی ایک شرح سپرد قلم کی اور تفسیر بیضاوی کا حاشیہ لکھا۔

برہان پور میں تین فاروقی حکمرانوں کا زمانہ دیکھا۔ ہر بادشاہ نے ان کی قدر کی۔ محمد شاہ فاروقی ان کے تقرر سے ایک سال بعد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد راجہ علی خاں عادل شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس نے بھی ان کے

---

❶ زبدۃ المقامات ص ۶۱ تا ۶۶- مآثر الکرام ص ۹۱' ۹۲- رود کوثر ص ۲۱۳- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۶۹

منصب و وظیفہ کو اضافے کے ساتھ برقرار رکھا۔ ۱۰۰۵ھ/ ۱۵۹۷ء میں بہادر خاں بادشاہ ہوا۔ وہ اگرچہ نہایت سنگین حالات میں حکمران ہوا تھا، لیکن ان کے احترام میں کوتاہی نہیں کی۔

۱۰۰۸ھ/ ۱۶۰۰ء میں علامہ عثمان سندھی نے برہان پور کی سکونت ترک کر کے، اس نواح کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ گاؤں انھیں بطور وظیفہ و جاگیر عطا ہوا تھا۔ وہاں پہنچے تو مغل حکمران جلال الدین اکبر نے تسخیر خاندیس کے عزم سے خود اقدام کیا اور اس کے لشکر کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس وقت برہان پور کی طرف واپس جانا خلاف مصلحت گردانا اور چند روز کے لیے وہاں کے جنگل ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ اکبر کے حملے کی وجہ سے ملکی نظام معطل ہو چکا تھا۔ ایک روز اچانک رہزنوں اور ڈاکوؤں کا ایک گروہ ادھر آ نکلا۔ صبح کا وقت تھا۔ ڈاکو ننگی تلواریں اور نیزے لہراتے ہوئے آئے۔ علامہ عثمان سندھی کا قافلہ سترہ افراد پر مشتمل تھا، جو سب ان کے اعزہ و اقارب، حسب ونسب میں بلند مرتبہ اور علوم دین سے آراستہ تھے۔ ڈاکوؤں کے اس سرکش گروہ نے علامہ عثمان سمیت سب کو قتل کر دیا اور خون سے بھری ہوئی جانمازیں ان کے کفن ہوئیں۔

علامہ حکیم عثمان علم وفضیلت کی نعمت سے بہرہ ور، تدین وتقویٰ کی صفت سے متصف اور تصنیف و تالیف کی دولت سے مالا مال تھے۔ شکستہ خاطر، عجز ولینت کے پیکر، اسباب دینوی اور اصحاب دنیا سے دور، پرہیز گاری کی کامل تصویر اور حلیم الطبع تھے۔ برصغیر کے اس عظیم المرتبت عالم دین نے ماہ شعبان ۱۰۰۸ھ/ فروری ۱۶۰۰ء میں درجہ شہادت حاصل کیا ❶۔

## ۶۱- قاضی عثمان سندھی

قاضی عثمان سندھی، علاقہ سندھ کے موضع دربیلہ کے رہنے والے تھے۔ نیکی و عفت سے بہرہ یاب اور فضل وصلاح سے سعادت اندوز تھے۔ عالم وفقیہ اور شیخ وقت تھے۔ عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے اور زاہد و عابد کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ متداول علوم کی تمام اقسام میں مہارت رکھتے تھے۔ صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ سے موصوف تھے۔ کبرسنی میں بھی تدریس وتعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ بے حد متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ عمدہ اوصاف میں اپنے معاصرین سے فائق تر تھے۔ دینوی مفاد سے کوئی علاقہ نہ رکھتے، کسی شخص سے کوئی نذرانہ یا عطیہ قبول نہ کرتے۔ علما وطلبا کی ایک جماعت ہمیشہ ان کے یہاں رہتی۔ سب کے قیام و طعام اور سکونت کا خود انتظام کرتے۔ اپنے قول وفعل اور عمل وحرکت سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچاتے۔ جو کچھ پاس ہوتا خدمت دین میں خرچ کر دیتے، کوئی چیز بچا کر نہ رکھتے۔ اس عالم دین اور فقیہ سندھ کی وفات ۱۰۰۲ھ/ ۱۵۹۴ء کو ہوئی ❷۔

---

❶ اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) ص ۴۴۵، ۴۴۶- تذکرۂ علمائے سندھ ص ۲۱۶ تا ۲۲۱- تحفۃ الکرام ص ۴۶۱- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۷۰، ۲۷۱-

❷ تاریخ معصومی ص ۳۳۱- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۷۱-

## ۶۲-شیخ عثمان سارنگ پوری

شیخ عثمان سارنگ پوری، شیخ منجھن بن عبداللہ بن خیر الدین لکھنوتوی مالوی سارنگ پوری کے بیٹے تھے۔ سرزمین مالوہ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ منجھن اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا۔ چونکہ علم وفضل کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ورع وتقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی تھی، اس لیے بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے اور فقہ واصول اور علوم عربیہ میں مہارت پیدا کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد مسند درس وافادہ پر متمکن ہوئے۔ کثیر الدرس، کثیر الافادہ اور صالح عالم دین تھے ❶۔

## ۶۳-مولانا عطاء اللہ عثمانی جون پوری

مولانا عطاء اللہ عثمانی اصفہانی جون پوری کے والد کا نام حبیب اللہ تھا۔ ان کے آباد اجداد درحقیقت اصفہان سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں برصغیر میں آکر جون پور کے قریب ایک گاؤں موضع گھوسی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں یہ ایک مرکزی قریہ تھا اور اہل علم کی ایک جماعت یہاں آباد تھی۔ جون پور، ہندوستان کے صوبہ یوپی کے علمی مرکز اعظم گڑھ سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ مولانا عطاء اللہ کی ولادت اپنے گاؤں گھوسی میں ہوئی اور وہیں تربیت کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ اس دور میں جون پور کو علم وتحقیق اور علما وفضلا کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں گیارھویں صدی ہجری کے نامور فاضل علامہ محمود عمری جون پوری (متوفی ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء) کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ مولانا عطاء اللہ اس میں داخل ہوئے اور علامہ ممدوح سے اخذ علم کرنے لگے۔ ان کے علاوہ دیگر علما سے بھی استفادہ فرمایا۔ حصول علم کے بعد سلوک وطریقت کی راہ پر قدم زن ہوئے اور اس ضمن میں شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جون پوری سے استفاضہ کیا۔ مولانا عطاء اللہ عثمانی اپنے زمانے کے فاضل کبیر اور شیخ تھے۔ پرہیز گار، متدین اور عبادت گزار تھے۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ۵ ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ/۲۳ فروری ۱۶۵۳ء کو لکھنؤ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❷۔

## ۶۴-مولانا عطاء اللہ سہسوانی

مولانا عطاء اللہ بن محمد ہاشم بن عبدالشکور حسینی مودودی سہسوانی، سہسوان کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، دادا، اور چچا سب اصحاب علم اور ارباب فضل تھے۔ خاندانی وقار ووجاہت اور علمی شان وشکوہ کی بنا پر یہ گھرانا خاص عزت وتکریم کا حامل تھا، اور لوگ ان کے سب افراد کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

❶ اذکار ابرار ص ۷۱-۳۷۲-نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۷۲-

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۷۴-۲۷۴-بحوالہ اصول المقصود-

اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا عطاء اللہ تھے' جو اپنے صاحب علم چچا شیخ صدر الدین محمد الحاکم کے شاگرد رشید اور مرید خاص تھے۔ چچا کی وفات کے بعد انہی کی مسند خلافت و درس پر فائز ہوئے۔ شیخ صالح اور نامور فقیہ تھے۔ صوری و معنوی فضائل کے حامل تھے۔ حلقہ درس و ارادت بڑا وسیع تھا' دور دراز علاقوں سے علما و طلبا استفادے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ اپنے اوصاف گوناگوں کی بنا پر مرجع خلائق اور مقتدائے عالم تھے۔ غزا و جہاد کے جذبے سے بھی سرشار تھے' چنانچہ کئی مرتبہ طلبا و مریدین کو ساتھ لے کر جہاد فی سبیل اللہ کا شرف حاصل کیا اور میدان کارزار میں کفار و مشرکین کو شکست دی۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور اشاعت اسلام ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ اس کے لیے تیغ و سناں سے بھی کام لیا اور وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ کثیر تعداد میں ہندو اور دیگر غیر مسلم ان کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور متعدد منکرین و مشرکین نے ان کی کوشش سے قبولیتِ دین حق کی سعادت حاصل کی۔ ایک بزرگ شیخ نور الدین سنبھلی نے اپنی کتاب ''اسرار العارفین'' میں ان کے حالات و سوانح' کمالات و فضائل اور علمی و عملی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مدت تک یہ کیفیت رہی کہ کبھی جذب و سکر کا غلبہ ہو گیا' اور کبھی سلوک و طریقت نے زور باندھا۔ ان کیفیات کے زمانے میں وہ زیادہ تر آبادی سے دور نکل جاتے اور کسی جنگل میں جا کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ جاتے' وہاں یکسوئی سے ریاضت و عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

بارعب اور پُرجلال عالم تھے۔ ان کو دیکھ کر لوگوں پر ایک خاص تاثر پیدا ہوتا اور مرعوبیت چھا جاتی۔ برصغیر کے شہر سہسوان کے اس عالم دین نے نوے (۹۰) برس کی عمر پا کر ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء کو جنت کی راہ لی ❶۔

## ۶۵- ملا عصمت اللہ سہارن پوری

ملا عصمت اللہ سہارن پوری دیار ہند کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ فاضل اور فقیہ متبحر تھے۔ عمر کے آخری دور میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔ لیکن چشم بصیرت ہمیشہ روشن رہی۔ پوری زندگی خدمت علم اور درس و تدریس میں گزار دی۔ بہترین تصانیف کے مصنف تھے' جن میں شرح خلاصۃ الحساب اور حاشیہ فوائد ضیائیہ۔ (یعنی شرح ملا جامی) شامل ہیں۔ ۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء میں فوت ہوئے ❷۔

## ۶۶- مولانا علاء الملک حسینی مرعشی

مولانا علاء الملک بن علامہ نور اللہ حسینی مرعشی' گیارھویں صدی ہجری کے شیخ اور صاحب فضل و کمال

❶ حیوۃ العلما ص ۱۷۔ ۱۸- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۷۵-

❷ مآثر الکرام ص ۱۹۴' ۱۹۵- سبحۃ المرجان ص ۵۲- ابجد العلوم ص ۹۰۰- تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۴۰- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب- ص ۱۹۷- حدائق الحنفیہ- ص ۴۰۷-

بزرگ تھے۔ اپنے والد علامہ نور اللہ حسینی مرعشی سے اخذ علم کیا اور طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے۔ پھر شیراز چلے گئے اور علما کی ایک بڑی جماعت سے مختلف علوم وفنون کی تحصیل کی۔ بعد ازاں وارد ہند ہوئے اور مغل حکمران شاہ جہان سے تعلق وقرب پیدا ہوا۔ شاہ جہان دین دار، علم دوست اور علما کا قدر دان بادشاہ تھا۔ اس نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے محمد شجاع کا معلم مقرر کر دیا اور یہ اس کے ساتھ بنگال چلے گئے۔

مولانا علاء الملک حسینی مرعشی، تصنیف وتالیف سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ مختلف عنوانات پر کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کے نام یہ ہیں: منطق میں کتاب مہذب، الٰہیات میں انوار الہدیٰ، اثبات واجب تعالیٰ کے موضوع پر الصراط الوسیط [1]۔

## ۶۷- شیخ علم اللہ امیٹھوی

شیخ علم اللہ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: علم اللہ بن عبدالرزاق بن خاصہ بن خضر صالحی امیٹھوی، ۲۷ر جمادی الاولیٰ ۹۵۴ھ/ ۱۵ر جولائی ۱۵۴۷ء کو شہر امیٹھی (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد گرامی شیخ عبدالرزاق سے جو عالم و فاضل بزرگ تھے، علم حاصل کیا۔ امیٹھی ہی کے ایک اور عالم شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ پھر عازم حجاز ہوئے اور ارض مقدس میں اٹھارہ سال قیام فرما رہے۔ وہاں کے مشائخ و اساتذہ سے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، یہاں تک کہ حدیث، فقہ اور دیگر علوم مروّجہ میں فائق تر گردانے گئے۔

ہندوستان واپس آئے تو برہان پور پہنچے۔ وہاں عادل شاہ فاروقی داد حکمرانی دیتا تھا۔ اس نے نہایت عزت واحترام سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس کی درخواست پر وہاں طویل عرصے تک مقیم رہے۔ ایک روایت کے مطابق اس اثنا میں جب کبرسنی کو پہنچے تو ۱۰۲۲ھ میں دوبارہ حج کے ارادے سے نکلے، لیکن جا نہ سکے۔

مولانا علم اللہ امیٹھوی کا یہ دلچسپ واقعہ تمام تذکروں میں مرقوم ہے کہ ان کے داماد قاضی نصیرالدین برہان پوری ان سے فقہ کی کچھ کتابوں کا درس لیتے تھے۔ قاضی نصیرالدین عامل بالحدیث تھے۔ وہ حدیث کے مقابلے میں فقہ اور قیاسِ مجتہد کو نہیں مانتے تھے۔ جب کوئی ایسی صورت پیش آتی اور مقابلہ فقہ اور حدیث کا ہوتا تو قاضی نصیرالدین حدیث کو ترجیح دیتے اور فقہ وقیاس کو ماننے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیتے، لیکن شیخ علم اللہ امیٹھوی اس کے برعکس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول سے احتجاج کرتے اور اس کو حجت گردانتے۔ ایک روز دورانِ درس میں کچھ ایسا ہی معاملہ سامنے آیا تو قاضی نصیرالدین نے امام ابوحنیفہ کے قول کے مقابلے میں حدیث پیش کی اور کہا کہ امام صاحب بھی ایک انسان تھے اور میں بھی ایک انسان ہوں، وہ معصوم تو نہیں تھے، حدیث کے مقابلے میں آخر ان کے قول کو کیوں راجح قرار دیا جائے۔ اس پر شیخ علم اللہ نے طیش میں آ کر تلوار نکال لی اور ان کو قتل

[1] صبح صادق۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۷۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۷۵، ۲۷۶۔

کرنے پر اتر آئے، لیکن نصیر الدین جان بچا کر بھاگ اٹھے، شیخ نے بیجا پور تک ان کا تعاقب کیا۔

عبدالباقی نہاوندی نے بھی مآثر رحیمی میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ علم اللہ امیٹھوی کے داماد قاضی نصیر الدین برہان پوری، قیاس وفقہ اور قول امام ابوحنیفہ پر حدیث رسول اللہ ﷺ کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ حدیث 'علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل موضوع ہے ❶۔ اس پر شیخ علم اللہ نے ان کو کافر قرار دیا اور فتویٰ جاری کیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے اور آگ میں جلا دیا جائے۔ ساتھ ہی اس فتوے کی توثیق کے لیے علما کا محضر بھی ترتیب دے دیا۔ علما نے شیخ علم اللہ کی تصدیق کی اور محضر پر مہریں ثبت کر دیں۔ ظاہر ہے یہ معاملہ انتہائی سنگین نوعیت کا تھا۔ اس زمانے میں اس علاقے کا امیر عبدالرحیم خانِ خاناں تھا۔ اس نے قاضی نصیر الدین کی مدد کی، اور زیر نزاع مسئلہ مغل حکمران جہاں گیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جہاں گیر نے شیخ علم اللہ امیٹھوی اور قاضی نصیر الدین برہان پوری دونوں کو طلب کیا۔ لیکن قاضی نصیر الدین تو حجاز چلے گئے اور شیخ علم اللہ بیجا پور تشریف لے گئے۔ بیجا پور میں وہ ابراہیم عادل شاہ سے منسلک ہو گئے۔

بہرحال شیخ علم اللہ امیٹھوی دین دار، پرہیز گار، عابد، زاہد، متورع اور متبحر عالم تھے۔ وہ عمر بھر درس و تدریس میں مصروف رہے۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ عبدالرحیم خان خاناں ان کا بے حد اکرام کرتا تھا اور ان کے ہاں جانے اور استفادہ کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی وقت ان سے مفارقت ہو۔ ان کی سفارشیں قبول کرتا اور عطیات وصلات سے نوازتا۔

روضۃ الاولیا کی روایت کے مطابق شیخ علم اللہ امیٹھوی نے ۱۱ رذی الحجہ ۱۰۲۴ھ/ ۱۲ر دسمبر ۱۶۱۵ء کو وفات پائی۔ بعض لوگوں نے ''استاد اہل حدیث'' سے تاریخ نکالی۔ انھیں بیجا پور میں دفن کیا گیا ❷۔

## ۶۹۔ سید علم اللہ شاہ بریلوی

سید علم اللہ شاہ بریلوی رحمہ اللہ، برصغیر کے عظیم القدر خاندان کے فرزند تھے۔ اکتیسویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ چوتھی پشت میں یہ باشندگانِ پاک وہند کے عظیم محسن اور مجاہد اسلام حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ کے جد امجد ہیں۔ ان کے خاندان کا ہر رکن نیکی و پاک بازی میں منفرد تھا۔ سید علم اللہ شاہ کے حالات بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار

❶ اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں۔ ملا علی قاری ہروی اس کے متعلق لکھتے ہیں: قال الدميری والعسقلانی لا اصل له وكذا قال الزركشی- وسكت عنه السيوطی- (موضوعات الکبریٰ ص ۴۸۔ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۵ء)

❷ ابرار ص ۵۷۸، ۵۷۹۔ مآثر رحیمی ج ۳ ص ۲۰ تا ۲۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۷۶، ۲۷۷۔

کے ساتھ ان میں سے بعض بزرگوں کا تعارف کرا دیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ سید موصوف کس اونچے خانوادے کے رکن رکین تھے۔ نیز پتا چل سکے کہ یہ خاندان کس طرح ہندوستان میں آیا اور ان میں سے کس شخص نے پہلے پہل اس ملک میں سکونت اختیار کی۔

## سید رشید الدین:

سید علم اللہ کے آباو اجداد میں پندرھویں پشت میں ایک بزرگ سید رشید الدین تھے۔ غالباً اس خاندان کے یہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے مع اہل وعیال مدینہ منورہ کی سکونت ترک کی اور بغداد کو اپنا مسکن بنایا۔ ترک مدینہ اور اقامت بغداد کی اصل وجہ کیا تھی؟ اس کا علم نہیں ہو سکا۔ سید رشید الدین نے بغداد ہی میں وفات پائی اور حظیرۂ شیخ عبدالقادر جیلانی میں دفن ہوئے۔

## سید قطب الدین محمد:

سید رشید الدین کے بیٹے سید قطب الدین محمد تھے۔ والد کی وفات کے بعد وہ بغداد سے اٹھ کر غزنی پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرے۔ بعد ازاں ۶۰۷ھ/۱۲۱۱ء کو اقربا و مریدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان چلے آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم ہو چکی تھی اور تخت دہلی پر سلطان شمس الدین ایلتتمش متمکن تھا۔ سلطان نے سید قطب الدین سے بڑے اعزاز و اکرام کا برتاؤ کیا، لیکن وہ دہلی میں نہیں ٹھہرے، پورب کو روانہ ہو گئے۔ نواحِ کڑا میں ایک وسیع علاقہ فتح کیا اور اس میں اقامت اختیار کر لی۔ اس خاندان کے شجروں میں انھیں ''امیر کبیر'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ قیام غزنی کے باعث انھیں 'الغزنوی' اور سکونت کڑا کی بنا پر ''الکردی'' کی نسبت سے پکارا جاتا ہے اور ''امیر سید قطب الدین محمد الغزنوی الکردی'' کے الفاظ کے ساتھ ان کا نام لکھا جاتا ہے۔

صاحب نزہتہ الخواطر سید عبدالحی حسنی لکھوی ان کا ذکر ''الامیر الکبیر'' بدر المنیر شیخ الاسلام، قطب الدین محمد بن احمد المدنی لکردی'' کے الفاظ سے کرتے ہیں:

اس خاندان کے یہ پہلے بزرگ ہیں جو وارد ہند ہوئے اور اس ملک میں باقاعدہ توطن اختیار کیا۔ سید قطب الدین محمد نے ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء کو وفات پائی۔

## سید قطب الدین کی اولاد:

سید قطب الدین محمد کے تین بیٹے تھے۔ بڑے سید نظام الدین، منجھلے سید قوام الدین، چھوٹے سید تاج الدین۔ سید نظام الدین کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا، البتہ سید قوام الدین کے حالات میں مذکور ہے کہ وہ

علم و عمل میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے اور اپنے عصر میں سرتاجِ سادات کے مرتبے پر فائز تھے۔ ان کے تدین اور علم و عمل سے متاثر ہو کر سلطان قطب الدین ایلتتمش نے اپنی ایک بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی ❶۔

تذکرۃ الابرار میں سید تاج الدین کا ذکر بھی بڑے احترام سے کیا گیا ہے اور انھیں "مشہور بہ سراج شہید" لکھا گیا ہے۔

ضیاء الدین برنی نے "تاریخ فیروز شاہی" میں ان حضرات کا تذکرہ بڑی عقیدت سے کیا ہے۔ برنی کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

سید السادات سید تاج الدین، شیخ الاسلام سید قطب الدین کے بیٹے تھے۔ خود سید تاج الدین کے بیٹے کا نام بھی قطب الدین تھا، اور پوتے سید اعز الدین تھے۔ یہ دونوں بدایوں کے منصب قضا پر فائز رہے۔ خود سید تاج الدین کئی برس تک اودھ کے عہدۂ قضا پر متعین رہے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے انھیں اودھ کی قضا سے معزول کر کے بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ سید تاج الدین مرحوم و مغفور بڑے بلند مرتبہ سید تھے ❷۔

سید قطب الدین محمد کے بڑے بیٹے سید نظام الدین تھے۔ سید نظام الدین کے بیٹے کا نام سید رکن الدین تھا۔ سید رکن الدین کڑا کے قاضی تھے۔ ضیاء الدین برنی نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ برنی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

سید تاج الدین کے بھتیجے سید رکن الدین تھے، جو کڑا کے قاضی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جامع فضائل پیدا کیا (باری تعالیٰ سید رکن الدین را جامع فضائل آفریدہ بود۔) وہ کشف و کرامت سے بہرہ مند تھے ــــــ ان کی عمر ترک و تجرید اور اعطا و ایثار میں گزری۔ تاریخ فیروز شاہی کے مؤلف نے سید تاج الدین اور سید رکن الدین رحمہما اللہ دونوں سے ملاقات کی سعادت حاصل کی اور ان کی پابوسی کے آداب بجالایا۔ (شرائط پابوس ایشاں بجا آوردہ) میں نے ان جیسے بلند مرتبہ سید بہت کم دیکھے ہیں۔ خدا نے جو عمدہ اور روشن اوصاف انھیں عطا کیے یا جس حشمت و عزت سے انھیں نوازا، وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ❸۔

## قاضی سید محمود:

اس عالی گھرانے کے ایک فرد سید قطب الدین ثانی تھے جو چھٹی پشت میں سید علم اللہ کے اجداد میں سے تھے۔ یہ کڑا کی سکونت ترک کر کے جائس چلے گئے تھے۔ ان کی اور ان کی زوجہ محترمہ کی وفات جائس ہی میں ہوئی۔ انھوں نے جائس میں ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ ان کے لڑکے سید علاء الدین تھے، علاء الدین بھی جائس

❶ تذکرۃ الابرار ص ۱۶۱۔

❷ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۸، ۳۴۵۔

❸ تاریخ فیروز شاہی ص ۳۴۹۔

میں سکونت پذیر رہے۔ لیکن پوتے سید محمود کو نصیر آباد میں عہدۂ قضا پر متعین کیا گیا تو وہ جائس سے نصیر آباد منتقل ہو گئے۔ نصیر آباد کا محلّہ قضیانہ انہی کا آباد کردہ ہے۔ شروع شروع میں اس محلے کو محلّہ قاضی محمود کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

## قاضی سید احمد:

قاضی سید محمود کی وفات کے بعد نصیر آباد کا منصب قضا ان کے بیٹے قاضی سید احمد کے سپرد ہوا۔ وہ دینی اور شرعی معاملات میں نہایت غیرت مند اور باحمیت تھے۔ ایک مرتبہ ایک قریبی رشتے دار کا مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے شریعت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کر دیا۔ یہ فیصلہ رشتے دار کے خلاف تھا۔ وہ فیصلہ سن کر غصے میں آ گیا اور ایسے الفاظ زبان سے نکالے جن سے شریعت کی اہانت کا پہلو نکلتا اور حکم شرعی سے اظہار برات ہوتا تھا۔ قاضی سید احمد نے یہ الفاظ سنے تو منصب قضا سے استعفا دے دیا اور اہل و عیال سمیت نصیر آباد سے نکل کر رائے بریلی چلے گئے۔ پھر زندگی بھر نصیر آباد کا رخ نہیں کیا۔ فرماتے تھے جس آبادی میں حکم شریعت سے بے زاری کا اظہار کیا گیا ہو، وہاں ٹھہرنا کسی ایمان دار کو زیب نہیں دیتا۔

## سید فتح عالم:

قاضی سید احمد کے استعفا کے بعد نصیر آباد کا عہدۂ قضا سید فتح عالم بن سید محمد بن سید محمود نے سنبھالا۔ مولانا غلام رسول مہر کے بقول ''خاندان میں غالباً وہی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے مغل دربار سے علاقۂ خاص پیدا کیا۔ ان کے فرزند سید ابومحمد، شہزادہ مراد بخش ابن شاہ جہان کے ہاں دیوانی کی خدمت پر مامور تھے ❶۔

## سید فضیل:

قاضی سید احمد نے نصیر آباد سے نقل مکانی کے بعد زندگی کے بقیہ ایام رائے بریلی میں گزارے۔ لیکن ان کے بیٹے سید معظم اپنے خاندان کے لوگوں میں پھر نصیر آباد چلے گئے تھے۔ سید معظم کے دو بیٹے تھے۔ سید فضیل اور سید اسحاق۔ دونوں زہد و عبادت کے پیکر تھے۔ بالخصوص سید فضیل بہت بڑے عالم اور تصوف و طریقت میں بلند مرتبے کے حامل تھے۔ ان کے شب و روز کا بیشتر حصہ ضرورت مندوں اور کمزور لوگوں کی خدمت میں صرف ہوتا۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ ہر ایک کے دروازے پر جا کر دستک دیتے اور پوچھتے کہ کوئی کام ہو تو بتاؤ میں کر دوں۔ خدمت خلق میں وہ اس حد تک آگے بڑھے ہوئے تھے کہ کسی کو ایندھن کی بھی ضرورت ہوتی تو بازار سے خرید کر اپنے سر پر اٹھا کر لاتے۔ یہ خدمات انجام دینے کے بعد طلبا کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو

❶ سید احمد شہید ص ۳۳۔

جاتے۔ علاوہ ازیں درویشوں اور عقیدت مندوں کے کام میں ان کی مدد کرتے۔

ایک مرتبہ برادری کے افراد بعض خاندانی جھگڑوں کے فیصلے کی غرض سے جمع ہوئے۔ سید فضیل بھی اس اجتماع میں شریک تھے۔ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مختلف تجویزیں پیش کیں۔ ان تجویزوں پر بحث ہونے لگی تو سید فضیل نے کہا: ''جو فیصلہ بھی کیا جائے' شریعت حقہ کے مطابق کیا جائے اور اللہ کے حکم کو معیارِ فیصلہ قرار دیا جائے۔'' بعض افراد نے ان کی اس تجویز کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔ اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر سید فضیل اسی وقت مجلس سے اٹھ کر چلے گئے۔ گھر پہنچے' سامان سفر باندھا اور دن غروب ہونے سے پہلے پہلے نصیر آباد سے نکل گئے۔ فرمایا جہاں شریعت حقہ کا احترام نہ کیا جاتا ہو' وہاں مسلمان کے لیے بودوباش حرام ہے۔ ان کے جد امجد سید احمد نے تو نصیر آباد کو چھوڑ کر دس میل کے فاصلے پر رائے بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی' لیکن سید فضیل نے پورے ملک ہند ہی کو خیر باد کہہ کر ارض حجاز کا رخ کر لیا۔ مکہ مکرمہ گئے اور حج ادا کرنے کی بعد مدینہ منورہ میں اقامت گزین ہو گئے۔ اواخر ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ/ اکتوبر ۱۶۲۳ء کو اسی خاک پاک کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ بعض اصحاب نے تاریخ وفات اللہ کے اس فرمان وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ سے نکالی۔

سید فضیل کی شادی قاضی سید فتح عالم کی بیٹی صاحب النسا سے ہوئی تھی۔ سید ممدوح کی وفات کے وقت ان کے بڑے بیٹے سید داؤد بہت کم سن تھے۔ دو یا تین برس کے۔! چھوٹے بیٹے سید علم اللہ باپ کی وفات سے دو مہینے چودہ دن بعد پیدا ہوئے۔ یہی سید علم اللہ ہیں' جو گیارھویں صدی ہجری کے وہ عالی مرتبت ہندی عالم تھے' جن کا عہد عالم گیری میں' زہد وتقویٰ میں کوئی حریف نہ تھا اور اتباع سنت نبوی ﷺ میں جن کا کوئی مثل نہ تھا۔ یہی وہ عظیم شخصیت ہیں' جو چوتھی پشت میں برصغیر پاک و ہند کے مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد تھے۔ آئندہ سطور میں ہم انہی کے حالات بیان کریں گے۔

## سید علم اللہ کی ولادت اور عہد طفولیت:

سید علم اللہ' ۱۲ ربیع الاول ۱۰۳۳ھ/ ۲۴ دسمبر ۱۶۲۳ء کو نصیر آباد کے محلّہ قضیانہ میں صبح کے وقت پیدا ہوئے۔ ان کے والد (سید فضیل) جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا' ہجرت کر کے حجاز تشریف لے گئے تھے اور مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ سید علم اللہ کی والدہ نصیر آباد ہی میں مقیم تھیں' ان کی ولادت باپ کی وفات سے دو مہینے چودہ دن بعد ہوئی۔ کچھ مدت بعد والدہ بھی انتقال کر گئیں۔ اب یہ دو کم سن یتیم بھائی تھے۔ ایک داؤد' دوسرے علم اللہ۔! دونوں کی تربیت کی ذمہ داری دیوان سید ابو محمد نے قبول کی جو ان کے حقیقی ماموں تھے۔

سید ابو محمد کو ان سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ اپنے بچوں پر بھی ان کو ترجیح دیتے تھے۔ خود شاہ علم اللہ اکثر اس کا ذکر کرتے اور فرمایا کرتے کہ میری اولاد کے لیے ضروری ہے کہ سید ابو محمد کی تکریم

اور حسنِ سلوک کو زندگی کا لازمی حصہ بنالیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ بات میرے لیے مسرت کا باعث ہو گی۔

مولانا غلام رسول مہر نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جو سید علم اللہ کی پیدائش سے قبل ظہور میں آیا۔ وہ واقعہ ایک خاندانی روایت کے طور پر مشہور ہے' جو یہ ہے کہ سید فضیل نے سید علم اللہ کی پیدائش سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ گھر میں مٹی کے ایک طشت کے نیچے آفتاب چھپا ہوا ہے اور اس کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی ہیں۔ آخر آفتاب آہستہ آہستہ طشت سے باہر نکل آیا اور بلند ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے در و دیوار اور اطراف و جوانب اس کی ضیا گستری سے بقعہ نور بن گئے [1]۔

منقول ہے کہ سید علم اللہ کی ولادت کو اس خواب کی تعبیر قرار دے دیا گیا۔ ان کے وجود سے سنن رسول ﷺ کی ترویج و تجدید کے اسباب پیدا ہوئے' احکام شریعت کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کے مواقع میسر آئے' اتباع سنت کا آفتاب درخشاں ہوا اور اسلام کے احکام و فرامین کی دور دور تک روشنی پھیلی۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ اس خاندان میں ترویج اسلام اور اشاعت دین کی جو روایت شروع سے چلی آ رہی ہے' وہ اب تک مختلف شکلوں میں قائم ہے۔

سید علم اللہ کے زمانۂ طفولیت کا ایک واقعہ جب کہ وہ پانچ برس کے لگ بھگ تھے' اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ادھر سے شیخ بندگی نظام الدین کے فرزند' شیخ بندگی جعفر امیٹھوی کا گزر ہوا۔ شیخ کی نظر شاہ علم اللہ پر پڑی تو رک گئے اور دیر تک انھیں دیکھتے رہے۔ ارادت مندوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا' اس بچے کی پیشانی سے تجلیٔ اعظم کے نور کی موجیں اٹھ رہی ہیں۔ امید ہے اس کے فیوض سے ایک جہان منور ہو گا۔

## شادی' سلسلہ ملازمت اور ترک دنیا:

اب سید علم اللہ کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے۔ عمر بلوغ میں قدم رکھا تو شیخ ہاشم جائسی کی بیٹی سے شادی ہوئی۔ اب تک ماموں سید ابو محمد کفیل تھے' جو شاہ جہان کے دربار میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ شادی کے بعد انھوں نے ملازمت کے لیے لاہور بلالیا۔ تذکرۃ الابرار کی روایت کے مطابق سید ابو محمد دو تین مرتبہ انھیں شاہی دربار میں لے کر گئے' لیکن ملازمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ بار بار کی یہ آمد و رفت سید علم اللہ کی طبعِ غیور پر گراں گزری اور ان کا قلب صفا دنیا کی اس ظاہری عز و جاہ سے متنفر ہو گیا۔ سوچا کہ دنیا کے سلاطین و ملوک کے دروازوں پر حاجب اور دربان بیٹھے ہوئے ہیں' ان سے ملاقات کے خاص آداب اور اوقات مقرر ہیں' کبھی شرف باریابی حاصل ہوتا ہے' کبھی نہیں ہوتا۔ کیوں نہ انسان ان سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس مالک

[1] سید احمد شہید ص ۳۵۔

حقیقی کے باب عالی پر مستقل طور سے بیٹھ جائے جو ہر شاہ و گدا اور امیر و غریب کے لیے ہر آن کھلا رہتا ہے۔ نہ وہاں کسی حاجب و دربان کی ممانعت کا خطرہ اور نہ آنے جانے کے اوقات و آداب مقرر۔! چنانچہ ہر چیز ترک کی۔ ننگے پاؤں اور ننگے سر باہر نکل آئے اور اعلان کر دیا کہ میرا سامان جو شخص چاہے' لے جائے۔

یہ تو تھی "تذکرۃ الابرار" کی روایت۔ اب "وقائع احمدی" کی روایت سنیے۔ "وقائع احمدی" میں مرقوم ہے کہ سید علم اللہ' سواروں میں ملازم ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ موکب شاہی موسم سرما میں لاہور پہنچا۔ رات کا وقت تھا اور شدید بارش ہو رہی تھی۔ شاہ جہان بادشاہ نے اپنے ایک معتمد کو بھیجا کہ وہ جا کر دیکھے کہ اس وقت پہرے پر کون کون موجود ہے۔ معتمد نے ہر جگہ گھوم پھر کر دیکھا' صرف ایک مقام پر ایک پہرے دار کھڑا نظر آیا جو موسلا دھار بارش میں گھوڑے پر سوار تھا۔ نیزہ ہاتھ میں تھا اور قرآن پڑھ رہا تھا۔ نام پوچھا تو بتایا۔ "علم اللہ۔"

دوسرے روز بادشاہ نے سید علم اللہ کو بلایا اور فرض شناسی و مستعدی پر خوش نودی کا اظہار فرمایا۔ جب سید ممدوح کو معلوم ہوا کہ خوش نودی کا یہ اظہار موسلا دھار بارش میں پہرے پر حاضر رہنے کا نتیجہ ہے تو معاً دل میں خیال آیا کہ دنیا کا بادشاہ اگر منصبی خدمت گزاری پر خوش ہو سکتا ہے تو مالک حقیقی کی خدمت گزاری کو اگر شیوہ و شعار بنا لیا جائے تو وہ اس سے بھی زیادہ خوش ہوگا' اور خدمت گزار کو مستحق اجر و انعام ٹھہرائے گا۔ چنانچہ اسی وقت ملازمت ترک کر دی' مال و اسباب لوگوں کو دے دیا اور فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔

یہ دو روایتیں ہیں۔ ان میں سے کسی کو صحیح مان لیجیے' نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے وہ یہ کہ سید علم اللہ شاہ آغاز شباب ہی میں دینوی ترقی و ترفع کے بہترین وسائل سے دست کش ہو گئے تھے اور فقر و انزوا کی زندگی اختیار کر لی تھی۔

لیکن دیوان سید ابو محمد کو لائق اور جوان بھانجے کے اس اقدام سے بڑی پریشانی ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بھانجا انھیں بچوں سے زیادہ عزیز تھا اور وہ اسے حالت فقیری میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خود ان کا شمار دربار شاہی کے امرا میں ہوتا تھا۔ اتنے بڑے عزیز کا اس طرح فقر و درویشی اختیار کر لینا' زمانے کے عام تصور کے مطابق ان کے لیے باعث عزت نہ تھا۔ فوراً بھانجے کے پاس پہنچے۔ بہت سمجھایا' زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا لیکن وہ نہ مانے' اپنے دل میں قطعی اور آخری فیصلہ کر کے جو قدم اٹھا چکے تھے اسے واپس لینے پر تیار نہ ہوئے۔ دوسروں نے بھی سمجھایا' لیکن اپنی بات پر قائم رہے۔

اب سید علم اللہ نے اپنی ذاتی شان و شکوہ ختم کرنے اور انکسار و مسکنت کی راہ پر گامزن ہونے کی مشق شروع کی جو راہِ حق میں وصولِ کمال کی منزلِ اولیں ہے۔ انھوں نے یہ معمول بنا لیا کہ روزانہ علی الصبح باہر نکل جاتے' جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور سر پر اٹھا کر اپنے ماموں ـــــ دیوان سید ابو محمد ـــــ کے لشکر میں فروخت کرتے۔ جتنے پیسے ملتے' ان میں سے کچھ پیسے اپنے کھانے پر صرف کرتے' باقی محتاجوں میں بانٹ دیتے۔

## شیخ آدم بنوری کی بیعت و خلافت:

یہ منزل طے کرنے کے بعد پیر طریقت کی تلاش شروع ہوئی۔ شیخ آدم بنوری کی خدمت میں پہنچے اور ان کی صحبت میں طریقت و سلوک کی منزلیں طے کیں اور اخذ علم کیا۔ اب ''ولایت خاصہ واخص و خاص الخاص'' کے منصب سے سرفراز تھے۔

شیخ آدم بنوری نے خلعت دے کر وطن جانے کا حکم دیا' اور فرمایا: ''اس جانب ولایت کے چراغوں میں تمھاری حیثیت شمع کی سی ہوگی' بلکہ ستاروں کے درمیان آفتاب کا درجہ پاؤ گے۔''

سید علم اللہ اپنے والد گرامی کی طرح حرمین شریفین جانے کا ارادہ رکھتے تھے' بیوی کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ شیخ سے اس کی اجازت چاہی تو دے دی۔ ساتھ ہی فرمایا: ''لیکن شرط یہ ہے کہ اہل اللہ میں سے اگر کوئی راستے میں روک لے تو رک جانا اور وہیں اقامت اختیار کر لینا۔''

## رائے بریلی میں قیام:

سید علم اللہ' شیخ آدم بنوری سے رخصت لے کر نصیر آباد پہنچے اور بیوی سے کہا میں اپنے لیے فقر وانزوا اور ترک و تجرید کی راہ منتخب کر چکا ہوں' اگر تمھیں میرے نقطہ نظر سے اتفاق ہے تو گھر کا تمام مال و اسباب محتاجوں اور ضرورت مندوں کو دے دو۔ نیک بخت بیوی نے بلند مرتبہ شوہر کے عمل وعقیدہ سے پورے اتفاق کا اظہار کیا اور بلا تامل ان کے حکم کی تعمیل کی۔ قریبی رشتے داروں نے اپنے اموال و املاک میں سے ایک ایک حصہ الگ کر کے سید علم اللہ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے یہ عطیہ بھی مسکینوں کو دے دیا۔ منقول ہے کہ چار مرتبہ یہی صورت پیش آئی۔ بالآخر اعزہ و اقارب اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی چیز انھیں اس خیال سے دینا بے سود ہے کہ یہ خود اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اب سید موصوف نے حجاز جانے کا ارادہ کیا اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر نصیر آباد سے رخصت ہو گئے۔ پہلی منزل رائے بریلی میں ہوئی۔ وہاں کچھ دن اپنے خالہ زاد بھائی کے ہاں ٹھہرے۔ سید علم اللہ کا معمول تھا کہ رات کے آخری حصے میں بیدار ہو کر سئی ندی پر تشریف لے جاتے۔ وہیں عالم تنہائی اور لوگوں سے علیحدگی میں نماز تہجد ادا کرتے۔ رائے بریلی ہی میں ایک مجذوب اہل اللہ شیخ عبدالشکور جائسی سے ملاقات ہوئی۔ انھیں جب پتا چلا کہ سید علم اللہ ہجرت حجاز کے ارادے سے جا رہے ہیں تو سخت اصرار کر کے روک لیا۔ اس وقت سید ممدوح کو اپنے شیخ طریقت آدم بنوری کا یہ فرمان بھی یاد آ گیا کہ اللہ کا کوئی نیک بندہ راستے میں روک لے تو رک جانا۔ چنانچہ رائے بریلی میں قیام پر رضا مند ہو گئے۔ یہ مقام ان کے لیے نیا اور غیر مانوس نہ تھا۔ ان کے جد امجد نے بھی یہاں عمر گزاری تھی اور کچھ عزیز بھی رہ رہے تھے۔ ایک مقامی زمیندار کو ان کے ارادۂ قیام کا علم ہوا تو آبادی سے باہر ی

ندی کے کنارے دس بیگھے زمین ہبہ کردی۔ یہی جگہ آگے چل کر دائرۂ علم اللہ یا تکیہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سید احمد شہید پیدا ہوئے اور اسی جگہ انھوں نے زندگی کے ابتدائی چالیس برس گزارے۔

معلوم ہوتا ہے، شیخ عبدالشکور جائسی اور سید علم اللہ کے درمیان گہرے مخلصانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ شیخ جائسی، سید موصوف سے بہت متاثر تھے اور وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سید ممدوح بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔

شیخ عبدالشکور ہی نے تکیہ کی جگہ تجویز کی۔ سید علم اللہ کے مکان اور مسجد کے مقامات بھی انہی نے متعین کیے۔ رائے بریلی کے ایک محلے کا نام لوہانی پور ہے، یہیں کے ایک زمیندار دولت خاں نے دس بیگھے زمین دی تھی۔ سید علم اللہ نے اسی زمین میں چھپر ڈال کر سکونت کا انتظام کیا اور کچی مسجد تعمیر کی۔

## سفرِ حج:

اقامت رائے بریلی سے کئی سال بعد سید علم اللہ حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ سفرِ حج میں ان کے تیسرے بیٹے ابوحنیفہ بھی ساتھ تھے جو ان دنوں بارہ برس کے تھے۔ تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق یہ بائیس آدمیوں کا قافلہ تھا جو سعادتِ حج کی غرض سے رائے بریلی سے روانہ ہوا۔ بندرگاہ تک ان لوگوں نے تمام سفر پیدل اور ننگے پاؤں طے کیا۔ عقیدت مندوں نے سواریوں کی پیش کش کی، لیکن سید صاحب نے کوئی سواری قبول نہ کی۔ اپنا ضروری سامان، جو قرآن مجید، جائے نماز، وضو کا لوٹا اور بستر وغیرہ پر مشتمل تھا، سید ممدوح خود اٹھاتے تھے۔ تمام سفر میں کسی کو کسی قسم کی تکلیف دینا گوارا نہ کی ___ مردانِ حق کا یہ قافلہ بندرگاہ پر پہنچا تو ان کے تدین و للّٰہیت، اسلام سے بے پناہ محبت و شیفتگی اور کمال اتباع سنت کو دیکھ کر جہاز کے مالکوں کے تاثر و گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ ان سب لوگوں کو مفت لے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا اور بائیس روپے فی کس کے حساب سے پورے قافلے کا کرایہ ادا کیا۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ گئے۔

دیارِ رسول ﷺ سے ان کی بے انتہا محبت کا اندازہ لگایئے کہ ہندوستان کے سفر میں اس لیے جوتا نہ پہنا کہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں، تاحد امکان عجز و ادب کے ظاہری تقاضوں کو بھی پورا کرنا چاہیے۔ حجاز کی ارضِ مقدس میں پہنچے تو اس بنا پر جوتا پہننا مناسب نہ جانا کہ اس پاک سرزمین کو رسول اللہ ﷺ کی خرام گاہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس پر ننگے پاؤں ہی چلنا چاہیے۔

قیامِ مدینہ منورہ کے ایام میں سید علم اللہ نماز کے بعد جنگل میں چلے جاتے اور لکڑیاں کاٹ کر لاتے، انھیں فروخت کر کے جتنے پیسے ملتے، ان میں اپنے اخراجات پورے کرتے۔ ان کی ترکِ دنیا اور عجز و سادگی کی وجہ سے مشائخ حرمین، انھیں ''مثیلِ ابی ذر'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ یہ حج انھوں نے غالباً ۱۰۶۸ھ یا ۱۰۶۹ھ/ ۱۶۵۸ء یا ۱۶۵۹ء میں کیا۔

دوسری مرتبہ ۱۰۸۰ھ/ ۱۶۶۹ء میں عازم حج ہوئے۔ اس مرتبہ حرم شریف کا نقشہ طول وعرض کے تعین کے ساتھ کاغذ پر کھینچ کر ساتھ لائے اور اسی نقشے کے مطابق رائے بریلی کے دائرے میں مسجد تعمیر کرائی۔ البتہ حرم کے احترام کے خیال سے مسجد کے طول وعرض میں چند انگشت کی کمی کر دی۔ مسجد کی بنیاد میں تبرک وتیمن کی غرض سے آب زمزم ڈالا۔ مسجد کی تعمیر ۱۰۸۳ھ/ ۱۶۷۲ء کو مکمل ہوئی۔ تاریخ تکمیل ''قبلۂ ثان'' سے نکلتی ہے۔

## اتباع سنت اور عمل وایثار کا بے پناہ جذبہ:

سید علم اللہ شاہ اتباع سنت کا نہایت شدید جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے۔ احکام شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ اس میں ان کی استقامت کا یہ حال تھا کہ کسی چھوٹے بڑے کی کوئی پروا نہ کرتے۔ قرآن وحدیث کے ہر حکم سے محبت اور ہر برائی سے نفرت تھی۔ ہر معاملے یعنی کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، جاگنے سونے، بات چیت، لوگوں سے میل جول اور رسم وراہ قائم رکھنے میں ہمیشہ اتباع سنت اور پیروئ شریعت پیش نگاہ رہتی۔ ان کی طبیعت بن گئی تھی کہ عزیمت کی باتوں پر عمل کرتے اور رخصت وجواز سے فائدہ نہ اٹھاتے۔ اعزہ واقارب اور معتقدین ومریدین کو بھی اسی کی تاکید کرتے۔ تواضع اور سادگی کا بہترین نمونہ تھے۔ ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرنے میں سبقت لے جانے کے لیے کوشاں ہوتے۔ اس باب میں جو مسنون طریقہ ہے، اسی کی پابندی فرماتے۔ ہاتھ اٹھا کر یا گردن جھکا کر سلام کو مکروہ اور خلاف شریعت گردانتے۔ لباس میں انتہائی محتاط اور پابندِ سنت تھے۔ روئی والا چغہ کبھی نہیں پہنا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی نہیں پہنا تھا۔ کسی سے مخاطب ہوتے تو بڑے احترام سے نام لیتے۔ ان کے سامنے اصل معیارِ تعلق اور پیمانہ محبت صرف اطاعت رسول ﷺ اور اتباع سنت تھا۔ کسی سے محبت کرتے تو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اور بغض رکھتے تو اللہ کی خوشنودی کی غرض سے۔ !الحب للہ والبغض للہ پر عامل تھے۔ کوئی شخص کسی خلاف سنت فعل کا مرتکب ہو جاتا تو جب تک اس سے توبہ ورجوع نہ کر لیتا اور اللہ سے معافی نہ مانگ لیتا، اس سے ملنا ترک کر دیتے، خواہ وہ کتنا ہی قریبی عزیز اور رشتے دار ہوتا۔

بدعات ومحدثات کے سخت مخالف تھے۔ اہل بدعت کے سلام کا بالکل جواب نہ دیتے، نہ ان سے ملتے، نہ ان کے ہدایا وتحائف قبول کرتے۔ ان کو شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور لوگوں کو تلقین فرماتے کہ ان سے تعلقات قائم نہ کریں۔ ان کی اتباعِ سنت اور تنفرِ بدعت کی عام شہرت تھی۔ لاہور کے شیخ میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید شیخ عبدالحمید ابدال تھے، جن کا حلقۂ ارادت بڑا وسیع تھا۔ ابدال صاحب کے ایک مرید نے سید علم اللہ کے بارے میں پوچھا تو ابدال صاحب نے فرمایا:

''اے عزیز! حضرت سید (علم اللہ) اتباعِ سنت اور پیروئ رسالت ﷺ میں اس عہد کے یگانہ مرد ہیں۔ اسلاف میں بھی ان جیسے بہت کم لوگ گزرے ہیں۔ سیّد ہونے کی وجہ سے ان کو فرزندی کا رتبہ حاصل تھا۔ پھر محبوبیت کا منصب ملا۔ یہ بلند درجے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئے۔''

گھر کے کام خود انجام دینے کی کوشش کرتے یا کم از کم ان میں شریک ہوتے' مثلاً جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے' پانی لاتے' کھانا پکانے میں گھر والوں کی مدد کرتے یہاں تک کہ جھاڑو دیتے اور گھر کی صفائی کرتے۔

کسی کام کے لیے کسی کو حکم نہ دیتے' خود کرنا شروع کر دیتے۔ دوسرے دیکھ کر خود ہی اس میں شریک ہو جاتے۔ شریک کار ہونے والے کو منع بھی نہ کرتے۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں تذکروں میں مذکور ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ چھپر بنانا چاہتے تھے' خود ہی بنانا شروع کر دیا۔ مسجد کے لیے چونے کی ضرورت تھی' خود ہی زمین کھود کر روڑی نکالنے لگے۔ بازار سے ضروری استعمال کی چیزیں خریدنے جاتے تو سب چیزیں اپنے سر پر اٹھا کر لاتے۔ دوسرے کو بالکل تکلیف نہ دیتے۔

تقسیم اشیا میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے۔ پورا خیال رکھتے کہ نہ کوئی چیز کسی کو زیادہ ملے' نہ کم۔ سب کا حصہ برابر اور مساوی ہو' اسی لیے کھانا اکٹھا تیار کراتے' پھر سب گھر والوں' عزیزوں اور عقیدت مندوں کو برابر تقسیم کر دیتے۔ یہ بظاہر چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے' لیکن درحقیقت بڑی اہم اور بنیادی بات ہے۔ اس سے کئی قسم کے شکوک کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سید علم اللہ اس میں انتہائی احتیاط فرماتے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ کسی نے چار یا چھ سنگترے پیش کیے' ان کو تقسیم کرنے سے بات نہیں بنتی تھی۔ سید موصوف نے ان کا عرق نکلوا کر کھانے میں ڈال دیا' تاکہ کوئی اس سے محروم نہ رہے اور تقسیم میں برابری کا اصول مجروح نہ ہو۔

شیر خور بچوں کی ماؤں کا بھی پورا خیال رکھتے۔ ان کو خشک چیزیں دے دیتے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق پکا کر کھا لیں۔ ہدایا قبول کرنے میں بڑے محتاط تھے۔ غریبوں اور مقروضوں سے کبھی تحفہ اور ہدیہ نہیں لیا۔ جن ارباب دولت اور اصحاب ثروت کے اقربا و اعزہ غریب ہوتے' ان سے بھی کوئی چیز نہ لیتے۔ فرماتے ''قرض کی ادائیگی اور ذوی الارحام کی امداد تم پر فرض ہے۔ پہلے فرض پر عمل کرو' پھر دوسروں کو دو۔ دوسروں کو دینا زیادہ سے زیادہ نفل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرائض کو ترک کرنے والوں کی نفلی عبادت کیوں کر درجہ مقبولیت کو پہنچ سکتی ہے؟''

ایک مرتبہ سئی ندی میں طغیانی آئی اور سید صاحب کا مکان پانی میں ڈوب کر منہدم ہو گیا۔ ایک مرید نے مکان کی تعمیر کے لیے پانچ سو روپے کی رقم بطور ہدیہ پیش کی۔ سید ممدوح نے تمام رفقا کو جمع کیا اور کہا کہ اگر اپنے ہاتھ سے مکان بنانے کے لیے تیار ہو جاؤ تو یہ رقم تمھاری عام ضرورتوں پر خرچ ہو گی ورنہ مزدوروں اور اجیروں کو دے دی جائے گی۔ رفقا نے بہ طیب خاطر سب کام خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ سید صاحب بھی برابر کام میں مصروف رہے۔ مٹی کھودتے' گارا تیار کرتے اور سب کے ساتھ برابر ٹوکریاں اٹھاتے۔

## علم و فضل:

علم و فضل کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ علوم شرعیہ اور معارف الہیہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ عارف [illegible] ربانی تھے۔ تمام انواع خبر اور اقسام علوم سے بہرہ ور تھے۔ قرآن' حدیث' فقہ اور باقی علوم متداولہ و

مروّجہ پر عبور رکھتے تھے۔ قانع و عفیف، عابد و زاہد اور مرقع صلاح و تقویٰ تھے۔ سفر و حضر میں کثرت سے صدقات و خیرات اور ایثار کا مظاہرہ کرتے۔ باوجود اس کے کہ خود تنگ دست ہوتے اور فقر و غربت کی زندگی بسر کرتے لیکن اصحاب حوائج کی نہایت صدق و اخلاص سے مدد کرتے۔

اللہ نے انھیں خوب صورتی سے بھی نوازا تھا۔ بہت ہی وجیہ اور حسین تھے۔ قد و قامت کے نعمت بھی حاصل تھی۔ نور ایمان کی باطنی تزیین کے ساتھ ساتھ ظاہری اعتبار سے بھی حسن و زیبائی سے مزین تھے۔ جب دن کو باہر نکلتے لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا اور حصولِ برکت غرض سے وہ ہاتھوں کو چومنے کی کوشش کرتے، مگر سید صاحب اس حرکت کو گوارا نہ کرتے اور سختی سے روک دیتے۔ جب کوئی ان کی تعریف کرتا تو اظہارِ خفگی فرماتے اور جب نصیحت کی جاتی تو خوش ہوتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مصروف رہتے اور خلافِ شرع امور کی نہایت سختی سے نکیر کرتے۔ شیخ جلیل، عالم کبیر اور زبردست مبلغ دین تھے۔

## اسلامیت کی تصویر کامل:

اپنے اعمال و افعال اور اخلاق و کردار میں اسلامیت کی کامل تصویر تھے۔ انہی امور پر عمل کرتے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ اپنے بیٹوں کا نکاح کیا تو اسی مقدار میں مہر مقرر کیا جس کا رسول اللہ ﷺ سے ثبوت ملتا ہے اور وہی شیوہ اختیار کیا جو احادیث میں مذکور ہے۔ بیٹیوں کے نکاح میں بھی یہی معیار سامنے رکھا۔ پھر نکاح کے بعد انھیں پیدل رخصت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اسی طرح رخصت فرمایا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس ضمن میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، جو یہ ہے کہ ایک بیٹی کی نسبت اپنے چچازاد بھائی سید ہدایت اللہ کے بیٹے سید عبدالرحیم سے ہوئی تھی۔ وہ نصیر آباد میں رہتے تھے۔ سید علم اللہ شاہ نے بیٹی کے نکاح اور رخصتی کا فیصلہ کیا تو خود نصیر آباد گئے۔ رشتے داروں سے ملے۔ پھر سید عبدالرحیم سے کہا: میاں وضو کر کے آیئے تاکہ نکاح کر دیا جائے۔ رشتے داروں نے اس طریق نکاح سے اختلاف کیا اور کہا کہ نکاح کے لیے باقاعدہ تاریخ مقرر کر کے برادری کو جمع کرنا چاہیے، اور جوڑے جامے تیار ہونے چاہئیں، لیکن سید صاحب موصوف نے چپ چاپ نکاح پڑھوایا اور بیٹی کو رخصت کر دیا❶۔

## سماع و مزامیر اور بدعات کی مخالفت:

سماع و مزامیر، قوالی اور غنا وغیرہ کے سخت مخالف تھے۔ اس سلسلے کے چند واقعات لائق تذکرہ ہیں۔

ایک مرتبہ مشہور عالم و شیخ پیر محمد سلونی رائے بریلی تشریف لائے۔ ان کی مجلس میں عام طور پر سماع کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ انھوں نے سید علم اللہ سے ملاقات کا وقت مانگا۔ سید موصوف نے جواب دیا کہ آپ باہر

❶ سید احمد شہید ۴۲۔

سے آئے ہیں، ملاقات کے لیے مجھے حاضر ہونا چاہیے تھا، لیکن چونکہ آپ کے ہاں سماع و مزامیر اور قوالی کا سلسلہ جاری ہے لہٰذا معذرت خواہ ہوں۔ نہیں آ سکتا۔

ایک دفعہ مشہور عالم و فاضل اور بہت سی علمی و فنی کتابوں کے مصنف ملا جیون امیٹھوی نے سماع کے موضوع پر مناظرہ شروع کر دیا۔ سید علم اللہ نے اعتراضات کیے تو ملا موصوف بہ ایں علم و فضل جواب نہ دے سکے۔

پہلے یا دوسرے سفر حج میں ایک مقام پر قیام پذیر ہوئے اور نماز جمعہ کے لیے مسجد میں گئے۔ وہاں ایک پیر چلہ کشی میں مشغول تھا اور گرد و نواح کے لوگوں میں اس کی نیکی اور خدا رسیدگی کی بڑی شہرت تھی۔ سید علم اللہ بھی اس سے ملنے کے آرزومند تھے اور خیال تھا کہ نماز کے بعد مسجد میں ضرور ملاقات ہو گی۔ لیکن پیر صاحب نماز جمعہ میں شامل نہ ہوئے۔ سید علم اللہ نماز کے بعد اپنی قیام گاہ پر چلے آئے اور اس پیر کے مریدوں سے کہا جو شخص نماز کے لیے باہر نہ نکلا اور اس نے کسی شرعی عذر کے بغیر قطعی فرض ترک کر دیا، اس کا منہ دیکھنا ہرگز روا نہیں اور اس کے ساتھ ملاقات سراسر خطا ہے [1]۔

غرض سید صاحب بدعات کی سخت تردید کرتے اور غیر شرعی امور کے مرتکب سے کوئی علاقہ نہ رکھتے، اگرچہ دینوی اعتبار سے وہ کتنا بھی بڑا آدمی ہوتا۔

## کمال احتیاط:

کسی کا ہدیہ لینے اور نذر قبول کرنے سے سید علم اللہ کمال احتیاط سے کام لیتے تھے۔ جب تک یقین نہ ہو جاتا کہ جو مال دیا جا رہا ہے، وہ شک و شبہ سے خالی ہے اور چیز دینے والا پابند شرع ہے، کوئی چیز قبول نہ فرماتے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ یہ ہے کہ رائے بریلی کے محلہ لوہانی پور کے ایک زمیندار کا نام پیر خاں تھا۔ یہ شخص سید علم اللہ سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سید صاحب کی خدمت میں آم پیش کیے۔ فرمایا یہ آپ کا اور آپ کے بھائیوں کا مشترکہ مال ہے۔ اگر آپ اپنا حصہ تقسیم کرا کے لاتے تو میں ضرور لے لیتا، اب نہیں لے سکتا۔ پیر خاں نے عرض کیا، بھائیوں کے حصے کا میں ذمہ دار ہوں۔ وہ آم دے کر تھوڑی دور گیا ہو گا کہ سید صاحب نے آدمی بھیج کر اسے واپس بلایا اور کہا:

میں جب سے راہِ فقر پر قدم زن ہوا ہوں، بارگاہ باری تعالیٰ میں ہمیشہ دعا مانگتا رہا ہوں کہ مجھے حرام اور مشتبہ مال سے محفوظ رکھا جائے۔ آپ کا ہدیہ مالِ مشتبہ ہے۔ میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔

نتائج الحرمین کی روایت ہے کہ شیخ آدم بنوری سے جن حضرات نے کسب فیض کیا، ان میں سید علم اللہ کا اسم گرامی تو شامل ہے ہی، ان کے علاوہ شیخ محمد سلطان بلیادی اور شیخ عثمان شاہ جہان پوری بھی اسی خوش بخت جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ عثمان کو سلطان اورنگ زیب عالم گیر کے ہاں خاص عزت و احترام کے مستحق

[1] سیرۃ السید احمد شہید ص ۴۲۔

سمجھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ عثمان نے شیخ محمد سلطان اور سید علم اللہ کی تنگ دستی کے بارے میں سلطان اورنگ زیب عالم گیر کو خط لکھا اور امداد کی سفارش کی۔ عالم گیر نے خط دیکھتے ہی شیخ سلطان کی خانقاہ کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ سید علم اللہ وظیفہ قبول نہیں کریں گے' اس لیے حکم دیا کہ جس مال سے خود ہمارے لیے کھانے کا انتظام ہوتا ہے' اس میں سے دو سو روپے بہ طور ہدیہ سید علم اللہ کو بھیج دیے جائیں۔ سید صاحب کو بے شک معلوم تھا کہ یہ ہدیہ رزق حلال سے آیا ہے اور بھیجنے والا وہ بادشاہ ہے' جس سے بڑھ کر صاحب تقویٰ بادشاہ کم از کم ہندوستان کے تخت حکومت پر کوئی نہیں بیٹھا۔ لیکن اس کے باوجود ہدیہ واپس کر دیا۔ یہ ان کی شانِ استغنا اور احتیاط کی انتہا تھی۔!

## فقر و تنگ دستی کی دعا:

لوگ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے فارغ البالی اور وسعت مال و دولت کی دعا مانگتے ہیں' لیکن سید علم اللہ کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اکثر اپنی اولاد کے لیے اللہ سے فقر و تنگ دستی کی دعا مانگتے تاکہ وہ لوگ اس جہان فانی کے عارضی آرام و آسائش اور دینوی نعم و زخارف کی محبت میں الجھ کر دین و شریعت اور صلاح و تقویٰ کی راہ ترک نہ کر دیں۔ چنانچہ اس خاندان میں اگر کسی کے گھر ضرورت کی عام چیزیں نہ ہوتیں اور فقر و احتیاج کی نوبت آ جاتی تو تنگی کی اس حالت کو اس طرح تعبیر کیا جانے لگا تھا کہ ''فلاں گھر میں شاہ علم اللہ تشریف فرما ہیں [1]۔''

یعنی ان کی اصطلاح میں تنگ دستی اور شاہ علم اللہ لازم و ملزوم ہیں اور ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

## صبر و تحمل کی انتہا:

سید علم اللہ بہ درجہ غایت صابر و شاکر اور انتہا درجے راضی بہ قضا رہنے والے تھے۔ ان کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے سید ابوحنیفہ تھے۔ بڑے متقی' پابند شرع اور پاک باز تھے۔ ان اوصاف کی وجہ سے بلند مرتبہ باپ کو بڑے محبوب تھے۔ عین عالم جوانی میں بتیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ سید صاحب نے گھر کے تمام افراد کو قضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کی تلقین فرمائی۔ نہ کوئی رویا' نہ کوئی حرف شکایت کسی کی زبان پر آیا۔ رات بالکل خاموشی میں گزر گئی۔ صبح ہوئی تو سید صاحب نے اطمینان کے ساتھ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا فرمائی۔ نماز کے بعد ایک شخص سے کہا کہ رات میاں ابوحنیفہ فوت ہو گئے' ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا چاہیے۔

جوان اور سعادت مند بیٹے کو دفن کر چکے تو فرمایا' الحمدللہ' میاں ابوحنیفہ اس دنیا سے دولت ایمان کے

---

[1] مخزن احمدی' ص ۴۲۔

ساتھ رخصت ہوئے ہیں۔ گھر میں ایک بوڑھی عورت روزانہ چرخا چلایا کرتی تھی۔ سوت کاتنے کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا۔ سید ابو حنیفہ کی وفات کے دن اس نے افسوس میں اپنا کام بند رکھا۔ سید علم اللہ گھر گئے تو چرخا بند تھا' فرمایا' یہ کام کیوں بند کیا ہے؟ بڑھیا نے کہا' ایسا نیک اور جوان بیٹا دنیا سے اٹھ گیا ہے' چرخے کا ہوش کیسے رہ سکتا ہے۔؟ فرمایا' یہ سب قضا و قدر کے معاملے ہیں' اللہ کے حکم میں کون دم مار سکتا ہے۔ سب کی زندگی چند روزہ ہے۔ ہمیں خدا کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ اپنا کام بند نہ کرو۔

## ایک عجیب وغریب واقعہ:

مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیا میں علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے حوالے سے سید علم اللہ کے بارے میں ایک عجیب وغریب واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ علامہ سیالکوٹی فرمایا کرتے تھے کہ سید علم اللہ نے مجھے (عبدالحکیم کو) ایک مرتبہ ایک روپیہ عطا کیا۔ میں نے وہ روپیہ تبرک کے طور پر ایک تھیلی میں رکھ لیا۔ کئی سال وہ روپیہ میرے پاس رہا۔ جب تک وہ روپیہ موجود رہا' تھیلی میں سے روپے ختم نہیں ہوئے۔

## وفات:

عمر کے آخری حصے میں غذا بہت کم کر دی تھی' چنے کی دال کا تھوڑا سا پانی اور چند دانے چاول کے کھاتے۔ حبّ رسول اللہ ﷺ کے جذبے میں یہ دعا کرتے کہ اتنی ہی عمر ہو' جتنی کہ رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمائی گئی تھی۔ ۸ر ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ/ ۲۵ر اکتوبر ۱۶۸۵ء کو دوشنبہ کے روز رائے بریلی میں فوت ہوئے۔ باسٹھ برس' آٹھ مہینے اور چھبیس دن کی عمر پائی۔ تاریخ وفات ''دوست بفردوس رسید'' نکلی۔

سلطان اورنگ زیب عالم گیر کو سید علم اللہ سے بڑی عقیدت تھی۔ انہی دنوں اس نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے رحلت فرمائی اور فرشتے آپ کے جنازۂ مبارک کو آسمان پر لے گئے۔ اس خواب سے عالم گیر سخت پریشان ہوا۔ ملا جیون سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا' غالباً سید علم اللہ فوت ہو گئے۔ چنانچہ خواب کی تاریخ لکھی گئی۔ پھر وقائع نویس کی اطلاع سے تصدیق ہو گئی کہ واقعی سید علم اللہ نے اسی روز انتقال کیا۔ بادشاہ نے ملا جیون سے پوچھا کہ آپ نے یہ تعبیر کس دلیل کی بنا پر کی تھی؟ کہا' صرف اس بنا پر کہ سید علم اللہ اتباع سنت کا اس قدر کامل ترین نمونہ تھے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی وفات کا مطلب یہ تھا کہ سنت کا ایک نہایت پاکیزہ اور عمدہ ترین نمونہ دنیا سے اٹھ گیا۔

## اولاد:

سید علم اللہ کی شادی سید ہاشم جائسی کی صاحب زادی بی بی صالحہ سے ہوئی تھی۔ اس سیدہ سے چار

بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹیوں میں سے ایک بیٹی کا نام سیدہ حنیفہ تھا۔ ان کی شادی سید عبدالرحیم بن سید ہدایت اللہ (بن سید اسحاق برادر سید فضل) سے ہوئی۔ دوسری حلیمہ تھیں، جو سید محمد جعفر بن سید قطب عالم سے بیاہی گئیں۔

چار بیٹوں کے نام یہ تھے: سب سے بڑے سید آیت اللہ، دوسرے سید محمد ہدیٰ، تیسرے سید ابوحنیفہ اور چوتھے سید محمد۔! سید ابوحنیفہ، بتیس سال کی عمر پا کر سید علم اللہ کی زندگی ہی میں ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۷ء میں وفات پا گئے تھے۔ سید آیت اللہ نے ۱۲/رجب ۱۱۱۶ھ/ ۳۰/اکتوبر ۱۷۰۴ء کو انتقال کیا۔

سید محمد ہدیٰ نے ربیع الاول ۱۱۲۰ھ/ مئی ۱۷۰۸ء کو رحلت فرمائی۔

سید محمد، دائرۂ علم اللہ کی سکونت ترک کر کے شہر رائے بریلی کے اس حصے میں جا آباد ہوئے تھے جو قلعے کے نام سے موسوم تھا۔ والدہ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہیں ایک دائرہ بنا لیا تھا، ایک مسجد بھی تعمیر کر لی تھی۔ ان کی والدہ سیدہ بی بی صالحہ اپنے جلیل القدر شوہر (سید علم اللہ) کے بارہ برس بعد ۱۱/صفر ۱۱۰۸ھ/ ۳۰/اگست ۱۶۹۶ء کو عازم فردوس ہوئیں۔ خود سید محمد نے ۲۴/ربیع الثانی ۱۱۵۵ھ/ ۱۷/جولائی ۱۷۴۲ء کو جنت کی راہ لی۔

ان سب کے حالات ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر بیان ہوں گے۔ یہ نہایت پاک باز اور بلند مرتبت حضرات تھے۔

سید علم اللہ نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد کسی بیٹے کی دستار بندی نہ کی جائے۔ یعنی کسی کو خلیفہ یا جانشین نہ بنایا جائے۔ سجادہ آرائی کا جو سلسلہ عام طور پر رائج تھا، اس سے سخت متنفر تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے خاندان میں یہ سلسلہ جاری نہ ہو۔ چنانچہ اسی پر عمل ہوا۔ اس گھرانے کے بہت سے افراد نے اپنے حلقے سے باہر جا کر بھی کسب فیض کیا۔ اگر کسی شخص نے خود ان میں سے کسی سے مستفیض ہونے کی خواہش ظاہر کی تو اس کی تمنا بھی پوری کر دی۔ لیکن باقاعدہ گدی بنا کر یا سجادہ نشین ہو کر کسی نے افادہ و افاضہ کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔ اسی طرح دنیوی مال و دولت اور عز و جاہ کی طلب کو بھی کسی نے شیوہ نہ بنایا اور نہ اس کے لیے کوئی سرگرداں ہوا۔ اگر دولت ملی تو اسے غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دیا[1]۔

## ۶۹ - قاضی علی بیجا پوری

قاضی علی بن اسد اللہ بن عبداللہ بن وجیہ الدین علوی گجراتی بیجا پوری۔ عالم کبیر، شیخ عصر اور علامۂ وقت تھے۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ ان کے والد اسد اللہ بھی عالم و فاضل تھے، دادا عبداللہ بھی یگانہ روزگار اور

[1] سید علم اللہ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تذکرۃ الابرار۔ مخزن احمدی۔ وقائع احمدی۔ نتائج الحرمین۔ بحر زخار۔ مہر جہاں تاب۔ خزینۃ الاصفیا۔ سیرت السادات۔ اعلام الہدیٰ۔ سیرت عطیہ۔ سید احمد شہید سیرت۔ سید احمد شہید۔

صاحب علم تھے اور پر دادا وجیہ الدین بھی دیار ہند کے منفرد عالم' ممتاز محقق اور بلند مرتبہ مصنف تھے۔ یعنی کئی پشتوں سے یہ خاندان علم و تحقیق اور زہد و اتقا کا مرکز چلا آ رہا تھا اور بے شمار علما وفضلا ان سے کسب فیض اور اخذ علم کر چکے تھے۔ تدین و تقویٰ میں بھی ان کا درجہ بہت اونچا تھا۔ عباد و صلحا کی بہت بڑی جماعت ان سے شرف فیض حاصل کر چکی تھی۔

قاضی علی گجرات میں پیدا ہوئے۔ وہیں پرورش پائی اور اسی شہر کے فحول علما اور نامور فضلا سے تحصیل کی۔ یہاں تک کہ تفسیر' حدیث' فقہ اور دیگر علوم متداولہ میں اونچے درجے کو پہنچے اور اقران و معاصرین میں بڑی شہرت پائی۔ اصلاً گجرات کے رہنے والے تھے' لیکن سلطان ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں اپنے برادر کبیر میران بن اسد اللہ کے ساتھ بیجا پور منتقل ہو گئے تھے' اس لیے بیجا پوری کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ والیٔ بیجا پور سلطان ابراہیم عادل شاہ نے ان کی بڑی تکریم کی اور منصب قضا پر متعین کیا۔ بیجا پور میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم فرمایا جس سے علما وطلبا کی کثیر تعداد مستفید ہوئی۔ ان کے مشہور تلامذہ میں شیخ ابوتراب بیجا پوری (متوفی ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء) سید محمد' قاضی برہان الدین' قاضی ابراہیم زبیری' ابراہیم بن عبدالمجید بیجا پوری وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائق تذکرہ ہیں۔ چونکہ ان سے اس عہد کے کثیر اصحابِ علم اور نامور حضرات نے علم حاصل کیا تھا' لہٰذا ''استاذ الاولیا'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔

اس جلیل القدر ہندی عالم وفقیہ نے ۵ ذی العقدہ ۱۰۷۰ھ/۳ر جولائی ۱۶۶۰ء کو بیجا پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے ❶۔

## ۷۰۔ قاضی علی اکبر الہ آبادی

قاضی علی اکبر الہ آبادی گیارھویں صدی ہجری کے نامور ہندوستانی شیخ اور معروف عالم وفقیہ تھے۔ فقہ اور اصول فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ مروّجہ علوم عربیہ کے رموز و نکات سے کامل آگاہی رکھتے تھے۔ شاہ جہان کے وزیر اور معتمد خاص علامی سعد اللہ خاں کے ندیم و جلیس تھے۔ سعد اللہ خاں ان کی جامعیت علم و ادراک سے بہت متاثر تھا۔ اس کا فرزند اکبر لطف اللہ خاں طویل عرصے تک ان کے حلقہ تلمذ میں شامل رہا جو باپ کی طرح فضل و کمال اور شجاعت و بسالت کا مرقع تھا۔ علوم و معارف کے مختلف گوشوں میں عبور رکھتا تھا۔ علامی سعد اللہ خاں کے بعد اسے شاہ جہان نے اپنی تربیت میں لے لیا تھا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے زمامِ سلطنت ہاتھ میں لی تو درجہ بدرجہ اس کو بہت ترقی دی۔ عالم گیر کا یہ معتمد علیہ امیر تھا۔ ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء کو فوت ہوا۔ لطف اللہ خاں نے قاضی علی اکبر الہ آبادی سے بڑا فیض حاصل کیا اور ان کے حسن تربیت سے اکثر علوم میں

❶ تذکرہ علمائے ہند' ص ۱۴۶ - نزہۃ الخواطر - ج ۵' ص ۲۸۰' ۲۸۱-

مہارت پیدا کی۔

علامی سعد اللہ خاں سے تعلق کی بنا پر قاضی علی اکبر الہ آبادی کو سعد اللہ خانی کہا جاتا تھا' اور وہ "سید قاضی علی اکبر الہ آبادی سعد اللہ خانی" کے نام سے موسوم تھے۔

قاضی علی اکبر کی وسعت معلومات کی شہرت سلطان اورنگ زیب عالم گیر تک پہنچی تو اس نے ان کو اپنے بیٹے محمد اعظم کا اتالیق مقرر کر دیا۔ پھر جب اس پر ان کی قابلیت کے مزید جوہر کھلے اور ان کی دقت نظر' اختصار علوم اور ورع و اتقا کا علم ہوا تو لاہور کے محکمہ قضا پر مامور فرمایا۔ وہ پوری زندگی اسی عہدۂ رفیعہ پر فائز رہے۔ قضا کے منصب جلیلہ میں بڑے اونچے کردار کے حامل تھے۔ اس عظیم ذمہ داری کو نبھانے میں ہمیشہ عظمت کا ثبوت دیا۔ ان کی نگاہِ احتساب بڑی تیز تھی۔ لوگوں پر کڑی نگرانی رکھتے' حدود و تعزیزات کے اجرا میں صاحب عزیمت اور مستقل مزاج تھے۔

اس باب میں ان کے عزم و استقلال کی بنا پر بعض امرائے سلطنت ان سے ناراض رہتے' لیکن بادشاہ عالم گیر کی ہیبت اور دبدبے کی وجہ سے کسی کو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور ہاتھ بڑھانے کی جرات نہ تھی۔ اسی اثنا میں امیر قوام الدین اصفہانی کو لاہور کا والی مقرر کیا گیا۔ نظام الدین اس شہر کا کوتوال تھا۔ قوام الدین اصفہانی نے کوتوال شہر نظام الدین کو اشارہ کیا کہ قاضی علی اکبر پر قابو پایا جائے۔ چنانچہ کوتوال نے اپنے خاص آدمیوں کی طاقت سے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا اور قاضی علی اکبر اور ان کے بھانجے سید فاضل کو قتل کر دیا۔ جب ان کے قتل کے حادثہ محزنہ کی اطلاع بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کو ہوئی تو اس نے قوام الدین اور نظام الدین کوتوال کو ان کے مناصب سے الگ کر دیا۔ بعد ازاں کوتوال کو قاضی علی اکبر کے ورثا کے حوالے کر دیا گیا' انھوں نے اسے قصاص کے طور پر قتل کر دیا۔ پھر بادشاہ نے قاضی شیخ الاسلام فتنی کو حکم دیا کہ امیر قوام الدین کے مقدمے کا شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جائے' لیکن قاضی علی اکبر کے ورثا نے ان کو معاف کر دیا۔

مآثر عالم گیر میں بھی اس حادثے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

"دار السلطنت لاہور کے واقعہ نگار نے اطلاع دی کہ قاضی شہر سید علی اکبر' اپنی دیانت اور طبیعت کی سختی کی وجہ سے کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا تھا۔ قاضی مذکور کے بھانجے سید فاضل کا طرز عمل اس کے برعکس تھا۔ وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے دست دراز اور بدزبان تھا۔ لاہور کے حکام یعنی ناظم اور کوتوال شہر اس کے ہاتھ اور زبان سے تنگ آ گئے تھے۔ انھوں نے مجبور ہو کر اس کی جان لینے کی ٹھانی۔ قاضی علی اکبر نے بھی اس فتنہ و آشوب میں امیر قوام الدین ناظم لاہور کے ہاتھوں بے حد ذلت اور رسوائی کے ساتھ جان دی۔

"ناظم لاہور قوام الدین اور کوتوال نظام الدین دونوں شاہی خدمت و خطاب سے برطرف کیے گئے۔ نظام الدین کوتوال تو لاہور ہی میں ختم ہوا' اور قوام الدین کو حضور شاہی میں طلب کیا گیا۔ قوام الدین کے بجائے شہزادہ محمد اعظم پنجاب کے ناظم مقرر ہوئے اور طرّۂ مرصع کے عطیے سے سرفراز فرمائے گئے۔ لطف اللہ خاں کو

صوبے کی نیابت عطا ہوئی اور اس امیر کے تغیر سے ابونصر خاں کو خدمت عرض مکرر پر متعین فرمایا گیا۔

"قوام الدین اجمیر میں آستانہ والا پر حاضر ہوا۔ محکمہ شرعیہ میں اس کے خلاف مقدمہ دائر ہوا' اور روزانہ عدالت میں ذلیل وخوار ہونے لگا۔ بالآخر سید علی اکبر مرحوم کے بیٹے نے' اعزۂ دربار کی سفارش سے مطالبہ قصاص کا دعویٰ واپس لے لیا۔ قوام الدین کو خود ہی اپنی حالت پر رحم آیا اور اس نے جلد ہی دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔"

قاضی علی اکبر مصنف بھی تھے' مختلف علوم وفنون پر ان کی گہری نظر تھی۔ فارسی زبان کی مشہور درسی کتاب "فصول اکبری"' اور عربی زبان میں "اصول اکبری"' اور اس کی شرح' ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں علم صرف کی ہیں۔

قاضی سید علی اکبر کو اس عہد کے علمائے ہند کی اس بلند مرتبت جماعت میں شمولیت کا فخر حاصل تھا' جن کو عالم گیر نے فتاویٰ ہندیہ (فتاویٰ عالم گیری) کی تدوین وترتیب پر متعین کیا تھا۔

برصغیر کے یہ عالم وفقیہ ۱۰۹۰ھ/۷۹-۱۶۷ء میں قتل کیے گئے ❶۔

## ۷۱- شیخ علی پانی پتی

شیخ علی بن محمود بن عبدالصمد انصاری پانی پتی' عبدالقادر کے عرف سے معروف تھے۔ عالم وفقیہ اور زاہد ومتقی تھے۔ فضل وصلاح کے اوصاف سے متصف تھے۔ اپنے چچازاد بھائی شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی اور شیخ عبدالرزاق جنجھانوی سے اخذ علم کیا۔ پھر کسب فیض کے لیے مختلف بلاد وامصار کے سفر پر روانہ ہوئے۔ للّٰہیت وتدین کا اندازہ کیجیے کہ تین مرتبہ ارض حجاز اور بیت المقدس کا عزم فرمایا۔ برصغیر کے شہرہ آفاق عالم وفقیہ شیخ علی بن حسام الدین متقی سے بھی فیض حاصل کیا۔ مختلف مقامات میں گھومے پھرے اور بہت سی عبادت گاہوں کی سیر کی' لیکن کسی کو تکلیف نہیں دی۔ نہ کسی سے روپیہ پیسا لیا' نہ کپڑے کا سوال کیا' نہ کسی سے کھانا کھایا اور نہ قیام وسکونت کی درخواست کی۔ مدت تک شہر اجین میں مقیم رہے۔ اجین سے سارنگ پور کا قصد فرمایا' وہاں ان کے عم محترم قاضی کے عہدے پر مامور تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ منصب بلند ان کے سپرد ہو گیا تھا لیکن طبیعت کسی جگہ جم کر بیٹھنے پر آمادہ نہ ہوتی تھی۔ چلنے پھرنے اور آزادی سے رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ لہٰذا یہ

---

❶ مآثر الامرا- ج ۳' ص ۹۹ تا ۱۰۱- مآثر عالم گیری' ص ۱۷۱' ۱۷۲- مفتاح التواریخ' ص ۲۸۱- فرحت الناظرین (شخصیات)' ص ۱۲۸' ۱۲۹- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۸۱' ۲۸۲- بزم تیموریہ' ص ۱۵۰- "معارف" اعظم گڑھ (بابت ماہ جنوری ۱۹۴۷ء ص ۵۴' ۵۵- تذکرۂ علمائے ہند- ص ۱۷۲- برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ' ص ۳۰۰ تا ۳۰۳- تذکرۂ مصنفین درس نظامی' ص ۱۵۵-

منصب ان کی طبع خاطر کے مطابق نہ تھا۔ کئی مرتبہ اس سے دست کش ہوئے اور جب جی چاہتا ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتے اور ایک شہر سے دوسرے شہر کو مسکن ٹھہرا لیتے۔ جہاں جاتے لوگ عقیدت سے پیش آتے اور وہاں سے جانے نہ دیتے۔

بہترین واعظ اور ناصح تھے، آواز میں بے پناہ اثر تھا۔ فصاحت و بلاغت کے اونچے درجے پر فائز تھے۔ جو بات زبان سے نکلتی لوگوں کے دلوں میں اترتی چلی جاتی اور وہ بے حد متاثر ہوتے۔ اللہ کے سوا کسی سے سوال نہ کرتے۔ عربی اور فارسی کے اس انداز سے اشعار پڑھتے اور ان کی توضیح فرماتے کہ لوگ وجد میں آ جاتے۔

قرآن مجید کے مفسر تھے۔ اس کے مشکل مقامات اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کی نہایت عمدگی سے وضاحت فرماتے۔ پھر شان نزول، قرآن کی عبارات و استعارات، اعجاز و ایجاز، تخصیص اعراب، مجملات، مقامات تذکیر و موعظت، واقعات و قصص، فضائل، اس کے اجمال و تفصیل، متشابہات و محکمات، حروف مقطعات اور وحی وغیرہ، ایسے اہم مسائل پر اس اسلوب سے گفتگو فرماتے کہ سامعین اش اش کر اٹھتے۔ انداز بیان درد میں ڈوبا ہوا، جو بات زبان سے ادا ہوتی وہ قلب کی گہرائی سے نکلتی، اس سے اثر کا دائرہ اور بھی بڑھ جاتا۔

ہفت روزہ سلسلہ موعظت و تذکیر جاری تھا، جو جمعے کے روز سارنگ پور کی جامع مسجد میں منعقد ہوتا۔ پورا وعظ خاص ترتیب کے ساتھ قرآن مجید سے کہتے۔ وفات کے دن سورہ مزمل کی تفسیر بیان کی۔ بدن میں لرزا پیدا ہوا، کچھ وصیت فرمائی اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء کو پیش آیا [1]۔

## ۷۲-خواجہ علی پنو کشمیری

خواجہ علی کشمیری، کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو نما پائی۔ جلیل القدر کشمیری عالم شیخ یعقوب صرفی اور شیخ شمس الدین کشمیری کے شاگرد تھے۔ شیخ حمزہ کی صحبت میں بھی رہے اور ان سے استفاضہ کیا۔ ان بزرگوں سے کسب فیض اور اخذ علم کے بعد حرمین شریفین گئے۔ حج و زیارت کا شرف حاصل کیا اور شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر ہیثمی مکی سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ پھر کشمیر واپس آ کر درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا۔ خلق کثیر ان کے چشمہ علم سے سیراب ہوئی۔

خواجہ زین الدین علی کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے اہل علم اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے ارض کشمیر کے نامور فقہا میں ہوتا تھا۔ عہد جہاں گیری کے عالم تھے۔ اپنے مسکن سے متصل محلہ رانیواری میں دفن ہوئے [2]۔

---

[1] اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار)، ص ۴۶۲، ۴۶۳-نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۴۸۴-

[2] حدائق الحنفیہ-ص ۴۲۶-تاریخ کشمیر اعظمی-ص ۱۳۴، ۱۳۵-تذکرہ علمائے ہند-ص ۱۷۲-نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۸۷-

# ۳۷-سید عمر حضرمی

سید عمر کا سلسلہ نسب یہ ہے: عمر بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عمر بن محمد بن احمد بن ابوبکر باشیبان حضرمی۔ شافعی المسلک فقیہ اور استاذ تھے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اسی ملک کے علما وفضلا سے تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تریم گئے۔ وہاں جید علمائے کرام کی مسند آراستہ تھی اور تشنگانِ علوم کی ایک جماعت حصول علم میں مشغول تھی، سید عمر حضرمی بھی اس میں شامل ہو گئے، چنانچہ شیخ عبداللہ بن شیخ اور ان کے فرزند شیخ زین العابدین سے اخذ علم کیا، قاضی عبدالرحمٰن بن شہاب الدین سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، شیخ ابوبکر بن شہاب الدین اور ان کے دونوں اصحاب علم بھائیوں (شیخ احمد بن شہاب الدین اور شیخ محمد ہادی) سے دیگر علوم دینیہ پڑھے۔ پھر بھی تشنگی علوم ومعارف پوری نہ ہوئی تو حجاز مقدس کا رخ کیا۔ عرصہ دراز تک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اقامت گزین رہے اور اس اثنا میں ان دیار پاک کے علمائے عظام کی ایک جماعت سے فیض یاب ہوئے، جن میں سید عمر بن عبدالرحیم بصری، شیخ احمد بن ابراہیم علان، شیخ عبدالرحمٰن خطیب اور دیگر فضلائے کرام کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اکثر مشائخ کی طرف سے خرقۂ خلافت بھی عطا ہوا اور بیشتر نے بیعت وارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حجاز مقدس سے پھر عازم تریم ہوئے۔ شادی کی اور سلسلۂ تدریس کا آغاز فرمایا۔ تریم میں کچھ عرصہ قیام اور درس وافادہ کے بعد دیار ہند کی راہ لی۔ اس زمانے میں سورت کی بندرگاہ بڑی مشہور تھی، وہاں مقیم ہوئے اور سید محمد بن عبداللہ العیدروس کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بہ ایں علم وفضل وہیں جا کر استفادہ کیا اور عام طریقہ تعلیم کے مطابق باقاعدہ ان کے حلقہ تلامذہ میں شمولیت کی، بہت سے علوم میں مستفید ہوئے۔ ملک عنبر نے بھی جو ایک حبشی نژاد امیر اور وزیر تھا، حاضر خدمت ہو کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں ملک عنبر برسر اقتدار آیا تو سید عمر حضرمی ان کے پاس آ گئے اور اس کی وفات تک مصروف درس وافادہ رہے۔

ملک عنبر کی وفات کے بعد سلطان عادل شاہ کے ہاں بیجا پور چلے گئے۔ عادل شاہ نے ان کی بڑی تکریم کی اور اعزاز وانعام سے سرفراز کیا۔ کئی سال بیجا پور میں مقیم رہے۔ پھر بلکام شہر میں توطن اختیار کر لیا اور لوگوں کی علمی نفع رسانی میں مصروف ہو گئے۔ طلبا کی بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا۔ طلبا کی خود کفالت کرتے اور انھیں کتابیں مہیا کرتے، کھلے دل کے ساتھ مال وزر عطا کرتے، قیام وطعام کا انتظام فرماتے، پہننے کے لیے کپڑے عنایت کرتے، غرض ان کے تمام مصارف کے خود ذمہ دار تھے۔

سید عمر حضرمی کا چشمۂ فیض طویل عرصے تک جاری رہا، جس سے علما وطلبا کے جم غفیر نے فیض حاصل کیا۔ حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے، رعب اور شہامت وجلال کے مالک تھے۔ بیجا پور کی سکونت ترک کرنے کے بعد تادمِ زندگی بلکام شہر میں اقامت اختیار کیے رکھی۔ ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء میں وفات پائی ❶۔

خلاصۃ الاثر- ج ۲، ص ۲۱۴، ۲۱۵-

# ۷۴- قاضی عمر اکبر آبادی

قاضی عمر بن حامد اکبر آبادی' شیخ اور عالم وفقیہ تھے- قاضی ناصر الدین عمر کے نام سے معروف تھے- مولانا ابو حامد ہارونی اور مفتی ابوالفتح تھانیسری وغیرہ اساتذہ سے تحصیل کی- فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود درس وافادے کا سلسلہ شروع کیا- فقہ واصول کے متبحر علما میں سے تھے- ابتدا میں سماعِ غنا کے مخالف تھے اور اس سے منع کرتے تھے' لیکن بعد میں سماع کے قائل ہو گئے تھے اور خود سماع کرنے لگے تھے-۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں فوت ہوئے ❶-

# ۷۵- قاضی عنایت اللہ بلگرامی

قاضی عنایت اللہ صدیقی بلگرامی' بلگرام کے مشہور اور نامور عالم قاضی اللہ دادا صدیقی کے فرزند تھے۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ گھر میں علم کی نہر جاری تھی اور بہت بڑے عالم باپ کے بیٹے تھے۔ ابتدا سے انتہا تک تمام کتب درسیہ والد ماجد سے پڑھیں۔ فضیلت علمی سے بہرہ ور ہوئے اور تحقیق وکاوش کے اعلیٰ مرتبے کو پہنچے۔ یہاں تک کہ بلدۂ بلگرام کی مسندِ افتا کو زینت بخشی اور اس منصب علیا کے تمام لوازم بہ وجہ احسن انجام دیے۔ سید طیب بن عبدالواحد بلگرامی سے صدق دلانہ مودت رکھتے تھے' سید طیب دہلی گئے تو قاضی عنایت اللہ کی درخواست کے موجب شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ سے ملے اور قاضی ممدوح کے لیے شیخِ محدث سے شرف اجازہ اور سلسلے کے بزرگان کرام کا شجرہ حاصل کیا ❷-

قاضی عنایت اللہ بلگرامی گیارھویں صدی ہجری کے عالم وفقیہ تھے' لیکن ان کی تاریخ ولادت ووفات کا علم نہیں ہو سکا۔

# ۷۶- مولانا عوض وجیہ سمرقندی

مولانا عوض وجیہ سمرقندی' مضافاتِ سمرقند کے ایک قریہ میں پیدا ہوئے' جس کا نام ''اخسیکت'' ہے۔ اسی مقام پر نشوونما پائی۔ میر عوض تاشقندی سے علم حاصل کیا اور فقہ کی تعلیم سے بہرہ مند ہوئے۔ خاصا عرصہ ان کی صحبت وملازمت اختیار کیے رکھی۔ اپنے دور کے شیخ' عالم کبیر اور فقیہ نامدار تھے۔ صاف ذہن' بلند فطرت' فہیم وفطین' روشن ضمیر' قوی الحفظ' عالی فکر اور اونچے دل ودماغ کے عالم تھے۔ معقول ومنقول میں اپنے تمام اقران ومعاصرین سے فائق تر تھے۔ طویل مدت تک بلخ میں درس وافادہ کی مسند پر فائز رہے اور بے شمار لوگوں

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۸۹' ۲۹۰ بحوالہ اخبار الاصفیا-

❷ مآثر الکرام ص ۲۱۹- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۲۹۰-

کو فائدہ پہنچایا۔ شاہ جہان بادشاہ نے اپنے بیسویں سال جلوس (۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء) کے اواخر میں بلخ فتح کیا تو مولانا عوض وجیہ سے ملاقات ہوئی۔ اس پادشاہِ دین پناہ کے نیک افکار و خیالات اور جذبۂ دین داری سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ بادشاہ پر بھی ان کی ذکاوت و فطانت اور دقّتِ نظر کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ وہ ہندوستان تشریف لے آئے۔ بادشاہِ خوش اطوار نے ان کو مفتی لشکر کے منصب اعلیٰ پر مامور کیا۔

شاہ جہان کی معزولی کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب عالم گیر سریر آرائے سلطنت ہند ہوا تو اس نے بھی ان کی نہایت تکریم کی۔ ان کے مرتبہ علم و فضل کا عملاً اعتراف کیا اور ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں محتسب کا عہدہ پیش کیا۔ دولت تیموری میں مولانا عوض وجیہ پہلے آدمی تھے' جنھیں احتساب کا محکمہ سپرد کیا گیا۔ ان کا کام اس بات کی نگرانی کرنا تھا کہ کوئی فواحش کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہے؟ کسی نے حدود شریعت سے قدم باہر تو نہیں نکال لیے ہیں اور منہیات کی وادی میں داخل نہیں ہو گیا ہے؟ حلال اور حرام امور میں امتیاز کی شرعی پابندیوں کو نظر انداز تو نہیں کر دیا گیا ہے؟ کہیں مسکرات کا استعمال تو نہیں ہو رہا ہے؟ ان امور پر وہ کڑی نگاہ رکھتے تھے اور جو لوگ حدود شرعی سے تجاوز کرتے' انھیں باقاعدہ سزا دی جاتی تھی۔

مولانا عوض وجیہ کی شخصیت اور خدمت کی بنا پر انھیں خلعت خاص عطا کیا جاتا اور پندرہ ہزار روپے سالانہ دیے جاتے۔ بعد ازاں اس کے عوض میں یک ہزاری منصب اور ایک صد گھڑ سوار کا منصب عطا ہوا۔

مولانا ممدوح بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے نزدیک بڑے معتمد علیہ تھے۔ ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۵ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ اس اثنا میں ان سے کسی ایسی خطا کا ارتکاب ہو گیا کہ بادشاہ نے انھیں معزول کر دیا' ان کی جگہ خواجہ قادر کو یہ منصب تفویض ہوا۔ منصب احتساب سے معزولی کے بعد وہ اپنے گھر میں گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گئے اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء میں بادشاہ ان سے پھر خوش ہو گیا اور لغزش معاف کر دی۔ پہلا منصب بحال کر دیا اور اپنے بیٹے محمد اعظم کا اتالیق بھی مقرر کیا۔ پھر زندگی بھر ان سے لوگ نفع اندوز ہوتے رہے۔

بے شبہ مولانا عوض وجیہ متقی اور پرہیز گار عالم تھے۔ احکام شرح کے پابند تھے' عوام کو اتباع سنت کی راہ مستقیم پر چلانے اور قائم رکھنے اور بدعات کا خاتمہ کرنے میں ہر آن ساعی رہتے۔ اس میں قطعی مبالغہ نہیں کہ اس دور میں مولانا موصوف جیسا متبع سنت محتسب کوئی نہیں ہوا۔ ان کے فضل و کمال کا اس عہد کے تمام تذکرہ نگار



واضح الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں۔

دور مغلیہ کے اس عالم و فقیہ نے ۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء میں وفات پائی ❶۔

---

❶ عمل صالح (الموسوم بہ شاہ جہان نامہ) ج ۳' ص ۳۰۱۔ عالم گیر نامہ' ص ۳۹۲۔ مآثر عالم گیری ص ۴۳' ۱۴۷۔

# ۷۷- شیخ عیسیٰ سندھی

شیخ عیسیٰ سندھی کا سلسلہ نسب یہ ہے: عیسیٰ بن قاسم بن یوسف بن رکن الدین بن معروف بن شہاب الدین المعروف الشہابی الجندی السندی الہندی البراری عیسیٰ القادری۔ لقب عین العرفا اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ شیخ عیسیٰ کو مسیح الاولیا کے لقب سے بھی ملقب کیا جاتا ہے اور شیخ عیسیٰ جنداللہ بھی کہا جاتا ہے۔

شیخ عیسیٰ کے آباواجداد اصلاً علاقہ سندھ کے قصبہ پاتری کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ خود انہی کے بزرگوں نے آباد کیا تھا۔ اس خاندان کے بزرگ اپنے علاقے میں عزت وتکریم کے حامل تھے اور ان کا شمار اس عہد کے متبحر علمائے دین، یگانہ روزگار مفسرین، نامور محدثین اور مشہور اولیائے کرام میں ہوتا تھا۔ مغل حکمران نصیرالدین ہمایوں کی لشکر کشی سے جب ملک سندھ میں افراتفری پھیلی اور شورش و بدامنی کا دور دورا ہوا تو شیخ عیسیٰ کے والد شیخ قاسم اور ان کے چچا شیخ طاہر محدث اپنے متعلقین ومریدین اور اعزہ واقربا کے ساتھ ۹۵۰ھ/ ۱۵۴۳ء میں وطن مالوف (پاتری سندھ) سے ہجرت کر گئے۔ یہ لوگ پہلے احمد آباد (گجرات) گئے اور پھر وہاں سے ایلچ پور (برار) پہنچے۔ اس سفر میں ان کو سخت تکلیف دِہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شیخ عیسیٰ کے چچا شیخ طاہر اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ زہد وتقویٰ کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ ان کے علم وفضل اور تدین واتقا کی شہرت تغال خاں تک پہنچی جو ان دنوں ملک برار کے نظم ونسق کا مالک تھا۔ اس نے بے حد اصرار اور نیازمندی سے شیخ طاہر محدث سے برار تشریف لانے کی استدعا کی۔ جب یہ خاندان تغال خاں کی التجا پر ایلچ پور پہنچا تو اس علم دوست حاکم نے ان کی شان کے شایاں ان کا خیر مقدم کیا اور نہایت عزت وتوقیر سے پیش آیا۔ اس نے شیخ طاہر کو وہاں کے دارالعلوم کی مسند پیش کی۔ نقد روپے کے علاوہ زرخیز اراضی کا ایک گاؤں بطور جاگیر نذر کیا۔ شیخ طاہر نے گاؤں اور گھریلو معاملات کی ذمہ داری اپنے چھوٹے بھائی شیخ قاسم (شیخ عیسیٰ کے والد) کے سپرد کی اور خود درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔

کچھ عرصہ بعد ۵ ذی الحجہ ۹۶۲ھ/ ۲۰ اکتوبر ۱۵۵۵ء شب یک شنبہ کو شیخ قاسم کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ اس روز شیخ قاسم گھر پر موجود نہ تھے، سفر پر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی شیخ طاہر محدث نے نومولود کا نام عیسیٰ رکھا۔ عیسیٰ نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ شیخ طاہر کے چچا کا نام عیسیٰ تھا، جو اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور نامور بزرگ تھے۔ اس نام کی معنوی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس نومولود عیسیٰ کو بھی علم وفضل اور ورع وتقویٰ کی دولت سے نوازا۔

شیخ قاسم سفر سے واپس آئے تو انھیں بیٹے کی ولادت کی خوش خبری سنائی گئی اور بتایا گیا کہ نومولود کا نام عیسیٰ رکھا ہے۔ شیخ قاسم بیٹے کا نام سلیمان رکھنا چاہتے تھے، اس لیے کہ جب ان کی بیوی حاملہ تھیں تو بعض

پرہیز گار اور نیک لوگوں نے یہ خواب دیکھا تھا کہ شیخ قاسم کے گھر حضرت سلیمان علیہ السلام تشریف لائے ہیں' لیکن انھوں نے بڑے بھائی (شیخ طاہر) کے احترام میں بیٹے کا نام نہیں بدلا۔

شیخ عیسیٰ سندھی نے مذہبی ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور علم و فضل کی گود میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور علوم متداولہ کے حصول کی طرف عنان توجہ مبذول کی۔ گھر کی فضا خالص علمی تھی اور ان کے عم محترم شیخ طاہر کی مسند درس آراستہ تھی۔ شیخ عیسیٰ نے ملا اسماعیل سے قرآن مجید پڑھا جن کا اس دور میں تعلیم قرآن میں کوئی ثانی نہ تھا۔ شیخ طاہر محدث سے حدیث و فقہ کی تکمیل کی' شیخ مبارک سندھی سے اصول فقہ اور علم کلام کی تحصیل فرمائی۔ شیخ عثمان بوبکانی سے علوم عقلی و نقلی حاصل کیے۔ شیخ فتح اللہ شیرازی سے علوم ریاضی اور عروض سیکھے۔ شیخ ابراہیم قاری سے جو مرغ لاہوتی کے لقب سے ملقب تھے' تجوید و قرأت میں جبرائیلی لہجے کی تعلیم حاصل کی۔ غرض اس عہد کے اجلا و فضلا اور مشہور اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے تمام علوم مروّجہ اخذ کیے اور درجہ کمال کو پہنچے۔ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں شیخ لشکر محمد عارف کی خدمت میں پہنچے' ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور طریقت کے غوامض و نکات کی عقدہ کشائی کی۔ عمر بھر ریاضت و مجاہدہ' درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے سے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔

شیخ عیسیٰ سندھی متوکل علی اللہ عالم تھے اور دینوی آسائش و نعمت پر فقر و فاقہ کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ اس ضمن کے بہت سے واقعات میں سے دو واقعے قابل ذکر ہیں' جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ عنفوان شباب میں جب شیخ عیسیٰ مرشد طریقت کی تلاش میں اکبر آباد (آگرہ) تشریف لے جا رہے تھے تو اثنائے سفر میں اجین (مالوہ) میں قیام پذیر ہوئے اور شیخ عبدالکریم بن شیخ عیسیٰ کی خانقاہ میں بطور مہمان ٹھہرے۔ اتفاق سے ان دنوں حاکم مالوہ مع امرا و وزرا کے وہاں فروکش تھا۔ اجین کے مشائخ نے اس خیال سے شیخ عیسیٰ کی ملاقات حاکم مالوہ سے کرانا چاہی کہ انھیں کچھ مالی فوائد حاصل ہو جائیں' لیکن شیخ نے یہ گوارا نہ کیا کہ علم و تقویٰ کی نعمتِ بے بہا کو ایک دنیا دار فرماں روا کے حضور پیش کریں اور اس سے مادی منفعت کے طالب ہوں۔ وہ دوسرے ہی دن اجین سے رخصت ہو گئے۔

۲۔ عبدالرحیم خان خاناں جو عالم و فاضل حاکم تھا اور علما کی انتہائی قدر کرتا تھا' ایک مرتبہ رات کو شیخ کی خانقاہ میں آیا۔ اس وقت خانقاہ میں علما و مشائخ کی مجلس گرم تھی۔ خان خاناں بھی اس میں شریک ہوا۔ یہ دلچسپ مجلس نصف رات تک جاری رہی۔ رخصت ہوتے وقت خان خاناں نے تین یا چار سو روپے شیخ کی نذر کیے۔ شیخ کی عادت تھی کہ روپیہ پیسا کبھی اپنے پاس نہ رکھتے۔ نذرانہ اور فتوحات وغیرہ کی رقم ایک معتمد خلیفہ شیخ محمد سندھی کی تحویل میں رہتی تھی' وہ خانقاہ کے مستحق افراد کو مناسب حصے سے رقم تقسیم کرنے پر مامور تھے۔ یہ رقم جب شیخ کو ملی تو شیخ محمد سندھی وہاں موجود نہ تھے' دریافت کرنے پر پتا چلا کہ وہ گھر جا کر سو گئے ہیں۔ شیخ نے اسی

وقت انھیں بلانے کا حکم دیا۔ وہ آئے تو پہلے اس بے وقت طلبی پر ان سے معذرت خواہ ہوئے۔ پھر رقم ان کے حوالے کی، تب اطمینان کا سانس لیا اور نیند آئی۔

شیخ عیسیٰ سندھی انیس برس کے تھے کہ والد محترم (شیخ قاسم سندھی) نے ۵ محرم ۹۸۱ھ/ ۸ رمئی ۱۵۷۳ء کو ایلچ پور میں وفات پائی۔ انھیں وہیں سپرد خاک کیا گیا۔ اسی اثنا میں اس خاندان کے محسن اور برار کے حاکم تغال خاں کا انتقال ہوا۔ تغال خاں کے انتقال کے بعد علاقہ برار کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کا نظم و نسق ختم ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب اس علاقے میں اس خاندان کو علم و فضل اور زہد و عرفان کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل تھی۔ اس کی فیض رسانیوں کا دائرہ دور تک پھیل چکا تھا اور علما و فضلا اور خواص و عوام میں یہ خانوادہ بحرالعلوم کی حیثیت سے متعارف تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان کی ایک اور علاقائی سلطنت خاندیس تھی، جس کا دارالحکومت برہان پور تھا۔ اس سلطنت کے حکمران خدمت علم اور علما دوستی میں بہت مشہور تھے۔ جس زمانے کے حالات ہم پڑھ رہے ہیں، اس زمانے میں خاندیس کی زمام حکومت عادل شاہی خاندان کے ہاتھ میں تھی، جو نسلاً فاروقی خاندان تھا۔ عادل شاہی حکمران عرصے سے شیخ عیسیٰ کو برہان پور تشریف لانے کی دعوت دے رہا تھا۔ سقوط برار کے بعد شیخ طاہر محدث اور شیخ عیسیٰ اپنے سندھی اعزہ و متعلقین کے ساتھ برہان پور چلے گئے۔ بادشاہ نے ان کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور عزت و احترام سے ٹھہرایا۔ سندھ کے جو لوگ اس نواح میں آباد تھے، وہ بھی مختلف علاقوں اور قصبوں سے اٹھ کر برہان پور منتقل ہو گئے اور ایک وسیع محلّہ سندھی باشندوں سے آباد ہو گیا جو ان کی وطنی نسبت کی بنا پر سندھی پورہ کہلایا۔

برہان پور کو اس عہد میں علم و علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ مشہور عالم شیخ یوسف بنگالی کا سلسلۂ درس وہاں جاری تھا۔ شیخ طاہر محدث بھی علوم دینیہ کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ شیخ عیسیٰ سندھی جو کتب درسیہ سے فارغ ہو چکے تھے، بایں علم و فضل شیخ یوسف بنگالی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور جلد ہی فراغت حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ شیخ طاہر کے مشورے سے ۹۸۲ھ/ ۱۵۷۵ء کو آگرہ روانہ ہوئے اور وہاں سے گوالیار کا قصد کیا۔ وہ ان دیار کے علما و فضلا اور اصحاب تصوف و طریقت سے بھی مستفیض ہوئے۔

غرض شیخ عیسیٰ سندھی نے اپنے عصر کے مختلف ارباب علم و فن سے استفادے کے بعد برہان پور میں خود مسند تدریس بچھائی اور بے شمار تشنگان علوم نے ان کے چشمہ فیض سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ ان کے تلامذہ اور فیض یافتہ حضرات کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ ان کے بیٹوں نے بھی ان سے کسب علم کیا۔

شیخ عیسیٰ سندھی بہ یک وقت مفسر بھی تھے اور محدث بھی، فقیہ بھی تھے اور اصولی بھی، مصنف بھی تھے اور صوفی بھی، صاحب طریقت بھی تھے اور بہت بڑے عالم دین بھی، کامیاب مدرس بھی تھے، اور بہترین مفتی بھی۔ ان

کی تگ وتاز علمی کا سلسلہ ہمہ گیر تھا اوران سب اصناف علم میں ان کو کامل درک حاصل تھا جوان دنوں مروّج تھے۔

وہ بہت بڑے مصنف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات یہ ہیں: روضۃ الحسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ، شرح اسماء اللہ الحسنیٰ میں ایک اور رسالہ عین المعانی کے نام سے لکھا۔ رسالہ حواس خمسہ، شیخ عبدالکریم الجیلی کی انسان الکامل پر حاشیہ، قصیدہ بردہ کی شرح فارسی زبان میں، تصوف کے انداز میں ایک کتاب قبلۃ المذاہب الاربعۃ، عبدالرحمٰن جامی کی فوائد ضیائیہ یعنی علم نحو کی شہرہ آفاق کتاب شرح جامی پر حاشیہ۔ ایک کتاب اپنے بیٹے عبدالستار کے لیے لکھی جس کو فتح محمدی کے نام سے موسوم کیا۔ ایک کتاب تفسیر قرآن کے بارے میں فتح محمد کے لیے لکھی۔ علم نحو کی مشہور کتاب مائۃ عامل کی شرح تحریر کی، جسے تمیم کے نام سے موسوم کیا۔ یہ کتاب انھوں نے ایک اہل علم سید علی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ ایک رسالہ عقد الانامل کے بارے میں تالیف کیا۔ علاوہ ازیں شرح رباعتین اور ترجمہ اسرار الوحی تصنیف کیں۔ ایک اور کتاب انوار الاسرار فی حقائق القرآن ومعارفہا لکھی۔ یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے جو ایک ضخیم اور مبسوط کتاب ہے۔ اس کا اسلوب زیادہ تر متصوفانہ ہے اور سلوک ومعرفت کے طریق پر لکھی ہے۔ اس کے بعض مقامات کی وضاحت اسلاف کرام کی عام روش سے ہٹ کر کی گئی ہے۔ مثلاً اعوذ باللہ من الشیطن الرحیم. کی تفسیر بیان کرتے ہوئے 'شیطان کو' "اس بعد" سے تعبیر کیا گیا ہے" جو بندے اور اللہ کے درمیان کسی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔" اس تفسیر میں اس قسم کی متعدد باتیں بیان کی گئی ہیں جو اسلاف کے نقطہ نظر سے صحیح نہیں، اور کتاب وسنت سے جن کی تائید نہیں ہوتی۔

شیخ عیسیٰ سندھی نے ۱۴ شوال ۱۰۳۱ھ/۱۲ اگست ۱۶۲۲ء کو برہان پور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❶۔

## ۷۸۔ مفتی عیسیٰ گوپاموی

مفتی عیسیٰ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عیسیٰ بن آدم بن محمد بن خواجہ بن شیخ بن محمد بن احمد صدیقی شہابی گوپاموی۔ شیخ نظام الدین اللہ دیا خیر آبادی کی نسل سے تھے۔ ۹۶۰ھ/۱۵۵۳ء کو گوپامئو میں پیدا ہوئے اور اپنے والد مکرم شیخ آدم اور شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی سے تحصیل علم کی اور علما وفقہا میں گردانے گئے۔ ان کے والد (شیخ آدم) گوپامئو کی مسند افتا پر فائز تھے۔ والد کی وفات کے بعد یہ مسند ان کے بیٹے (مفتی عیسیٰ) کے حصے میں آئی۔ مفتی عیسیٰ کی شادی شیخ جعفر بن شیخ نظام الدین عثمانی امیٹھوی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی، جن کے بطن سے تین بیٹے متولد ہوئے۔ ان بیٹوں میں ایک مفتی وجیہ الدین تھے اور یہی سب سے بڑے عالم تھے۔ مفتی عیسیٰ گوپاموی نے ۲۹ ذی الحجہ ۱۰۲۲ھ/۳۰ جنوری ۱۶۱۴ء کو وفات پائی ❷۔

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: اذکار ابرار ص ۵۰۸ تا ۵۳۶۔ برہان پور کے سندھی علما المعروف بہ تذکرۂ اولیائے سندھ ص ۳۱ تا ۱۰۳- تذکرۂ علمائے ہند ص ۱۵۳- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۹۵ تا ۲۹۹- تاریخ برہان پور ص ۱۳۶، ۱۳۷- تذکرۂ صوفیائے سندھ ص ۱۵۶ تا ۱۶۴-

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۲۹۹-

## ۷۹- قاضی عیسیٰ اکبر آبادی

قاضی عیسیٰ بن ابوالفتح بن عبدالغفور بن شرف الدین عمری تھانیسری اکبر آبادی۔ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والد مفتی ابوالفتح تھانیسری (متوفی ۸/ جمادی الاولیٰ ۹۷۶ھ/ ۲۸/ نومبر ۱۵۶۸ء) سے علم فقہ کی تحصیل کی اور اپنے عصر کے نامور علما و فقہا اور اصولیین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۰۹ء کو جہاں گیر کے عہد میں منصب قضا پر متمکن ہوئے ❶۔

## ـــــ غ ـــــ

## ۸۰۔ سید غضنفر گجراتی

گیارھویں صدی ہجری کا ہندوستان علم تحقیق کے لحاظ سے بڑا پُرثروت تھا۔ اس صدی میں برصغیر کے مختلف علاقوں میں بے شمار علما وفقہا اور مفسرین ومحدثین پیدا ہوئے، جنھوں نے بھرپور علمی خدمات انجام دیں۔ ان میں سرزمین گجرات کے ایک عالم سید غضنفر بن سید جعفر حسینی نہروالی گجراتی بھی تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے عظیم المرتبت اساتذہ اور جلیل القدر علما سے اخذ علم کیا تھا، جن میں شیخ عبدالرحمٰن جامی کے بھانجے شیخ محمد امین، شیخ محمد سعید بن مولانا خواجہ کوہی خراسانی اور شیخ تاج الدین عبدالرحمٰن بن مسعود بن شمس الدین گاذرونی کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔

سید غضنفر حسینی گجراتی، شیخ وعلامہ، محدث اور جید عالم تھے۔ ان کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے مشہور علمائے حدیث وفقہ اور ماہرین علوم عربیہ میں ہوتا تھا۔

سید غضنفر حسینی نے حصول علم کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور ان سے بہت سے علما وطلبا نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ ابوالمواہب احمد بن علی عباسی شناوی، مفتی حرم مکہ مکرمہ شیخ عبدالرحمٰن بن عیسیٰ عمری مرشدی اور شیخ امام عبدالقادر بن محمد بن یحییٰ حسینی طبری مکی قابل ذکر ہیں۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس عالم وفقیہ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا علم نہیں ہوسکا ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۰۰- بحوالہ اخبار الاصفیا-

❷ تذکرۂ علمائے ہند- ص ۲۷۲- نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۰۱-

## ــــ ف ــــ

# ۸۱- شیخ فاضل سنبھلی

شیخ فاضل بن امجد نقشبندی سنبھلی، عالم وفقیہ تھے اور فقہ واصول کے ماہر علما میں سے تھے۔ طریقت و سلوک سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ اور شیخ تاج الدین عثمانی سنبھلی سے فیض یافتہ تھے۔ ایک مدت تک ان سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ علم ومعرفت میں ماہر کامل ہو گئے۔ حصول علم وطریقت کے بعد اپنے آپ کو درس و تدریس کے لیے وقف کر دیا تھا۔ علوم دینیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کا اندازِ تدریس یہ تھا کہ علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ تلامذہ کو طریقت وصلاح سے بھی مستفید فرماتے تھے۔

اس صاحب تصوف عالم وفقیہ نے ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء کے بعد سنبھل میں وفات پائی ❶۔

# ۸۲- شیخ فتح محمد برہان پوری

شیخ فتح محمد برہان پوری اپنے عصر کے محدث اور عالم وفقیہ تھے اور شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی کے لائق بیٹے تھے۔ کنیت ابوالمجد تھی اور لقب عبدالرحمٰن تھا۔ عارف باللہ اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔ مشائخ صوفیا اور علمائے مشہورین میں سے تھے۔ اس متبحر وصوفی عالم نے اپنے والد سے اخذ علم کیا اور انہی سے طریقت سیکھی۔ حصول علم اور اخذ طریقت کے بعد درس وافادہ میں مشغول ہو گئے۔ طویل عرصے تک برہان پور میں ہنگامۂ درس برپا کیے رکھا۔ پھر سرزمین حجاز کا رخ کیا اور سعادتِ حج سے بہرہ یاب ہوئے۔ بعدازاں وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

متعدد کتب ورسائل کے مصنف تھے، جن میں ایک رسالہ مراتب العوالم الخمسہ کے بارے میں لکھا اور ایک رسالہ وحدت الوجود سے متعلق تحریر کیا۔ شیخ علی بن شہاب الدین حسینی ہمدانی کے لیے ستر احادیث کی تخریج کی۔ ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں مفتاح فتوح العقائد تصنیف کی۔ ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں فتوح الاوراد لکھی۔ ایک کتاب عربی زبان میں فقہ کے متعلق تصنیف کی، جس کا نام فتح المذاہب الاربعہ رکھا۔ سلوک میں فتح الطریقہ معرض تصنیف لائے۔ ایک رسالہ شیخ عبدالقادر جیلانی کی تحقیق نسب کے سلسلے میں تصنیف کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی رسائل تصنیف کیے۔

شیخ فتح محمد برہان پوری نے مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، فوت بھی اسی مقدس سرزمین میں ہوئے ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۰۲، ۳۰۳ بحوالہ اسراریہ۔

❷ تذکرۂ ... برہان پور ص ۱۳۷، ۱۳۸ - تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۶۰ - نزہۃ الخواطر - ج ۵، ص ۳۰۴

## ۸۳- شیخ فرخ نارنولی

شیخ فرخ نارنولی، شیخ نظام الدین چشتی نارنولی کے پوتے تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد اور دادا سے اخذ علم کیا، یہاں تک کہ ان کا شمار علما وفقہا کی جماعت میں ہونے لگا۔ والد اور دادا کے بعد مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے۔ نہایت بارعب اور بلند مرتبہ شیخ تھے۔ معارفِ الٰہیہ میں یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء کو نارنول میں فوت ہوئے ❶۔

## ۸۴- میر سید فیروز بلگرامی

میر سید فیروز بن عبدالواحد بن ابراہیم بن قطب الدین حسینی واسطی بلگرامی۔ بلگرام میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سید عبدالواحد بلگرامی سے علم حاصل کیا۔ سید عبدالواحد بھی اگرچہ صاحب علم وفضل بزرگ تھے لیکن مہارتِ فنون اور کمال علم میں سید فیروز، باپ سے بہت آگے تھے۔ فقہ اور دیگر علوم مروّجہ میں جو درک بیٹے کو حاصل تھا، باپ کو حاصل نہ تھا۔ سید فیروز کے بڑے بھائی سید طیب (متوفی ۵ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ/۲۲ دسمبر ۱۶۵۵ء) تھے، والد کی وفات کے بعد مسند مشیخت سید طیب نے سنبھالی اور سید فیروز درس وافادہ، خدمت خلق، فقرا ومساکین کی مدد اور مسافروں کی اعانت میں مشغول ہو گئے۔ نہایت سخی تھے اور بذل واعطا ان کا معمول تھا۔ جود وسخا کا یہ عالم تھا کہ ایسی چار سو جوان لڑکیوں کی شادی کی اور اپنی گرہ سے مناسب جہیز عطا کیا جن کے والدین غربت کی وجہ سے اس کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ تقریباً سو برس کی عمر پائی اور ہمیشہ لوگوں کی خدمت کو اپنا معمول بنائے رکھا۔ ۵ محرم ۱۰۶۶ھ/۲۴ اکتوبر ۱۶۵۵ء کو بلگرام میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔

لائق اور فاضل بھائی کی وفات سے میر سید طیب نہایت مغموم ہوئے، لیکن ان کی تدفین کے بعد چہرے پر انتہائی خوشی اور شگفتگی کے آثار ابھر آئے۔ لوگوں نے متعجب ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

برادر من با من وعدہ کرد کہ غم مخور بعد از شصت روز بہ من ملحق می شوی۔

(میرے بھائی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ غم نہ کرو، چھ دن کے بعد مجھ سے آملو گے۔)

چنانچہ ٹھیک چھ دن بعد میر سید طیب بھی اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو تشریف لے گئے ❷۔

---

❶ نزہۃ الخواطر- ج ۵، ص ۳۰۵ بحوالہ اسراریہ۔

❷ مآثر الکرام دفتر اول ص ۴۳، ۴۴- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۰۹-

ـــــ ق ـــــ

## ۸۵- مولانا قاسم حسینی بیانوی

مولانا قاسم بن ابوالقاسم حسینی بیانوی' شیخ' فاضل اور محدث تھے۔ حدیث وفقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ شیخ ابراہیم بن داؤد مانک پوری اکبرآبادی کے شاگرد تھے' تمام عمر اپنے استاد مکرم (شیخ ابراہیم) سے وابستہ رہے۔ شیخ ابراہیم کی وفات کے بعد ان کی جگہ درس وافادہ کی مسند پر متمکن ہوئے ❶۔

## ۸۶- شیخ قطب الدین دہلوی

شیخ قطب الدین بن عبدالعزیز بن حسن بن طاہر جون پوری دہلوی' قطب العالم کے لقب سے مشہور تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور تربیت کی منزلیں وہیں طے کیں۔ اخذ طریقت شیخ چاٹین سہوی سے کیا' جو ان کے والد شیخ عبدالعزیز کے شاگردوں میں سے تھے۔ بعد ازاں عازم مالوہ ہوئے اور شیخ منور بن عبدالمجید لاہوری سے علم حاصل کیا۔ تکمیل علم کے بعد دہلی کو مراجعت کی اور طویل عرصے تک درس وتدریس میں مصروف رہے۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ قطب الدین دہلوی فاضل کبیر تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ مدت مدید تک تشنگانِ علوم کی علمی تشنگی بجھانے میں مصروف رہے۔ ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء کو فوت ہوئے ❷۔

## ۸۷- مرزا قلیچ محمد اندجانی

مرزا قلیچ خاں' اصلاً اندجان کے باشندے تھے اور عہد اکبری کے ایک سر برآوردہ سردار تھے۔ اکبر کے بیٹے شہزادہ دانیال کی شادی مرزا قلیچ خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ قلیچ خاں امیر کبیر اور فاضل وعلامہ تھے۔ خیر وصلاح کے اوصاف سے متصف اور فضل وکمال کی نعمت سے بہرہ ور تھے۔ شہنشاہِ ہند جلال الدین اکبر اس امیر کی خوبیوں سے واقف ہوا تو اس نے ان کو ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں قلعہ سورت کا محافظ مقرر کر دیا۔ ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں گجرات کے عہدۂ امارت پر مامور کیا۔ ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء میں وزارت کا منصب جلیلہ عطا کیا۔ ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں علاقہ مالوہ کی امارت سے سرفراز کیا۔ ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں سنبھل کے نواح میں جاگیر عنایت کی اور لاہور میں اقامت گزیں ہونے کا حکم دیا اور فرمان جاری کیا کہ راجہ ٹوڈرمل وزیر خراج اور راجہ بھگونت داس کے ساتھ مل کر اس نواح کے اہم امور انجام دیے جائیں۔ پھر راجہ ٹوڈرمل کی وفات کے بعد مرزا قلیچ محمد کو

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۱۰ بحوالہ اخبار الاصفیا۔

❷ ایضاً' ص ۳۱۱ بحوالہ اسراریہ۔

وزارت خراج پر مامور کیا اور ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۴ء میں کابل کا والی مقرر کیا۔ لیکن تھوڑی مدت بعد اس عہدے سے معزول کر دیا۔ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۷ء میں اکبر نے انھیں اپنے بیٹے دانیال کا اتالیق بنا دیا۔ مگر دانیال چونکہ ان کا داماد تھا' اس لیے اس منصب سے جلد ہی الگ ہو گئے اور بادشاہ کی خدمت میں آ گئے۔ ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۹ء میں بادشاہ نے ان کو اکبر آباد (آگرہ) کا منصب حفاظت عطا کیا۔ ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۱ء کو پنجاب کی ولایت کے عہدے پر مامور کیا۔ اس کے ساتھ ہی کابل کی ولایت بھی عطا کی۔

اکبر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جہاں گیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے مرزا قلیچ خاں کو گجرات کے منصب تولیت سے نوازا۔ پھر ۱۰۱۶ھ/۱۶۰۷ء کو پنجاب کا والی مقرر کیا اور ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء میں کابل کی ولایت عطا کی۔ غرض قلیچ خاں ملک کے مختلف علاقوں کی صوبے داری پر متعین رہے اور اکبر کے آخری ایام میں کئی سال تک پنجاب کے عہدۂ گورنری پر فائز رہے۔ بڑے بہادر' جرات مند' متدین اور عالم دین امیر مملکت تھے۔ لاہور کی گورنری کے زمانے میں روزانہ مدرسے جاتے اور کئی گھنٹے طلبا کو تفسیر' حدیث اور فقہ کا درس دیتے۔ علوم شرعی کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ ان سے متاثر ہو کر لاہور کے بہت سے لوگوں نے حصولِ علم کو اپنا مقصد ٹھہرا لیا تھا اور وہ اپنے مقاصد کے حل کے لیے علوم میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے۔ قلیچ خاں کے تدین اور علوم شرعیہ میں انہماک کے بارے میں مآثر الامرا کے درج ذیل الفاظ لائق مطالعہ ہیں:

قلیچ خاں صلاح و تقویٰ بسیار داشت و در تسنن متعصب بود و ہمیشہ بدرس علوم و افادۂ طلب اشتغال می نمود۔ گویند در صوبہ داری لاہور یک پاس بدرس فقہ و تفسیر و حدیث در مدرسہ قیام می ورزید و بہ اقصیٰ غایت در ترویج علوم شرعیہ می کوشید۔ مردم آں جا بہ امید روشناسی و انجاح مطالب غلوے تمام بہ تحصیل علوم کردند ❶۔

(یعنی قلیچ خاں انتہائی صلاح و تقویٰ کے حامل اور اتباع سنت میں نہایت سخت تھے۔ ہمیشہ درس علوم اور افادہ طلبا میں مشغول رہتے۔ کہتے ہیں' لاہور کی گورنری کے زمانے میں تفسیر' حدیث اور فقہ کے درس میں کافی وقت صرف کرتے اور مدرسے جا کر اشاعت علوم شرعیہ کے لیے انتہائی کوشش اور سرگرمی کا اظہار فرماتے۔ لاہور کے لوگ بھی ان سے متاثر ہو کر اپنے حصول مقاصد کی غرض سے تحصیل علوم میں سرگرم ہوئے۔)

پرتگیز مشنری بھی اپنے انداز خاص میں قلیچ خاں کے اسلام کی زور دار الفاظ میں شہادت دیتے ہیں۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

پرتگیز مشنری بھی لکھتے ہیں کہ وہ بڑا پکا مسلمان تھا۔ پرتگیز مشنری اس کے ڈر سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ اس نے لاہور کے ہندوؤں کی شکایت پر جس گھر میں عیسائی پادری رہتے تھے' وہ ان سے خالی کرا لیا اور مشنریوں سے وہ تمام مراعات چھین لیں' جن کی اکبر نے سیاسی مصلحتوں یا مذہبی رواداری سے اجازت دے رکھی تھی ❷۔

❶ مآثر الامرا

❷ رود کوثر' ص ۲۰۵۔

حضرت مجدد الف ثانی بھی اس امیر کی پابندیٔ شرع کی تعریف کرتے ہیں اور لاہور میں قلیچ خاں نے ترویج دین اور اشاعت علوم کی جو کوششیں شروع کر رکھی تھیں' ان کا بہترین الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔ حضرت مجدد کا قلیچ خاں سے اگرچہ بالمشافہ تعارف نہیں تھا' لیکن وہ ان کی علمی و دینی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

ثانیاً اظہار محبت گزاری ایشاں می نماید کہ در بلدۂ معظمہ لاہور بہ وجود ایشاں بسیارے از احکام شرعیہ دریں طورِ زمانہ رواجے پیدا کردہ است' وتقویت دین وترویج ملت دراں بقعہ حاصل گشتہ است۔

(دوسری بات یہ ہے کہ ان سے اس بنا پر اظہار محبت کرنا چاہیے کہ لاہور کے عظیم شہر میں ان کے وجود سے احکام شرعیہ کی بہت ہی ترویج ہوئی اور اس خطے میں تقویت دین اور نشر و اشاعت اسلام کے مواقع پیدا ہوئے ہیں۔)

غرض قلیچ خاں دور اکبری کے نیک' صاحب تقویٰ اور عالم و فاضل امیر تھے۔ معقولات و منقولات پر عبور رکھتے تھے۔ تفسیر' حدیث اور فقہ کے ماہر تھے اور ان مضامین پر مشتمل کتابوں کا باقاعدہ مدرسے جا کر طلبا کو درس دیتے تھے۔ کتب درسیہ کئی مرتبہ باقاعدہ پڑھ چکے تھے اور علما و فضلا کی ایک بڑی جماعت ان سے مستفید ہو چکی تھی۔ ان کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔

امیر قلیچ خاں شاعر بھی تھے۔ ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

عاشق ہوس وصال در سردارد　　صوفی روقی و خرقہ در بردارد
من بندہ آں کسم کہ فارغ زہمہ　　دائم دلِ گرم و دیدۂ تردارد

امیر قلیچ خاں نے اسی (۸۰) سال سے زائد عمر پا کر ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء کو عہد جہاں گیر میں انتقال کیا ❶۔

## ۸۸- مولانا قیام الدین لاہوری

خطۂ لاہور علم و فضل کے اعتبار سے ہمیشہ زرخیز رہا ہے۔ گیارھویں صدی ہجری میں بھی اس میں بڑے بڑے علما و فضلا موجود تھے' جن میں مولانا قیام الدین بن نظام الدین لاہوری کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ ممدوح جلیل القدر عالم' فاضل وقت اور شیخ عصر تھے۔ فقہ' اصول فقہ اور علوم عربیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ طبقۂ علما میں بے حد قدر و منزلت کے حامل تھے۔ قوتِ حفظ اس درجہ تیز تھی کہ جو بات ایک مرتبہ پردۂ سماع سے ٹکرا جاتی' وہ کبھی ذہن سے نہ نکلتی۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں علوم مروّجہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے۔ ان کا مولد و مدفن لاہور ہے۔ ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء میں فوت ہوئے ❷۔

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: مآثر الامرا- بادشاہ نامہ- عمل صالح (شاہ جہان نامہ)- اذکار ابرار- نزہۃ الخواطر ج ۵- منتخب اللباب- رود کوثر-

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۱۴-

## ــــ ک ــــ

# ۸۹- شیخ کمال الدین بیجاپوری

شیخ کمال الدین بن فخر الدین بیجاپوری فاضل کبیر تھے اور اصول وکلام کے جید علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے شیخ ابن حجر مکی کی ''الصواعق المحرقہ'' کا ''البراہین القاطعہ'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ انھوں نے دلاور خاں وزیر کے حکم سے ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء میں کیا تھا۔ دلاور خاں' والیٔ بیجاپور سلطان ابراہیم عادل شاہ کا وزیر تھا❶۔

# ۹۰- قاضی کمال الدین کشمیری

قاضی کمال الدین بن موسیٰ کشمیری مولانا جمال الدین کشمیری کے بھائی اور برصغیر پاک و ہند کے فحول علما میں سے تھے۔ اپنے دور کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء میں کشمیر سے سیالکوٹ منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں تمام عمر درس وافادہ کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا' یہاں تک کہ فقہ' اصول فقہ' منطق وحکمت' علم کلام اور دیگر علوم وفنون میں ان کی مہارت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا۔ نہایت ذکی اور سریع الحفظ تھے' بہترین مدرس تھے' طلبائے علم ان کے انداز تدریس سے بہت متاثر تھے۔ ہر وقت مطالعہ کتب میں مستغرق رہتے اور بڑی محنت سے طلبا کو پڑھاتے۔ ان کے شاگردان کے اسلوبِ درس سے بہت مطمئن تھے۔ جن حضرات نے ان سے اخذ علم کیا، ان میں برصغیر پاک و ہند کے مشاہیر علما وفضلا شامل ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے ان کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علما نے ان سے استفادہ کیا۔

قاضی کمال الدین کشمیری نے ۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء کو لاہور میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے❷۔

# ۹۱- مفتی کمال محمد عباسی گجراتی

مفتی کمال محمد عباسی گجراتی کی ولادت ہندوستان کے صوبہ گجرات کے شہر احمد آباد میں ہوئی اور وہیں تربیت پائی۔ اس زمانے میں احمد آباد میں علامہ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء) کا سلسلۂ درس زوروں پر تھا اور نہ صرف علاقہ گجرات میں بلکہ پورے برصغیر میں ان کے علم وفضل کی شہرت تھی۔ کمال محمد عباسی نے ہوش سنبھالا تو ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور طویل مدت تک ان سے وابستہ رہے' تا آنکہ علوم و

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۱۶ بحوالہ محبوب الالباب۔

❷ تاریخ کشمیر اعظمی' ص ۱۱۹- تذکرہ علمائے ہند' ص ۱۷۳- حدائق الحنفیہ' ص ۴۰۱- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۱۶-

فنون کی تمام مروّجہ اصناف میں اپنے اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے اور فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے جید علما میں گردانے گئے۔ اپنے دور کے شیخ اور عالم کبیر ہوئے۔ علوم ظاہری سے فراغت کے بعد طریقت کی طرف متوجہ ہوئے۔ حدیث کی سند اس عہد کے مشہور عالم شیخ عبدالملک بنانی احمد آبادی (متوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۳ء) سے حاصل کی۔ ۹۸۲ھ/۱۵۷۴ء میں احمد آباد سے نکلے اور ارض مالوہ کے شہر اجین چلے گئے۔ وہیں سکونت اختیار کر لی، کالپی کے شیخ اولیا بن سراج الدین کی صاحب زادی سے نکاح کیا اور اجین کی مسند افتا پر فائز ہوئے۔ ساتھ ہی سلسلہ تدریس بھی شروع کر دیا۔ پورے تیس سال وہاں افتا و تدریس کی مسند پر فائز رہے۔

مفتی کمال محمد عباسی کا معمول تھا کہ جب رات کا تیسرا حصہ باقی رہ جاتا تو بیدار ہو جاتے۔ غسل کرتے، نماز تہجد پڑھتے اور قرآن مجید کے خاصے حصے کی تلاوت فرماتے۔ پھر ماثورہ اوراد و وظائف میں مصروف ہو جاتے اور بہ آواز بلند اللہ کا ذکر کرتے۔ نماز فجر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن شروع ہو جاتی جو نماز اشراق تک جاری رہتی۔ نماز اشراق کے بعد مسند درس پر بیٹھ جاتے۔ زوال آفتاب تک طلبا کو درس دیتے۔ پھر دوپہر کا کھانا کھاتے، کھانے میں طلبا کی جماعت بھی شریک ہوتی۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرتے۔ پھر ظہر کی نماز کے بعد مسند افتا آراستہ کرتے اور عصر تک فتاویٰ نویسی کا کام جاری رہتا۔ عصر کے بعد بھی فتووں کا سلسلہ چلتا۔ مغرب کی نماز کے بعد اپنے تلامذہ کی طرف متوجہ ہو جاتے اور عشا تک ان سے علمی گفتگو فرماتے۔ عشا کے بعد اپنے حجرے میں چلے جاتے اور ان کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے جو دوسرے دن طلبا کو پڑھانا ہوتیں۔ یہ کام رات کے ثلث اول تک جاری رہتا۔ پھر گھر تشریف لے جاتے۔ یہ ان کی شب و روز کی تقسیم اوقات تھی۔ یہ طریق عمل پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوا اور چون (۵۴) سال کی عمر تک جاری رہا۔

اس نامور عالم و فقیہ نے دوشنبہ کے روز ۱۰ شعبان ۱۰۱۳ھ/۲۲ دسمبر ۱۶۰۴ء کو رات کے وقت وفات پائی❶۔

ل

## ۹۲- علامہ لطف اللہ کوروی

علامہ لطف اللہ کوروی اپنے علاقے اور دور کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے فحول ہندی علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تمام مروّجہ علوم و فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بالخصوص فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں مہارت حاصل تھی۔ شیخ جمال اولیا چشتی کوروی کے شاگرد تھے۔ خود ان کا اپنا حلقہ تلامذہ بھی بڑا وسیع

❶ ابرار ص ۴۶۴، ۴۶۵۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۱۶، ۳۱۷۔

تھا۔ ان سے جن حضرات نے کسب علم کیا' ان میں شیخ احمد بن ابوسعید امیٹھوی (یعنی مشہور عالم و مفسر ملاجیون) قاضی علم اللہ کچندوی اور شیخ علی اصغر قنوجی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ کی علمی' تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں سے اس برصغیر میں علم و فضل کو بڑی ترقی ہوئی اور مختلف اصناف علم کی نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع معرضِ عمل میں آئے ❶۔

—— م ——

## ۹۳۔ مفتی مبارک جون پوری

مفتی مبارک بن ابوالبقا بن محمد درویشی حسینی جون پوری کی جائے ولادت جون پور ہے۔ تربیت بھی جون پور میں پائی۔ شیخ ابوالبقا کے یہ سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ اپنے والد شیخ ابوالبقا جون پوری کے تلمیذ شیخ علی محمد سے حصول علم کا آغاز کیا اور ان سے علوم عربیہ کی تحصیل کی۔ پھر عازم الہ آباد ہوئے اور وہاں کے علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دہلی گئے اور ملوک و امرا سے تقرب پیدا کیا۔ اپنے شہر کے منصب افتا پر متمکن ہوئے۔ اس عہد کے شیخ و عالم اور فقیہ تھے۔ جون پور میں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے چشمۂ فیض سے بہت سے علما نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔

اس عالم دین نے ۲۰ رمضان ۱۰۹۸ھ/ ۲۰ رجولائی ۱۶۸۷ء کو سفر آخرت اختیار کیا ❷۔

## ۹۴۔ شیخ مبارک ناگوری

شیخ مبارک بن خضر ناگوری' ارض ہند کے جید عالم اور مشہور فاضل تھے۔ ان کے اجداد میں سے پانچویں پشت میں ایک بزرگ شیخ موسیٰ تھے جو دیار یمن سے نکلے اور دنیا کے مختلف مقامات کی سیاحت پر روانہ ہوئے۔ اثنائے سیاحت میں بڑے بڑے عجائب کا مشاہدہ کیا اور اسی عالم غربت میں نویں صدی ہجری میں اعمالِ سیوستان کے ایک قصبے ''ریل'' میں آئے۔ وہاں توطن اختیار کیا اور متاہل زندگی اختیار کرنے لگے۔ شیخ مبارک کے والد شیخ خضر نے دسویں صدی ہجری کے آغاز میں سیاحت ہند شروع کی اور شہر ناگور کو جو ہندوستان کے مشہور شہر اجمیر کے شمال مغرب میں واقع ہے' اپنا مسکن ٹھہرایا۔

شیخ مبارک کی ولادت ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء کو ناگور میں ہوئی۔ شعور کی منزل میں داخل ہوئے تو گجرات کے شہر احمد آباد کا قصد کیا۔ احمد آباد اس عہد میں علم و فضل کا مرکز تھا اور متعدد علمائے مشاہیر کی تدریسی سرگرمیاں

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۱۹۔

❷ تاریخ شیراز ہند' جون پور' ص ۲۸۷'۲۹۷۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۱۹' ۳۲۰۔

وہاں جاری تھیں، جن میں خطیب ابوالفضل گاذرونی اور مولانا عماد الدین محمد طارمی لائق تذکرہ ہیں۔ ان سے تحصیل علم میں مشغول ہو گئے اور بحث و اشتغال علمی میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ علوم و فنون کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوئے اور فتویٰ و تدریس کی صلاحیت سے بہرۂ وافر پایا۔

شیخ مبارک ناگوری بے حد ذکی اور ذہین تھے۔ صغر سنی ہی میں علمی مجلسوں اور تحقیقی محفلوں میں شریک ہونے لگے تھے۔ مباحثہ و مجادلہ میں تیز اور مناظرے میں حاضر جواب تھے۔ ان کے اسلوب بحث اور انداز گفتگو سے کبار علما اور اعیان ملک حیران ہوتے تھے۔ ۹۵۰ھ/۱۵۴۳ء کو اکبر آباد (آگرہ) گئے اور درس و افادہ کی مسند پر فائز ہوئے۔ کم و بیش پچاس سال سرگرم تدریس رہے۔ علم و عمل، تحقیق و کاوش، زہد و ورع، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ ان کی مجلس موعظت و تذکیر اور حلقہ تدریس و تعلیم کے وقار کا یہ عالم تھا اور وہ اس درجہ رعب و دبدبہ کے مالک تھے کہ امرائے مملکت میں سے کسی کو اس میں سرخ یا ریشمی لباس پہن کر آنے کی جرات نہ ہوتی۔ نہ کوئی ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہن کر ان کے سامنے آ سکتا، نہ کسی کو ان کی موجودگی میں تہہ بند ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کی ہمت تھی اور نہ کسی قسم کی غیر شرعی حرکت کا مرتکب ہو سکتا تھا۔ اس زمانے میں وہ سماع کے بھی شدید مخالف تھے۔ اگر راہ چلتے بھی غنا کی آواز کانوں میں پڑ جاتی تو راستہ بدل لیتے اور ہر طریقے سے اس خلاف شرع حرکت سے دامن بچانے کی کوشش کرتے۔ مگر آخر میں غنا و سماع کی طرف راغب ہو گئے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ غنا و مزامیر کے سوا چین نہ آتا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ کے مختلف مقامات پر ان کی بہت سی قلبی اور عملی کیفیات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان پر کئی قسم کے دور آئے اور وہ متعدد حالتوں سے دوچار ہوئے۔ وہ ایک زمانے میں مہدویت سے بھی متاثر ہوئے اور مدتِ مدید تک شیخ علائی سے وابستہ رہے۔ مغل حکمران جلال الدین اکبر کے عہد حکومت کے ابتدائی دور میں طریقہ نقشبندیہ پھیلا تو اس سے ہم آہنگ ہو گئے اور مشائخ ہمدان کی طرف انتساب شروع کر لیا، اور جب دیکھا کہ امورِ مملکت میں ایرانیوں کا اثر و رسوخ بڑھ گیا ہے اور حکومت کے اہم اور کلیدی محکمے ان کے قبضے میں آ گئے ہیں تو ان کی طرف ملتفت ہو گئے۔ غرض بعد میں ان کے رجحانات میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی اور ان کے قلب و ذہن کی حالت میں بہت تغیر رونما ہو گیا تھا، جو قطعی ناپسندیدہ اور غیر شرعی تھا۔

شیخ مبارک ناگوری کی زندگی کا ابتدائی دور بلاشبہ ایک مبلغ شریعت، ناہی عن المنکر و امر بالمعروف کا دور تھا، لیکن بعد میں ان کی زندگی کے لیل و نہار بالکل بدل گئے تھے۔ جلال الدین اکبر کو الحاد کی راہوں پر لگانے اور علمائے دربار کی مخالفت پر آمادہ کرنے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اکبر نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی اور اس کی ابتدائی زندگی ایک اچھے مسلمان کی زندگی تھی، لیکن بعد میں جو حالات پیدا ہوئے اور بادشاہ نے جو غلط اور سراسر غیر اسلامی اقدامات کیے، ان کے جواز کے لیے شیخ مبارک اور ان کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی نے راہ ہموار کرنے میں زبردست کردار ادا کیا۔ ان واقعات و حوادث کے چشم دید گواہ ملا عبدالقادر بدایونی نے اس کی

تمام تفصیلات بیان کر دی ہیں اور اس عہد کے علما و مشائخ کی زندگیوں کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

''منتخب التواریخ ایک ایسا مرقع ہے، جس میں اس عہد کے تمام ارباب عمائم و اصحاب خرقہ وسجادہ کی تصویریں اپنے اصلی بھیس میں نظر آ جاتی ہیں، اور دیکھ کر عبرت ہوتی ہے کہ بڑے بڑے مدعیان علم و زہد کو بھی دنیا پرستی نے چین سے بیٹھنے نہ دیا اور راہِ حق پرستی میں استقامت نصیب نہ ہوئی ❶۔''

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی صدر الصدور بھی اگرچہ مبرا عن الخطانہ تھے، لیکن ان کے خلاف اکبر کو برانگیختہ کرنے کی ذمہ داری سے ملا مبارک اور ان کے بیٹے بری نہیں ہو سکتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور صدر الصدور شیخ عبدالنبی پر شدید تنقید کرتے ہیں، رقم طراز ہیں:

''ایک عرصے کے بعد جب حالات بدلے اور ملا مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو انھوں نے ان لوگوں کے زور کو توڑنا چاہا اور اس کی تدبیر یہ نظر آئی کہ مذہبی تعصب کی شدت کو کسی طرح کم کیا جائے۔ چنانچہ حکمت وتحقیقِ جدید کے نام سے آزاد خیالی و مطلق العنانی کی ہوائیں چلنے لگیں ❷۔''

بادشاہ کو ''خلیفتہ الزمان'' قرار دینے کا محضر بھی ملا مبارک اور ان کے بیٹوں نے تیار کیا۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

''خاندان ملا مبارک (یعنی ابوالفضل و فیضی) نے مولویوں کا زور توڑنے کے لیے ایک تدبیر یہ کی کہ ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء میں اپنے والد ملا مبارک سے ایک محضر تیار کرایا۔ مضمون یہ تھا کہ بادشاہ خلیفتہ الزمان اور امام عہد واجب الاطاعت ہے، اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ مسائل مختلف فیہا میں حسبِ ضرورتِ وقت اجتہاد کرے، اور اس کا اجتہاد واجب العمل ہے ❸۔''

اس محضر پر علمائے دربار میں سے کسی نے طوعاً اور کسی نے کرہاً اپنی اپنی مہریں ثبت کر دیں۔ عبدالقادر بدایونی علما کی اس جماعت میں شیخ مبارک کو بہت بڑا عالم قرار دیتے ہیں۔ اور ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء کے وقائع میں لکھتے ہیں۔ ''شیخ مبارک کہ اعلم علماء زمان بود ❹۔

محضر تیار کرنے کا پس منظر یہ ہے کہ جن دنوں صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی نے متھرا کے ایک برہمن کو مسجد کے بجائے شوالہ تعمیر کرنے اور رسول اللہ ﷺ پر سب وشتم کرنے کے جرم میں قتل کیا تھا، انہی دنوں شیخ مبارک کسی وجہ سے بادشاہ کی خدمت میں آئے۔ بادشاہ نے ان سے بعض ان مسائل کے بارے میں گفتگو

❶ تذکرہ، ص ۴۰۔

❷ تذکرہ، ص ۴۴۔

❸ ایضاً۔

❹ منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۲۷۰۔

کی جو اکثر پیش آتے رہتے تھے اور علما کا ذکر بھی کیا۔ شیخ مبارک کے' جو پہلے سے صدر الصدور شیخ عبدالنبی سے کدورت رکھتے تھے اور ذہنی طور پر ان سے بہت دور تھے' موقع ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے علما کی مخالفت کی اور کہا کہ بادشاہ عادل خود مجتہد ہے۔ اختلافی مسئلے میں حالات کے مطابق حضور جو مناسب سمجھیں اور قرین مصلحت جانیں' حکم جاری فرما سکتے ہیں۔ علمائے دین کا رویہ صحیح نہیں ہے۔ کسی مسئلے میں ان سے رائے لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بادشاہ نے اتنے بڑے عالم کے منہ سے یہ بات سنی تو بہت خوش ہوا' اور کہا:

ہرگاہ شما استاد ما باشید' وسبق پیش شما خوانده باشیم۔ چرا ما را از منت ایں ملایاں خاص نمی سازید۔

(یعنی آپ ہمارے استاد بن جایئے' ہم آپ سے سبق پڑھیں گے۔ کسی طرح ہمیں ان ملانوں سے نجات دلایئے۔)

دیر تک اکبر اور شیخ مبارک کے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر یہ تجویز ٹھہری کہ آیات و احادیث کی روشنی میں ایک تحریر لکھی جائے' جس کا مفاد یہ ہو کہ امام عادل اختلافی مسئلے میں اپنی رائے سے' مصلحت وقت اور تقاضائے حالات کے مطابق جو چاہے کر سکتا ہے۔ علما و مجتہدین کی رائے پر اس کی رائے کو بہر حال ترجیح حاصل ہوگی۔ چنانچہ اس کا مسودہ خود شیخ مبارک نے تیار کیا۔ مسودہ تیار ہو چکا تو دربار کے تمام علما' اصحاب فتویٰ اور قضاۃ کو بلایا گیا اور انھیں مسودہ پڑھ کر سنایا گیا۔ کوئی اس کا مخالف تھا اور کوئی موافق' لیکن طوعاً و کرہاً سب نے اس پر مہریں ثبت کر دیں۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اس کے مخالف تھے' مجبوراً انھیں بھی اس کی تصویب کرنا پڑی۔ اس صورت حال سے شیخ مبارک بے حد خوش تھے اور وہی صدر محفل تھے۔ ان کے حریف علما بے بس تھے اور عوام الناس کی صف میں ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اس محضر کی عبارت بعینہ یہ ہے:

مقصود از تشیید ایں مبانی وتمہید ایں معانی آں کہ چوں ہندوستان صنت عن الحدثان' بمیامن معدلت سلطانی و تربیت جہاں بانی' مرکز امن و امان و دائرۂ عدل و احسان شدہ' طوائف انام از خواص و عوام خصوصاً علمائے عرفان شعار وفضلائے دقائق آثار کہ ہادیان بادیہ نجات وسالکان مسالک اولوا العلم درجات اند' از عرب وعجم رو بدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودند۔ جمہور علمائے فحول کہ جامع فروع واصول وحادی معقول ومنقول اند' و بہ دین ودیانت وصیانت اتصاف دارند' بعد از تدبیر وافی وتامل کافی در غوامض معانی آیہ کریمہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الا مرمنکم و احادیت صحیح' ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل۔ من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی' و غیر ذلک من الشواھد العقلیۃ و دلائل النقلیۃ' قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبۂ سلطان عادل عنداللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است' وحضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابداً' اعدل واعلم واعقل باللہ اند۔ بنا بریں اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بہ ذہنِ صائب وفکرِ ثاقب خود یک جانب را از اختلافات' بجہت تسہیل معیشت بنی آدم و

مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بہ آں جانب حکم فرمایند، متفق علیہ می شود واتباع آں برعموم برایا وکافۂ رعایا لازم ومتحتم است۔ وایضاً اگر بہ موجب رائے صواب نمائے خود حکمے راازاحکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد وسبب ترفیہ عالمیاں بودہ باشد، عمل برآں نمودن برہمہ کس لازم ومتحتم است ومخالفت آں موجب سخط اخروی وخسران دینی ودینوی است۔ وایں مسطور صدقِ وفور حسبۃ للّٰہ واظہاراً لاجرائے حقوق الاسلام بہ محضر علمائے دین و فقہائے مہدیین تحریر یافت۔ وکان ذالک فی شہر رجب ۹۸۷ھ/ستمبر ۱۵۷۹ء سبع وثمانین وتسع مائتہ۔

(''یعنی اس تمہید وتشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ ملک ہندوستان آفات سے محفوظ رہے، سلطان جہاں پناہ کے عدل وانصاف اور تدبیر وانتظام سے دارالامن بن چکا ہے، اور ہر جگہ خواص وعوام بالخصوص عرب وعجم کے علما و فضلا یہاں آکر مقیم ہو چکے ہیں۔ بنا بریں تمام علمانے بڑے غور وفکر کے بعد اس آیۂ کریمہ: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں کہ ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل۔ من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعصی الا میر فقد عصانی۔ وغیرہ عقلی ونقلی دلائل وشواہد کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ سلطان عادل کا مرتبہ اللہ کے نزدیک مجتہد کے مرتبے سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا حضرت سلطان الاسلام امیر المومنین ظل اللہ ابوالفتح جلال الدین اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، عوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر، اگر دین کے ان مسائل میں جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہوں، کسی بھی ایک صورت کو تجویز کر کے اس کے مطابق احکام جاری فرمائیں تو ان کی تجویز وحکم کو متفق علیہ تصور کیا جائے گا اور اس کی اطاعت وپیروی تمام رعایا پر لازمی اور قطعی ہوگی۔ نیز سلطان عالم پناہ کوئی بھی ایسا قانون اور حکم نافذ فرمائیں جو عوام کے لیے باعث سہولت ہو اور نصِ شرع کے مغائر نہ ہو، اس پر عمل درآمد ہر شخص پر ضروری اور قطعی ہوگا، اور اس کی مخالفت عذاب اخروی اور خسران دینی ودینوی کا باعث ہوگی۔ یہ سطور حقوق اسلام کے اجرا کی غرض سے حسبتہً للّٰہ علمائے دین اور فقہائے مہدیین کے محضر سے ماہ رجب ۹۸۷ھ/ستمبر ۱۵۷۹ء کو ضبط تحریر میں لائی گئیں۔'')

شیخ مبارک ناگوری نے بلاشبہ اکبر کو خلاف شرع راستے پر لگایا اور غلط امور میں اس کی رہنمائی کی۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے دور کے بہت بڑے عالم تھے، فقہ واصول میں مہارت رکھتے تھے۔ علوم عربیہ کے دقائق وغوامض کی گرہ کشائی میں انھیں عبور حاصل تھا۔ تصوف کے رموز سے آگاہ تھے، فن شعری میں یکتا تھے، قرآن مجید کی دس قرائتوں کے عالم تھے اور شاطبی کا درس دیتے تھے۔ کثیر المطالعہ تھے اور ہر آن درس وافادہ میں مصروف رہتے تھے۔ حافظہ نہایت تیز تھا اور قوت ادراک میں لاثانی تھے۔ جو چیز ایک مرتبہ حافظے کی گرفت میں آجاتی وہ نکلنے نہ پاتی۔ آخر عمر میں جب بصارت ضائع ہوگئی اور مطالعہ کتب سے معذور ہوگئے تو تفسیر قرآن لکھنا شروع کی، جو چار ضخیم مجلدات میں ختم ہوئی، اس کا نام ''منبع نفائس العیون۔'' [1] رکھا۔ زندگی کے

[1] مآثر الکرام میں میر سید غلام علی آزاد نے اس تفسیر کا نام ''منبع عیون المعانی'' لکھا ہے لیکن اس تفسیر کا پورا نام ''منبع العیون المعانی ومطلع شموس الثانی'' ہے۔

آخری ایام میں ابن الفارض کا تائیہ، بصیری کا قصیدہ بردہ، قصیدہ کعب بن زہیر اور دیگر قصائد پڑھتے رہتے تھے، جو انھیں زبانی یاد تھے۔

شیخ مبارک ناگوری نے ۱۷ ذی القعدہ ۱۰۰۱ھ/ ۵ راگست ۱۵۹۳ء کو وفات پائی ❶۔

## ۹۵- مولانا محبّ علی سندھی برہان پوری

مولانا محبّ علی بن صدر الدین محمد بن علی بیگ ٹھٹھوی سندھی، ایک فقیہ اور شاعر بزرگ تھے۔ اصلاً کوہستان برکہ کے ایک قبیلے کے فرد تھے جو چغتائی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کے جدامجد علی بیگ بابر کے ساتھ وارد ہند ہوئے اور مرتبۂ شہادت پایا۔ ان کے والد صدر الدین محمد مغل حکمران ہمایوں کے ساتھ بلاد سندھ میں گئے اور ٹھٹھہ میں فروکش ہوئے۔ وہیں محبّ علی کی ولادت ہوئی۔ ابھی کم عمر تھے کہ والد وفات پا گئے اور محبّ علی نے حصول علم کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا۔ اس سلسلے میں بے حد محنت اور کوشش کا ثبوت بہم پہنچایا اور اکثر علوم متداولہ اور فنون مروّجہ میں درجہ کمال کو پہنچے۔ جب عبدالرحیم خان خاناں نے سندھ فتح کیا اور اس کی ملاقات اس عالم دین سے ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل اور فکر و تدبر سے بہت متاثر ہوا، اور اپنے ساتھ دارالحکومت آگرہ لے گیا۔ عرصے تک اس عالم اور علم دوست امیر کی مصاحبت و ملازمت میں رہے۔ پھر برہان پور کی راہ لی۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی۔ مدت تک برہان پور میں اقامت اختیار کیے رکھی۔ برہان پور سے حج بیت اللہ کے ارادے سے روانہ ہوئے لیکن سورت پہنچے تو وہاں شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری (متوفی ۲ رمضان المبارک ۱۰۲۹ھ/ ۲۲ رجولائی ۱۶۲۰ء) سے ملاقات ہوئی۔ وہیں ٹھہر گئے اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ بعد ازاں حرمین شریفین کا عزم فرمایا اور سعادتِ حج و زیارت سے بہرہ ور ہوئے۔ وہاں سے واپس مراجعت کی تو برہان پور کو مسکن بنایا۔

مغل بادشاہ شاہ جہان اس عالم و فقیہ کو اپنے ساتھ دارالحکومت آگرہ لے گیا تھا۔ تمام عمر اس کے پاس رہے۔ شیخ و فقیہ، عالم دین اور بہترین شاعر تھے۔ ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۱ء کے قریب فوت ہوئے ❷۔

❶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اکبر نامہ۔ منتخب التواریخ کے مختلف مقامات۔ مآثر الکرام ج ۱، ص ۱۸۳، ۱۸۴۔ بوستان اخبار ص ۱۴۷ تا ۱۵۳۔ دربار اکبری، ص ۳۲۸ تا ۳۵۸۔ حدائق الحنفیہ ص ۱۹۴۔ بزم تیموریہ، ص ۸۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۲۰، ۳۲۱۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۷۴۔

❷ عمل صالح، ج ۳، ص ۳۸۱، ۳۸۳۔ بادشاہ نامہ، ج ۳، ص ۳۳۵، ۳۳۶۔ مآثر رحیمی، ج ۳، حصہ اول، ص ۴۸۹ تا ۵۱۶۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۲۲۔ تحفۃ الکرام ص ۵۹۵۔ برہان پور کے سندھی اولیا، ص ۲۲۸ تا ۲۵۹۔

## ۹۶-علامہ حکیم محمد مصری برہان پوری

علامہ محمد مصری برہان پوری' شیخ وقت' عالم کبیر اور طبیب تھے۔ متعدد فنون کے ماہر تھے۔ بالخصوص فن طب کی علمی اور عملی جزئیات میں عبور رکھتے تھے۔ فقہ اور اصول فقہ سے باخبر تھے۔ بہترین اوصاف کے مالک' عذوبت لسان کی صفت سے متصف' حاضر جواب' ظریف الطبع اور نرم گفتار۔ فارسی کے عمدہ مزاحیہ شاعر۔ بعض امراض کا اس انداز سے علاج کرتے کہ عقل حیران رہ جاتی۔

محمد بن عمر آصفی کا کہنا ہے کہ ان کا نام حکیم بیبرس مصری تھا۔ غالباً بلاد مصر سے ہندوستان آئے اور احمد نگر میں داخل ہوئے اور فن طب کے ماہر کی حیثیت سے ملوک و سلاطین کا تقرب حاصل کیا۔ عرصے تک مرتضٰی نظام شاہ کے شاہی طبیب کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں چنگیز خاں وزیر کو زہر کھلا کر مار دیا گیا تو مرتضٰی نظام شاہ نے ان کو اپنا وزیر بنالیا' لیکن یہ منصب بہت کم مدت کے لیے ان کے پاس رہا۔ کچھ دنوں بعد وزارت سے معزول کر دیے گئے۔ پھر ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں جب مرتضٰی نظام شاہ قتل ہو گیا تو احمد نگر سے احمد آباد چلے گئے۔ احمد آباد میں خان اعظم عزیز کوکہ نے ان کو خوش آمدید کہا اور بڑے احترام سے پیش آیا۔ اس نے ان کو جلال الدین اکبر کے دربار میں اکبر آباد۔ (آگرہ) بھیج دیا۔

شیخ فیضی کا علاج انہی نے کیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ خود کہا کرتے کہ موت کے سامنے سب عاجز و بے بس ہیں۔ اگر طب سے عمر میں اضافہ ہو سکتا تو کوئی طبیب اس دنیا سے رخصت نہ ہوتا۔ کہتے ہیں ۱۰۰۸ھ/۱۶۰۰ء کو برہان پور میں انھیں زہر کھلا کر مار دیا گیا تھا[1]۔

## ۹۷- شیخ محمد بیجاپوری

شیخ محمد بن ابوالمعالی بن علم اللہ صالحی امیٹھوی' قاضی اعزالدین بیجاپوری کے نام سے معروف تھے۔ شیخ اور عالم و فقیہ تھے اور نامور فقہا و اصولیین میں گردانے جاتے تھے۔ سلطان محمد عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور کے منصب قضا پر متعین ہوئے اور تمام عمر اس منصب پر فائز رہے[2]۔

## ۹۸-سید محمد عاملی

سید محمد بن احمد بن محمد عاملی' مسلکا شیعہ تھے۔ فاضل و عالم اور فقیہ تھے۔ شیخ بہاء الدین عاملی کے معاصرین میں سے تھے۔ کشمیر چلے گئے تھے اور وہیں توطن اختیار کر لیا تھا۔ کشمیر ہی میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے[3]۔

---

1. منتخب التواریخ' ص ۱۶۵- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۲۹' ۳۳۰-
2. نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۳۰ بحوالہ روضۃ الاولیا-
3. نجوم السماء' ص ۴۰- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۲۳۱

# ۹۹- شیخ محمد غوثی مانڈوی

شیخ محمد بن حسن بن موسیٰ غوثی گجراتی مانڈوی کی تاریخ ولادت ۱۱ رجب ۹۶۲ھ/ یکم جون ۱۵۵۵ء ہے۔ جائے ولادت مانڈو ہے۔ قرآن مجید شیخ کمال الدین قرشی سے پڑھا۔ پھر فارسی کے کچھ رسائل و کتب کی تعلیم حاصل کی۔ گیارہ سال کے تھے کہ والد وفات پا گئے۔ سترہ سال کو پہنچے تو والدہ نے شادی کر دی، لیکن حصول علم کا شغل جاری رکھا اور شادی اس راہِ صواب میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ علم نحو اور علوم عربیہ کی تحصیل شیخ برہان الدین کالپوی سے کی۔ بعد ازاں کشف المنار اور اصول فقہ کی مشہور کتاب تلویح کا درس سید شاہ محمد سے لیا۔ پھر عازم آگرہ ہوئے، اور پانچ سال وہاں مقیم رہے۔ ۹۹۰ھ/ ۱۵۸۲ء میں سفر گجرات پر روانہ ہوئے۔ وہاں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کا غلغلۂ درس بلند تھا، اس میں داخل ہو گئے اور اکثر کتب درسیہ کی تکمیل فرمائی۔ برہان پور میں حکیم عثمان بن عیسیٰ سندھی سے فنون ریاضی پڑھے۔ ۹۹۴ھ/ ۱۵۸۶ء میں مانڈو واپس آ گئے۔

شیخ محمد غوثی گیارھویں صدی ہجری کے عالم دین اور مستقیم الحال صوفی تھے۔ شیخ صدر الدین محمد بروودی سے مستفیض تھے اور ان کے خلیفہ شیخ محمود بن جلال گجراتی سے منسلک۔ تذکرۂ رجال کی مشہور کتاب "گلزار ابرار" کے مصنف تھے۔ یہ کتاب ۶۱۲ علما و مشائخ کا مستند تذکرہ ہے۔ جن حضرات کے اس میں حالات درج ہیں، ان میں کچھ بزرگوں سے شیخ محمد غوثی خود ملے ہیں۔ یہ تذکرہ جہانگیر بادشاہ کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کا نقش اول ۹۹۸ھ/ ۱۵۹۰ء میں تیار ہوا۔ پھر ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۲ء تک اس میں اصلاح و اضافہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کا زیادہ تر حصہ ۱۰۲۰ھ اور ۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۱ء اور ۱۶۱۳ء کے درمیان معرض کتابت میں لایا گیا۔ یعنی ۹۹۸ھ سے (۱۰۲۰ھ) (۱۵۹۰ء سے ۱۶۱۱ء) تک مصنف اس کی تکمیل و تصحیح اور اضافہ و اصلاح میں مصروف رہے۔

گلزار ابرار فارسی زبان میں ہے۔ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے لینڈ سینا، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن اور برٹش میوزم میں موجود ہیں۔ اجین (ہندوستان) کے ایک صاحب علم منشی اللہ یار خاں کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ کراچی کے سید سخاوت علی خسرو کا ذاتی کتب خانہ بھی اس کے ایک قلمی نسخے سے مزین ہے۔

۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) میں ایک ہندی عالم جناب فضل احمد نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا، جو اسی سال مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا تھا۔ اصل فارسی کتاب چوں کہ دست یاب نہیں ہے، لہٰذا جو لوگ برصغیر کے فقہا و علما اور مشائخ و اولیا کے حالات کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں، ان میں زیادہ تر یہ ترجمہ ہی متداول ہے اور وہ اپنی تصنیفات میں اسی کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ ترجمہ "اذکار ابرار" (۱۳۲۶ھ) کے تاریخی نام سے موسوم ہے۔ یہی ترجمہ ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء میں اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

شیخ محمد بن حسن غوثی مانڈوی نے چھ سو سے زائد علما و مشائخ کے حالات تحریر کیے' لیکن افسوس ہے' خود ان کی زندگی کے کوائف بہت ہی کم میسر ہیں ❶۔

## ۱۰۰- قاضی محمد نصیر آبادی

قاضی محمد بن عبدالعزیز بن فتح بن محمد بن محمود حسنی نصیر آبادی۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ قاضی پیر علی کے نام سے معروف تھے۔ شیخ' فقیہ اور عالم تھے۔ اپنے دور کے کبار فقہا میں سے تھے۔ اپنے والد قاضی عبدالعزیز سے' جو بہت بڑے عالم اور نصیر آباد کے منصب قضا پر متعین تھے' علم فقہ حاصل کیا___ پھر مزید حصول علم کی غرض سے مختلف بلاد و امصار میں گئے اور علمائے اعلام کی ایک بڑی جماعت سے مستفید ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد اپنے والد مرحوم کی جگہ نصیر آباد کی مسند قضا سنبھالی اور تمام عمر اس پر متمکن رہے ❷۔

## ۱۰۱- شیخ محمد سندھی

شیخ محمد بن عبداللہ سندھی کا مولد برہان پور ہے' پرورش بھی وہیں ہوئی۔ منطق و حکمت کی کتابیں حکیم عثمان بوبکانی سے پڑھیں۔ فقہ و اصول کا علم شیخ طاہر بن یوسف سندھی (متوفی ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۶ء) سے حاصل کیا۔ نقد النصوص' شرح منازل السائرین اور شرح گلشن راز کی تحصیل شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی سے کی۔ شرح المواقف کا کچھ حصہ بھی انہی سے پڑھا۔ اخذ طریقت شیخ لشکر محمد عارف سے کیا۔ یہاں تک کہ علم و معرفت' تدین و صالحیت' فقہ و اصول اور علوم مروّجہ میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ طویل مدت تک برہان پور میں مقیم رہے اور وہاں درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔

جلال الدین اکبر بادشاہ نے ناراض ہو کر ایک مرتبہ ان کو جیل میں بھی ڈال دیا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب اکبر نے علاقہ خاندیس پر فوج کشی کی تو وہاں کا فاروقی بادشاہ اپنے امرائے سلطنت اور عمائد مملکت کے ساتھ برہان پور کے قلعہ اسیر میں جا بیٹھا۔ بادشاہ اور ارکان حکومت کا خیال تھا کہ اکبر اس قلعے کو مسخر نہیں کر سکتا' لیکن اکبر بھی ارادے کا مضبوط تھا۔ اس نے بہت بڑی فوج جمع کر دی اور نواح خاندیس میں پھیلا دی۔ گیارہ مہینے اکبر اپنی کثیر فوج کے ساتھ وہاں خیمہ زن رہا اور باوجود انتہائی کوشش کے قلعے پر قبضہ نہ کر سکا۔ اکبر کے دل میں یہ بات جم گئی کہ برہان پور کے صوفیا اور مشائخ اپنے بادشاہ کی رد بلا کے لیے وظیفے پڑھتے اور دعائیں مانگتے ہیں' اسی لیے برہان پور کی چھوٹی سی حکومت کو اس کی اتنی بڑی فوج شکست نہیں دے سکی اور سب

---

❶ ان کے مختصر حالات کے لیے دیکھیے: اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار)' ص ۶۱۱ تا ۶۲۴- مقدمہ ''اذکار ابرار'' مطبوعہ اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۳۹-

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۴۱-

لوگ اطمینان کے ساتھ اپنے شہر میں بیٹھے ہیں۔ چنانچہ اس نے وہاں کے بزرگوں کو نشانہ بنایا اور اکثر کو گرفتار کر کے قید و بند میں ڈال دیا۔ جو بزرگان دین زیادہ اثر و رسوخ کے مالک تھے اور ان کو گرفتار کرنے میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا' انھیں کسی اور طریقے سے مبتلائے اذیت کیا۔ یہ ایک عظیم آزمائش اور فتنے کا دور تھا۔ شیخ عثمان بوبکانی پہلے ہی ابتلا کے ڈر سے برہان پور چھوڑ چکے تھے۔ بعض دیگر مشائخ بھی احمد آباد اور سورت چلے گئے تھے۔ لیکن شیخ محمد سندھی وہاں موجود تھے۔ اکبر انھیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ آگرہ لے گیا اور شاہ برہان پور کی خیر خواہی کا الزام عائد کر کے حوالہ زنداں کر دیا۔ عرصے تک وہ جیل میں رہے۔ پھر بعض لوگوں کی سفارش سے انھیں رہا تو کر دیا گیا مگر برہان پور جانے کی اجازت نہ دی اور اپنے ایک امیر قلیچ خاں کے حوالے کر دیا۔ قلیچ خاں بڑا عالم و فقیہ اور نیک امیر تھا۔ علما کا بے حد قدر دان تھا' وہ شیخ محمد سندھی کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے بہت متاثر ہوا۔ ہر وقت انھیں اپنے ساتھ رکھتا۔ اس اثنا میں وہ لاہور کی مہم پر روانہ ہوا تو شیخ کو بھی ساتھ لے گیا۔ کئی سال اسی طرح کے حالات رہے۔ شیخ محمد سندھی قلیچ خاں کی کمان میں کفار سے جنگ کر رہے تھے کہ غرہ جمادی الاخری ۱۰۱۳ھ/ اکتوبر ۱۶۰۴ء کو راجپوتوں کی لڑائی میں شہید ہو گئے [1]۔

## ۱۰۲- سید محمد جالندھری کالپوی

سید محمد جالندھری کالپوی کا سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن ابوسعید بن بہاء الدین بن عماد الدین بن اللہ بخش بن سیف الدین بن مجد الدین بن شمس الدین بن شہاب الدین بن عمر بن حامد بن احمد زاہد حسینی سدانوی کالپوی۔ عالم کبیر تھے' ان کا شمار علمائے ربانیین میں ہوتا تھا۔ اصلاً ترمذ کے صحیح النسب سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اجداد کرام میں سے کوئی بزرگ پنجاب کے شہر جالندھر میں آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ بعد ازاں سید محمد کے والد سید ابوسعید روزگار کے سلسلے میں جالندھر کی سکونت ترک کر کے کالپی چلے گئے تھے۔

سید محمد ۱۰۰۶ھ/ ۱۵۹۸ء کو شہر کالپی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ابوسعید' بیٹے کی ولادت سے قبل ہی بلاد دکن میں چلے گئے تھے اور کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں ہیں۔ محمد نے والد کی غیر موجودگی میں اپنی نیک بخت ماں کی گود میں پرورش پائی۔ سات برس کے تھے کہ ایک عالم حدیث شیخ محمد یونس شہر کڑھ سے کالپی آکر فروکش ہوئے۔ محمد بن ابوسعید نے ان سے حصولِ علم کا آغاز کیا اور علم بیان و معانی کی مشہور کتاب مطول تک ان سے درسی کتابیں پڑھیں۔ انھی سے سند حدیث حاصل کی۔ پھر عازم جاجمو ہوئے۔ وہاں مولانا جاجموی سے بعض کتابوں کا درس لیا۔ بعد ازاں کور گئے۔ وہاں شیخ جمال بن مخدوم کوردی کی مسند درس آراستہ تھی' ان سے باقی کتب درسیہ پڑھیں۔ پھر انھی سے اخذ طریقت کیا۔ اخذ علم اور کسب طریقت کے بعد اپنے شہر کالپی کا قصد کیا

[1] اذکار ابرار' ص ۴۶۵- برہان پور کے سندھی علما' ص ۳۳۴ تا ۳۳۹- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۴۱-

اور درس و افادہ کی طرح ڈالی۔ عرصے تک خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔ پھر اپنے اعزہ و اقارب میں شادی کی غرض سے وارد جالندھر ہوئے۔ جالندھر سے آگرہ گئے' وہاں امیر ابوالعلا حسینی اکبر آبادی سے ملے۔ ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر اخذ فیض کیا۔ اس کے بعد دس سال تک درس و افادہ میں مشغول رہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ لوگوں سے بالکل منقطع ہو گئے اور علیحدگی کی زندگی اختیار کر لی۔ تعلیم و تدریس اور بحث و اشتغال کی دلچسپیاں ختم کر دیں۔ اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں محصور کر لیا اور لوگوں سے میل جول کا سلسلہ قطعی ختم کر دیا۔ اب انھیں یا تو گھر میں دیکھا جاتا تھا یا مسجد میں' اور کہیں نہ جاتے۔

آخر عمر میں ہمیشہ روزے سے رہنے لگے تھے۔ صرف انہی دنوں میں افطار کرتے جن دنوں میں اللہ نے روزے رکھنے کو حرام قرار دیا ہے۔ چھ سال یہ کیفیت رہی' اس کے بعد وفات پا گئے۔ شیخ محمد بن ابوسعید کالپوی جالندھری' صاحب تصنیف بھی تھے۔ وہ مختلف عنوانات کے تحت بہت سی کتابیں ضبط تحریر میں لائے' جن میں ایک سورہ یوسف کی تفسیر ہے۔ ایک عربی زبان میں کتاب الروائح ہے۔ ایک رسالہ تحقیق روح سے متعلق ہے' ایک رسالہ عربی میں وحدت الوجود کے بارے میں ہے۔ ایک کتاب فارسی زبان میں سلوک کے موضوع پر ارشاد السالکین ہے۔ ایک اور رسالہ فارسی میں مبحث فنا کے سلسلے میں ہے۔ ایک رسالہ عقائد صوفیا کے متعلق ہے۔ ایک رسالہ واردات کے متعلق ہے اور عربی میں ہے۔ سلوک کے باب میں ایک اور عمدہ رسالہ ہے۔ ایک رسالہ مراتب فنا اور وصول الی اللہ کے بارے میں فارسی زبان میں ہے۔

شیخ محمد بن ابوسعید اپنے دور کے عالم و فاضل' فقیہ اور صوفی بزرگ تھے۔ ۲۶ رشعبان ۱۰۷۱ھ/ ۱۶/ اپریل ۱۶۶۱ء کو پینسٹھ (۶۵) سال کی عمر پا کر فوت ہوئے اور کالپی میں دفن کیے گئے ❶۔

## ۱۰۳۔ سید محمد حضرمی

سید محمد بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس حضرمی ثم ہندی سورتی۔ مشاہیر علمائے کاملین میں سے تھے۔ علم و عمل کے اعتبار سے اپنے وقت کے امام تھے۔ کردار و گفتار' زہد و تقویٰ اور تحقیق و کاوش میں یگانۂ روزگار تھے۔

۹۷۰ھ/ ۱۵۶۳ء کو تریم میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید پڑھا اور حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ اپنے والد کی گود میں تربیت پائی اور ان سے متعدد علوم کی تحصیل کی۔ سید محمد بن حسن' محمد بن اسماعیل فقیہ اور سید عبدالرحمٰن بن شہاب سے علم فقہ حاصل کیا۔ پھر حدیث کی سماعت کے لیے علما کی ایک جماعت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علم تصوف کے حصول کے لیے بھی بہت سے علما سے منسلک رہے۔ ان کے تمام مشائخ ان کی

---

❶ مآثر الکرام' ص ۷۱ تا ۷۶۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۲۷' ۳۲۸ بحوالہ ضیا محمدی۔

تعریف کرتے اور ان کے فضل و کمال کی شہادت دیتے ہیں۔ اپنے عم محترم شیخ عبدالقادر سے بھی انھوں نے کسب فیض کیا اور انھوں نے ان کے والد شیخ عبداللہ کو مبارک باد کا خط لکھا اور ان کے اس بیٹے (سید محمد) کے علم وفضل کی ہمہ گیری اور زہد و ورع میں انفرادیت کو ان کے لیے قابل فخر قرار دیا۔ ان دنوں سید محمد کے دادا شیخ بن عبداللہ احمد آباد میں تھے' انھیں پوتے کے فضل و کمال کا پتا چلا تو ۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء میں انھیں احمد آباد بلا لیا۔ احمد آباد پہنچ کر اپنے جدامجد سے بہت سے علوم حاصل کیے اور اس مرتبۂ علمی کو پہنچے' جس پر اس دور کے بہت سے کبار مشائخ نہیں پہنچ پائے تھے۔

غرض سید محمد حضرمی دیار ہند میں آ بسے تھے اور اپنے دور کے جلیل القدر عالم وفقیہ تھے۔ پہلے وہ احمد آباد میں قیام پذیر ہوئے تھے' اس کے بعد سورت چلے گئے تھے اور اسی شہر کو اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ اس ملک کا حکمران طبقہ بھی انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ علم وفضل کی فراوانی کے علاوہ جود وسخا میں بھی مشہور تھے۔ اس عالم وفقیہ نے ساٹھ سال کی عمر پا کر ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء کو سورت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے ❶۔

## ۱۰۴۔ شیخ محمد راندیری

شیخ محمد بن علی حمید شافعی اشعری عیدروسی راندیری سورتی' صالح عالم دین تھے۔ ان کا شمار مشائخ صوفیا میں ہوتا تھا۔ سید عمر بن عبداللہ باشیبان سے اخذ طریقت کیا۔ پھر ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۱ء میں سفر حج پر روانہ ہوئے۔ حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے ارض ہند میں آئے اور سورت میں اقامت اختیار کی۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے' جن میں اللمعان بتکفیر من قال بخلق القران' صوارم الصدیق لقطع الزندیق اور دخیق المحمدیه فی طریق الصوفیه شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب کو صاحب نزہۃ الخواطر علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نہایت عمدہ کتاب قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ حضرت سید نواب صدیق حسن قنوجی کے صاحب زادے سید نور الحسن کے کتب خانے میں موجود تھا۔

شیخ محمد راندیری کی وفات کے بارے میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں کہ میں نے کتاب کی پشت پر شیخ محمد ابوبکر حنفی احمد آبادی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تحریر پڑھی ہے کہ شیخ محمد راندیری نے ہفتے کے روز ۲۱/ ذی الحجہ ۱۰۶۸ھ/ ۹/ستمبر ۱۶۵۸ء کو وفات پائی ❷۔

## ۱۰۵۔ سید محمد عاملی

دیار ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے ایک بزرگ سید شریف محمد بن علی حسینی عاملی تھے' جو اس دور

❶ خلاصۃ الاثر' ج ۴' ص ۲۶۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۴۱ تا ۳۴۳۔

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۴۹' ۳۵۰۔

کے مشہور شیعہ فاضل اور فقیہ تھے۔ اپنے معاصرین و اقران میں ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا۔ بہ یک وقت فقیہ، نحوی اور شاعر تھے۔ تمام اصناف علم سے باخبر تھے۔ نیکی اور صالحیت کے جوہر سے آراستہ تھے۔ کشمیر میں رہنے لگے تھے اور اسی خطۂ ارض کو اپنا مسکن ٹھہرالیا تھا❶۔

## ۱۰۶- شیخ محمد برہان پوری

شیخ محمد بن فضل اللہ بن صدر الدین جون پوری ثم برہان پوری، شیخ و امام اور عالم دین تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ صغرسنی ہی میں باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے۔ شیخ صفی الدین گجراتی سے خرقہ طریقت زیب تن کیا۔ پھر ارض حجاز کو روانہ ہوئے اور بارہ سال وہاں مقیم رہے۔ شیخ علی بن حسام الدین متقی مکی ان دنوں مکہ مکرمہ میں مقیم تھے اور ان کا سلسلۂ درس صلاح جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور فیض حاصل کیا۔ پھر احمد آباد کا قصد کیا، وہاں شادی کی اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ بارہ سال ان کی خدمت وصحبت میں رہے۔ بعد ازاں شیخ محمد ماہ بیر پوری سے اخذ طریقت کیا۔ پھر شیخ ابو محمد بن خضر تمیمی سے تصوف و سلوک کی منزلیں طے کیں۔ شیخ ابو محمد خضر تمیمی ان حضرات میں سے تھے، جنھوں نے ان کے والد شیخ فضل اللہ برہان پوری سے کسب فیض کیا تھا۔ ان تمام منزلوں کو عبور کرنے کے بعد برہان پور کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور درس و افادہ میں منہمک ہو گئے۔ نہایت عبادت گزار، یاد خدا میں مصروف رہنے اور اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ ہمیشہ تفسیر، حدیث فقہ اور دیگر علوم دینی کی تدریس و تعلیم میں مشغول رہتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ علم و عمل، زہد و عبادت اور ورع و تقویٰ میں امام کی حیثیت رکھتے تھے اور پورے ہندوستان میں مشہور تھے۔ جس مرتبۂ بلند کو پہنچے، دوسرا کوئی نہیں پہنچ سکا۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ دن کے آخری حصے میں اپنے آپ کا محاسبہ کرتے۔ روزانہ جو کام کیا ہوتا وہ بھی ضبط تحریر میں لاتے۔ ہر وقت اللہ کے خوف میں رہتے اور موت کی توقع رکھتے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ۹۹۹ھ/۱۵۹۱ء میں اس موضوع سے متعلق ایک رسالہ بھی لکھا جس کا نام "التحفة المرسله الی النبی ﷺ" پھر "الحقیقة الموافقة للشریعه" کے نام سے اس کی ایک لطیف شرح سپرد قلم کی۔ اس کے علاوہ ایک کتاب الهدية المرسلة الی النبی ﷺ تصنیف کی، ایک اور کتاب الوسيلة الی النبی ﷺ لکھی، اس میں قاضی عیاض کی شفا اور ترمذی کی شمائل کی تلخیص کی گئی ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مولانا جامی کی مشہور کتاب لوائح کی شرح لکھی۔ ایک رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ امرد کی امامتِ نماز مکروہ ہے۔ معراج کے بارے میں بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔

---

❶ نجوم السما، ص ۹۵- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۴۴-

شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری نے دوشنبہ کے دن ۲/ رمضان المبارک ۱۰۲۹ھ/ ۲۲/ جولائی ۱۶۲۰ء کو وفات پائی۔ برہان پور میں مدفون ہیں ❶۔

## ۱۰۷- مولانا محمد سندھی

مولانا محمد بن یوسف ٹھٹھوی سندھی' بہت بڑے فاضل تھے۔ علوم حکمیہ اور فنون ادبیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ فقہ اور اصول پر بھی گہری نظر تھی۔ علم جفر' تکسیر اور اعداد سے خوب آگاہ تھے۔ جہاں گیر بادشاہ کا وزیر مطلق ابوالحسن آصف جاہ جو جہاں گیر کی بیوی نور جہاں کا بھائی تھا' شیخ محمد بن یوسف ٹھٹھوی کا شاگرد اور عقیدت مند تھا۔ ابوالحسن آصف جاہ منطق وحکمت' تاریخ ورجال اور شعر وانشا کا عالم تھا اور یہ علوم اس نے انھی شیخ محمد بن یوسف سندھی سے حاصل کیے تھے۔ وہ ان کی انتہائی قدر کرتا اور بے حد تکریم سے پیش آتا تھا۔ انھیں مال ومنال سے بھی نوازتا تھا۔ دیگر امرائے مملکت کے نزدیک بھی انھیں قدر ومنزلت حاصل تھی۔ شیخ محمد بن یوسف نے علاقہ سندھ میں قضا وافتا اور احتساب وغیرہ کے سلسلے کی خدمات شرعیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔

پھر جب بادشاہِ ہند کے دربار میں مہابت خاں کا اثر ورسوخ بڑھا اور آصف جاہ کی طرف سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوا تو ایسے تین آدمی قتل کر دیے گئے جو آصف جاہ سے گہرا تعلق رکھتے تھے اور ان کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ وہ آصف جاہ کے معاون خاص ہیں اور اسے فتنہ بپا کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان میں مولانا محمد بن یوسف سندھی کا نام بھی شامل تھا۔ مولانا موصوف نے کبرسنی میں قرآن مجید حفظ کیا تھا اور ہر وقت اس کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ چلتے پھرتے ان کا یہی مشغلہ تھا۔ تلاوت کی وجہ سے چونکہ ہونٹ ہلتے رہتے تھے' اس لیے آصف جاہ کے مخالفوں اور مہابت خاں کے حامیوں نے یہ یقین کر لیا کہ مولانا محمد سندھی دم اور دعائیں کرتے رہتے ہیں کہ مہابت خاں کا ستارہ گردش میں آئے اور بادشاہ کے نزدیک جو عزت واحترام اسے حاصل ہے' وہ ختم ہو جائے۔ اس بنا پر ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۶ء میں انھیں قتل کر دیا گیا ❷۔

## ۱۰۸- قاضی محمد آصف الہ آبادی

قاضی محمد آصف صدر پوری ثم الہ آبادی' فاضل اور علامہ وقت تھے۔ علوم حکمیہ میں ماہر کامل تھے۔ ہندوستان کے شہر خیر آباد کے نواح میں ایک گاؤں صدر پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ مفتی عبدالسلام اعظمی دیوی اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا۔ حصول علم کے بعد الہ آباد کی مسند قضا پر متمکن ہوئے اور الہ آبادی

❶ خلاصۃ الاثر' ج ۴' ص ۱۱۰- اذکار ابرار' ص ۵۹۷' ۵۹۸- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۵۲' ۳۵۳-

❷ مآثر الامرا (اردو ترجمہ) ج ۳' ص ۳۱۴- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۵۶-

کہلائے۔ ساتھ ہی سلسلہ تدریس بھی جاری رکھا اور دیار ہند کے بہت سے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا' جن میں شیخ محمد افضل بن عبدالرحمٰن عباسی الہ آبادی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے قاضی محمد آصف سے شرح المطالع اور شرح حکمۃ العین کا کچھ حصہ پڑھا۔ تفسیر بیضاوی کا درس بھی لیتے رہے۔

قاضی محمد آصف' تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے' چنانچہ مبحث وجود میں محقق دوانی کے رسالے کا رد لکھا۔ تفسیر بیضاوی پر تعلیقات سپرد قلم کیں ❶۔

## ۱۰۹- شیخ محمد آفاق لکھنوی

شیخ محمد آفاق لکھنوی' شیخ صالح اور صوفی المشرب فقیہ اور عالم تھے۔ ہندوستان کے صوبہ بہار میں پٹنہ کے قریب ایک گاؤں ''تلاوہ'' میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور فقر و فاقہ کی راہ پر گامزن ہوئے۔ گوپامئو گئے' وہاں مفتی وجیہ الدین گوپاموی کا سلسلۂ درس جاری تھا' ان سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ پھر لکھنؤ کا عزم کیا اور شیخ پیر محمد لکھنوی سے فیض طریقت حاصل کیا اور طویل عرصے تک ان کی مصاحبت میں رہے۔۔۔۔ شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد ان کی جگہ خود درس و افادہ میں سرگرم عمل ہوئے۔ تکلفات کو بالکل پسند نہ کرتے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۲۲ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ/ ۳ جون ۱۶۷۸ء کو وفات پائی ❷۔

## ۱۱۰- قاضی محمد اسلم ہروی

قاضی محمد اسلم ہروی' ملا خواجہ کوہی اولاد سے تھے جو خراسان کے مشاہیر مشائخ اور نامور علما میں سے تھے اور شیخ محمد سعید حنفی خراسانی المعروف بہ میر کلاں محدث کے والد تھے۔ میر کلاں بادشاہ ہند جہاں گیر کے استاد تھے۔ قاضی محمد اسلم ہرات میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ کابل آئے اور بعض علوم کی تحصیل کی۔ عہد جہاں گیری کے آغاز میں حصول علم کی غرض سے لاہور کا قصد کیا اور مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری اور شیخ بہلول لاہوری سے درسی کتابیں پڑھیں' جو اس دور کے فحول علما اور صنادید فضلا میں سے تھے۔ تکمیل علم کے بعد عازم آگرہ ہوئے اور جہاں گیر سے تقرب پیدا کیا۔ چونکہ یہ مولانا میر کلاں کی اولاد سے تھے اور بادشاہ کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا' اس لیے بادشاہ نے ان کی بڑی قدر و تکریم کی اور کابل کے منصب قضا سے سرفراز کیا۔ کافی عرصہ اس اہم منصب پر فائز رہے۔ پھر قاضی لشکر مقرر کر دیے گئے۔ جہاں گیر کے بعد اس کا بیٹا شاہ جہان تخت ہند پر متمکن ہوا تو اس نے ان کے اعزاز میں اور بھی اضافہ کیا۔ اس نے پانچ وقت کی نمازوں، جمعے اور عیدین کا امام مقرر کر دیا۔ ساتھ ہی

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۵۶' ۳۵۷۔

❷ تذکرہ علمائے ہند' ص ۱۸۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۵۷

منصب یک ہزاری سے نوازا۔ اس نے اس حد تک ان کی تکریم کی کہ ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں ان کو چاندی سے تلوایا اور جو رقم ان کے وزن کے برابر آئی' وہ عنایت کی۔ یہ رقم چھ ہزار پانچ سو روپے کی تھی۔

قاضی محمد اسلم ہروی فاضل وقت اور اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے۔ منطق و حکمت میں بالخصوص عبور رکھتے تھے اور اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ تیس سال تک قاضی لشکر رہے اور کمال دیانت اور وقار کے ساتھ یہ عظیم خدمت انجام دی۔ اس اثنا میں کسی کو ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ جہاں گیر بھی ان کے علم و فضل اور دیانت و تقویٰ سے بہت متاثر تھا اور شاہ جہان بھی ان کی فضیلت علمی اور کام سے انتہائی خوش تھا۔ لیکن بعد میں شاہ جہان کے دل میں ان کی پہلی سی منزلت باقی نہ رہی تھی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ایک مرتبہ (۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء میں) یہ گھوڑے پر سوار تھے' گھوڑا بدکا اور یہ نیچے آگرے' خاصی چوٹیں آئیں' تین مہینے صاحب فراش رہے۔ علاج ہوتا رہا اور تندرست ہو گئے۔ ان کے صحت یاب ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنے ایک امیر مملکت فراست خاں کو جو حج بیت اللہ کے سلسلے میں بادشاہ کی طرف سے نظامت کے عہدے پر فائز تھا' ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کی رقم دے کر حج پر جانے کا حکم دیا۔ یہ رقم مکہ مکرمہ کے امیر اور وہاں کے دیگر اشراف و امرا کی خدمت میں پیش کرنا تھی۔ بادشاہ نے فراست خاں سے کہا کہ وہ قاضی محمد اسلم ہروی کو بھی سفر حج میں اپنے ساتھ لے جائے۔ فراست خاں نے قاضی موصوف سے کہا تو وہ حج کو جانے پر رضا مند نہ ہوئے اور جو عذر پیش کیے وہ بظاہر معقول نہ تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے برا مانا اور قاضی موصوف کو اپنے منصب سے الگ کر دیا اور دس ہزار روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ ان کی جگہ قاضی خوش حال کو پورے ہندوستان کے قاضی کا منصب عطا کیا۔

ایک روایت کے مطابق قاضی محمد اسلم ہروی نے لاہور میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ دوسری روایت کے مطابق کابل میں انتقال کیا۔ ان کا سال وفات ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء ہے ❶۔

منتخب اللباب میں خافی خاں نے ان کا نام قاضی محمد سلیم تحریر کیا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند الفاظ میں یہاں قاضی خوشحال کا تعارف بھی کرا دیا جائے جو قاضی محمد اسلم ہروی کے بعد منصب قضا پر مامور ہوئے۔ یہ دراصل مضافات کابل کے باشندے تھے۔ آگرہ میں شاہ جہان بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دہلی کے قاضی مقرر کر دیے گئے۔ جب قاضی محمد اسلم عہدہ قضا سے

---

❶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مآثر الکرام' ص ۱۹۵ تا ۱۹۸۔ عمل صالح' ج ۱' ص ۴۴۳۔ ج ۲' ص ۲۰۹' ۲۴۷' ۴۲۳۔ ج ۳' ص ۲۸۹' ۳۶۷۔ بادشاہ نامہ' ج ۳' ص ۳۳۳۔ ابجد العلوم' ص ۹۰۳' ۹۰۴۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب' ص ۲۰۰' ۲۰۱۔ سبحۃ المرجان' ص ۶۷۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۵۷' ۳۵۸۔ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۱۷۸۔ منتخب اللباب' ج ۱' ص ۷۰۲۔ حدائق الحنفیہ' ص ۴۱۲۔ بزم تیموریہ' ص ۲۱۴' ۲۱۵۔

معزول ہوئے تو انھیں دہلی کا قاضی مقرر کیا گیا۔اس کے بعد قاضی لشکر مقرر ہوئے۔ پھر اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ بنا تو قاضی عبداللطیف کولشکر کا قاضی بنا دیا اور قاضی خوش حال کو لاہور کا منصب قضا تفویض ہوا۔ چند سال وہ لاہور کے قاضی رہے۔ان کے حسن سلوک اور دیانت داری سے خواص وعوام سب خوش تھے۔موت کا پیغام آیا تو آواز آئی۔

﴿يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيٓ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾(الفجر:۲۷،۲۸)

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کی طرف واپس ہو‘اس طرح سے کہ تو اس سے راضی‘ وہ تجھ سے راضی۔‘‘

اور روح عالم علوی کو پرواز کر گئی ❶۔

## ۱۱۱۔سید محمد اشرف نہٹوری

سید محمد اشرف کا سلسلہ نسب یہ ہے: محمد اشرف بن محمد سعید بن محمد معروف بن داؤد بن خیرالدین جون پوری نہٹوری۔ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں منفرد تھے۔ان کا مولد نہٹور ہے۔نشوونما بھی اسی شہر میں ہوئی۔ وہیں شیخ تاج الدین سنبھلی کی صاحب زادی سے شادی کی۔ پھر عہد شاہ جہانی میں امروہہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی ❷۔

## ۱۱۲۔علامہ محمد افضل جون پوری

علامہ محمد افضل کا سلسلہ نسب یہ ہے: محمد افضل بن محمد حمزہ بن محمد سلطان بن فریدالدین بن بہاءالدین عثمانی جون پوری‘ شیخ عثمان ہارونی کی نسل سے تھے۔عالم کبیر‘ علامہ وقت اور شیخ تھے‘ مختلف علوم میں یگانۂ روزگار اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع تھے۔

علامہ محمد افضل کے والد محمد حمزہ بلاد مازندران کے ایک مقام دماوند کے رہنے والے تھے۔وہ وہاں سے چلے اور اعمال اودھ میں ردولی کے مقام پر سکونت پذیر ہو گئے۔ ردولی میں ۱۷؍رمضان ۹۷۷ھ/۲۳؍فروری ۱۵۶۹ء کو محمد افضل کی ولادت ہوئی۔ محمد حمزہ اچھے عالم تھے‘انھوں نے اپنے اس بیٹے کو ابتدائی تعلیم خود ہی دی۔ بعض درسی کتابیں بھی خود ہی پڑھائیں۔اس اثنا میں محمد افضل کو بھی علم سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور عمر کی کچھ منزلیں بھی طے کر لی تھیں‘ لہٰذا مزید تعلیم کے لیے ردولی سے دہلی کا قصد کیا۔ دہلی اس زمانے میں علم وفضل کا مرکز تھا اور مختلف جلیل القدر علما وفضلا کا سلسلہ درس جاری تھا‘ جن میں شیخ طاہر لاہوری کے تلمیذ شیخ حسین عمری‘

❶ فرحت الناظرین(شخصیات)ص ۲۰۷‘ ۲۰۸-نزہۃ الخواطر‘ج ۵‘ص ۱۴۳-

❷ نزہۃ الخواطر‘ج ۵‘ص ۳۵۹ بحوالہ نخبۃ التواریخ-

شیخ عبداللہ سلطان پوری کے شاگرد شیخ ابوحنیفہ اور دیگر علمائے مشاہیر کی تدریسی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور علما و طلبا کی بڑی تعداد ان سے استفادہ کر رہی تھی محمد افضل بھی ان کے حلقہ درس میں شریک ہو گئے اور کسب علم کرنے لگے' یہاں تک کہ بحث و اشتغال میں مرتبہ بلند کو پہنچے اور علوم متداولہ میں منفرد حیثیت کے حامل ہوئے۔

علامہ محمد افضل کے حفظ و اتقان اور جامعیت علم و ادراک کا یہ عالم تھا کہ بیس سال کی عمر میں درس و افتا کی مسند بلند پر متمکن ہو گئے تھے اور ان کا شمار اکابر علما میں ہونے لگا تھا۔ جون پور ایک عرصے سے علمی شہرت کا شہر تھا اور وقت کے جید علما اور نامور فضلا کا مسکن رہ چکا تھا۔ جس زمانے کے حالات کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں' اس زمانے میں بھی عظیم المرتبت علما و مشائخ وہاں موجود تھے اور ان کا سلسلۂ درس اور چشمۂ فیض وہاں جاری تھا۔ علامہ محمد افضل بھی جون پور روانہ ہو گئے اور مستقل طور سے وہاں اقامت اختیار کر لی' اس کے بعد وہ جون پوری کہلائے۔ جون پور میں انھوں نے شیخ عبدالقدوس جون پوری سے اخذ طریقت کیا اور درس و افادہ میں سرگرم عمل ہو گئے۔ ان سے فلسفہ و حکمت کی مشہور اور انتہائی کتاب "شمس البازغہ" کے مصنف علامہ محمود فاروقی جون پوری اور فن مناظرہ کی درسی کتاب "رشیدیہ" کے نامور مؤلف شیخ محمد رشید عثمان جون پوری نے اخذ علم کیا۔ ان کے علاوہ خلق کثیر ان کے علم و فضل کی ہمہ گیری سے مستفید ہوئی۔

علامہ محمد افضل جون پوری نہایت پاک باز' حسن اخلاق کے مالک' متقی اور سلیم الطبع تھے۔ ان کے علم و تدریس کی وجہ سے جون پور نے بڑی شہرت پائی۔ ان کے شاگرد علامہ محمود فاروقی جون پوری بڑے فاضل بزرگ تھے اور استاد (علامہ محمد افضل) کو ان سے بے حد محبت تھی۔ ان کے یہ لائق شاگرد استاد کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ علامہ محمد افضل نے ان کی وفات پر انتہائی حزن و ملال کا اظہار کیا اور بے حد مغموم رہنے لگے۔ غم و اندوہ کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چالیس روز تک مسکرائے بھی نہیں' بالآخر چالیس روز کے بعد خود بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی تاریخ وفات ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ/۲ مارچ ۱۶۵۲ء ہے۔ چوراسی (۸۴) سال سے زائد عمر پائی۔ جون پور کے محلہ چوچک پور میں دفن کیے گئے ❶۔

## ۱۱۳۔ قاضی محمد افضل لاہوری

قاضی محمد افضل حنفی لاہوری' شیخ اور عالم تھے۔ ان کا شمار فقہ و اصول اور علوم عربیہ کے ماہرین میں ہوتا تھا۔ شیخ ابوتراب بن نجیب الدین شیرازی سے اخذ طریقت کیا تھا۔ قاضی محمد افضل سے خلق کثیر فیض یاب ہوئی۔ ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء کو لاہور میں فوت ہوئے ❷۔

❶ سبحۃ المرجان' ص ۵۴۔ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۱۸۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۳۵۹۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۱۱' ۱۲' ۱۷۔ ابجد العلوم ص ۹۰۲۔

❷ خزینۃ الاصفیا' ص ۹۸۸۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۶۱۔

# ۱۱۴- قاضی محمد حسین جون پوری

قاضی محمد حسین ہندوستان کے مشہور مرکز علم وتحقیق جون پور کے باشندے تھے۔ ان کا شمار اپنے دور کے بڑے بڑے علما وفقہا کے زمرے میں ہوتا تھا۔ فقہ واصول میں انھیں بہرۂ وافر حاصل تھا۔ شاہ جہان بادشاہ کے عہد حکومت میں جون پور کے منصب قضا پر متمکن ہوئے۔ اورنگ زیب عالم گیر تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے اوائل عہد حکومت میں انھیں الہ آباد منتقل کر دیا اور وہاں کی مسند قضا ان کے سپرد کی۔ اس کے بعد ان کے منصب میں اضافہ کر کے فوج کے محکمہ احتساب پر متعین کر دیا گیا۔

قاضی محمد حسین جون پوری علمائے برصغیر کی اس بلند بخت جماعت میں شامل تھے، جنھوں نے ''فتاویٰ ہندیہ'' یعنی فتاویٰ عالم گیری کی تدوین وتصنیف میں تحقیق وکاوش کے جوہر دکھائے۔ فرحت الناظرین کے مصنف محمد اسلم انصاری پسروری نے ان کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:

از علم وہنر بہرۂ وافر داشت ❶۔

(یعنی قاضی محمد حسین جون پوری علم وفن کے بہرۂ وافر سے سعادت اندوز تھے۔)

تذکرہ علمائے ہند میں ان کے تذکرہ وتعارف کے سلسلے میں یہ الفاظ مرقوم ہیں:

قاضی محمد حسین جون پوری از علم وفضل نصیبے وافر داشت۔ در عہد شاہ جہانی قاضی جون پور بود ودر اوائل عہد عالم گیر بہ قضائے الہ آباد ممتاز شدہ۔ ودر سن ہفتم جلوس عالم گیر بہ حضور آمدہ۔ بہ اضافۂ منصب واحتساب لشکر سرفراز گردید ودر تالیف فتاویٰ عالم گیری بسے سعی نمودہ ❷۔

(قاضی محمد حسین جون پوری علم وفضل میں حصۂ وافر رکھتے تھے۔ شاہ جہان کے عہد حکومت میں جون پور کے قاضی تھے۔ عالم گیر کے آغازِ عہدِ بادشاہت میں الہ آباد کے قاضی مقرر ہوئے اور ساتویں سال جلوس میں عالم گیر کے حضور آئے۔ اضافۂ منصب سے سرفراز کیے گئے اور محتسب لشکر کی حیثیت سے ان کا تقرر کیا گیا۔ فتاویٰ عالم گیری کی تالیف میں بڑی علمی اور تحقیقی کوششیں کیں۔)

مآثر عالم گیری سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی محمد حسین جون پوری کی وفات ۱۰۸۰ھ/ ۱۶۶۹ء میں ہوئی۔ کیوں کہ جلوس عالم گیری کے تیرھویں سال یعنی ۱۰۸۰ھ/ ۱۶۶۹ء کے واقعات کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ:

''قاضی محمد حسین کے انتقال کی وجہ سے سید احمد خاں پسر سید محمد قنوجی کو خدمت احتساب عنایت ہوئی۔ جو اہل دربار، حضور شاہی میں ہاتھ سر پر رکھ کر آداب بجالانے کے لیے جھکتے تھے، ان کو حکم ہوا کہ مسنون طریقے پر سلام کیا کریں ❸۔''

---

❶ فرحت الناظرین، ص ۸۴۔

❷ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۷۵۔

❸ مآثر عالم گیری، ص ۹۴۔

نزہۃ الخواطر میں ان کی وفات کے متعلق یہ الفاظ مرقوم ہیں:

مات فی الثالث عشر من جلوس عالمگیر علی سریر الملك نحو ست و سبعین والف❶۔

(یعنی عالم گیر کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے تیرھویں سال ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۶ء کے قریب فوت ہوئے۔)

نزہۃ الخواطر میں مرقوم یہ سال وفات صحیح نہیں معلوم ہوتا' کیوں کہ عالم گیر کا تیرھواں سال جلوس ۱۰۷۶ھ نہیں' ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء ہے۔ اس حساب سے ان کا سن وفات ۱۰۸۰ھ ہونا چاہیے۔

## ۱۱۵- مولانا محمد حسین کشمیری

مولانا محمد حسین کشمیری' شیخ اور فاضل بزرگ تھے' مشاہیر علما میں سے گردانے جاتے تھے۔ پٹنہ (عظیم آباد) کے منصب افتا پر متعین تھے' سلسلہ تدریس بھی جاری تھا۔ عرصے تک اقلیم ہند کے اس شہر کی مسند درس و افتا پر فائز رہے۔ معارف دینیہ کے مختلف گوشوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اس موضوع کے مشکل اور اہم مسائل کی عمدہ انداز سے عقدہ کشائی کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں صبح صادق کے مصنف مرزا محمد صادق اصفہانی شامل ہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے خود ہی اپنی کتاب (صبح صادق) میں کیا ہے۔ مولانا محمد حسین کشمیری نے ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۶ء کو سفر آخرت اختیار کیا❷۔

## ۱۱۶- مفتی محمد خلیل جون پوری

جون پور کے ایک جید عالم دین مفتی محمد خلیل بن شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری تھے' جو شیخ وقت اور فقیہ عصر تھے۔ ان کے والد مفتی شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری (متوفی ۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء) بھی فحول علما اور صنادید وقت میں سے تھے' ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے انھیں اپنے بیٹے پرویز کا اتالیق مقرر کیا تھا اور وہ عرصے تک الہ آباد اور جون پور کے مفتی رہے تھے۔ یہی مفتی شمس الدین جون پوری ہیں، جن کے سامنے صاحب ''شمس البازغہ'' علامہ محمود عمری جون پوری اور صاحب ''رشیدیہ'' شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری نے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ مفتی محمد خلیل نے بھی اپنے والد سے اخذ علم کیا اور مرتبہ فضیلت کو پہنچے۔ اس زمانے میں ظاہری علوم کے ساتھ باطنی علوم کا حصول بھی ضروری تھا اور

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۶۴۔

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۶۶' ۳۶۷۔ بحوالہ صبح صادق۔

علمائے دین تصوف وطریقت سے بھی بہرہ ور ہوتے تھے' مفتی محمد خلیل نے بھی اس طرف توجہ کی اور رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری سے (جو ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے) کسب طریقت کیا۔ حصول علم کے بعد اپنے بھائی مفتی محمد صادق بن مفتی شمس الدین کی جگہ مسند افتا کو زینت بخشی اور عمر بھر اس منصب پر متمکن رہے۔ ساتھ ہی درس وتدریس میں بھی سرگرم رہے۔ کثیر الدرس اور کثیر الافادہ عالم دین تھے۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ جمعرات کے روز ۲۹ ر ذی الحجہ ۱۰۷۹ھ/ ۲۰ر مئی ۱۶۹۹ء کو جون پور میں فوت ہوئے اور اپنے بھائی محمد صادق جون پوری کے قبرستان میں دفن کیے گئے ❶۔

## ۱۱۷- شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری

ان کا پہلا نام محمد رشید تھا اور وہ اسی نام کو پسند کرتے اور مراسلات ومکاتبات میں لکھتے تھے' تذکرہ نگاروں میں سے بعض حضرات انھیں عبدالرشید عثمانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور بعض محمد رشید عثمانی کے نام سے! چونکہ شیخ ممدوح خود اپنے آپ کو محمد رشید لکھتے ہیں' اس لیے ہم بھی انھیں اسی نام سے موسوم کریں گے۔

شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری گیارھویں صدی ہجری کے اقلیم ہند کے ممتاز عالم دین' نامور فقیہ اور مشہور مصنف تھے۔ تحقیق وتدقیق اور علوم میں بالغ نظری اور جامعیت میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ عالم کبیر' علامہ دوراں اور شیخ وقت تھے۔ عدیم النظیر فقیہ اور بے مثال اصولی تھے۔ تصوف وسلوک میں بھی خاص انفرادیت کے حامل تھے۔ مشہور بزرگ شیخ کبیر سری بن مفلس سقطی عثمانی کی اولاد سے تھے۔

شیخ محمد رشید عثمانی ۱۰ ذی القعدہ ۱۰۰۰ھ/ ۸ر اگست ۱۵۹۲ء کو موضع ''برونہ'' میں پیدا ہوئے جو اعمال جون پور میں ایک قریہ تھا۔ ان کی والدہ معروف عالم وصوفی شیخ نورالدین بن عبدالقادر صدیقی برونوی کی صاحب زادی تھیں۔ محمد رشید نے ننھیال میں پرورش پائی تھی اور کم عمری ہی میں حصول علم سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ قرآن مجید اپنے قابل احترام نانا شیخ نورالدین صدیقی برونوی سے پڑھا' کتابت بھی انہی سے سیکھی' علم صرف کی کچھ کتابیں اور علم نحو کی لب' الارشاد اور کافیہ کی تعلیم بھی انہی سے حاصل کی۔

مختلف مروجہ علوم وفنون کی کتابیں شیخ قاسم' شیخ مبارک مرتضیٰ' شیخ نور محمد مداری' شیخ محی الدین بن عبدالشکور' شیخ حبیب اسحاق' شیخ جمال کاکوروی' مولانا محمد لاہوری' شیخ عبدالعزیز' سید عبداللہ' مفتی شمس الدین برونوی اور شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری وغیرہ سے پڑھیں۔ یہ حضرات اس دور کے جید علمائے کرام اور مشہور فضلائے عظام تھے' جو ملک کے مختلف مقامات میں سرگرم درس وتدریس تھے۔ سند حدیث شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحب زادۂ گرامی مفتی نورالحق دہلوی سے لی۔ ان سے صحیح بخاری' مصابیح اور مشکوٰۃ کا درس لیا۔ شیخ

---

❶ تجلی نور' ج ۲' ص ۶۷۔ تاریخ شیراز ہند جون پور' ص ۱۴۷۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۶۷۔

ممدوح نے تمام مروّج اور متداول علوم ملک کے عظیم القدر اساتذہ سے حاصل کیے اور ہر علم میں مرتبہ کمال کو پہنچے۔ ذہن بے حد رسا پایا تھا اور قوت اخذ بڑی مضبوط تھی۔ تمام علوم کے مختلف گوشے خاص ترتیب اور بہترین انداز کے ساتھ حافظے میں محفوظ تھے۔

اس زمانے میں علمائے کرام بعض مروّج سلاسل تصوف کے مطابق علم طریقت بھی حاصل کرتے تھے اور مشہور صوفیا میں سے رُوحانی رشد و ہدایت کے لیے کسی بڑے صوفی کے دروازے پر دستک دیتے تھے۔ شیخ محمد رشید جون پوری نے بھی اخذ طریقت کیا۔ ان کے والد گرامی شیخ مصطفیٰ عثمانی جون پوری بہت بڑے عالم دین اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ہونہار بیٹے نے زمانہ طفولیت ہی میں عظیم باپ کی نگرانی میں سلوک کی منزلیں طے کر لی تھیں اور خرقہ طریقت حاصل کر لیا تھا' لیکن آگے چل کر وہ اس طرح علمی و تحقیقی ہنگاموں میں سرگرم ہوئے کہ صرف اذکار و اشغال کو مرکز التفات ٹھہرا لینا ممکن نہ رہا اور عنانِ توجہ حصولِ علم ہی کی طرف مرکوز رکھی۔

یہاں یہ بات لائق تذکرہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک شیخ طریقت طیب بن معین بنارسی (متوفی ۸ شوال ۱۰۴۰ھ/۳۰ اپریل ۱۶۳۱ء) سے بنارس کے قریب ایک گاؤں ''منڈواڈیہ'' میں ان کی ملاقات ہوئی۔ ایک روز ان کے پاس رہے اور علمی بحث و اشغال کو ترک کر کے مستقل طور پر سلوک و طریقت کی وادیوں میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی' لیکن شیخ طیب نے اس سے اتفاق نہ کیا اور بہ دستور علمی و تحقیقی مساعی کو جاری رکھنے پر زور دیا۔ چنانچہ شیخ محمد رشید دوبارہ جون پور آ گئے اور اپنے آپ کو مزید حصولِ علم کے لیے وقف کر دیا۔ جب علم کی تمام اصناف میں پختہ ہو گئے تو شیخ طیب کی خدمت میں دوبارہ منڈواڈیہ گئے اور باقاعدہ اخذ طریقت کیا۔ شیخ طیب نے ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۱ء میں ان کو اپنا خلیفہ بنایا اور وثیقۂ خلافت مرحمت کیا۔

شیخ محمد رشید جون پوری نے طویل مدت تک ہنگامہ درس و افادہ بپا کیے رکھا' لیکن بعد میں اسے ترک کر کے مطالعہ کتب حقائق میں مشغول ہو گئے۔ بالخصوص شیخ محی الدین ابن عربی کی تصانیف کو مطمحِ نظر ٹھہرایا اور اس میں یہاں تک آگے نکل گئے کہ ابن عربی کی جو عبارات بظاہر محلِ طعن نظر آتی ہیں' ان کو محامل حسنہ پر محمول کرتے اور ثابت کرتے کہ وہ اپنے اندر درحقیقت اچھائی اور عمدگی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔

شیخ محمد رشید بڑے خود دار اور بلند کردار عالم تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ امرا و اغنیا کے دروازوں پر جانے سے احتراز کرتے اور ان سے میل جول اور اختلاط کو علمی وقار کے منافی سمجھتے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب بادشاہ ہند شاہ جہان کو ان کے علم و ادراک کی ہمہ گیری اور جامعیت کا علم ہوا تو اس نے اپنی علم پروری اور علما دوستی کی بنا پر ان سے ملنا چاہا اور ایک مکتوب کے ذریعے اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی مگر اس بوریا نشین عالم نے ہندوستان کے عظیم بادشاہ کو ملنے سے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ وہ کسی بادشاہ یا امیر مملکت کے ہاں جانے کے لیے اپنے زاویہ اور خانقاہ سے باہر قدم نہیں نکالیں گے۔

شیخ محمد رشید کتاب وسنت کی روشنی میں بعض امور پر سختی سے عامل تھے۔ مثلاً سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتے تھے، فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان تھوڑی دیر اضطجاع کرتے یعنی دائیں جانب لیٹتے تھے۔ وفات سے پہلے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ موجودہ زمانے کے رواج کے مطابق موت کے بعد انھیں عمامہ نہ پہنایا جائے، نہ ایصال ثواب کی غرض سے کوئی چارپایہ ذبح کر کے اس کا گوشت پکایا اور تقسیم کیا جائے، نہ تین دن سے زیادہ افسوس کیا جائے اور نہ پختہ قبر بنائی جائے، مٹی کی کچی قبر بنائی جائے۔

شیخ ممدوح اونچے مرتبے کے مصنف بھی تھے۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں کتابیں تصنیف کیں۔ خالص علمی اور فنی کتابیں بھی لکھیں اور تصوف وسلوک کے بارے میں بھی کچھ کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ان کی تصانیف میں ایک کتاب ''رشیدیہ'' ہے جو فن مناظرہ سے متعلق ہے۔ اس کتاب کو اہل علم میں بڑی شہرت وقبولیت حاصل ہوئی، اسے باقاعدہ کتب درسیہ میں شامل کیا گیا۔ علما نے اسے اعتنا وتلقی سے نوازا اور تعلیق وتحشیہ اور تدریس وتعلیم کے لیے منتخب کیا۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ اور شیخ اکبر کی اسرار الخلوق پر شرح سپرد قلم فرمائی۔ عربی زبان میں خلاصۃ النحو کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ فارسی زبان میں زاد السالکین اور مقصود الطالبین ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں شرح مختصر عضدی پر حواشی لکھے۔ علم نحو کی مشہور درسی کتاب کافیہ کا فارسی زبان میں حاشیہ لکھا۔ ابن عربی کے کلام کے بعض حصوں کا محکوم مربوط کے نام سے ترجمہ کیا۔ بہت سے اشعار پر مشتمل ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ شمسی تخلص کرتے تھے۔ شیخ محمد رشید کے ملفوظات بھی ہیں جو شیخ نصرت جمال ملتانی نے گنج ارشدی میں جمع کیے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ مودود بن محمد حسین جون پوری نے بھی ان کے ملفوظات کا ایک مجموعہ تیار کیا۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس عظیم المرتبت عالم نے تراسی (۸۳) سال عمر پا کر جمعۃ المبارک کے روز ۹ رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ / ۱۹ دسمبر ۱۶۷۲ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

ان کی وفات بھی عجیب طرح واقع ہوئی۔ فجر کی سنتوں سے فارغ ہو کر فرض پڑھنے لگے تھے کہ تکبیر تحریمہ میں داعی حق کا بلاوا آ گیا[1]۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

## ۱۱۸- قاضی محمد زاہد کابلی

قاضی محمد زاہد کابلی، شیخ فاضل اور علامہ تھے۔ بادشاہ ہند جہاں گیر کے عہد میں کابل کے قاضی مقرر ہوئے اور اس کے بیٹے شاہ جہان کے عہد تک اس اہم منصب پر فائز رہے۔ بہت بڑے عالم، فقہ واصول اور

[1] عمل صالح، ج ۳، ص ۲۹۱- مآثر الکرام دفتر اول، ص ۱۹۱، ۱۹۲- سبحۃ المرجان ص ۶۶، ۶۷- تجلی نور، ج ۱، ص ۷۱، ۷۲- ابجد العلوم، ص ۹۰۳- خزینۃ الاصفیاء، ص ۴۷۳، ۴۷۴- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب، ص ۱۹۹، ۲۰۰- تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۱۹- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۶۷ تا ۳۷۰- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۸۴، ۸۵- حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۸- تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۶۴۶ تا ۶۴۸- برصغیر پاک وہند میں علم فقہ، ص ۳۰۳ تا ۳۰۵-

علوم عربیہ کے ماہر اور دیگر فنون مروجہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ متقی اور متورع تھے۔ ہر وقت خدمت علم میں مصروف رہتے۔ ساتھ ہی طلبا کو طریقۂ ظاہری کی تلقین فرماتے اور صلاح وتقویٰ کا درس دیتے ___ شاہ جہان کے تیسرے سال جلوس میں فوت ہوئے' جو ۱۰۳۹ھ/۱۶۳۰ء بنتا ہے ❶۔

## ۱۱۹- شیخ محمد سعید سرہندی

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے بڑے صاحب زادے خواجہ محمد صادق تھے جو عین عالم جوانی میں بعارضہ طاعون وفات پا گئے تھے۔ دوسرے خواجہ محمد سعید تھے' تیسرے بیٹے کا اسم گرامی شیخ محمد معصوم تھا۔ یہ حضرت مجدد کے دوسرے خلیفہ' عروۃ الوثقیٰ اور قیوم ثانی تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے شیخ محمد یحییٰ تھے جو شاہ جیو کے عرف سے معروف تھے۔

شیخ محمد سعید ماہ شعبان ۱۰۰۵ھ/ مارچ ۱۵۹۷ء میں سرہند میں پیدا ہوئے اور بعض کتب درسیہ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد صادق سے پڑھیں۔ زیادہ تر کتابیں شیخ محمد طاہر لاہوری سے پڑھیں۔ اپنے والد حضرت مجدد الف ثانی سے بھی تحصیل کی۔ ان سے اور شیخ عبدالرحمٰن رمزی سے حدیث کی سند حاصل کی۔ طویل عرصے تک اپنے والد محترم سے وابستہ رہے اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ شیخ مجدد نے آخر عمر میں ان کو طریقت وسلوک کی منزلیں طے کرانے کی غرض سے درس وتدریس کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا علمائے راسخین میں سے ہے۔ انھیں خرقۂ طریقت وخلافت عطا کیا اور ''خازن رحمت'' کے لقب سے ملقب فرمایا۔ لیکن والد کی وفات کے بعد شیخ محمد سعید مسند مشیخت سے علیحدہ ہو گئے تھے اور یہ خدمت اپنے چھوٹے بھائی شیخ محمد معصوم کے سپرد کر دی تھی۔ اس کے بعد ارض حجاز گئے اور حج وزیارت کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ پھر ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۹ء میں واپس ہندوستان تشریف لائے اور تدریس وتلقین میں مصروف ہو گئے۔

شیخ محمد سعید سرہندی اپنے عظیم باپ حضرت مجدد الف ثانی کے تربیت یافتہ تھے اور عالم و فاضل' محدث وفقیہ اور شیخ و مصلح تھے۔ تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ مشکوٰۃ کا حاشیہ سپرد قلم کیا اور جن احادیث کو ائمہ حنفیہ اپنا مآخذ قرار دیتے ہیں' ان کی تحقیق اور مسائل حنفیہ کے اثبات میں بے حد محنت کی ___ اس ضمن میں زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے۔

مشکوٰۃ المصابیح کہ دراں بہ تحقیق صحت وقوت آں احادیث کہ ماخذ ائمہ حنفیہ است' غایت سعی مبذول داشتہ اند ❷۔

ایک رسالہ تشہد میں عدم رفع سبابہ کے موضوع پر لکھا۔ اس مسئلے میں مذہب حنفیہ کی تائید کی

❶ عمل صالح' ج ۱' ص ۲۴۸' ۲۴۹ - بادشاہ نامہ' ج ۲' ص ۳۴۳ - نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۷۱ -

❷ زبدۃ المقامات' ص ۳۱۰ -

ہے۔شرح عقائد کے حاشیہ خیالی پر ایک حاشیہ تحریر کیا۔اس کے علاوہ اور بھی کتابیں تصنیف کیں۔مختلف اہم علمی شخصیتوں اور ارباب حکومت کے نام مکتوبات تحریر کیے۔ بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے نام بھی کئی خطوط لکھے۔ مکتوبات کا مجموعہ ''مکتوبات سعیدیہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

بہرحال شیخ محمد سعید سرہندی اپنے دور کے نامور عالم اور مشہور صاحب سلوک بزرگ تھے۔تفسیر' حدیث' فقہ' اصول فقہ اور دیگر علوم متداولہ کے ماہر تھے۔ درس وتدریس میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔تفسیر بیضاوی' عضدی اور شرح حکمۃ العین وغیرہ باقاعدہ طلبا کو پڑھاتے تھے۔۲۷ر جمادی الاخریٰ ۱۰۷۰ھ/ ۲۹ر فروری ۱۶۶۰ء کو فوت ہوئے ❶۔

## ۱۲۰- شیخ محمد سعید ہندی

شیخ الحاج محمد سعید ہندی' اپنے عصر کے فاضل اور علامہ تھے' تحقیق و تدقیق مسائل میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔متورع اور متقی عالم دین تھے۔ معارف الٰہیہ کے ماہر تھے۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور بعض علماء نے عمامہ اور طیلسان پہننے کا جو التزام کر رکھا تھا' اس کی پروانہ کرتے تھے' نہ اس قسم کے تکلفات کے عادی تھے۔ احتیاط اور تورع کا یہ عالم تھا کہ اپنے والد کے گھر کا کھانا نہیں کھاتے تھے' اس لیے کہ وہ بادشاہ کی سلک ملازمت میں منسلک تھے اور یہی خدمت شاہی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ والد کی وفات کے بعد ان کو مال وراثت کا حصہ ملا۔ اسی وقت سفر حجاز پر روانہ ہو گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ ہندوستان واپس آئے تو درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ملوک وسلاطین کے درباروں میں بالکل نہ جاتے اور علمی و تدریسی کام میں مشغول رہتے۔ اس زمانے میں شاہ جہان تخت ہند پر متمکن تھا۔ وہ ان کا بہت معتقد اور ان کے فضل وکمال کا مداح تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ان سے ملنا چاہا اور علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو انھیں بلانے کے لیے بھیجا مگر انھوں نے دربار میں جانے اور بادشاہ سے ملنے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے' بیضاوی کے کئی اجزا پر حاشیہ لکھا ❷۔

## ۱۲۱- مفتی محمد شریف الہ آبادی

مفتی محمد شریف حسینی الہ آبادی کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے فقہ واصول اور علوم عربیہ کے ماہرین

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: زبدۃ المقامات' ص ۳۰۸ تا ۳۱۵- حضرات القدس- تذکرۂ علمائے ہند' ص ۱۹۰'۲۷۵- حدائق الحنفیہ' ص ۴۱۷- رود کوثر' ص ۳۳۳ تا ۳۳۶- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۳۶' ۳۳۷- خزینۃ الاصفیا' ص ۶۳۸' ۶۳۹- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۵۲ تا ۵۴-

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۷۲-

میں ہوتا تھا۔ شہر الہ آباد کے منصب قضا پر متمکن تھے۔ جامع صفات عالم اور منبع فیوض شیخ تھے۔ علم و عمل، صلاح و تقوی، ورع و عفاف اور حسن اخلاق کے حامل تھے۔ دینی و شرعی معاملات میں صلابت ان کی خصوصیت تھی۔ احکام الٰہی کے اجرا میں جری اور بے خوف تھے۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی مداہنت اور نرمی کے قائل نہ تھے۔ بڑے سے بڑے سخت گیر اور ظالم حکمران کے سامنے بھی اللہ کے فرمان بلا جھجک بیان کرتے اور اس کی تختی کو بالکل خاطر میں نہ لاتے ___ ماہ صفر ۱۰۳۵ھ/نومبر ۱۶۲۵ء میں الہ آباد میں فوت ہوئے اور وہیں اپنے گھر میں دفن کیے گئے ❶۔

## ۱۲۲- قاضی محمد شریف صدیقی گجراتی

قاضی محمد شریف بن محمد فرید صدیقی گجراتی، حنفی المسلک تھے۔ علاقہ گجرات کے شیخ، فاضل اور عالم کبیر تھے۔ فقہ و اصول کے ماہر علما میں سے تھے۔ گجرات کی مسند درس و افادہ پر فائز تھے۔ شیخ احمد بن سلیمان گجراتی (متوفی ۱۶ شعبان ۱۰۲۴ھ/۳۱ راگست ۱۶۱۵ء) نے اکثر کتب درسیہ انہی سے پڑھیں ❷۔

## ۱۲۳- علامہ محمد شفیع یزدی

علامہ محمد شفیع یزدی، کتب رجال اور تذکروں میں ملا شفیعا یزدی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ اقلیم ہند کے مشہور فضلا میں سے تھے۔ ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء کو شاہ جہان بادشاہ کے زمانے میں تجارت اور سیاحت کی غرض سے بحری راستے سے ہندوستان آئے اور سورت میں داخل ہوئے۔ آتے ہی ملک کے حلقۂ علما میں مشہور ہو گئے۔ جب ان کے فضل و کمال کی شہرت بادشاہ تک پہنچی اور اسے پتا چلا کہ شفیعا یگانۂ روزگار اور عراق و خراسان کے نامور علما میں سے ہیں تو وہ واپس وطن جانے کے لیے سورت کی بندرگاہ میں پہنچ چکے تھے۔ بادشاہ نے سفر خرچ اور زاد راہ کے لیے پانچ ہزار روپے دے کر آدمی بھیجے۔ بہت ہی خواہش اور اعزاز کے ساتھ اپنے ہاں بلایا اور بے حد احترام و تکریم سے پیش آیا۔ بڑی نوازشیں کیں اور مال و دولت سے نوازا۔

اس زمانے میں حکمرانوں کو علما کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کی مجلسیں منعقد کرانے کا بہت شوق تھا۔ شاہ جہان چونکہ خود صاحب علم و فضل تھا، اس لیے اس نے دیار ہند کے جن بڑے بڑے علما سے ذاتی تعلقات استوار کر رکھے تھے، ان میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو اولیں درجہ حاصل تھا۔ مولانا سیالکوٹی ممتاز عالم اور نہایت محقق و مدقق بزرگ تھے۔ بادشاہ نے ملا شفیعا یزدی کے امتحان اور مناظرے کے لیے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو بلایا۔ بلاشبہ دونوں بے مثال فاضل تھے۔ مجلس مباحثہ شروع ہوئی۔ دونوں کے درمیان سورہ فاتحہ کی

❶ نزہۃ الخواطر ج، ج ۵، ص ۳۷۴۔ وفیات الاعلام از شیخ محمد یحییٰ عباسی۔

❷ مرأۃ احمدی، ج ۲، ص ۶۷۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۷۵۔

آیت : ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کی تفسیر پر گفتگو کا آغاز ہوا۔ حکم اور ثالث علامی سعد اللہ خاں کو مقرر کیا گیا جو شاہ جہان کے وزیر اور برصغیر کے جلیل القدر عالم اور نامور فاضل تھے۔ دونوں فضلائے عصر کے درمیان معیاری گفتگو ہوئی اور دلچسپ علمی نکتے بیان کیے گئے۔

شاہ جہان بادشاہ نے ملا شفیعا یزدی کے اسلوب کلام اور انداز تقریر کو بہت پسند کیا اور ان کی جامعیت علم سے متاثر ہو کر مقربین دربار میں شامل فرمایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں بڑی نوازشیں ہوئیں اور فراوانیٔ معلومات کی بنا پر دانشمند خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ تین ہزاری منصب اور بخشی گری کی خلعت سے نوازے گئے۔ ان کے مناصب میں برابر اضافہ ہوتا رہا' پانچ ہزاری منصب کو پہنچے۔ شاہ جہان کے آخری ایام حکومت میں ملا محمد شفیعا یزدی ان مناصب اور خدمت شاہی سے الگ ہو گئے تھے اور دہلی میں گھر کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے تھے۔

شاہ جہان کے بعد اورنگ زیب عالم گیر تخت نشین ہوا تو ملا شفیعا یزدی پھر جلوہ گر ہوئے اور عالم گیر کی نوازشہائے پیہم کے مستحق قرار پائے۔ ۱۰۷۸ھ/ ۱۶۶۷ء کو امیر بخشی گری کے عہدے پر فائز کیے گئے اور تازندگی یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ علاوہ ازیں مسلسل چار ہزاری اور پانچ ہزاری منصب کو پہنچے۔ بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے ان سے بعض علمی اور دینی کتابیں پڑھیں۔ امام غزالی کی احیاء علوم الدین شروع سے آخر تک پوری پڑھی۔ گویا یہ اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے استاد تھے۔

علامہ محمد شفیعا یزدی (دانشمند خاں) کے علم و فضل اور بحر تحقیق میں غواصی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندو' عیسائی اور افرنگی اہل علم کثیر تعداد میں ان کی خدمت میں آتے' ان کی جامعیت علم سے مستفید ہوتے اور مختلف علوم و فنون کے بارے میں مذاکرات کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس طرح ان کا حلقہ تعارف اور دائرۂ اثر بہت بڑھ گیا تھا اور وہ اہل علم کے لیے مرکز و مرجع کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ فلسفہ' تاریخ اور عمرانیات میں بالخصوص وسیع المعلومات اور کثیر المطالعہ تھے اور مختلف زبانوں کے جید عالم اور بہت بڑے فاضل۔!

ارض ہند کے اس نامور حکیم و مفکر اور ممتاز عالم دین نے ۱۰ ربیع الاول ۱۰۸۱ھ/ ۱۸ جولائی ۱۶۷۰ء کو عہد عالم گیری میں وفات پائی ❶۔

## ۱۲۴- مولانا محمد صادق جون پوری

مولانا محمد صادق بن ابوالبقا بن محمد درویش حسینی واسطی جون پوری کی جائے ولادت اور مقام نشوونما

❶ عمل صالح' ج ۳' ص ۲۹۸' ۲۹۹- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۹۵' ۹۶- مآثر عالم گیری' ص ۹۶- مآثر الامرا' ج ۲ (اردو ترجمہ)' ص ۲۹ تا ۳۱- بزم تیموریہ' ص ۲۲۶' ۲۲۷- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۲۷۵' ۲۷۶- برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ' ص ۲۵۳' ۲۵۴-

جون پور ہے۔ اپنے والد شیخ ابوالبقا سے تحصیل کی اور اونچے مرتبے کے علما وفضلا میں شمار ہوئے۔ بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر سے تقرب حاصل ہوا تو اس نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے محمد معظم کا معلم مقرر کر دیا۔ شہزادہ محمد معظم عرصہ تک ان سے تعلیم حاصل کرتا رہا۔ پھر جب وہ وارث ہند ہوا تو انھیں جہاں گیر نگر (ڈھاکہ) میں ایک قطعۂ اراضی عنایت کیا اور وہ وہاں سے (ڈھاکہ) چلے گئے۔

علوم وفنون پر ان کی گہری نظر تھی' چنانچہ ''شرح زنجانی'' اور ''شرح مائۃ عامل'' کتابیں لکھیں۔ فن مناظرہ میں ''الآداب الصادقۃ'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی' جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور (ہندوستان) میں موجود ہے۔ فن مناظرہ کی ایک اور کتاب ''العضدیہ'' پر حاشیہ تحریر کیا____ اس عالم دین نے ڈھاکہ میں وفات پائی' جس کو اس زمانے میں ''جہاں گیر نگر'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا[1]۔

## ۱۲۵- مفتی محمد صادق جون پوری

مفتی محمد صادق بن شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری' جلیل القدر عالم تھے۔ انھوں نے بعض کتب درسیہ اپنے والد مکرم مفتی شمس الدین صدیقی برونوی جون پوری (متوفی ۱۰۴۷ھ/ ۱۶۳۷ء) سے پڑھیں۔ زیادہ تر درسی کتابوں کی تعلیم کے لیے علامہ محمود عمری جون پوری (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/ ۹ فروری ۱۶۵۲ء) کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیے' اور اپنے عصر اور علاقے کے مشاہیر علما وفقہا میں سے گردانے گئے۔ بحث واشتغال میں انتہائی محنت سے کام لیتے تھے' علم کی تمام شاخوں سے بہرہ ور تھے۔ فتویٰ اور تدریس کی اعلیٰ صلاحیتیں ان میں پائی جاتی تھیں' اسی بنا پر اپنے رفیع القدر والد مفتی شمس الدین صدیقی جون پوری کی جگہ مسند افتا پر فائز کیے گئے۔

شیخ محمد صادق جون پوری' ورع وتقویٰ کے زیور سے آراستہ' قناعت وعفاف کی دولت سے مالا مال اور عبادت وتدین کے پیکر تھے۔ ہمیشہ سرگرم درس وافادہ رہتے۔ مدرسہ اور مسجد کے سوا اور کہیں نہ جاتے۔ کسی سے کوئی شی بطور نذرانہ یا تحفہ قبول نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ ان کے والد مفتی شمس الدین جون پوری کے ایک شاگرد' رکن الدین نے جو مدت کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور شائستہ خاں کے ندیموں میں سے تھے' ایک کشمیری شال تحفۃً پیش کی۔ یہ شال وہ اپنے شہر سے خاص جذبہ عقیدت کے ساتھ ان کے لیے لائے تھے' مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

ومن دلق را بہ اطلس شاہاں نمی خرم۔

(میں اپنی گدڑی میں اس شاہی اطلس سے زیادہ خوش ہوں۔ فقیر کو گدڑی کافی ہے۔)

زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مشہور عالم اور اپنے استاد علامہ محمود عمری جون پوری کے پیچھے نماز نہ پڑھتے

---

[1] تاریخ شیراز ہند جون پور' ص ۲۹۷' ۳۰۷- تجلی نور' ج ۲' ص ۶۵ - نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۷۶-

تھے' کیوں کہ علامہ محمود فلسفہ اور اس کے متعلقات میں انتہائی غلو اور انہاک رکھتے تھے۔

منقول ہے کہ ایک مرتبہ جون پور کے امیر شہر نواب اللہ وردی خاں نے ان کو ایسے کاغذات پر مہر افتا ثبت کرنے کا حکم دیا' جن کے مندرجات غیر مشروع تھے' مفتی محمد صادق نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ امیر کو بڑا غصہ آیا اور انتقام لینے کے لیے بات دل میں رکھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ اللہ وردی خاں ایک سفر میں انھیں ساتھ لے گیا اور کشتی میں سوار کیا' خود بھی اسی کشتی میں سوار ہوا۔ کشتی جب وسط دریا میں پہنچی تو وہی کاغذات نکالے اور جبراً مہر تصدیق ثبت کرانا چاہی۔ مفتی ممدوح نے مجبوراً مہر امیر مذکور کے حوالے کر دی' لیکن جب امیر کاغذات پر مہر ثبت کرنے لگا تو کوشش کے باوجود مہر نمایاں نہ ہوئی۔ امیر نہایت شرمندہ ہوا اور ان کے ورع و تقویٰ کا اعتراف کیا۔

مفتی محمد صادق جون پوری نے ۴/ ذی الحجہ ۱۰۶۸ھ/۲۲/ اگست ۱۶۵۸ء کو جون پور میں وفات پائی❶۔

## ۱۲۶- شیخ محمد صادق گنگوہی

شیخ محمد صادق بن فتح اللہ حنفی گنگوہی' دیار ہند کے مرکز علم و فضل بلدۂ گنگوہ کے باشندے تھے اور کبار مشائخ چشتیہ میں سے تھے۔ ولادت اور نشو و نما گنگوہ ہی میں ہوئی' اپنے عم محترم شیخ ابو سعید گنگوہی سے اخذ طریقت کیا۔ ان کے بعد مسند ارشاد سنبھالی۔ بہت سے حضرات نے ان سے حصول علم اور کسب فیض کیا۔ اپنے زمانے کے شیخ صالح اور نامور فقیہ تھے۔ ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء کو گنگوہ میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ خزینۃ الاصفیا میں سن وفات ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء مرقوم ہے اور نزہۃ الخواطر میں ۱۰۵۸ھ/ ۱۶۴۸ء۔❷!

## ۱۲۷- مولانا محمد صادق کشمیری

مولانا محمد صادق بن مولانا کمال الدین کشمیری' اپنے عصر اور شہر کے شیوخ میں سے تھے۔ دیار کشمیر اور خطہ ہند کے معروف عالم و مدرس مولانا کمال الدین کشمیری سیالکوٹی کے فرزند تھے۔ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ اور مرتبہ تحقیق و تدقیق پر فائز تھے۔ فروع مذاہب پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ منطق و حکمت اور طب کے ماہر تھے' فصیح البیان تھے اور مسائل شرعیہ کی عمدہ انداز سے وضاحت کرتے تھے۔ جہاں گیر بادشاہ نے ان کے علم و فضل کا شہرہ سنا تو دربار شاہی میں باریاب کیا اور اکابر علما کی صف میں جگہ دی۔ جب علمائے اہل سنت اور علمائے شیعہ کے

---

❶ تاریخ شیراز ہند جون پور' ص ۴۰۷'۳۹ - نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۷۷۔

❷ خزینۃ الاصفیا' ص ۴۶۰'۴۵۹ - نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۷۸'۳۷۷۔

درمیان مباحثہ و معارضے کا سلسلہ شروع ہوا تو اہل سنت کی طرف سے شیعہ عالم ملا حبیب اللہ سے مناظرے کے لیے علمائے اہل سنت نے انہی مولانا محمد صادق کو منتخب کیا' اور دلائل کے زور سے اپنے حریف ملا حبیب اللہ کو خاموش کرا دیا۔ مولانا محمد صادق کشمیری ''ملا محمد صادق دانا'' کے عرف سے معروف تھے۔ کشمیر میں وفات پائی۔

مناظرے کا یہ واقعہ مولوی فقیر محمد جہلمی نے حدائق الحنفیہ میں نقل کیا ہے اور اس کے حوالے سے علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی نے بھی مولانا محمد صادق کشمیری کی طرف منسوب کیا ہے' جب کہ تاریخ کشمیر اعظمی کے مصنف شہیر خواجہ محمد اعظم کا کہنا ہے کہ جہاں گیر سے مولانا کمال الدین کشمیری کے فرزند مولانا محمد رضا نے تعلقات استوار کیے تھے' وہی ''حکیم دانا'' کے عرف سے معروف تھے اور شیعہ عالم ملا حبیب اللہ سے مناظرہ بھی انہی نے کیا تھا۔

صاحب تاریخ کشمیر اعظمی نے مولانا محمد صادق کا ذکر ''خواجہ محمد صادق سوذ'' کے نام سے کیا ہے' انھیں کشمیر کے اکابر علما میں سے گردانا ہے اور لکھا ہے کہ وہ فقرا اور صوفیا کی صحبت میں رہنے لگے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی کی مصاحبت بھی اختیار کر لی تھی۔ حضرت مجدد نے دو ایک مکتوب بھی ان کے نام تحریر فرمائے تھے۔ طبع موزوں رکھتے تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے [1]۔

ہمارے خیال میں اس سلسلے میں تاریخ کشمیر کے مصنف شہیر کی روایت کو ترجیح دینی چاہیے۔ مگر ہم نے یہاں دونوں روایتیں بیان کر دی ہیں۔

## ۱۲۸- شیخ محمد صالح سندھی

شیخ محمد صالح بن ابراہیم سندھی ثم لاہوری' شیخ صالح اور فقیہ نامور تھے۔ علم و معرفت کے یگانۂ روزگار مشائخ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بعض درسی کتابوں کی تحصیل مفتی رزق اللہ سے اور اکثر کتابوں کی دیگر علمائے مشاہیر سے کی۔ پھر خواجہ باقی باللہ کے فرزند خواجہ عبداللہ سے وابستگی اختیار کر لی اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ لاہور میں اقامت گزین رہے۔ حسن اخلاق کے مالک تھے۔ اہل علم میں بڑے مشہور اور مقبول تھے [2]۔

## ۱۲۹- شیخ محمد طاہر لاہوری

شیخ محمد طاہر بلدۂ لاہور کے مشاہیر افاضل میں سے تھے۔ خطۂ لاہور میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں تربیت پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور علمائے لاہور سے تحصیل علم کی۔ حصول علم کے بعد شیخ اسکندر بن عماد کیتھلی سے

[1] تاریخ کشمیر اعظمی' ص ۱۳۳' ۱۳۴- حدائق الحنفیہ' ص ۴۲۸- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۷۸-

[2] نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۸۰ بحوالہ اسراریہ-

بیعت ہوئے۔ بعد ازاں شیخ عبدالاحد سرہندی کی صحبت اختیار کی۔ پھر ان کے نامور فرزند حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے منسلک ہوئے اور اخذ طریقت کیا۔ لاہور ہی کو مسکن ٹھہرائے رکھا اور درس وافادہ میں مشغول رہے۔ ان کے سلسلۂ درس وتدریس کی بڑی شہرت تھی۔ مجدد الف ثانی کے بیٹوں ــــــ شیخ محمد صادق، شیخ محمد سعید اور شیخ محمد معصوم سرہندی ــــــ نے بھی ان سے اخذ علم کیا۔ علما کی کثیر تعداد ان سے مستفید ہوئی۔

شیخ محمد طاہر لاہوری، قانع وعفیف اور متوکل علی اللہ بزرگ تھے۔ عمر بھر گھر کی چادیواری میں بیٹھ کر استفادے کا سلسلہ جاری رکھا، کبھی کسی صاحب ثروت اور امیر مملکت کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں کی کتابت وتصحیح اور تحشیہ نویسی میں مصروف رہتے۔ ان کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی وہی ذریعہ اکل وشرب تھا ــــ لاہور کے اس پیکر زہد وتقویٰ عالم وفقیہ نے ۲۰ محرم ۱۰۴۰ھ/ ۱۹ اگست ۱۶۳۰ء کو لاہور میں وفات پائی ❶۔

## ۱۳۰- مفتی محمد طاہر کشمیری

مفتی محمد طاہر کشمیری اپنے عصر اور خطۂ کشمیر کے عالم وفقیہ اور شیخ تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ میں منفرد شخصیت تھے۔ خطۂ کشمیر کے منصب افتا پر متعین تھے ❷۔

## ۱۳۱- شیخ محمد عاشق ہندی

شیخ محمد عاشق بن عمر ہندی، فضل وکمال میں مشہور تھے۔ مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری سے حدیث پڑھی۔ عالم اور فقیہ بزرگ تھے۔ صاحب تصنیف بھی تھے۔ شمائل ترمذی کی بڑی لطیف اور عمدہ شرح لکھی۔ ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۴ء کو فوت ہوئے ❸۔

## ۱۳۲- میر محمد علی کشمیری

میر محمد علی بن محمد نازک حسینی قادری کشمیری، شیخ صالح اور خیر وفضل سے متصف فقہائے ہند میں سے تھے۔ ارض کشمیر میں پیدا ہوئے، وہیں نشو ونما پائی اور اپنے والد گرامی قدر شیخ محمد نازک سے علم فقہ حاصل کیا۔

❶ زبدۃ المقامات، ص ۳۴۰- خزینۃ الاصفیا، ص ۵۸۵ تا ۵۸۷- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۱- تحقیقات چشتی، ص ۲۹۰ تا ۲۹۴-

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۲-

❸ حدائق الحنفیہ، ص ۴۰۴- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۸۲، ۳۸۳-

سلسلۂ قادریہ کے مطابق ان سے اخذ طریقت بھی کیا۔ پھر عازم سرہند ہوئے۔ اس زمانے میں مجدد الف ثانی کے فرزند شیخ محمد معصوم سرہندی کی مسند رشد و ہدایت آراستہ تھی‘ ان سے طریقہ نقشبندیہ کے مطابق کسب فیض کیا۔ بعد ازاں کشمیر کو مراجعت فرمائی اور خود ارشاد و ہدایت کی مسند بچھائی‘ ان سے بہت سے مشائخ کرام نے استفاضہ کیا___ ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کو سرزمین کشمیر میں فوت ہوئے ❶۔

## ۱۳۳۔مولانا محمد فاضل بدخشی

مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری‘ عین القضاۃ ہمدانی کی اولاد سے تھے۔ روستاق کے باشندے تھے جو اعمال بدخشاں میں واقع ہے‘ اسی علاقے کے مختلف مقامات کے علما سے علم حاصل کیا۔ پھر کابل گئے جہاں مولانا محمد صادق حلوائی کا سلسلۂ درس جاری تھا‘ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعد ازاں عازم توران ہوئے‘ وہاں اس عہد کے مشہور فاضل مرزا جان شیرازی اور ان کے تلمیذ رشید ملا کوسج سرگرم تدریس تھے‘ بہت سی کتابوں کی ان سے تحصیل کی۔ پھر وارد ہند ہوئے اور لاہور تشریف لائے۔ لاہور میں شیخ جمال الدین تلوی لاہوری کا ہنگامہ درس و افادہ بپا تھا‘ ان سے تفسیر اور اصول وغیرہ کی کتابیں پڑھیں اور علم و فضل کے مرتبہ بلند کو پہنچے۔ تخت ہند پر اس زمانے میں نورالدین محمد جہاں گیر متمکن تھا۔ مولانا محمد فاضل نے اس سے ملاقات کی۔ اس نے ان کے علم و فضل کی وجہ سے صوبہ پنجاب کی صدارت مرحمت فرمائی۔ اس کے لشکر کے میر عدل مقرر ہوئے۔ شاہ جہان بادشاہ کے آٹھویں سال جلوس تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر غالباً ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء کو اس خدمت سے استعفا دے دیا اور بادشاہ کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا یا جو قطعہ اراضی حاصل تھا‘ اسی پر قانع ہو گئے۔

درس و تدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ فاضل کبیر اور علامہ عصر تھے۔ کتابوں پر گہری نظر تھی۔ علما و طلبا کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کو لاہور میں وفات پائی اور اسی شہر میں مدفون ہوئے ❷۔

## ۱۳۴۔مولانا محمد قلی دہلوی

مولانا محمد قلی بن رستم نقشبندی کا مولد و مسکن دہلی ہے۔ شیخ عبدالباقی (باقی باللہ) کے نامور فرزند شیخ عبداللہ سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا۔ طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ شیخ صالح اور متورع عالم دین تھے۔ ”سراج المشکوٰۃ“ ان کی تصنیف ہے‘ جس میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ”اشعۃ اللمعات“ کے فوائد و نوادر جمع کیے گئے ہیں۔ ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۰ء کو فوت ہوئے ❸۔

❶ خزینۃ الاصفیا‘ ص ۹۸۹۔ نزہۃ الخواطر ص ۳۸۳۔

❷ باشاہ نامہ‘ ج ۲‘ ص ۳۴۰۔ عمل صالح‘ ج ۳‘ ص ۲۹۹۔ مرأۃ العالم (قلمی)۔ نزہۃ الخواطر‘ ج ۵‘ ص ۳۸۴۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۲۰۶۔ مآثر الامرا‘ ج ۱‘ ص ۴۸۳۔

❸ نزہۃ الخواطر‘ ج ۵‘ ص ۳۸۶ بحوالہ اسراریہ۔

## ۱۳۵-شیخ محمد معصوم سرہندی

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ کے سب سے بڑے بیٹے شیخ صادق تھے جو عالم جوانی میں بہ عارضہ طاعون وفات پا گئے تھے۔ بہت نیک، متقی اور عالم دین تھے۔ دوسرے بیٹے شیخ محمد سعید تھے، جو شعبان ۱۰۰۵ھ/ مارچ ۱۵۹۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۶۰ء کو وفات پا گئے۔ ان کا مرتبہ علم و فضل اور مقام زہد و تقویٰ بہت بلند تھا۔ تیسرے فرزند شیخ محمد معصوم تھے، جو ۱۱ شوال ۱۰۰۷ھ (یا ۱۰۰۹ھ/ ۲۷/ اپریل ۱۵۹۹ء یا ۱۶۰۱ء) کو متولد ہوئے۔ نہایت زاہد، متقی اور پرہیزگار تھے۔ علم و فضل کی دولت سے بھی بہرۂ وافر رکھتے تھے۔ علوم و معارف، انداز بیان، اسلوب کلام، تدین و تورّع، ہر بات میں اپنے جلیل القدر والد (شیخ احمد سرہندی) سے مشابہ تھے۔ چھوٹی عمر میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ گھر میں تصوف و طریقت کا چشمہ بہ رہا تھا، جس سے لاتعداد لوگ فیض پا رہے تھے، شیخ محمد معصوم نے بھی حصول علم و اخذ فیض کا اولین سلسلہ گھر سے شروع کیا۔ بعض درسی کتابیں اپنے برادر کبیر شیخ محمد صادق سے پڑھیں اور زیادہ کتابوں کا درس اپنے عظیم المرتبت والد اور شیخ محمد طاہر لاہوری سے لیا۔

مجدد الف ثانی نے اپنے اس بیٹے کو تقویٰ و تدین اور علم و فضل کے مقامات عالیہ پر فائز ہونے کی بشارت دی تھی۔ باپ کی وفات کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے۔ حج و زیارت کی سعادت حاصل کی اور عرصے تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ حج کے بعد واپس ہندوستان آئے اور درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ عمر بھر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ زیادہ تر تفسیر بیضاوی، مشکوۃ، ہدایہ، عضدی اور تلویح پڑھاتے تھے۔

شیخ محمد معصوم سرہندی کی مساعیٔ فیض و ہدایت کا سلسلہ بہت وسیع تھا۔ ان کی علمی و روحانی تگ و تاز سے جہالت کے اندھیرے ختم ہوئے اور علم کی روشنی پھیلی، بدعات کا زور ٹوٹا اور سنت کی راہیں نمایاں ہوئیں۔ کئی لاکھ افراد ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے اور اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی اتباع کرنے لگے۔ ان کے مکتوبات بھی ہیں جو تین مجلدات میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے والد کے مکتوبات کی طرح تصوف کے اسرار و لطائف اور شریعت کے احکام و اوامر کو متضمن ہیں۔

شیخ محمد معصوم نے ۹/ ربیع الاول ۱۰۷۹ھ/ ۷/ اگست ۱۶۶۸ء کو سرہند میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے [1]۔

## ۱۳۶-مولانا محمد مومن ترندی

مولانا محمد مومن بن عبداللہ حسینی ترندی، مشہور خطاط، بہت بڑے فاضل، بہترین شاعر اور فقہ و اصول کے جید عالم تھے۔ شاہ جہاں بادشاہ نے ان کی قابلیت و صلاحیت کی بنا پر اپنے پوتے شہزادہ سلیمان بن دارا شکوہ

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: زبدۃ المقامات، ص ۳۱۵ تا ۳۲۶-فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۵۴ تا ۵۷

کا معلم مقرر کیا۔ جب کبرسنی کو پہنچ گئے اور اسی (۸۰) سال کی عمر ہو گئی تو اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ ان کا ایک دیوان شعری بھی ہے۔ اس عالم وفقیہ نے ۱۰۹۰ھ/۱۶۷۹ء کو عہد عالم گیری میں وفات پائی ❶۔

## ۱۳۷- قاضی محمد مودود جون پوری

قاضی محمد مودود بن محمد حسین جون پوری ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں حصول علم کو مرکز توجہ ٹھہرالیا۔ حصول علم کے بعد صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری سے اخذ طریقت کیا اور ایک ضخیم کتاب کی صورت میں ان کے ملفوظات بھی جمع کیے' ملفوظات کی جمع وترتیب کا سلسلہ ۴ رصفر ۱۰۷۴ھ/ ۲۸ راگست ۱۶۶۳ء کو شروع کیا تھا' جو ۵ رربیع الثانی ۱۰۷۵ھ/ ۱۶ را کتوبر ۱۶۶۴ء میں ختم کیا۔ جلیل القدر عالم اور مشہور فاضل تھے۔ فقہ' اصول فقہ اور علوم عربیہ کے ماہر تھے۔ اپنے والد شیخ محمد حسین جون پوری کی زندگی ہی میں بادشاہ کی طرف سے جون پور کے محکمہ قضا پر متعین ہونے کی درخواست کی گئی' لیکن اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ باپ کو پتا چلا تو بیٹے کو ڈانٹا اور دھمکی دی کہ اگر بادشاہ کی جانب سے پیش کردہ منصب قضا قبول نہ کیا تو وہ انھیں گھر سے نکال دیں گے اور قطع تعلق کر لیں گے۔ قاضی محمد مودود نے باپ کے دباؤ میں آ کر قضا کا عہدہ قبول تو کر لیا لیکن جب بادشاہ کے حضور پیش ہوئے تو وہ مراسم تعظیم ادا نہ کیں جو بادشاہوں کے سامنے ادا کی جاتی تھیں' سنت کے مطابق سلام کیا۔ پھر جب باقاعدہ عہدۂ قضا سنبھال لیا تو چونگی محصول کی وصولی ختم کر دی۔ حدود جون پور میں مال پر جو ٹیکس لیے جاتے تھے' وہ معاف کر دیے اور یہ سب بادشاہ ہند سے باقاعدہ اجازت لے کر کیا۔ جون پور میں مسجدیں تعمیر کیں۔ ہر مسجد میں امام' موذن اور خادم مقرر کیے اور انھیں معقول تنخواہیں اور وظیفے دینے کا فیصلہ کیا۔ قاضی محمد مودود نے ایک کام یہ کیا کہ موذنوں کو جمعے کی پہلی اذان کہنے سے منع کر دیا۔ لیکن اس ممانعت کی بہ ظاہر کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

قاضی محمد مودود جون پوری نے ۶ رشوال ۱۰۷۸ھ/ ۱۰ر مارچ ۱۶۶۸ء کو الہ آباد میں وفات پائی ❷۔

## ۱۳۸- مولانا محمد نافع اکبر آبادی

مولانا محمد نافع اکبر آبادی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے مصاحب وندیم بختاور خاں کے لیے فارسی زبان میں "خلاصۃ الخانیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی' جو مسائل فقہیہ پر مشتمل تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے عالم اور فقیہ تھے ❸۔

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۰ بحوالہ مراۃ العالم۔

❷ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۱' ۳۹۲۔ بحوالہ گنج ارشدی۔

❸ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۳ بحوالہ مراۃ العالم

## ۱۳۹۔ شیخ محمد نعمان بدخشی

شیخ محمد نعمان بن شمس الدین بن جلال الدین بن حمید الدین حسینی بدخشی کا شمار اپنے عہد کے کبار مشائخ نقشبندیہ اور جلیل القدر فقہا میں ہوتا تھا۔ ان کے والد شیخ شمس الدین بھی فضل وتقویٰ میں یگانۂ روزگار اور مشاہیر بدخشاں و ماوراء النہر میں سے تھے۔ دادا شیخ جلال الدین اور پردادا حمید الدین بھی فضل وکمال کے جامع اور علم وادراک میں وحید الدہر تھے۔

شیخ محمد نعمان کی ولادت ۹۷۷ھ/۱۵۸۹ء کو بدخشاں میں ہوئی۔ منقول ہے کہ ان کی ولادت سے پیشتر ان کے والد شیخ محمد نعمان نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو خواب میں دیکھا کہ انھوں نے ان کو ایک سعادت مند فرزند کے تولد کی خوش خبری سنائی ہے اور فرمایا کہ حضرت امام کے نام کی مناسبت سے اس کا نام نعمان رکھا جائے۔ ان دنوں شیخ شمس الدین سخت مالی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ بیٹا پیدا ہوا تو نعمان نام رکھا۔ نعمان نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو اپنے علاقے کے فضلائے نام دار کی خدمت میں حاضری دی اور علم حاصل کیا۔ حصول علم کے بعد عنفوان شباب ہی میں شیخ عبداللہ بلخی سے بیعت ہو گئے۔ اس زمانے میں ہندوستان کو علم وفضل، زہد وتقویٰ اور تصوف وطریقت میں بڑی شہرت حاصل تھی اور برصغیر میں بے شمار اصحاب کمال کا سلسلۂ فیض جاری تھا۔ بہت سے شائقین علم وسلوک عرب وعجم کے متعدد ممالک سے یہاں آتے اور علم وعرفان کے مختلف گوشوں سے بہرہ یاب ہوتے۔ انہی بلند بخت حضرات میں شیخ محمد نعمان بھی تھے جو بدخشاں سے واردِ ہند ہوئے۔ سب سے پہلے دہلی گئے اور خواجہ عبدالباقی (باقی باللہ) نقشبندی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے فیض حاصل کیا۔ کافی عرصہ ان کی صحبت و ملازمت میں گزارا۔ ان کی وفات کے بعد شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے منسلک ہو گئے جو خواجہ باقی باللہ ہی کے فیض یافتہ تھے۔ مجدد الف ثانی سے علم ومعرفت پر عبور حاصل کیا اور بلند مرتبے کو پہنچے۔ پھر ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء کو عازم برہان پور ہوئے اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ علماو مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ ۱۰۵۸ھ/۱۶۴۸ء کو (ایک روایت کے مطابق ۱۰۶۰ھ/۱۶۵۰ء کو) اکبر آباد (آگرہ) میں فوت ہوئے ❶۔

## ۱۴۰۔ شیخ محمد ہاشم دہلوی

شیخ محمد ہاشم دہلوی، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بیٹے تھے۔ مشہور عالم اور محدث وفقیہ تھے۔ علمائے باعمل اور اللہ کے صالح بندوں میں سے تھے۔ مولد ومنشا دہلی ہے، جس کو برصغیر میں مرکز علم کی

❶ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: زبدۃ المقامات، ص ۳۲۶ تا ۳۴۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۹۳۔

حیثیت حاصل تھی۔ اپنے والد گرامی شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے تعلیم حاصل کی اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے۔ یہاں تک کہ حدیث اور فقہ میں ماہر کامل ہوئے۔ ان کے ایک بھائی مفتی نورالحق دہلوی تھے' وہ بھی علم و عمل میں یگانۂ روزگار تھے۔ فہرس التوالیف میں ان کے مرتبہ علمی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا:

جوہر طبع او بجودت و سلامت و قوت در علم خصوصاً بعلم شریف حدیث موصوف و ممتاز است ❶۔

## ۲۴۱۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی

خواجہ محمد ہاشم کشمی اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے استاد تھے۔ ان کا مولد و منشا سرزمین بدخشاں کا ایک قریہ ''کشم'' ہے۔ اپنے علاقے کے علمائے کرام سے علم حاصل کیا اور حدیث' فقہ اور دیگر علوم مروجہ میں مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ بعد ازاں ہندوستان آئے اور برہان پور گئے۔ وہاں شیخ محمد نعمان بدخشی کا سلسلۂ فیض جاری تھا' اس میں شامل ہو گئے۔ ان سے اخذ طریقت کیا۔ پھر ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء کو سرہند گئے' وہاں حضرت مجدد الف ثانی کا چشمہ علم و طریقت جاری تھا' عرصے تک ان سے استفاضہ کناں رہے' ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء میں ان سے سند حدیث حاصل کی اور تلقین ذکر کی اجازت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کے بعد برہان پور کو مراجعت فرمائی اور وہاں سکونت اختیار کی۔

خواجہ محمد ہاشم کشمی سے کثیر التعداد حضرات نے استفادہ کیا۔ فارسی زبان میں ''زبدۃ المقامات'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی' جس میں حضرت خواجہ باقی باللہ' ان کے فرزندان گرامی' خلفائے عالی مقام' شیخ عبدالاحد سرہندی' حضرت مجدد الف ثانی' ان کی اولاد' ان کے خلفا اور فیض یافتہ حضرات کے حالات بیان کیے ہیں۔ اپنے موضوع میں یہ ایک دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ہے اور اس دور کے تذکرۂ رجال میں حوالے کے طور پر اس کا نام آتا ہے۔ یہ کتاب مطبع نامی منشی نول کشور واقع کان پور میں باہتمام منشی بھگوان دیال' جنوری ۱۸۹۰ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔

## ۱۴۲۔ میر محمد ہاشم گیلانی

میر محمد ہاشم بن محمد قاسم حسینی گیلانی' شیخ' فاضل اور علامہ تھے۔ کبار علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے متعدد علما سے مختلف علوم کی تحصیل کی۔ علوم حکمیہ مرزا ابراہیم ہمدانی اور نصیر الدین حسین شیرازی سے حاصل کیے۔ حدیث' فقہ اور علوم عربیہ کے لیے شیخ محمد عربی محدث' شیخ عبدالرحیم حسانی اور شیخ علی نبیرہ علامہ عصام الدین اسفرائنی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ بارہ سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں اقامت گزیں رہے اور وہاں کے مختلف علما و فضلا سے مستفید ہوئے۔ شیخ حکیم علی گیلانی سے فنونِ ریاضی اور علم طب کی تحصیل کی۔

❶ [حی]ات شیخ عبدالحق محدث دہلوی' ص ۲۵۶۔ تذکرۂ شیخ عبدالحق محدث دہلوی' ص ۲۷۰۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۴۔

اس کے بعد احمد آباد میں مقیم ہو گئے اور درس و افادہ کا غلغلہ بلند کیا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے تخت حکومت پر شاہ جہان بادشاہ متمکن تھا۔ میر محمد ہاشم گیلانی کی شہرتِ علمی اس کے کانوں میں پہنچی تو اس نے ان کو احمد آباد کی صدارت پیش کی۔ عرصے تک اس منصب پر فائز رہے۔ پھر شاہ جہان نے ان کو اپنے بیٹے اورنگ زیب عالم گیر کا معلم مقرر کر دیا۔

میر محمد ہاشم گیلانی تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ جس زمانے میں وہ اورنگ زیب کو تعلیم دینے پر مامور تھے' اس زمانے میں تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا اور شاہ جہان کے نام معنون کیا۔ تحریر اقلیدس کے مقالہ تاسعہ پر بھی حواشی سپرد قلم کیے۔ اس عالم و فقیہ' ماہر معقولات و منقولات اور ممتاز طبیب نے اسی (۸۰) سال عمر پا کر ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۱ء کو اورنگ آباد میں انتقال کیا[1]۔

## ۱۴۳۔ شیخ محمد یحییٰ سرہندی

شیخ محمد یحییٰ سرہندی حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند تھے۔ ۱۰۲۷ھ/ ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوئے اور اپنے دو بھائیوں شیخ محمد سعید اور شیخ محمد معصوم سے اخذ علم کیا۔ تدقیق و فقاہت کے مرتبے کو پہنچے اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع فرمایا۔ علمائے ربانی میں سے تھے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے بیٹے خواجہ عبیداللہ کی صاحب زادی سے شادی ہوئی۔ حرمین شریفین گئے اور حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۰۹۸ھ/۳۰ اپریل ۱۶۸۷ء کو اکہتر سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

ایک روایت کے مطابق سال پیدائش ۱۰۲۴ھ/ ۱۶۱۵ء اور سال وفات ۱۰۹۶ھ/ ۱۶۸۵ء ہے[2]۔

## ۱۴۴۔ مولانا محمد یعقوب بنانی لاہور

مولانا ابو یوسف محمد یعقوب بنانی لاہوری' گیارھویں صدی ہجری کے دیار لاہور کے مشہور شیخ و عالم اور معروف محدث و فقیہ تھے۔ فنون حکمیہ میں بھی ماہر تھے۔ مولد و منشا لاہور ہے۔ اپنے عصر کے ممتاز اساتذہ سے علم حاصل کیا اور علوم و فنون میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ شاہ جہان بادشاہ نے ان کو فوج کے میر عدل کے عہدے پر مامور کیا۔

معقولات و منقولات کے جامع اور فروع و اصول کے ماہر تھے۔ مدرسہ شاہ جہانیہ کی مسند درس پر فائز تھے۔ بے شمار اصحاب علم نے ان سے استفادہ کیا۔ حدیث میں درک حاصل تھا۔ "الافق المبین فی اخبار

---

[1] بادشاہ نامہ' ج اول' ص ۳۴۵۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۵۔ بزم تیموریہ ص ۲۱۶۔ مقالات یوم عالم گیر' ص ۲۲۔ مرأۃ العالم۔

[2] الیانع الجنی۔ مشائخ مجددیہ' ص ۲۲۲' ۲۲۳۔ ہدیہ احمدیہ' ص ۸۶' ۸۷۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۵۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۵۸۔

المقربین" کے طبقہ تاسعہ میں رزق اللہ ان کی فراوانیٔ علم وفضل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے ان کو اثنائے درس میں دیکھا کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی پر شدید تنقید کرتے تھے۔

مولانا یعقوب بنانی لاہوری بہت بڑے مصنف اور شارح بھی تھے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں: الخیر الجاری شرح صحیح البخاری' المعلم شرح صحیح الامام مسلم' المصفی شرح الموطا' شرح تہذیب الکلام' شرح حسامی' شرح شرعۃ الاسلام' اساس العلوم (علم صرف میں) حاشیہ رضی' حاشیہ عضدی اور حاشیہ بیضاوی۔ درسی کتابوں کے ان شروح و حواشی اور تعلیقات سے ان کی وسعت علم اور کثرتِ مطالعہ کا پتا چلتا ہے۔ کتب درسیہ اور علوم مرجہ میں انہماک کا یہ عالم تھا کہ دور عالم گیری میں لشکر کے میر عدلیہ تھے' لیکن درس و افادہ کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونے دیا' ہمیشہ اس میں مشغول رہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ بالا کتب درسیہ پر ان کی تعلیقات وشروح سے بہ آسانی ہو جاتا ہے۔

لاہور کے اس عظیم عالم وفقیہ اور محدث نے ۱۰۹۸ھ/ ۱۶۸۷ء کو وفات پائی ❶۔

## ۱۴۵- سید محمود سندھی

سید محمود بن عبدالباقی بن محمود بن ابوسعید حسینی سبزواری ثم سندھی' اپنے عصر کے عالم وفقیہ تھے اور اللہ کے نیک بندوں اور باعمل علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ علم وکمال اور فضل وتقویٰ میں بے نظیر تھے۔ ان کے والد شیخ عبدالباقی بلاد سندھ کے شیوخ میں سے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد شیخ محمود نے مسند مشیخت سنبھالی اور ۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء کو انتقال کیا ❷۔

## ۱۴۶- شیخ محمود گجراتی

شیخ محمود بن محمد حسن عمری چشتی احمد آبادی گجراتی۔ احمد آباد میں پیدا ہوئے' وہیں پرورش پائی اور اپنے والد شیخ محمد حسن عمری سے جو عالم وفاضل بزرگ تھے' تعلیم حاصل کی۔ طویل مدت تک ان کی خدمت ومصاحبت میں رہے' ان سے اخذ طریقت بھی کیا' یہاں تک کہ اپنے علاقے اور عصر کے فقیہ صالح تسلیم کیے گئے۔ والد کی وفات کے بعد مسند مشیخت کو زینت بخشی اور بے شمار تشنگانِ علوم کو مستفید فرمایا۔ ۹ ربیع الثانی ۱۰۴۰ھ/ ۵ نومبر ۱۶۳۰ء کو احمد آباد میں فوت ہوئے ❸۔

---

❶ عمل صالح' ج ۳' ص ۳۰۱- مآثر عالم گیری' ص ۱۲۰' ۱۲۴' ۱۶۰- انفاس العارفین ص ۷۸ تا ۷۹- بزم تیموریہ' ص ۲۴۴- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۳- "نقوش" لاہور نمبر' ص ۵۰۸- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۹' ۴۴۰-

❷ تحفۃ الکرام' ص ۶۱۱- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۷-

❸ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۷ بحوالہ محبوب ذی المنن-

# ۱۴۷- شیخ محمود فاروقی جون پوری

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان میں شیخ محمود فاروقی جون پوری کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولا ریب انه لم یظهر بالهند مثل فاروقیین احمد هما فی الحقائق و هو مولانا الشیخ احمد السرهندی والثانی فی العلوم الحکمة والادبیة و هو الملا محمود الجون پوری۔

(یعنی سرزمین ہند میں دو ایسی فاروقی النسل شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں کہ کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک شیخ احمد سرہندی جو حقائق و معارف میں فقید المثال تھے' دوسرے شیخ محمود جون پوری جن کا علوم حکمیہ و ادبیہ میں کوئی حریف نہ تھا۔)

لیکن صاحب نزہۃ الخواطر عبدالحی حسنی لکھنوی ان میں تیسرے فاروقی النسل ہندی کا اضافہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اقول و ثالثهم الشیخ ولی الله بن عبدالرحیم العمری الدهلوی فانه کان عدیم النظیر فی الفلسفة الالهیة۔

(ان میں تیسرے فاروقی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں' جن کی فلسفۂ الٰہیات میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔)

ان سطور میں اختصار کے ساتھ فاروقی نسل کے جید عالم اور معقولات و منقولات کے وحید العصر فاضل' شیخ محمود جون پوری کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ شیخ محمود ۹۹۳ھ/ ۱۵۸۵ء کو کشور ہند کے مرکز علم و فضل جون پور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ محمد جون پوری کی نگرانی میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ شیخ محمد جون پوری اپنے علاقے کے بلند پایہ عالم تھے۔ لائق بیٹے نے درسی کتابیں انہی سے پڑھیں۔ اس زمانے میں جون پور کی مسند تدریس پر شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری متمکن تھے۔ شیخ محمود نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق و حکمت کی مروج و متداول کتابیں ان کے حلقہ درس میں پڑھیں' یہاں تک کہ فضیلت علمی کے مرتبۂ علیا کو پہنچے اور اپنے تمام اقران سے فوقیت لے گئے۔ سترہ سال کی عمر میں درسیات از بر ہو چکی تھیں۔ ذکاوت و فطانت' حدتِ ذہن و فکر اور قوت حفظ و ادراک کا یہ عالم تھا کہ اصناف علوم کے ہر گوشے پر گہری نظر تھی۔ صغر سنی ہی میں بڑی بڑی علمی مجلسوں اور فکری محفلوں میں جانے لگے تھے۔ وہاں کبار و مشاہیر علما سے ہم کلام ہوتے' اہم اور پیچیدہ مسائل پر ان سے مباحثے کرتے اور زورِ استدلال سے سب پر چھا جاتے۔ ان کی روانیٔ کلام اور قوت استدلال سے جون

پور کے علما وفضلا اور اعیان واکابر انتہائی متحیر ہوتے۔ اس عہد میں علوم حکمیہ اور معارف ادبیہ میں انھیں جو عبور و استحضار تھا، اس میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ یوں تو تمام اصناف علم پر عبور رکھتے تھے، لیکن فلسفہ وحکمت اور منطق و کلام میں تو بالخصوص ماہر کامل تھے، گیارھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں انھیں عالم کبیر اور امام شہیر کی حیثیت حاصل تھی۔ فلسفہ وحکمت کی جزئیات کی وضاحت میں مجتہد کے مرتبے پر فائز تھے۔

محمد یحییٰ بن محمد امین عباسی الہ آبادی وفیات الاعلام میں لکھتے ہیں کہ معانی، بیان اور فلسفہ ومنطق میں ارض ہند کا کوئی عالم شیخ محمود جون پوری کے مرتبے کو نہیں پہنچا۔ ایک مرتبہ ملک میں رصد گاہ تعمیر کرنے کا جذبہ دل میں بیدار ہوا، اور اس موضوع پر شاہ جہان بادشاہ سے گفتگو کے لیے اکبر آباد (آگرہ) گئے۔ اس سے بات کی، منصوبے کے تمام پہلو اس کے سامنے رکھے اور رصد گاہ کی ضرورت واہمیت کو واضح کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو اس عظیم اور مفید ترین منصوبے کی تکمیل کے لیے آمادہ کرلیا اور رصد گاہ کی تعمیر کے مسئلے پر وہ سنجیدگی سے غور کرنے لگا، لیکن اس کے ایک وزیر نے اس منصوبے کی مخالفت کی اور کہا کہ بلخ کی مہم درپیش ہے اور اس کے لیے بہت سے روپے کی ضرورت ہے۔ وزیر کی اس بات سے معاملہ ختم ہوگیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شیخ محمود جون پوری نے رصد گاہ کے لیے جو زمین تجویز کی تھی، کہتے ہیں یہ وہی زمین تھی جو اس سے قبل بعض حکما اس کام کے لیے منتخب کرچکے تھے۔

علامہ شیخ محمود کو تعمیر رصد گاہ کے سلسلے میں اپنی ناکامی اور شاہ جہان بادشاہ کے وزیر کی مخالفانہ گفتگو سے بہت مایوسی ہوئی۔ وہ واپس جون پور آگئے اور درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ بعدازاں شاہ جہان کے بیٹے شہزادہ شجاع نے ان کی طرف رجوع کیا، وہ انھیں اپنے ساتھ بنگال لے گیا اور ان سے علوم حکمیہ اور فنون فلسفہ کی تحصیل کی۔ نواب شائستہ خاں (یعنی ابوطالب بن ابوالحسن اکبر آبادی) نے ان سے الفرائد المحمودیہ پڑھی، علاوہ ازیں شیخ نورالدین جعفر جون پوری۔ "الآداب الباقیہ" کے مصنف شیخ عبدالباقی صدیقی اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔

شیخ محمود جون پوری اور شیخ محمد رشید جون پوری، دونوں شیخ محمد افضل جون پوری کے شاگرد تھے۔ دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے تھے اور دونوں کے علم وفضل کی وسعت اور جامعیت سے شیخ محمد افضل بہت خوش تھے اور ان عظیم الشان شاگردوں کا استاد ہونا ان کے لیے باعث فخر تھا۔ ان کا ارشاد ہے:

وقتے کہ علامہ تفتازانی و جرجانی از عالم رفتہ اند کسے اجتماع فاضل بہ ایں فضیلت در یک شہر نشان نہ دادہ۔

(یعنی جب سے علامہ سعدالدین تفتازانی (متوفی ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء) اور سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء) اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے ہیں، ایک شہر میں اس قسم کی فضیلت کے حامل فضلا کا اجتماع نہیں ہوا۔)

شیخ محمد افضل کی مراد شیخ محمود جون پوری اور شیخ محمد رشید جون پوری سے تھی کہ ایک ہی وقت میں دونوں جون پور میں موجود تھے اور خدمت علم انجام دیتے تھے۔

جس زمانے میں شیخ محمود جون پوری بنگال میں مقیم تھے اور شہزادہ شجاع کو درس دیتے تھے' اس زمانے میں بنگال ہی میں ان کی ملاقات مشہور بزرگ شیخ نعمت اللہ بن عطاء اللہ فیروز پوری متوفی ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء سے ہوئی' ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے اور ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں ان سے اخذ طریقت کیا۔

شیخ محمود نہایت حاضر جواب تھے لیکن کبھی ایسی بات زبان سے نہ نکالتے جس سے بعد میں رجوع کرنا پڑے۔

میر سید غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں لکھتے ہیں:

مدت العمر قولے ازو سر برنہ زد کہ ازاں رجوع کردہ باشد' ہرگاہ سائلے مسئلہ می پرسید' اگر دل حاضری بود بہ جواب می پرداخت' والا می گفت دریں وقت خاطر متوجہ جواب نیست۔

(عمر بھر میں کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے رجوع کرنے کی نوبت آئے۔ اگر طبیعت حاضر ہوتی' سائل کے ہر علمی سوال کا جواب دیتے۔ ورنہ فرماتے کہ اس وقت طبیعت آمادۂ جواب نہیں ہے۔)

شیخ ممدوح کا جہاں درس وافادے کا سلسلہ جاری تھا' وہاں وہ تصنیف وتالیف کے بھی ماہر تھے اور قلم میں بڑا زور تھا۔ علم فلسفہ میں شمس البازغہ ان کی شہرہ آفاق کتاب ہے اور وہ کتاب ہے جس کی وجہ سے فلسفہ و حکمت کے بڑے بڑے مراکز میں اسلامی ہند کی علمی سرگرمیوں کو ممتاز مقام عطا ہوا۔ یہ کتاب درس نظامیہ میں پڑھائی جاتی ہے اور علما وطلبا میں متداول ہے۔ حلقہ اہل علم میں اس سے بے حد اعتنا کیا گیا۔ ملا حسن' مولانا محمد یوسف اور مولانا عبدالحکیم وغیرہ اصحابِ حکمت نے اس پر حواشی لکھے۔ اس کے علاوہ معانی و بیان اور بدیع میں قاضی عضد الدین ایجی کی کتاب فوائد غیاثیہ پر جو بڑی مشہور کتاب ہے' الفرائد کے نام سے شرح قلم بند کی اور اسے الفرائد شرح الفوائد کے نام سے موسوم کیا۔ اس کتاب پر ممدوح نے نہایت عمدہ تعلیقات وحواشی لکھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ محمود فصاحت و بلاغت اور بدیع و معانی میں کس درجہ تبحر رکھتے تھے۔ ایک کتاب شیخ محب اللہ الہ آبادی کی التسویہ کے جواب میں حرز الایمان کے نام سے تصنیف کی۔

شیخ محمود جون پوری نے ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ/ ۹ فروری ۱۶۵۲ء کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

شیخ موصوف کی وفات کے وقت ان کے استاد شیخ محمد افضل جون پوری زندہ تھے۔ انھیں لائق شاگرد کی موت کا پتا چلا تو نہایت حزن و ملال کا اظہار کیا اور اس درجہ غم والم میں مبتلا ہوئے کہ چالیس دن تک لب آشنائے تبسم نہیں ہوئے۔ بالآخر چالیس روز بعد ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ/۲۰ مارچ ۱۶۵۲ء کو اپنے اس جلیل القدر شاگرد سے جا ملے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

گیارھویں صدی ہجری کا ہندوستان علمی و تحقیقی لحاظ سے بے حد زرخیز اور پرثروت تھا۔ مختلف مقامات میں فحول علمائے کرام کے تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس کے وسیع سلسلے جاری تھے۔ اس دور میں خاندان مغلیہ کے یکے بعد دیگرے تین عظیم الشان حکمران تخت نشین ہند ہوئے' جلال الدین اکبر' نورالدین محمد جہاں گیر اور شہاب الدین شاہ جہان۔ انھوں نے اس ملک کی بڑی علمی خدمت کی۔ اس کی تہذیب اور ثقافت کو خوب ترقی دی اور برصغیر میں علم و تحقیق کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا جس سے اب تک لوگ متمتع ہو رہے ہیں۔ جن علمائے عالی مقام' فضلائے عظام اور فقہائے نام دار نے اس صدی میں علم و فضل' زہد و تقویٰ اور تصوف و طریقت میں ارتقا و تقدم کی منزلیں طے کیں' ان میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی' شیخ عبدالحق محدث دہلوی' علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی' مولانا محمد فاضل لاہوری' مولانا محمد یعقوب صرفی کشمیری' شیخ محمود جون پوری' مولانا محمد افضل جون پوری' صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری' شیخ معین الدین کشمیری' مولانا عبدالسلام لاہوری' مولانا کمال الدین کشمیری' مولانا جمال الدین کشمیری' مولانا عبداللہ سیالکوٹی' شیخ عیسی سندھی' شیخ اسماعیل لاہوری' علامی سعد اللہ چنیوٹی لاہوری' قاضی اللہ داد بلگرامی' شیخ بلال لاہوری اور مولانا جان محمد لاہوری وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

علمائے کرام اور فقہائے عظام کے علاوہ اصحاب طریقت اور ارباب تصوف کی بھی بہت بڑی جماعت اس عہد میں برصغیر پاک و ہند کے مختلف بلاد و امصار اور قصبات و دیہات میں موجود تھی [1]۔

## ۱۴۸- شیخ محمود سہارن پوری

شیخ محمود بن مصطفیٰ بن عبدالستار انصاری سہارن پوری کی ولادت و تربیت ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر سہارن پور میں ہوئی۔ پہلے علم نحو اور دیگر علوم عربیہ کی تحصیل کی' پھر اپنے دور کے اساتذہ سے علم فقہ حاصل کیا۔ حصول علم کے بعد گنگوہ کا قصد کیا۔ وہاں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بیٹے شیخ رکن الدین گنگوہی کا سلسلۂ فیض جاری تھا' ان سے اخذ طریقت کیا۔ علم اور طریقت سے فارغ ہو کر حجازِ مقدس کا عزم فرمایا' سعادت حج سے بہرہ ور ہوئے اور مدینہ منورہ گئے۔ عرصے تک مختلف بلاد و امصار کی سیر و سیاحت کرتے رہے۔ اس اثنا میں بہت سے مشائخ و علما سے ملاقات ہوئی' ان کی صحبت اختیار کی اور کسب فیض فرمایا۔ بعد ازاں اپنے شہر سہارن پور آ گئے تھے۔

شیخ محمود انصاری سہارن پوری اللہ کے برگزیدہ بندوں اور صالح مشائخ میں سے تھے۔ ۵ ذی الحجہ ۱۰۵۰ھ/ ۷ر مارچ ۱۶۴۱ء کو فوت ہوئے [2]۔

---

[1] شیخ محمود جون پوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: عمل صالح' ج ۳' ص ۳۴۲- تجلی نور' ج ۲' ص ۴۸ تا ۵۱- تاریخ شیراز ہند جون پور' ص ۶۸۸ تا ۶۹۰- مآثر الکرام' دفتر اول ص ۱۸۹ تا ۱۹۱- وفیات الاعلام- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب' ص ۱۹۸- تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۲۱- حدائق الحنفیہ' ص ۴۱۲' ۴۱۳- ابجد العلوم' ص ۹۰۱' ۹۰۲- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۷ تا ۳۹۹- سبحۃ المرجان' ص ۵۳ تا ۶۳- رود کوثر' ص ۳۳۶- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۳۴' ۱۳۵-

[2] نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۳۹۹ بحوالہ مرآۃ جہاں نما-

# ۱۴۹-مولانا محی الدین بہاری

مولانا محی الدین بن عبداللہ بہاری' ملا موہن بہاری کے عرف سے معروف تھے۔ ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر "بہار" کے نواح میں متولد ہوئے' نشوونما بھی اسی گاؤں میں پائی۔ حصول علم کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ نو سال کی عمر کے تھے کہ قرآن مجید حفظ کر لیا۔ ان کے والد مولانا عبداللہ بہاری بھی صاحب علم بزرگ تھے۔ حفظ قرآن کے بعد ان سے درسی کتابیں پڑھنا شروع کیں اور سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ پھر اپنے شہر میں درس و افادے کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس دور کے مشاہیر فقہا میں گردانے گئے۔ کچھ عرصہ شائقین علم کو پڑھاتے اور مستفید کرتے رہے۔ بعد ازاں دہلی گئے اور شاہ جہان بادشاہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر اپنے بیٹے اورنگ زیب کا معلم مقرر کر دیا۔ بارہ سال اس خدمت علمی پر مامور رہے۔ پھر تصوف و طریقت کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے پوتے شیخ حیدر کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے اخذ طریقت کیا۔ اس کے بعد اپنے شہر بہار واپس چلے گئے اور سب اطراف سے منقطع ہو کر زہد و عبادت کی زندگی اختیار کر لی۔ اس اثنا میں علم نحو کی انتہائی کتاب "کافیہ" کی مبحث غیر منصرف تک فارسی زبان میں شرح سپرد قلم کی۔ حقائق و معارف کے انداز ہی میں مبحث غیر منصرف تک عربی زبان میں "کافیہ" کی ایک شرح شیخ ابوالبقا نے لکھی ہے۔

گنج ارشدی میں شیخ غلام ارشد جون پوری لکھتے ہیں کہ مولانا محی الدین بہاری شیخ محمد افضل جون پوری کے شیوخ میں سے تھے۔ وہ ایک مرتبہ جون پور تشریف لائے اور شیخ محمد افضل کے ہاں گئے۔ شیخ اس وقت درس دے رہے تھے اور طلبا کی جماعت ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے مولانا محی الدین کے اعزاز میں درس بند کرنے کا ارادہ کیا لیکن مولانا نے روک دیا اور فرمایا کہ ان کی موجودگی میں سلسلۂ درس جاری رکھا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری طلبا کی جماعت میں شیخ محمد افضل سے درس لے رہے تھے اور مولانا محی الدین بہاری شیخ محمد رشید کی استعداد علمی سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ غالباً یہ اس بنا پر تھا کہ شیخ محمد رشید کی شہرت زمانۂ طالب علمی ہی میں اہل علم میں پہنچ گئی تھی۔ مولانا محی الدین بہاری نے دوران درس میں کسی مسئلے میں شیخ محمد رشید سے مذاکرہ و مباحثہ شروع کر دیا۔ شیخ نے ان کو اس انداز سے جواب دیا اور اس نہج سے بحث میں حصہ لیا کہ قریب تھا کہ مولانا کو خاموش کرا دیں' مگر شیخ محمد افضل نے اپنے لائق شاگرد کو خاموش رہنے کا حکم دیا اور وہ خاموش ہو گئے۔

مولانا محی الدین بہاری نے ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء کو وفات پائی [1]۔

---

[1] مآثر الکرام' دفتر اول ص ۴۱' ۴۲ - نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۰۰' ۴۰۱۔

## ۱۵۰- قاضی مرتضیٰ بیجاپوری

قاضی مرتضیٰ بن محمود نائطی بیجاپوری کا لقب رضی الدین تھا۔ اپنے عصر کے نامور عالم وفقیہ اور شیخ تھے۔ ان کے والد محمود نائطی بندرگاہ گوا کے قاضی تھے۔ والد کی وفات کے بعد ۹۹۳ھ میں یہ منصب لائق بیٹے کو ملا۔ قاضی ممدوح مصنف بھی تھے' فن صنائع و بدائع سے متعلق سلطان ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں ''تحفۃ الفقیر'' کے نام سے ایک مفید کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب لکھ کر بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ کو بطور تحفہ پیش کی' بادشاہ نے اسے بہت پسند کیا❶۔

## ۱۵۱- سید مصطفیٰ بیجاپوری

سید مصطفیٰ بن ہاشم بن برہان الدین علوی گجراتی بیجاپوری کا مولد ومنشا بیجاپور ہے۔ ان کے والد سید ہاشم بیجاپوری عالم و فاضل بزرگ تھے' بیٹے نے انہی سے اخذ علم اور کسب طریقت کیا۔ طویل عرصے تک ان کی مصاحبت میں رہے' علمائے ربانی اور فضلائے مشاہیر میں گردانے گئے۔ والد کے بعد مسند مشیخت کے وارث بنے۔ عوام وخواص میں مقبول اور حسن اخلاق میں مشہور تھے۔ ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۶۰ء کے لگ بھگ بیجاپور میں فوت ہوئے❷۔

## ۱۵۲- شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی

شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی کا نسب نامہ یہ ہے: مصطفیٰ بن عبدالحمید بن بن راجو بن سعدی بن عارف بن عبدالواسع بن منجھلی بن ہدی بن عبدالملک بن منتھن بن نصیر الدین بن بخشی ____ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی کو لوگ شیخ رومی عثمانی برونوی کے لقب سے پکارتے تھے۔ شیخ سری بن مفلس سقطی عثمانی کی اولاد سے تھے' جو مشہور ولی اور متقی بزرگ تھے۔ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی اپنے دور کے عالم وفقیہ اور پرہیزگار بزرگ تھے' اور صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ/ ۱۹/ دسمبر ۱۶۷۲ء) کے والد تھے۔ یہ دراصل ''سکلائی'' کے باشندے تھے جو علاقہ اودھ میں اعمال امیٹھی میں ایک قریہ تھا۔ شیخ مصطفیٰ نے موضع سکلائی میں نشوونما پائی اور شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی (متوفی ۲۶/ ذی القعدہ ۱۰۱۱ھ/ ۲۷/ اپریل ۱۶۰۳ء) سے بیعت ہوئے۔ پھر حصول علم کا شوق پیدا ہوا اور اپنے علاقے کے علما سے تحصیل کی۔ بعد ازاں ان کے مرشد شیخ محمد بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی نے جون پور جانے کی اجازت مرحمت فرمائی اور وہ جون پور چلے گئے۔ جون پور

❶ تاریخ النوائط' ص ۳۰۵- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۰۳-

❷ الخواطر' ج ۵' ص ۴۰۶ بحوالہ محبوب ذی المنن-

علمائے عظام کا مرکز تھا اور مختلف علما و مشائخ کے درس و تدریس اور تصوف و طریقت کے سلسلے جاری تھے' شیخ مصطفیٰ بھی ان سے منسلک ہو گئے۔ وہاں کے اساتذہ سے علم حاصل کیا اور شیخ قیام الدین بن قطب الدین جون پوری سے خرقہ طریقت عطا ہوا۔ پھر امیٹھی کا قصد کیا اور کافی عرصہ وہاں مقیم رہے۔ امیٹھی سے موضع برونہ منتقل ہو گئے جو اس زمانے میں اعمال جون پور میں ایک گاؤں تھا۔ برونہ کے نامور بزرگ شیخ نورالدین بن عبدالقادر صدیقی برونوی کی صاحب زادی سے شادی کی اور اللہ نے اس سے اولاد عطا کی۔ پھر ایک وقت آیا کہ اہل و عیال کو برونہ میں چھوڑا اور خود علاقہ بنگال کے ایک شہر ''پرینہ'' چلے گئے' وہاں اقامت اختیار کر لی' مدفن بھی وہی ہے۔ ان کے بیٹے شیخ محمد رشید جون پوری نے جو سرزمین برصغیر کے بہت بڑے عالم اور صاحب تصانیف مشہور تھے' اپنے نانا شیخ نورالدین برونوی کے ہاں تربیت حاصل کی اور ابتدائی کتابیں (بعض انتہائی بھی' جیسا کہ شیخ محمد رشید جون پوری کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے) انہی سے پڑھیں ___ شیخ مصطفیٰ عثمانی برونوی' فقیہ' زاہد' متورع اور متوکل علی اللہ تھے۔ مشتبہات سے دامن کشاں رہتے تھے۔ انھوں نے ۲۰/ذی الحجہ ۱۰۷۶ھ/۱۳/جون ۱۶۶۶ء کو پرینہ میں وفات پائی ❶۔

## ۱۵۳- خواجہ معین الدین کشمیری

خواجہ معین الدین نقشبندی کشمیری کا سلسلہ نسب یہ ہے: معین الدین بن خاوند محمود بن ضیاء الدین بن میر محمد بن تاج الدین بن علا الدین عطار بخاری نقشبندی کشمیری۔ خواجہ معین الدین کشمیری خطۂ کشمیر کے ممتاز بزرگ حضرت خواجہ خاوند محمود (متوفی ۱۲/شعبان ۱۰۵۲ھ/۲۶/اکتوبر ۱۶۴۲ء) کے فرزند تھے۔ خواجہ خاوند محمود کبار مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے۔ ماوراء النہر اور اس کے گرد و نواح میں بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے اور ان کے ارادت مند دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کے عہد میں کابل سے ہندوستان آئے اور کشمیر میں سکونت اختیار کی۔ کئی مرتبہ لاہور' دہلی اور آگرہ گئے' ملوک و امرائے سلطنت سے ملے اور اپنے تدین کی وجہ سے ان کے نزدیک انتہائی عزت و اکرام کے مستحق قرار پائے۔ کشمیر میں ترویج اسلام کی اور ہزاروں لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے ❷۔

خواجہ معین الدین کشمیری' انہی خواجہ خاوند محمود کے بیٹے تھے' جن کا شمار مشائخ نقشبندیہ اور فقہائے کشمیر میں ہوتا تھا۔ ان کا مولد و منشا کشمیر ہے۔ گھر میں علم کے چشمے بہہ رہے تھے۔ اپنے والد گرامی خواجہ خاوند محمود سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں اور فقہ کی کچھ تعلیم حاصل کی۔ مزید حصول علم کی غرض سے دہلی گئے' وہاں شیخ عبدالحق

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۰۷۔

❷ عمل صالح' ج ۳' ص ۲۸۴- نیز ملاحظہ ہو' تاریخ کشمیر اعظمی' ص ۱۳۸ تا ۱۴۰-

محدث دہلوی کی تدریسی سرگرمیاں جاری تھیں، ان کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور کافی عرصہ وہاں رہ کر حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھیں، یہاں تک کہ اپنے عہد کے جید عالم اور نامور فقیہ گردانے گئے۔ بعد ازاں کشمیر واپس آئے اور مسند مشیخت کو زینت بخشی۔ علم وفضل کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ اس عہد کے بڑے بڑے کشمیری اصحاب علم اور ارباب طریقت ان کی خدمت میں آتے اور استفادہ کرتے۔ ان علمائے کرام میں ملا محمد طاہر کشمیری خلف مولانا حیدر کشمیری، علامہ ابوالفتح کلو، ملا یوسف مدرس، مفتی محمد طاہر، مولانا عبدالغنی اور مولانا مفتی شیخ احمد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ وہ حضرات علمائے عظام تھے، جو علوم شریعت کے ماہر اور مبلغ تھے اور احکام شرعیہ میں خواجہ معین الدین کشمیری سے طالب فتویٰ ہوتے تھے۔ یعنی وضاحت مسائل شرعیہ اور افتا میں خواجہ ممدوح علمائے کشمیر کے مرکز ومرجع تھے۔ خطۂ کشمیر کے ارکان دولت، ارباب حکومت اور خواص وعوام سب اس سلسلے میں ان سے رجوع کرتے تھے۔

خواجہ معین الدین کشمیری نے کشمیری مسلمانوں میں اتباع شریعت اور ترویج سنت کا جذبہ پیدا کیا۔ بدعات کو ختم کرنے اور خلاف شرع رسوم کو مٹانے میں بے حد کوششیں کیں۔ وہ زاہد وعابد اور متقی ومتورع عالم و فقیہ تھے۔ مصنف بھی تھے، فتاویٰ نقشبندیہ اور کنز السعادات، مسائل فقہ میں ان کی تصانیف ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی زبان میں سیر وسلوک سے متعلق ایک رسالہ ''رضوانی'' لکھا۔ مرأۃ القلوب، سید خیر البشر اور مرأۃ طیبہ بھی ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کی دو ضخیم تفسیریں بھی ہیں۔ ایک زبدۃ التفاسیر عربی میں اور دوسری شرح القرآن فارسی میں۔!

خواجہ ممدوح نے ماہ محرم ۱۰۸۵ھ/اپریل ۱۶۷۴ء میں کشمیر میں وفات پائی ❶۔

## ۱۵۴- شیخ منوّر لاہوری

شیخ منور بن عبدالحمید بن عبدالشکور بن سلیمان بن اسرائیل لاہوری، علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔ شیخ سعداللہ بن ابراہیم لاہوری ان کے خالو تھے، جو اپنے وقت کے جید عالم اور متقی بزرگ تھے، انہی سے اخذ علم کیا اور مرتبہ عالی کو پہنچے۔ قوت حفظ وادراک نہایت تیز تھی۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہوگئے تھے۔ قرات وتجوید پر عبور رکھتے تھے اور قرات سبعہ کے عالم تھے، حسن صورت اور حسن سیرت کے زیور سے آراستہ تھے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر ان کی فراوانی علم وفضل سے بہت متاثر تھا، ۹۸۵ھ/۱۵۷۷ء میں اس نے ان کو مالوہ کے منصب صدارت پر مامور کیا۔ جب وہ مالوہ کے شہر سارنگ پور پہنچے تو وہاں علما وفضلا

❶ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۶۷، تا ۱۶۹۔ تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۲۹۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۲۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ رود کوثر، ص ۱۴۰۔ ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۶۷ء۔

اور اصحاب طریقت وسلوک کی ایک جماعت موجود تھی' انھوں نے جوش اور مسرت سے انھیں خوش آمدید کہا اور بڑی تکریم سے پیش آئے۔ دس سال سارنگ پور میں قیام رہا۔ منصب صدارت کے ساتھ ساتھ وہاں غلغلۂ تدریس بھی بلند کیے رکھا۔ اس اثنا میں بے شمار شائقین علم وعرفان نے ان سے استفادہ کیا اور شہرت علمی پورے ملک میں پھیل گئی۔

شیخ منور ارض لاہور کے وہ عالم کبیر ہیں' جن کا ذہن رسا' تفسیر' حدیث' فقہ' منطق وحکمت اور تمام علوم مروجہ کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اکبر کے سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہونے سے پہلے چوالیس سال اقلیم علم میں سیاحت کناں رہے اور درس وتدریس کو بنیادی مشغلہ قرار دیے رکھا۔

امیر فتح اللہ شیرازی (متوفی ۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء)' ان کے علم وفضل کے بہت مداح تھے۔ یہ شیراز میں پیدا ہوئے تھے۔ مسلکاً شیعہ تھے اور علوم حکمیہ کے متبحر عالم تھے' بیجا پور کے بادشاہ علی عادل شاہ کی دعوت پر ہندوستان آئے اور اس کے پاس بیجا پور میں قیام پذیر ہوئے۔ اس کے قتل کے بعد ۹۹۱ھ/۱۵۸۳ء میں آگرہ گئے اور جلال الدین اکبر بادشاہ سے ملاقات ہوئی۔ اکبر نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء میں منصب صدارت عطا کیا اور امین الملک کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ پھر عضد الدولہ کا خطاب دیا۔ بعد ازاں عضد الملک کے لقب سے نوازا اور دیوان وزارت میں داخل کیا۔ اپنے دور کے فحول علما اور مشاہیر حکما میں سے تھے۔ جب یہ اکبر کے فرمان کے مطابق آگرہ گئے تو شیخ منور لاہوری بھی وہیں سکونت فرما تھے۔ ایک روز منطق و حکمت کے موضوع پر شیخ منور سے گفتگو ہوئی تو بہت سے فکری عقدے حل ہوئے اور متعدد علمی گوشوں سے پردے اٹھے۔ خوش ہو کر شیراز کے اس عظیم عالم نے فرمایا ''سیر ہند کرتے ہوئے مدت گزر گئی' اس طویل عرصے میں آج پہلا موقع ہے کہ شیراز کی مہک علمی دماغ آرزومند میں پہنچی۔''

حکیم شمس الدین علی گیلانی' اکبر کی عنایات شاہی سے حکیم الملک کے خطاب سے سرفراز تھے اور مولانا شاہ محمد شاہ آبادی سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں شیخ منور لاہوری کے بیٹے شیخ کبیر کا بیان ہے کہ ایک روز بادشاہ کے حضور عرض گزار ہوئے کہ تفسیر بیضاوی اور دیگر منتہی کتابوں پر ان کے استاد مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے ایسے اعتراضات کیے ہیں کہ علمائے وقت ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں' اور شاہ آبادی عالم اس باب میں سب پر غالب ہیں۔ حکیم گیلانی نے شہنشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ علما کی مجلس منعقد کر کے ان کے اعتراضات وایرادات سے متعلق گفتگو کی جائے۔ چنانچہ اکبر نے جو پہلے ہی اس قسم کی مجالس کے انعقاد کا متمنی رہتا تھا' اس کا انتظام کیا اور مجلس علما میں علم وعقل کا دنگل شروع ہوا۔ قرآن کی آیت: ﴿وَاِذَا بْتَلٰـى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ کی تفسیر پر حکیم موصوف نے مولانا شاہ آبادی کا اعتراض پیش کیا۔ قاضی صدر الدین لاہوری ثالث مقرر ہوئے۔ شیخ منور نے اس انداز سے اس آیۂ کریمہ کی وضاحت کی اور اس اسلوب سے اعتراض کا جواب دیا کہ حاضرین مجلس حیران رہ گئے۔ قاضی صدر الدین نے شیخ کو داد دیتے ہوئے کہا کہ شیخ

منور نے قاضی ناصر الدین بیضاوی کی عبارت کی اس حسن و خوبی سے وضاحت کی ہے اور اس عمدگی سے اعتراض کا جواب دیا ہے کہ اگر خود بیضاوی موجود ہوتے تو شیخ کی نگاہِ دور بین کی تحسین فرماتے۔

دس سال کے بعد ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں اکبر نے شیخ منور کو سارنگ پور (مالوہ) کے عہدۂ صدارت سے معزول کیا اور ان کی جگہ عضد الدولہ میر فتح اللہ شیرازی کو صدر مقرر کر کے بھیجا۔ میر شیرازی وہاں پہنچے تو شیخ منور سے بعض علمی نکات پر بحث شروع ہوئی۔ شیخ منور نے مقدمہ طوالع کی شرح ان کو دکھائی جس کی عبارت بڑی مشکل اور الجھی ہوئی تھی۔ میر فتح اللہ نے جواب کے لیے ایک دن کی مہلت مانگی۔ دوسرے دن پھر گفتگو شروع ہوئی تو فرمایا میں نے اس پر کچھ مسودہ تیار کیا ہے، جس سے مسئلہ زیر بحث کی عقدہ کشائی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو میرے ساتھ بھیجیے تاکہ میں اسے صاف کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ شیخ منور کا فرستادہ دو تین منزل تک ان کے ساتھ گیا اور بغیر جواب لیے واپس آ گیا۔

بہرحال شیخ منور لاہوری بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ اکبر نے ۹۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں ان کو سارنگ پور کی صدارت سے معزول کر کے قلعہ گوالیار میں محبوس کر دیا، پانچ سال قید و بند میں مبتلا رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے بڑا تصنیفی کام کیا۔ چنانچہ "الدرر النظیم فی ترتیب الآی وسور القرآن الکریم" کے نام سے قرآن کی تفسیر لکھی۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تفسیر قرآن حکیم "البحر المواج" کو جو فارسی زبان میں ہے، عربی میں منتقل کیا۔ ایک کتاب "حدائق البیان شرح علیٰ بدیع البیان" سپرد قلم کی۔ شرح طوالع لکھی، بوصیری کے قصیدہ بردہ کی شرح قلم بند کی۔ ایک رسالہ "الحق الصریح فی اثبات عدم قبول التوبة الساب النبی ﷺ" تحریر کیا۔ یہ رسالہ انھوں نے مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری کے جواب میں لکھا تھا۔ عبداللہ سلطان پوری نے ایک رسالے میں رسول اللہ ﷺ پر سب وشتم کرنے والوں کی قبولیت توبہ کا اثبات کیا ہے۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی "الارشاد" کی شرح بھی لکھی، نیز شیخ حسن صغانی لاہوری (متوفی ۶۲۰ھ/۱۲۲۳ء) کی حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" کی شرح سپرد قلم فرمائی۔

شیخ منور پانچ برس قلعہ گوالیار میں قید رہے۔ اس مدت میں انھوں نے اپنی تفسیر "الدرر النظیم فی ترتیب الآی سور القرآن الکریم" اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۲۵ رجب ۸۵۹ھ/ ۲۷ راکتوبر ۱۴۴۵ء) کی تفسیر "البحر المواج" کو عربی کے قالب میں ڈھال لیا تھا، اور دونوں تفسیروں کا مسودہ مکمل کر لیا تھا۔ اب وہ نظر ثانی اور تصحیح کرنا چاہتے تھے کہ فرماں روائے ہند جلال الدین اکبر کے غیظ وغضب کا پارہ اور چڑھ گیا اور وہ تمام کتابیں جو جیل میں لکھی تھیں، اور کم وبیش ڈیڑھ ہزار اجزا پر مشتمل تھیں، ایک ایک ورق کر کے چھین لی گئیں اور کتب خانہ شاہی میں جمع کر دی گئیں۔ افسوس ہے وہ سب کتابیں ضائع ہو گئیں، صرف ایک کتاب تفسیر قرآن "الدرر النظیم فی ترتیب الآی و سور القرآن الکریم" محفوظ رہ سکی، جو کسی طرح قیدخانے میں مصنف کے پاس رہ گئی تھی۔

اس اثنا میں بادشاہ کا غصہ اور بڑھا تو حکم صادر ہوا کہ شیخ منور کو قلعہ گوالیار سے دارالحکومت آگرہ میں لایا جائے' اس حکم کی تعمیل کی گئی اور زندگی کے جو چند روز باقی رہ گئے تھے' نہایت تنگی اور تاریکی میں بسر کیے۔ بالآخر ۱۲/ذی القعدہ ۱۰۱۱ھ (۱۳/اپریل ۱۶۰۳ء) کو اس عالم کون وفساد سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ موت کے بعد مرکزِ علم و تحقیق لاہور کے اس جلیل القدر عالم وفقیہ اور مفسر و محدث کو غربا اور فقرا کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ بعد ازاں ماہ محرم ۱۰۱۵ھ/مئی ۱۶۰۶ء میں ان کے فرزندان گرامی کسی مناسب تدبیر سے رفیع المرتبت باپ کی میت کو خاکِ آگرہ سے نکال کر لاہور لے آئے' اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیا❶۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بادشاہ کی ناراضی کی اصل وجہ کیا تھی۔ دس سال مالوہ کی صدارت پر مامور رہے۔ اس عرصے میں بادشاہ ان سے خوش رہا۔ ۹۹۵ھ/ ۱۵۸۷ء میں میر فتح اللہ شیرازی کو اس منصب پر مامور کیا۔ ان سے شیخ کی علمی بحثیں رہیں' وہ شیخ کی رفعت علمی سے بہت متاثر تھے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ناراضی کی بنیاد کیا شی تھی۔ ہو سکتا ہے' اکبر کی تبدیلی مذہب سے انھیں اختلاف ہو' وہ اس پر نکتہ چینی کرتے ہوں اور دربار کے کسی شخص نے ان کے خلاف اکبر کے کان بھر دیے ہوں۔ بہرکیف وجہ ناراضی پردۂ راز میں ہے۔

## ۱۵۵- شیخ مودود کالپوی

شیخ مودود بن اولیا بن سراج حنفی کالپوی' علم و مشیخت کی گود میں پلے بڑھے اور اپنے والد گرامی شیخ اولیا کے ساتھ سعادتِ حج حاصل کی۔ شیخ علی متقی کے خلیفہ شیخ عبدالوہاب بن ولی اللہ متقی برہان پوری سے حدیث کا درس لیا۔ عرصے تک ان کی خدمت میں رہے اور حدیث کے ماہر علما میں شمار ہوئے❷۔

## ۱۵۶- سید میران بیجاپوری

سید میران بن اسد اللہ بن عبداللہ بن وجیہ الدین علوی بیجاپوری کا مولد و منشا گجرات ہے۔ گجرات کے علمائے عظام سے اخذ علم کیا اور نامور فقہا وعلما میں شمار کیے گئے۔ زہد و مجاہدہ میں بھی ممتاز تھے۔ حصولِ علم کے بعد گجرات سے بیجاپور چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں وہاں کا حکمران ابراہیم عادل شاہ تھا۔ بیجاپور میں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا اور اسی عظیم کارِ خیر میں عمر صرف کر دی۔

جمادی الاولیٰ ۱۰۵۵ھ/ جولائی ۱۶۴۵ء کو بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے❸۔

---

❶ اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) ص ۴۷۲ تا ۴۷۵۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۱۱' ۴۱۲۔

❷ اذکار ابرار (ترجمہ گلزار ابرار) ص ۳۴۸' بضمن یاد شیخ اولیا۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۱۳۔

❸ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۱۵۔

## ن

# ۱۵۷- شیخ ناصر الدین شیخ پوری

شیخ ناصرالدین شیخ پوری، عالم وفقیہ تھے اور خواجہ کلاں بن نصیر الدین جھونسوی الہ آبادی کے سلسلۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ تاج الدین جھونسوی سے اخذ علم ومعرفت کیا اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے، تا آنکہ مرتبہ مشیخت کو پہنچے۔ شیخ طیب بن معین بنارسی سے بھی شرف اجازہ حاصل کیا۔ جمعۃ المبارک کے دن غرۂ ربیع الاول ۱۰۶۸ھ/ دسمبر ۱۶۵۷ء کو فوت ہوئے ❶۔

# ۱۵۸- قاضی نصیر الدین برہان پوری

قاضی نصیرالدین بن قاضی سراج محمد برہان پوری، شیخ وعالم اور محدث وفقیہ تھے۔ حدیث وفقہ اور علوم عربیہ میں اس درجہ عبور رکھتے تھے کہ اس دور میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ حدیث ورجال پر پوری نظر تھی۔ متبع کتاب وسنت اور پابند احکام شرعیہ تھے۔ حصول علم اپنے والد گرامی قاضی سراج محمد (متوفی ۳ شعبان ۱۰۱۰ھ/ ۱۷ جنوری ۱۶۰۲ء) سے کیا۔ شیخ عثمان بن عیسی سندھی (متوفی شعبان ۱۰۰۸ھ/ فروری ۱۶۰۰ء) سے بھی تحصیل کی۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں گزارا اور بہت مستفید ہوئے، حتیٰ کہ اپنے تمام معاصرین سے سبقت لے گئے۔ بحث ومناظرہ میں تیز تھے اور علمی وتحقیقی مباحث میں درک کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ جب کہ صرف اٹھارہ برس کی عمر تھی، فلسفہ وحکمت اور ہیئت وریاضی کے نامور فاضل علامہ شکر اللہ شیرازی (متوفی ۱۸ رمضان ۱۰۴۸ھ/ ۱۳ جنوری ۱۶۳۹ء) سے پنجہ آزما ہو گئے اور دلائل کے زور سے انھیں خاموش کرا دیا۔

قاضی نصیرالدین برہان پوری ان علمائے کرام میں سے تھے جو حدیث کو قیاس مجتہد پر ترجیح دیتے تھے اور ارشاد رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں قول امام کو ہرگز نہ مانتے تھے۔ وہ صاف لفظوں میں کہا کرتے تھے کہ اگر ایک طرف رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہو اور دوسری طرف امام ابوحنیفہ کا قول ہو تو ترجیح بہرحال فرمان رسول اکرم ﷺ کو حاصل ہوگی، امام ابوحنیفہ کا قول حدیث کے مقابلے میں رد کر دیا جائے گا۔ وہ ہر صورت میں اپنے اس موقف پر قائم رہتے اور کسی کی کوئی پروا نہ کرتے۔ یہ بھی فرمایا کرتے کہ حدیث "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" موضوع ہے۔ ان کے سسر شیخ علم اللہ بیجاپوری (متوفی ۱۱ ذی الحجہ ۱۰۲۴ھ/ ۲۱ دسمبر ۱۶۱۵ء) اس سلسلے میں انتہائی سخت اور ان کے مخالف تھے۔ اپنے داماد قاضی نصیرالدین کی یہ بات بالکل نہ مانتے تھے، لیکن قاضی نصیرالدین بے جھجک ان کے سامنے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے۔ ایک مرتبہ شیخ علم اللہ بیجاپوری نے قول

---

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۱۶۔ بحوالہ گنج ارشدی۔

امام ابوحنیفہ سے استدلال کیا تو قاضی نصیر الدین نے مخالفت کی اور اس کے مقابلے میں حدیث پیش فرمائی۔ شیخ علم اللہ نہ مانے تو قاضی ممدوح نے کہہ دیا کہ "ھو رجل و انا رجل" (امام ابوحنیفہ بھی انسان ہیں اور میں بھی انسان ہوں) یعنی اصل شی جو ہمارے لیے قابل حجت ہے' وہ حدیث رسول ہے نہ کہ قول امام' جس میں امکان خطا موجود ہے۔ اس پر شیخ علم اللہ نے غصے میں آکر تلوار کھینچ لی اور اپنے داماد قاضی نصیر الدین کو قتل کرنے کے لیے ان کے پیچھے دوڑے۔ لیکن قاضی نے بھاگ کر جان بچائی۔ شیخ نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور حکم دیا کہ انھیں آگ میں جلا دیا جائے۔ ساتھ ہی علما کا محضر طلب کرلیا' تمام علما نے ان کے فتوے پر تصدیق کی مہریں ثبت کردیں۔ البتہ دو جلیل القدر عالموں شیخ محمد بن فضل اللہ برہان پوری (متوفی ۲ ر رمضان ۱۰۲۹ھ/۱۲ ر جولائی ۱۶۲۰ء) اور شیخ عیسی بن قاسم سندھی (متوفی ۱۴ شوال ۱۰۳۱ھ/۱۲ ر اگست ۱۶۲۲ء) نے اس کی تصویب و تصدیق نہیں کی۔

اس موقعے پر عبدالرحیم خان خاناں نے ان کی امداد کی' معاملہ جب بہت نازک صورت اختیار کر گیا تو ہندوستان کے بادشاہ جہاں گیر کو اطلاع دی گئی۔ اس نے قاضی نصیر الدین اور شیخ علم اللہ دونوں کو لشکر گاہ میں بلایا' لیکن بادشاہ کی خدمت میں جانے کے بجائے' شیخ علم اللہ تو بیجاپور چلے گئے اور وہاں کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ سے منسلک ہوگئے اور قاضی نصیر الدین نے حجاز کا عزم فرمایا۔ اس موقعے پر عبدالرحیم خان خاناں نے ان کی مدد کی اور حجاز جانے کے لیے سفر خرچ عطا کیا۔ قاضی نصیر الدین پانچ سال مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

قاضی نصیر الدین برہان پوری حجاز سے واپس آرہے تھے کہ ان کا جہاز فرنگیوں کے قبضے میں آگیا۔ فرنگیوں سے قاضی ممدوح کی گفتگو ہوئی تو وہ ان کی فہم و فراست اور کمالات علمی سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھیں اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے۔ دربار میں پہنچے تو قاضی موصوف نے فرنگی بادشاہ کو سلام نہ کیا۔ فرنگیوں نے پوچھا کہ آپ سلام و آداب کیوں بجا نہیں لائے؟ فرمایا بادشاہ کے لیے جو تمھارے ہاں اسلوب آداب مروج ہیں' وہ اسلام میں نہیں ہیں۔ کچھ عرصہ وہاں محصور رہے۔ اس کے بعد رہا کر دیے گئے اور ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں ابراہیم عادل شاہ کی سلطنت میں بندرگاہ وائل میں داخل ہوئے۔ ابراہیم عادل شاہ کو اپنے ملک میں ان کی آمد کی اطلاع ملی تو تین میل آگے بڑھ کر استقبال کیا اور انتہائی اعزاز کے ساتھ اپنے دارالحکومت میں لایا۔

کچھ عرصہ بعد ہندوستان کے بادشاہ جہاں گیر کو ان کی تشریف آوری اور بیجاپور میں سلطان ابراہیم عادل شاہ کے پاس قیام کا پتا چلا تو حکیم ہمام کے بیٹے حکیم خوشحال کو ان کی خدمت میں بھیجا اور تاکید کی کہ ہر حال میں آگرہ کے لشکر گاہ میں لے کر آئیں۔ قاضی نصیر الدین کو اس کا علم ہوا تو وہ بیجاپور سے برہان پور چلے گئے اور اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اسی اثنا میں شہزادہ شاہ جہان آگرہ سے دکن جاتے ہوئے برہان پور پہنچا تو قاضی ممدوح کو یاد فرمایا۔ قاضی صاحب نے پہلے تو شہزادے کے پاس جانے سے انکار کیا' لیکن بعد میں لوگوں کے کہنے سے چلے گئے۔ مگر آداب بادشاہت بجا

نہیں لائے۔ شہزادے نے بھی اس کی پروا نہیں کی۔ بڑی عزت سے پیش آیا اور کہا کہ ہم آپ سے ملاقات کے بہت مشتاق تھے۔ قاضی نصیر الدین نے پوچھا' کس بنا پر؟ کہا' آپ کے کمالات علمی سنتے تھے۔ قاضی ممدوح نے جواب دیا' اب مجھ میں وہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ قاضی کے اس جواب سے اگرچہ مجلس میں کچھ تکدر کے آثار پیدا ہوئے' لیکن بادشاہ نے اس کو اہمیت نہ دی اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔

شہزادہ شاہ جہان نے قاضی نصیر الدین سے عرض کیا کہ اس کے والد جہاں گیر بادشاہ ان سے ملاقات کے بہت خواہاں ہیں' وہ ہر حال میں آگرہ تشریف لے جائیں۔ بڑے اصرار کے بعد وہ آگرہ کو روانہ ہوئے۔ ابھی دربار شاہی میں نہیں پہنچے تھے کہ بادشاہ کی سواری باغ سے محل کی طرف جا رہی تھی۔ قاضی نصیر الدین نے سلام کرنا چاہا تھا کہ بادشاہ کی نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ دوڑ کر آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر بغل میں لے لیا۔ کچھ روز آگرہ میں رہے۔ اس کے بعد اپنے شہر برہان پور چلے گئے اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔

قاضی نصیر الدین کا حلقہ تلمذ بڑا وسیع تھا۔ جن علما نے ان سے کسب علم کیا' ان میں فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کے سربراہ اور اورنگ زیب عالم گیر کے استاد شیخ نظام الدین برہان پوری بھی شامل ہیں' جو بڑے عالم و فقیہ تھے۔

قاضی نصیر الدین برہان پوری نے ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۲ء کو وفات پائی[1]۔

## ۱۵۹- شیخ نظام الدین تھانیسری

شیخ نظام الدین بن عبدالشکور عمری بلخی تھانیسری عالم و فقیہ اور زاہد و عابد تھے' مشائخ چشتیہ میں سے تھے' علم و عمل کے جامع اور ریاضت و مجاہدہ کے دلدادہ تھے' شیخ جلال الدین عمری تھانیسری (متوفی ۹۸۹ھ/۱۵۹۹ء) سے اخذ علم کیا جو ان کے چچا اور سسر تھے' ان کے بعد مسند مشیخت پر فائز ہوئے۔ ۱۰۰۷ھ کو سفر حج پر روانہ ہوئے۔ دوران سفر میں برہان پور پہنچے تو شیخ عیسیٰ سندھی نے اعیان و اکابر کے ساتھ برہنہ پا ان کا استقبال کیا۔ کچھ عرصہ برہان پور میں ٹھہرایا اور مستفید ہوئے۔ ۱۰۲۰ھ کو واپس ہندوستان آئے' واپسی پر بیجاپور سے گزرے تو وہاں کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوا' اور بے حد احترام سے پیش آیا۔ بعد ازاں اپنے وطن تھانیسر گئے اور درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔

جب شہزادہ خسرو نے اپنے باپ جہاں گیر بادشاہ کے خلاف بغاوت کی اور برسر پیکار ہوا تو وہ تھانیسر سے گزرتے ہوئے شیخ نظام الدین سے بھی ملا' جس کی وجہ سے جہاں گیر کے دل میں شیخ کے متعلق اپنی مخالفت کا

---

[1] مآثر رحیمی' ج ۳' حصہ اول' ص ۲۰ تا ۲۲- تاریخ برہان پور' ص ۱۵۳' ۱۵۴- تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۳۸' ۲۳۹- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۱۷' ۴۱۸-

شبہ پیدا ہوا اور اس کا دل غصے سے بھر گیا' چنانچہ اس نے ہندوستان سے ان کی جلاوطنی کا حکم صادر کیا اور وہ بلخ چلے گئے' بلخ میں مدتِ مدید تک درس و افادہ میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں علما و مشائخ کی کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ خود والیٔ بلخ سلطان امام قلی ازبک ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔ وہ ہفتے میں ایک مرتبہ ان کی خدمت میں آتا اور فیض حاصل کرتا۔

شیخ نظام الدین تھانیسری مصنف اور شارح بھی تھے۔ غزالی کی شرح سوانح' عراقی کی شرح لمعات' رسالہ حقیقیہ' رسالہ بلخیہ وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ تفسیر نظامی کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ اس عالم و فقیہ نے ۲۶/ شوال ۱۰۲۴ھ/ ۸/ نومبر ۱۶۱۵ء کو (ایک روایت کے مطابق ۱۰۲۶ھ/ ۱۶۱۷ء کو) بلخ میں انتقال کیا[1]۔

## ۱۶۰-سید نظام الدین سندھی

سید نظام الدین بن نور محمد بن شکر اللہ بن ظہیر الدین بن شکر اللہ حسینی ٹھٹھوی سندھی' فقہ و اصول کے نامور علما میں سے تھے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو دہلی گئے اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں بھرپور حصہ لیا۔ تدوین فتاویٰ کے بعد سلطان اورنگ زیب عالم گیر سے فوجی منصب کے طالب ہوئے۔ مگر بادشاہ نے یہ درخواست قبول نہ کی' کیوں کہ وہ علما کو فوجی خدمات پر مامور نہ کرتا تھا۔ اس کے بدلے میں اورنگ زیب عالم گیر نے ان کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا' لیکن وہ اس وظیفے پر خوش نہ تھے اور تادم وفات دارالحکومت ہی میں رہے۔

تذکرہ علمائے ہند کی روایت کے مطابق سید نظام الدین ٹھٹھوی علم فقہ اور دیگر علوم میں عالم اجل اور ماہر تھے۔ جذبۂ رغبت طبع کی بنا پر دہلی تشریف لے گئے اور فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں شامل ہو کر فقہ کے بہت سے مشکل اور پیچیدہ مسائل کی عقدہ کشائی کی۔

سید شیخ نظام الدین ٹھٹھوی' سندھ کے ایک بلند پایہ علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے' ان کے آبا و اجداد شیراز کے رہنے والے تھے' جنھوں نے بعد کو ہرات میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس خاندان کے ایک بزرگ قاضی شکر اللہ تھے جو حدیث' فقہ' اصول اور علوم عربیہ کے جید علما میں سے تھے اور تدین و اتقا سے بہرہ ور۔

قاضی شکر اللہ ۹۰۶ھ/ ۱۵۰۱ء میں ہرات سے قندھار منتقل ہوئے۔ اکیس سال وہاں مقیم رہنے کے بعد ۹۲۷ھ/ ۱۵۲۱ء میں سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں تشریف لائے۔ اس زمانے میں سندھ کا حکمران شاہ بیگ تھا' اس نے ان کی خداداد صلاحیتوں اور حسن سیرت سے متاثر ہو کر انھیں ٹھٹھہ کی مسند قضا پر مامور کر دیا۔ اس منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے نہایت وقار و احترام اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ انجام دیا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ شاہ بیگ کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسن تخت سندھ کا وارث بنا تو اس نے بعض تاجروں سے چند گھوڑے

[1] تذکرہ علمائے ہند' ص ۲۴۱' ۲۸۸- حدائق الحنفیہ ص ۴۰۱' ۴۰۲- خزینۃ الاصفیا' ص ۴۶۳ تا ۴۶۶- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۴۱۹' ۴۱۹- علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۱' ص ۴۵۱ تا ۴۵۵-

خریدے اور ان کی قیمت ادا کرنے میں عمداً تساہل اور تاخیر سے کام لیا۔ تاجروں نے ناامید ہو کر قاضی شکر اللہ سے رجوع کیا اور ان کی عدالت میں بادشاہ کے خلاف مدعی بن کر حاضر ہوئے۔ قاضی موصوف نے مدعی علیہ بادشاہ کو عدالت میں طلب کیا۔ بادشاہ' قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا تو اسے مدعی تاجروں کے ساتھ کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا۔ دعویٰ پیش ہوا' قاضی کے سوال پر مدعی علیہ بادشاہ نے تاجروں کے موقف کی تصدیق کی اور قیمت ادا نہ کرنے کا اقرار کیا۔ قاضی نے تاجروں کے حق میں فیصلہ دیا اور سلطان نے تاجروں کو قیمت ادا کر دی۔

فیصلے کے بعد قاضی شکر اللہ اپنی جگہ سے اٹھے۔ قاعدے کے مطابق آداب سلطانی بجا لائے اور بادشاہ کو اپنے پاس بٹھایا۔ اب بادشاہ نے تلوار نکالی جو اس نے قبا میں چھپا رکھی تھی اور اسے قاضی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: ''یہ تلوار میں نے آپ کے لیے رکھی تھی' اگر آپ صحیح فیصلہ نہ کرتے اور میرے لحاظ و آداب میں اپنے مقام و منصب کا خیال نہ رکھتے تو اس تلوار سے آپ کی گردن اڑا دیتا۔'' اس کے بعد بادشاہ اس فیصلے پر اظہار مسرت کرتے ہوئے عدالت سے باہر نکل گیا۔

اس نے تاجروں کو صرف اس بنا پر قیمت ادا کرنے میں تاخیر کی تھی کہ وہ قاضی شکر اللہ کو اپنے بارے میں آزمانا چاہتا تھا اور اسے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ قاضی صحیح فیصلہ کرتا ہے یا نہیں۔ اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد قاضی شکر اللہ منصب قضا سے الگ ہو گئے اور لوگوں سے منقطع ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

تحفۃ الکرام میں تاریخ طاہری کے حوالے سے یہ سارا واقعہ بیان کر کے لکھا ہے کہ قاضی شکر اللہ نے بھی بادشاہ کی بات سن کر مسند کے نیچے سے برہنہ تلوار نکالی اور اسے دکھائی اور کہا: ''میں نے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ مبادا بادشاہ خلاف شرع قدم اٹھائے اور کوئی شخص اس کو ٹوکنے کی جرات نہ کرے' اگر یہ صورت حال پیدا ہوئی تو میں خود اس تلوار سے سیاست شرعی بجا لاؤں گا۔''

قاضی سید شکر اللہ کی نسبت سے میر سید نظام الدین کا خاندان ٹھٹھہ میں سادات شکر اللہی کے نام سے موسوم ہوا۔ اس خانوادہ کے تقریباً تمام افراد علم و فضل اور مرتبہ دینی کی وجہ سے یگانۂ روزگار ہیں۔ اب بھی ان کا خاندان اپنے قدیم محلے میں آباد ہے [1]۔

# ۱۶۱۔ شیخ نظام الدین برہان پوری

شیخ نظام الدین برہان پوری' اکابر علمائے حنفیہ اور مشہور فقہائے ہند میں سے تھے۔ ان کا شمار ان خوش بخت اہل علم میں ہوتا ہے' جو علوم میں تبحر کامل تھے' اور جنھوں نے تحریر مسائل' نقل احکام اور محاسن فتویٰ نویسی

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے۔ تحفۃ الکرام' ص ۵۹۲ و ۶۰۰۔۔ تذکرہ علمائے ہند' ص ۲۸۸۔ نزہۃ الخواطر' ج ۴' ص ۱۳۸' ۱۳۹۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵ ص ۴۱۹' ۴۲۰۔ ماہنامہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) بابت ماہ جون ۱۹۴۷ء مضمون ''فتاویٰ عالم گیری کے دو سندھی مؤلفین اور ان کے اجداد''۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ' ص ۲۷۷ تا ۲۷۹۔

میں خاص طور سے نام پیدا کیا۔ ان کو قاضی نصیر الدین محدث برہان پوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ جس زمانے میں عالم گیر اپنے والد شاہ جہان بادشاہ کی طرف سے بلاد دکن میں والی کی حیثیت سے متعین تھا' اس زمانے میں اس نے شیخ نظام الدین کو اپنے ساتھ وابستہ کر کے اپنے خاص ندیموں اور مشیروں میں شامل کر لیا تھا۔ بعد ازاں جب وہ بادشاہ بنا اور ہندوستان کی عنان حکومت ہاتھ میں لی تو فتاویٰ عالم گیری (فتاویٰ ہندیہ) کی تدوین و ترتیب کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس نے دیگر فقہائے حنفیہ کی خدمات حاصل کر کے اس کا اہتمام شیخ نظام الدین کے سپرد کر دیا۔ اور ان فقہا میں سے چار کو اس طرح ان کے نائب مقرر کیا کہ فتاوے کے چار حصے کر کے ان چار فقہا میں تقسیم کر دیے' ان میں سے ایک قاضی محمد حسین جون پوری محتسب' دوسرے سید علی اکبر سعد اللہ خانی' تیسرے شیخ حامد جون پوری اور چوتھے مفتی محمد اکرم لاہوری تھے۔

شیخ نظام الدین برہان پوری نے اس خدمت جلیلہ کی انجام دہی کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کر دیں' یہاں تک کہ اس ضخیم و مبسوط فتاویٰ کو دو سال کی مختصر مدت میں مرتب کر دیا۔ اس کے نتیجے میں عالم گیر نے ان کے منصب میں بڑا اضافہ کیا اور ان تمام تکلفات شاہی اور مروجہ درباری تسلیمات سے جو بادشاہ کے ہاں حاضری کے وقت ضروری تھیں اور جنھیں کورنش سے تعبیر کیا جاتا تھا' انھیں مستثنیٰ قرار دے دیا۔

عالم گیر کے نزدیک شیخ نظام الدین برہان پوری' علمی اعتبار سے اس قدر اونچا مرتبہ رکھتے تھے کہ وہ ان سے ہفتے میں تین دن امام غزالی کی احیاء علوم الدین اور فتاویٰ عالم گیری اور بعض کتب سلوک سے متعلق مذاکرہ کرتا۔

شیخ نظام الدین پورے چالیس سال عالم گیر سے وابستہ رہے اور اسی (۸۰) سال سے زائد عمر پائی۔ ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں فوت ہوئے۔ ان کے ایک بیٹے عبداللہ تھے' جنھوں نے اپنے باپ (شیخ نظام الدین برہان پوری) سے اخذ علم کیا اور اپنے عصر میں بڑی فضیلت و تکریم کے مستحق قرار پائے ❶۔

## ۱۶۲-سید نعمت اللہ فیروز پوری

سید نعمت اللہ بن عطاء اللہ نارنولی فیروز پوری کا لقب جلال الدین تھا۔ عالم کبیر اور فاضل وقت تھے۔ مولد و منشا نارنول ہے۔ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے مختلف بلاد و امصار کی خاک چھانی' جون پور بھی گئے اور شیخ محمد افضل عثمانی جون پوری سے علم ہیئت پڑھا۔ پھر ازدواجی زندگی اختیار کی اور فیروز پور میں متوطن ہوئے۔ فیروز پور (مضافات کوڑ) میں سیف خاں نے انھیں کچھ زمین عطا کر دی تھی۔ شاہ جہان بادشاہ کا بیٹا شاہ شجاع جب باپ کی طرف سے بنگال کا والی بنا تو ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا تھا اور شہزادے کی

❶ عالم گیر نامہ' ص ۱۰۸۷- تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۴۲- مرآۃ العالم' ص ۲۷۴- مآثر عالم گیری' ص ۵۲۹' ۵۳۰- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۲۰- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۰۱' ۱۰۲- تاریخ برہان پور' ص ۱۵۴- انفاس العارفین' ص ۲۴- برصغیر میں علم فقہ' ص ۲۶۹ تا ۲۷۷۔

بیعت اور خود ان کے زہد و تقویٰ کی بنا پر لوگوں میں انھیں بے حد مقبولیت اور شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ پھر جب شجاع شکست کھا گیا اور ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں بھاگ گیا تو زمامِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ نے انھیں پانچ ہزار روپے نقد مرحمت فرمائے۔

شیخ نعمت اللہ فیروز پوری متعدد کتابوں کے مصنف تھے، جن میں قرآن مجید کی ایک تفسیر ہے جو تفسیر جلالین کے انداز میں ہے۔ یہ تفسیر صرف چھ مہینے کی مختصر مدت میں لکھی اور ۱۰۷۰ھ/۱۶۶۰ء میں مکمل کی۔ ایک ترجمہ قرآن ہے جو جہاں گیر کے لیے لکھا اور اس کی طرف منسوب کیا۔ اس کا نام "تفسیر جہاں گیری" ہے۔

اس ہندی عالم دین نے ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کو وفات پائی ❶۔

# ۱۶۳۔ مفتی نور الحق دہلوی

مفتی نور الحق دہلوی، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند کبیر تھے۔ ۹۸۳ھ/۱۵۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے، تعلیم و تربیت عظیم المرتبت باپ ہی کی آغوش میں پائی۔ شیخ وامام، عالم و عامل اور محدث و فقیہ تھے۔ کبار و مشاہیر مشائخ ہند میں سے تھے۔ علم حدیث اور دیگر علوم باپ ہی سے حاصل کیے۔ شیخ محدث کی زندگی ہی میں اکبر آباد (آگرہ) کے منصب قضا پر فائز ہو گئے تھے۔ بات یہ ہے کہ شاہ جہان زمانہ شہزادگی سے ان کی فضیلت علمی اور استعداد و قابلیت سے آگاہ اور اس کا معترف تھا۔ تخت نشین ہوا تو انتہائی اصرار سے یہ خدمت ان کے سپرد کی، اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے یہ خدمت نہایت دیانت و خوبی سے انجام دی۔ میر سید غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

حق ایں منصب نازک نوعے کہ باید بہ تقدیم رساند

(حق یہ ہے کہ اس نازک منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے خوب نباہا۔)

مفتی نور الحق زیادہ عرصہ اس منصب شاہی سے وابستہ نہیں رہے۔ انھوں نے زندگی کا بہت بڑا حصہ باپ کی جگہ مسند درس پر ہی گزارا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی وفات کے بعد منصب قضا سے دست کش ہو گئے تھے اور زمام تدریس ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس سلسلے میں عمل صالح کے الفاظ ہیں:

پس از رحلت آں جناب، نور الحق خلف الصدقش کہ در علم و فضل شہرۂ آفاق بود، مدت مدید صدر آرائے مدرسہ استفادہ گشتہ۔

(شیخ محدث کی وفات کی بعد ان کے خلف الصدق مفتی نور الحق، جو علم و فضل میں شہرۂ آفاق تھے، طویل مدت تک مسند درس پر فائز رہ کر لوگوں کو مستفید فرماتے رہے۔)

شیخ محدث کو اپنے اس عظیم فرزند سے انتہائی محبت تھی اور وہ مختلف مجالس اور خطوط میں اس کا اکثر

❶ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۲۳، ۴۲۴۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۶۶ تا ۶۸۔ گنج ارشدی۔ مرآۃ العالم۔

اظہار بھی کرتے تھے‘ وہ انھیں اپنے ”وجود ثانی“ سے تعبیر کرتے اور ان کے علم وفضل کے مداح تھے۔

مفتی نور الحق کو تصنیف و تالیف سے بہت دلچسپی تھی۔ مندرجہ ذیل کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔

تیسیر القاری شرح صحیح البخاری:۔ یہ شرح فارسی میں لکھی اور اورنگ زیب عالم گیر کے نام سے منسوب کی۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں مطبع علوی محمد علی حسن خاں لکھنؤ سے شائع ہوتی تھی۔ شرح شمائل ترندی‘ تفسیر سورۃ الفاتحہ‘ حاشیہ علی شرح الجامی‘ شرح عضدی‘ شرح مطالع الانوار‘ شرح ہدایۃ الحکمۃ‘ شرح قران السعدین‘ رسالہ دربیان رویا‘ محی القلوب‘ زبدۃ التواریخ۔ ایک رسالہ تشہد میں انگشت شہادت اٹھانے کے بارے میں لکھا۔

فرحت الناظرین میں ہے کہ شیخ نور الحق دہلوی نے صحیح بخاری کی مکمل شرح لکھی اور احادیث کی مشکلات اور پیچیدگیوں کو حل کیا۔ امام ابو حنیفہ کے مذہب (حنفی) کی تقویت کے لیے انھوں نے بہت کوشش اور جدوجہد کی اور اس مذہب کی مخالف احادیث کی مستحسن تاویلات فرمائیں۔

مفتی نور الحق شاعر بھی تھے اور مشرقی تخلص کرتے تھے۔ فرحت الناظرین کی روایت کے مطابق انھوں نے تحفۃ العراقین کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی۔ اور ایک دیوان بھی تھا جو پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ یہ مثنوی اور دیوان اب دست یاب نہیں ہیں۔

اس جلیل القدر ہندی عالم وفقیہ اور شیخ ومحدث نے ۹ر شوال ۱۰۷۳ھ/ ۷ر مئی ۱۶۶۳ء کو نوے (۹۰) سال کی عمر پا کر داعی اجل کو لبیک کہا اور دہلی میں اپنے باپ کے احاطہ قبرستان میں دفن ہوئے ❶۔

## ۱۶۴- شیخ نور محمد سہارن پوری

شیخ نور محمد بن محمود انصاری سہارن پوری‘ سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ شیخ عزیز اللہ بن رکن الدین گنگوہی سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ عالم وفقیہ اور صالح بزرگ تھے۔

۲۰ر ربیع الاول ۱۰۹۱ھ/۱۰ر اپریل ۱۶۸۰ء کو ان کا انتقال ہوا ❷۔

## ۱۶۵- شیخ نور محمد جون پوری

شیخ نور محمد بن نصیر الدین انصاری جون پوری‘ جمعۃ المبارک کی رات ۱۷ر جمادی الاخریٰ ۹۷۵ھ/۲ر دسمبر

---

❶ عمل صالح‘ ج ۳‘ ص ۲۹۶- مآثر الکرام دفتر اول‘ ص ۱۸۸‘ ۱۸۹- فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۶۸ تا ۷۱- حدائق الحنفیہ ص ۴۱۸- سبحۃ المرجان‘ ص ۵۳- ابجد العلوم‘ ص ۹۰۱- خزینۃ الاصفیا‘ ص ۹۸۹- تذکرۂ علمائے ہند‘ ص ۲۴۶- اتحاف النبلا‘ ص ۴۲۶‘ ۴۲۷- حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی‘ ص ۲۵۷ تا ۲۶۱- تذکرۂ شیخ عبدالحق محدث دہلوی‘ ص ۱۱۱‘ ۳۱۳ تا ۳۱۳- قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب‘ ص ۱۹۸-

❷ نزہۃ الخواطر ج ۵‘ ص ۴۲۸ بحوالہ مرآۃ جہاں نما-

۱۶۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ سن رشد کو پہنچے تو اپنے والد گرامی شیخ نصیرالدین انصاری جون پوری (متوفی ۴ جمادی الاخری ۱۰۷۶ھ/ ۱۹ر دسمبر ۱۵۶۷ء) اور دیگر علما سے اخذ علم کیا۔ تا آنکہ بلند علمی مرتبے کو پہنچے اور قرأت و تجوید میں کمال حاصل کیا۔ فقہ میں بھی مہارت پیدا کی اور جون پور میں زاویہ شیخ بدیع الدین کی مسجد میں خطابت پر مامور ہوئے۔

شیخ نور محمد کا خطابت وسلوک کے علاوہ درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ صاحب رشید یہ شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری نے ان سے کافیہ کے کچھ سبق پڑھے تھے۔

شیخ نور محمد تقریباً پچاسی سال کی عمر پا کر ۲۹ر رجب ۱۰۵۹ھ/ ۲۹ر جولائی ۱۶۴۹ء کو راہی ملک بقا ہوئے [1]۔

## ۱۶۶- شیخ نور محمد پٹنی

شیخ نور محمد حنفی نقشبندی پٹنی عالم وفقیہ اور صاحب فضل وصلاح تھے۔

وقت کے معروف اساتذہ سے اخذ علم کیا۔ کشورِ ہند کے متعدد خدا دوست حضرات سے ملے اور بلند مرتبت مشائخ امجاد سے مستفیض ہوئے۔ بعد میں حضرت مجدد الف ثانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور طویل مدت تک ان سے منسلک رہے اور اذکار واشغال اور تصوف ومعرفت کے مرتبۂ بلند کو پہنچے۔ حضرت مجدد نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور واپس وطن جانے کی اجازت فرمائی۔ انھوں نے دریائے گنگا کے کنارے سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں ایک مسجد تعمیر کر لی تھی۔ ان سے بہت سے اہم لوگوں نے استفاضہ کیا [2]۔

---

## ۱۶۷- مفتی وجیہ الدین گوپاموی

مفتی وجیہ الدین بن عیسی بن آدم بن محمد صدیقی گوپاموی' شیخ جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی کی اولاد سے تھے۔ ممتاز عالم' تیز ذہن اور صاف دل بزرگ تھے۔ تقریر نہایت عمدہ کرتے تھے۔ علم معانی و بیان میں اپنے دور کے عدیم المثال عالم تھے۔ ولادت یک شنبہ کے روز ۲ر رجب ۱۰۰۵ھ/ ۹ر فروری ۱۵۹۷ء کو اودھ کے مشہور مرکز علم گوپامئو میں ہوئی۔ اپنے جدامجد شیخ جعفر اور دیگر علمائے عصر سے تعلیم حاصل کی۔ علم وتحقیق کی گود میں پرورش پائی اور تصوف وطریقت کے ماحول میں تربیت کی منزلیں طے کیں۔ ان کے والد مفتی عیسی بن آدم گوپاموی (متوفی ۲۹ر ذی الحجہ ۱۰۲۳ھ/ ۲۰ر جنوری ۱۶۱۵ء) بہت بڑے عالم اور گوپامئو کی مسند افتا پر فائز تھے اور دور جہاں گیری کے نامور عالم تھے۔ والد کی وفات کے بعد یہ مسند افتا ان کے حصے میں آئی۔ ان کے دادا شیخ آدم بن محمد صدیقی گوپاموی (متوفی ۱۰۰۱ھ/ ۱۵۹۳ء) بھی گوپامئو کے مفتی تھے اور ان کی وفات کے بعد ان

---

[1] تجلی نور' ج ۲' ص ۶۰- تاریخ شیراز ہند جون پور' ص ۲۴۳' ۲۴۷- نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۴۲۸

[2] زبدۃ المقامات' ص ۳۵۱ تا ۳۵۴- نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۲۹-

کے بیٹے شیخ عیسیٰ اس منصب پر متعین ہوئے۔

مفتی وجیہ الدین صدیقی گوپاموی کی وسعت فکر ونظر اور علم فقہ میں عبور کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ فتاویٰ عالم گیری کے مرتبین کی جماعت میں شامل تھے۔ انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کے چوتھے حصے کی تکمیل کی۔ یہ اہم خدمتِ علمی انجام دینے کے لیے دس فقہائے کرام ان کے زیر نگرانی کام کرتے تھے۔

مفتی وجیہ الدین نے اشاعت علم کی غرض سے اپنے وطن گوپامئو میں سلسلۂ درس شروع کر رکھا تھا' جس میں دور دراز سے شائقین علم استفادے کے لیے آتے تھے۔ جن حضرات نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا' ان میں شیخ محمد آفاق لکھنوی (متوفی ۲۲ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ/۳ جون ۱۶۷۸ء) قاضی عصمت اللہ بن عبدالقادر فاروقی اور دیگر بے شمار اہل علم شامل ہیں۔

فتاویٰ عالم گیری کی تدوین و تالیف میں شرکت کے علاوہ مفتی ممدوح نے اور بھی کئی تصنیفی کام کیے' مثلاً حصن حصین کی شرح' خیالی اور مطول پر حواشی و تعلیقات' تصوف وسلوک سے متعلق رسائل حلقۂ اہل علم میں مشہور ہیں ___ علم معانی اور علم بیان میں خصوصاً درک حاصل تھا۔ اس کی شہادت میں فرحت الناظرین کے یہ الفاظ قابل ذکر ہیں:

خصوصاً در علمِ معانی و بیان عدیم المثال عصر بود۔

(علم معانی اور بیان میں بالخصوص اپنے وقت کے بے مثال عالم تھے۔)

فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے جو محنت کی اس کا ثبوت ''معارف'' (اعظم گڑھ) کی مندرجہ ذیل عبارت سے مل سکتا ہے۔ مرقوم ہے:

''زمخشری کی قسطاس'' کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش خاں لائبریری (پٹنہ) کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اس پر شیخ وجیہ الدین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت ہے۔ کاتب اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:

''عبارت منقول از دستخط مولانا وجیہ الدین رئیس علمائے فتاویٰ عالم گیری''

عبارت کا یہ آخری ٹکڑا واضح کرتا ہے کہ فتاویٰ عالم گیری کی تالیف میں مفتی وجیہ الدین گوپاموی کا بہت بڑا حصہ تھا اور وہ اس میں کوئی ممتاز حیثیت رکھتے تھے' اگرچہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو۔

یہ بزرگ خاندانی لحاظ سے صاحبِ افتا تھے۔ ان کے والد شیخ عیسیٰ بھی مفتی تھے جو اپنے والد مفتی آدم کی وفات کے بعد مسند افتا پر فائز ہوئے تھے۔ کچھ دن داراشکوہ کے مقربین میں بھی شامل رہے۔ جلوس عالم گیری کے نویں سال عالم گیر کے حضور پہنچے اور منصب سے سرفراز ہوئے۔ ۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۸۳ھ/ ۱۸ ستمبر ۱۶۷۲ء کو دہلی میں وفات پائی اور اپنے اصل وطن گوپامئو میں دفن کیے گئے [1]۔

---

[1] فرحت الناظرین' ص ۸۵۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۳۱ تا ۱۳۴۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۰' ۴۳۱۔ ''معارف'' (اعظم گڑھ) دسمبر ۱۹۴۶ء

ہ

# ۱۶۸- سید ہدایت اللہ حسنی نصیر آبادی

سید ہدایت اللہ بن اسحاق بن معظم بن احمد بن محمود بن علا حسینی نصیر آبادی۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے بڑے بھائی سید احمد بن اسحاق حسینی نصیر آبادی (متوفی ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۷ء) سے اخذ علم کیا۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے، یہاں تک کہ فقہ واصول اور علوم عربیہ میں ماہر کامل ہوئے۔

سید ہدایت اللہ نصیر آبادی، سید قطب الدین محمد بن احمد حسنی مدنی کی اولاد سے تھے اور اپنے وقت کے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ صاحب نزہتہ الخواطر علامہ سید عبدالحی حسنی لکھنوی اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرا (سید عبدالحی حسنی) کا سلسلۂ نسب سات واسطوں سے سید ہدایت اللہ تک پہنچتا ہے۔ انھوں نے سید ہدایت اللہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قلمی رسالہ بھی دیکھا ہے جو خراج کے موضوع سے متعلق تھا[1]۔

ی

# ۱۶۹- شیخ یاسین بنارسی

شیخ یاسین کا سلسلۂ نسب یہ ہے: یاسین بن احمد بن محمد بن عبدالرحیم بن اوحد الدین صدیقی جون پوری ثم بنارسی، ۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء کو نواح بنارس کے ایک گاؤں ''منڈواڈیہ'' میں پیدا ہوئے اور شیخ طیب بن معین بنارسی (متوفی ۸ر شوال ۱۰۴۲ھ/ ۸ر اپریل ۱۶۳۳ء) کی مہد علم وتصوف میں تربیت پائی۔ صرف، نحو (ارشاد تک) اور فقہ (کنز تک) ان سے کتابیں پڑھیں۔ پھر جون پور چلے گئے۔ وہاں سات یا آٹھ سال مقیم رہے۔ اس عرصے میں جون پور کے دو اعاظم رجال ___ شیخ محمد افضل جون پوری (متوفی ۱۹ر ربیع الثانی ۱۰۶۲ھ/ ۲۰ر مارچ ۱۶۵۲ء) اور شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ر رمضان المبارک ۱۰۸۳ھ/ ۱۹ر دسمبر ۱۶۷۲ء) ___ سے نحو، منطق، فلسفہ، فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ محمد رشید جون پوری سے سند حدیث بھی حاصل کی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۲۳ر ربیع الثانی ۱۰۵۲ھ/ ۱۱ر جولائی ۱۶۴۲ء) کے فرزند کبیر مفتی نور الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۳ء) سے بھی حدیث کی سند لی۔ حتیٰ کہ اپنے وقت کے عالم وفقیہ ہوئے۔

بعد ازاں شیخ طیب کی خدمت میں گئے اور ان سے وابستگی اختیار کی اور ذکر و تلقین کا درس لیا۔ شیخ طیب نے ۱۰۴۰ھ میں انھیں وثیقہ خلافت لکھ کر دیا اور موضع ''کوڑہ'' جانے کو کہا۔ کوڑہ جا کر بھی حصول علم میں

[1] نزہتہ الخواطر ج ۵، ص ۴۳۳۔

مشغول رہے وہاں شیخ جمال اولیا گوروی (متوفی ۲۹ رمضان ۱۰۴۷ھ/۴ فروری ۱۶۳۸ء) سے ہدایہ کے کچھ حصے اور تفسیر بیضاوی کا درس لیا۔ پھر منڈواڑیہ کو معاودت فرمائی لیکن ان کے شیخ اور استاد شیخ طیب وہاں پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ تمام عمر افادہ وعبادت میں صرف کر دی اور بے شمار مشائخ وعلما کو مستفید فرمایا❶۔

## ۱۷۰۔ مولانا یتیم اللہ احمد نگری

مولانا یتیم اللہ بن جمال بن حسین حسنی حسینی قادری احمد نگری۔ شیخ عبدالوہاب بن شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے تھے۔ مقام ولادت اعمال احمد نگر کا ایک گاؤں ''پتری'' ہے' تربیت بھی وہیں پائی' کبار اساتذہ سے علم حاصل کیا اور عالم وفقیہ ہوئے۔ ان کے والد بھی عالم دین تھے اور درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے۔ حصول علم کے بعد مولانا یتیم اللہ نے بھی باپ کی جگہ یہی سلسلہ شروع کیا۔ ''گلزار ابرار'' کے مصنف شیخ محمد بن حسن غوثی ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء میں احمد آباد میں ان سے ملے تھے۔ اس کے پانچ سال بعد ۱۰۰۸ھ یا ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء یا ۱۶۰۱ء میں فوت ہوئے❷۔

## ۱۷۱۔ میر سید یحییٰ بلگرامی

میر سید یحییٰ بن عبدالواحد بن ابراہیم بن قطب الدین حسینی بلگرامی کی ولادت ۲ ذی القعدہ ۹۸۵ھ/ ۱۱ جنوری ۱۵۷۸ء کو ہوئی اور علم ومعرفت کے ماحول میں پرورش پائی۔ اپنے والد گرامی میر سید عبدالواحد بلگرامی (متوفی ۳ رمضان المبارک ۱۰۱۷ھ/ یکم دسمبر ۱۶۰۸ء) سے علم حاصل کیا اور فضل وکمال کو پہنچے پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اپنے وقت کے شیخ اور عالم وفقیہ تھے۔ نیک' متقی زاہد وعابد' قانع اور متوکل علی اللہ تھے۔ قرآن مجید کے حافظ تھے۔ تلاوت اس انداز سے کرتے کہ سامعین پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ انسانی شکل میں فرشتہ تھے' دنیا اور اس کے مال واسباب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سلوک وطریقت سے متعلق ایک کتاب ''میزان الاعمال ومعیار الاحوال'' کے نام سے تصنیف کی۔ بلگرام میں فوت ہوئے اور اپنے باپ میر سید عبدالواحد بلگرامی کے قریب دفن کیے گئے❸۔

## ۱۷۲۔ شیخ یعقوب صرفی کشمیری

مولانا یعقوب بن شیخ حسن صرفی کشمیری گنائی عاصمی' خطۂ کشمیر کے عالم کبیر' ممتاز شیخ اور فاضل بزرگ

---

❶ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۴ بحوالہ گنج ارشدی۔

❷ اذکار ابرار' ص ۲۳۱ بضمن یاد شیخ جمال بھری۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۵

❸ مآثر الکرام' ص ۴۴۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۸۔

تھے۔ ۹۰۸ھ/۱۵۰۳ء کو کشمیر میں پیدا ہوئے۔ فطانت و فراست اور زیرکی و بزرگی کے آثار صغر سنی ہی میں ہویدا تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ حصول علم کے لیے اپنے دور کے جلیل القدر علما کی خدمت میں حاضری دی۔ صرف و نحو اور فقہ کی کتابیں مولانا رضی الدین کشمیری سے پڑھیں۔ منطق، فلسفہ و حکمت اور معانی و بیان کا علم شیخ بصیر الدین سے حاصل کیا اور عرصے تک ان کی خدمت میں رہے۔ شعر و عروض کے لیے مولانا عبدالرحمٰن جامی کے شاگرد شیخ محمد آنی سے استفادہ کیا۔ حصول علم کے بعد اخذ طریقت کا شوق پیدا ہوا، اور سمرقند کی راہ لی۔ وہاں شیخ حسین خوارزمی کے حلقۂ طریقت میں داخل ہوئے اور کچھ عرصہ ان کے پاس مقیم رہے۔ پھر واپس اپنے وطن کشمیر آ گئے اور سلسلۂ تدریس شروع کیا۔ اس کے بعد عازم حجاز ہوئے اور سعادت حج حاصل کی۔ مدینہ منورہ گئے۔ حجاز کے علمائے عظام سے استفادہ کیا اور شیخ ابن حجر ہیثمی مکی سے کتب حدیث کا درس لیا۔ حجاز مقدس سے بغداد کا عزم فرمایا اور وہاں کے مشائخ کرام سے مستفیض ہوئے۔ بغداد سے اپنے وطن کشمیر آئے اور طویل مدت تک کشمیر میں اقامت گزین رہے۔ اس اثنا میں بہت سے علما و طلبا کو مستفید فرمایا۔ دوبارہ پھر دل میں سفر حجاز کے شوق نے کروٹ لی اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حجاز سے واپسی پر تفسیر، حدیث اور فقہ کی بہت سی نفیس کتابیں ساتھ لائے، اور انھیں علمائے کشمیر میں مروّج کیا۔ اب کشمیر میں باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور بے شمار تشنگان علوم کی علمی تشنگی بجھائی۔ اکابر و اعاظم رجال ہند میں سے جو حضرات ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے، ان میں حضرت شیخ مجدد الف ثانی کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

شیخ یعقوب صرفی کشمیری گیارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے ہندی عالم تھے، اور تمام اصناف علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، علوم عربیہ، فلسفہ و حکمت، معانی و بیان اور صرف و نحو پر عبور رکھتے تھے۔ عظیم المرتبت مصنف بھی تھے۔ یہ کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں: تفسیر قرآن حکیم جو نامکمل رہی، شرح صحیح بخاری، مغازی النبوۃ، حاشیہ توضیح و تلویح، مسلک الاخیار، کتاب مناسک حج، روائح، وامق و عذرا، رسالہ اذکار، لیلی مجنوں، مقامات مرشد، مولانا عبدالرحمٰن جامی کی جواہر خمسہ کا جواب، شرح رباعیات وغیرہ۔

عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں مولانا یعقوب کی شخصیت اور علم و فضل کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ہمایوں بادشاہ اور شہنشاہ جلال الدین اکبر کو ان سے بڑی عقیدت تھی، ان دونوں بادشاہوں سے ان کو گفتگو اور مصاحبت کا شرف حاصل تھا۔ اکبر کے تو بڑے منظور نظر اور مکرم و محترم تھے، طبعاً فیاض اور ایثار پیشہ تھے۔

شیخ یعقوب صرفی شاعر بھی تھے، لیکن بدایونی اپنے خاص انداز سے ان کی شعر گوئی پر میٹھی اور تیکھی تنقید کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ان کے مرتبے کے لحاظ سے شعر گوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی لیکن اس وادی میں بھی [۱۰] کامل دخل تھا۔

بہر حال شیخ یعقوب صرفی دور اکبری کے علمائے عظام میں سے تھے اور جامعیت علم کی بنا پر ہر طبقے کے اہل علم میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ خود شاہ ہند جلال الدین اکبر ان کی بہت تکریم کرتا تھا۔ عبدالقادر بدایونی سے ان کو خاص تعلق خاطر تھا۔ انھوں نے بدایونی کے نام چند خط بھی لکھے' جو منتخب التواریخ میں درج ہیں۔ بدایونی بھی ان کی توصیف کرتے اور احترام سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں شیخ یعقوب صرفی حجاز سے واپس کشمیر پہنچے' وہاں شیعہ سنی جھگڑے زوروں پر تھے۔ جب یعقوب چک نے قاضی موسیٰ کو شیعہ طریقے سے خطبہ نہ پڑھنے پر شہید کرا دیا اور اہل سنت کے لیے حالات بہت ناساز گار ہو گئے' تو شیخ یعقوب' بابا داؤد کو ساتھ لے کر اکبر کے پاس لاہور پہنچے اور کشمیری عوام کی طرف سے دعوتِ حملہ دی۔ اکبر تو اس موقعے کا پہلے سے منتظر تھا۔ اس نے اپنی فوجیں بھیجیں اور اکتوبر ۱۵۸۶ء کو کشمیر مملکت مغلیہ کا حصہ ہو گیا۔

اس کے آگے وہ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد اکبر اور شیخ کے درمیان خاص روابط استوار ہو جانا عجب نہیں۔

اکرام صاحب مزید رقم طراز ہیں کہ ''شیعہ سنی مسئلے پر شیخ یعقوب کے جو شدید احساسات تھے' اس کا اندازہ ان اقدامات سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے قاضی موسی کی شہادت پر شروع کیے۔ لیکن اس کی مثالیں اس سے پہلے بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد اپنی کتاب ''پاکستان میں فارسی ادب'' (جلد اول) میں لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوب صرفی کے سری نگر میں ایک استاد تھے' ملا بصیر' بڑے بڑے صاحب عظمت بزرگ ان کے حلقۂ تلمذ میں شریک تھے۔ مثلاً شیخ داؤد خاکی۔ لوگوں نے مشہور کیا کہ ملا بصیر بھی مائل بہ تشیع ہیں' تو شیخ صرفی ان کے مدرسے سے اٹھ آئے۔''

مجدد الف ثانی' شیخ یعقوب صرفی کے تلمیذ تھے اور وہ شیعہ کے مخالف تھے۔ انھوں نے ''رد روافض'' ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ اس ضمن میں شیخ محمد اکرام مرحوم بطور استفسار تحریر فرماتے ہیں کہ ''کیا (حضرت مجدد میں) اس نقطہ نظر کے پیدا کرنے یا اسے تقویت دینے میں ان (حضرت مجدد) کے مرشد اور استاد شیخ یعقوب صرفی کا اثر بھی کارفرما تھا❶۔''

بہر حال شیخ یعقوب صرفی اپنے دور کے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ انھوں نے پنجشنبہ کے روز' بعد نماز عشاء' ۱۲/ ذی القعدہ ۱۰۰۳ھ/ ۹/ جولائی ۱۵۹۵ء کو وفات پائی❷۔

---

❶ رود کوثر' ص ۲۲۵' ۲۲۶۔

❷ منتخب التواریخ' ج ۳' ص ۱۴۲ تا ۱۴۹۔ تاریخ کشمیر اعظمی' ص ۱۱۰' ۱۱۱۔ تذکرۂ علمائے ہند' ص ۲۵۵۔ حدائق الحنفیہ' ص ۳۹۴' ۳۹۵۔ نزہۃ الخواطر' ج ۵' ص ۴۳۸' ۴۳۹۔

## ۱۷۳- قاضی یوسف بلگرامی

قاضی یوسف بن ابوالمکارم بن ابوالفتح بن عبدالدائم عثمانی بلگرامی کا مولد بلگرام ہے۔ بڑے ہوئے تو کچھ عرصے تک اپنے شہر بلگرام ہی میں حصول علم میں مصروف رہے' بعدازاں عازم الہ آباد ہوئے اور شیخ محبت اللہ الہ آبادی سے کتب درسیہ پڑھیں۔ اپنے دور کے عالم وفقیہ تھے۔ قاضی یوسف کے والد قاضی ابوالمکارم بلدۂ بلگرام کے عہدۂ قضا پر متعین تھے۔ والد کی وفات کے بعد شاہ جہان کے نویں سال جلوس میں قاضی یوسف کو ان کی جگہ قاضی بنایا گیا۔ داراشکوہ نے سولہ سوالوں پر مشتمل ایک رسالہ لکھ کر شیخ محب اللہ الہ آبادی کو بھیجا تھا' اس کا جواب عربی اور فارسی میں قاضی یوسف بلگرامی نے رسالے کی شکل میں تحریر کیا اور اس کا نام "ہدیۃ السلطانیہ" رکھا۔

قاضی یوسف بلگرامی نے ۵/ ذی القعدہ ۱۰۸۴ھ/ یکم فروری ۱۶۷۴ء کو بلگرام میں وفات پائی ❶۔

## ۱۷۴- مولانا یوسف لاہوری

مولانا یوسف لاہوری' عالم کبیر اور علامہ عصر تھے۔ ہمیشہ مصروف عمل رہتے۔ کثرت درس و آفادہ' وعظ و تذکیر' صلاح وتقویٰ اور تفسیر وتوضیح مسائل میں اس وقت کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ مولانا جمال الدین تلوی لاہوری کے تلمیذ تھے۔ بادشاہ نامہ میں عبدالحمید لاہوری لکھتے ہیں کہ پچاس سال تک لاہور میں سرگرم تدریس رہے۔ (قریب پنجاہ سال بافادہ پرداخت) پچاس سال کی اس طویل مدت میں لاتعداد علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ تفسیر قرآن' حلو کلام اور حسن بیان میں بے مثال تھے۔ حسن اخلاق اور حسن سیرت کے زیور سے آراستہ تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں اسی (۸۰) سال عمر پا کر فوت ہوئے۔

مرأۃ العالم کی روایت کے مطابق اوائل عمر میں کچھ عرصے تک خدمت سلطانیہ کو ترجیح دیتے رہے' لیکن بعد کو یہ سلسلہ ترک کر دیا تھا اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر درس وافادہ کو مطمح نظر ٹھہرا لیا تھا۔ اس خدمت علمی کے لیے انھوں نے مرکز علم لاہور کو منتخب فرمایا۔ بارہ سال یہ خدمت انجام دی۔ اس اثنا میں بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا' جن میں شیخ عبداللطیف سلطان پوری اور علامی سعداللہ خاں وزیر کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں ❷۔

## ۱۷۵- مفتی یوسف کاشمیری

مفتی یوسف کشمیری' مفتی یوسف چچک کے نام سے معروف تھے۔ بے مثال عالم اور بے نظیر فقیہ

---

❶ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۴۴۰'۴۴۱ بحوالہ شرائف عثمانی۔

❷ بادشاہ نامہ ج ۲' ص ۳۴۲۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۲۰۰۔ نزہۃ الخواطر ج ۵' ص ۴۴۱۔

تھے۔ مباحثہ و معارضہ میں ایسے تیز اور حاضر جواب کہ کوئی انھیں زیر نہ کر سکا۔ اس دور کے علما میں سے ملا فاضل اور ملا عبدالرزاق کشمیری بالخصوص ان کے علمی کمالات کے معترف تھے اور کسی بحث میں انھیں مغلوب نہ کر سکتے تھے۔ اکثر خواجہ خاوند محمود بخاری کشمیری کی خدمت وصحبت میں رہتے اور ان سے دقائق علم فقہ اور مشکلات تفسیر قرآن کے سلسلے میں استفادہ کرتے۔ فقرا و مشائخ سے بڑی محبت سے پیش آتے۔ نہایت تواضع اور انکسار سے ملتے اور ان کی خدمت کو بڑی سعادت سمجھتے۔

مفتی یوسف چچک کے فرزند ملا عبدالنبی تھے، وہ بھی اپنے وقت میں دیارِ کشمیر کے فقیہ اور جلیل القدر عالم تھے ❶۔

## ۱۷۶-مولانا یونس کردی

مولانا یونس بن ابو یونس حسینی کردی، گیارھویں صدی ہجری میں کشورِ ہند کے فحول علما میں سے تھے۔ محدث وفقیہ تھے۔ ہمیشہ حدیث، فقہ اور فنون عربیہ کے درس و تدریس میں مشغول رہتے۔ زہد و قناعت اور اتباع سنت میں مرتبہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اپنے وطن کڑہ سے کالپی منتقل ہو گئے تھے۔ سید محمد بن ابو سعید حسینی ترمذی نے مطول تک ان سے درسی کتابیں پڑھیں اور حدیث کی سند حاصل کی ❷۔

❶ تاریخ کشمیر اعظمی، ص ۱۴۸- تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۵۷- نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۴۱، ۴۴۲-

❷ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۴۴۲- بحوالہ ضیاء محمدی-

# مراجع ومصادر

فقہائے ہند کی اس جلد چہارم حصہ دوم کی تصنیف میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔


۱۔ آئین اکبری: ابوالفضل۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۹۳ء

۲۔ آثار بدایوں: حافظ فضل اکبر بدایونی۔ وکٹوریہ پریس، بدایوں۔ ۱۹۱۵ء / ۱۸۷۸ء۔

۳۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع صدیقیہ، بھوپال۔ ۱۲۹۵ھ۔

۴۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع نظامی، کان پور۔ ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء۔

۵۔ اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء۔

۶۔ اخبار الصنادید: حکیم نجم الغنی رام پوری۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۹۱۸ء۔

۷۔ ادبیات سرحد: رضا ہمدانی۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۵ء

۸۔ ادبیات سرحد: فارغ بخاری۔ نیا مکتبہ، پشاور۔ ۱۹۵۳ء

۹۔ اذکار ابرار: (ترجمہ گلزار ابرار) تصنیف، محمد غوثی شطاری مانڈوی۔ ترجمہ فضل احمد جیوری، مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء۔

۱۰۔ اذکار الابرار: شاہ محمد تقی حیدر۔ شاہی پریس، لکھنؤ۔ ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء۔

۱۱۔ الاعلام: خیر الدین زرکلی۔

۱۲۔ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام: مفتی قطب الدین محمد نہروالی المکی۔ لیٹرگ بروکلیس۔ ۱۸۵۹ء

۱۳۔ اقبال نامہ جہاں گیری: مرزا محمد عرف معتمد خاں بخشی۔ نول کشور لکھنؤ۔

۱۴۔ اکبر اینڈ دی جیوئٹس: سی، ایچ، پین۔ طبع لندن۔ ۱۹۲۶ء

۱۵۔ اکبر نامہ: ابوالفضل۔ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ۔

۱۶۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع احمدی دہلی،

۱۷۔ انفاس العارفین: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ مطبع مجتبائی، دہلی۔ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء۔

۱۸۔ انوار العارفین: حافظ محمد حسین مراد آبادی۔ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۶ء

۱۹۔ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون: اسماعیل پاشا۔ مطبع بہیہ' استنبول ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۵ء

۲۰۔ بادشاہ نامہ: عبدالحمید لاہوری۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' کلکتہ۔ ۱۸۶۷ء۔ ۱۸۷۶ء

۲۱۔ البدر الطالع: امام محمد بن علی شوکانی۔ طبع قاہرہ' مصر۔ ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۱۹ء

۲۲۔ برصغیر میں علم فقہ: محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۷۳ء

۲۳۔ برہان پور کے سندھی اولیا المعروف بہ تذکرہ اولیائے سندھ: سید محمد مطیع اللہ راشد برہان پوری۔ سندھی ادبی بورڈ' کراچی طبع اول۔ ۱۹۵۷ء

۲۴۔ بزم تیموریہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دار المصنفین' اعظم گڑھ۔

۲۵۔ بوستان اخبار: سعید احمد ماہروی مطبوعہ آگرہ۔ ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء۔

۲۶۔ التاج المکلل: نواب صدیق حسن خاں۔ المطبعۃ الہندیۃ العربیہ۔ بمبئی۔ طبع ثانی۔ ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء

۲۷۔ تاریخ برہان پور۔ خلیل الرحمٰن برہان پوری۔ مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء۔

۲۸۔ تاریخ برہان مآثر: سید علی طباطبائی۔ ناشر مجلس مخطوطات فارسیہ' حیدر آباد دکن۔ مطبع جامعہ' دہلی۔ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء

۲۹۔ تاریخ تحفۃ الکرام: جلد اول' دوم' سوم' مطبع حسینی اثناعشری' محلہ فراش خانہ' وزیر گنج' لاہور۔ ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء' مطبع ناصری۔

۳۰۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین۔ ادارہ شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس' جون پور' ۱۹۶۳ء

۳۱۔ تاریخ طاہری: سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹھوی۔ سندھی ادبی بورڈ' حیدر آباد' سندھ ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء

۳۲۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر غلام محمد نور محمد' تاجران کتب سری نگر۔ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء

۳۳۔ تاریخ مشاہیر چشت: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین' دہلی۔ ۱۹۵۳ء

۳۴۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ' کراچی ۱۹۵۹

۳۵۔ تاریخ النوائط: نواب عزیز جنگ بہادر۔ مطبوعہ عزیز المطابع' حیدر آباد دکن۔ ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء۔

۳۶۔ تجلی نور المعروف بہ تذکرہ مشاہیر جون پور: نور الدین زیدی۔ مطبع اعظم المطابع' جون پور' ۱۸۸۹ء

۳۷۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۳۸۔ تحقیقات چشتی: نور احمد چشتی۔ پنجابی ادبی اکیڈیمی' لاہور۔ ۱۹۶۴ء

۳۹۔ تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبہ احباب' لاہور۔

۴۰۔ تذکرۃ الابرار والاشرار: حضرت اخون درویزہ۔ ادارہ اشاعت سرحد' قصہ خوانی بازار' پشاور۔

۴۱۔ تذکرہ صوفیائے سندھ: اعجاز الحق قدوسی۔ اردو اکیڈیمی سندھ' کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۴۲۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی: سید احمد قادری۔ ناشر شاہ بک ڈپو' پٹنہ۔

۴۳۔ تذکرۃ العلماء والمشائخ: محمد الدین فوق۔ گلزار محمدیہ اسٹیم پریس' لاہور۔ ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء

۴۴۔ تذکرہ علمائے ہند: مولوی رحمان علی۔ مطبع نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۴۵۔ تذکرہ مشائخ بنارس: ابوالاثر عبدالسلام۔ ندوۃ المعارف' بنارس۔ ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء۔

۴۶۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری: محمد علی حیدر۔ مطبع اصح المطابع' لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء

۴۷۔ تذکرہ مؤرخین: بنی احمد سندیلوی۔ مطبع سلیمانی' بنارس۔ ۱۹۲۶ء

۴۸۔ ترخاں نامہ: سید میر محمد بن سید جلال ٹھٹھوی۔ سندھی ادبی بورڈ' حیدر آباد سندھ۔ ۱۹۶۴

۴۹۔ تزک جہاں گیری: مطبع نامی' منشی نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۵۰۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع شاہ جہانی' بھوپال۔ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء۔

۵۱۔ ''ثقافت'' ماہ نامہ لاہور۔ بابت ماہ اپریل اور جون ۱۹۶۷ء

۵۲۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبوعہ دمشق۔ ۱۹۵۸ء

۵۳۔ جہاں گیر نامہ: خواجہ ابوالحسن۔ مطبع نامی منشی نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء

۵۴۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

۵۵۔ حدیقۃ الاولیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۸۷۷ء

۵۶۔ حیات العلماء: سید عبدالباقی سہسوانی' مطبع نول کشور لکھنؤ' ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء۔

۵۷۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی: خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین' دہلی۔ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء

۵۸۔ خزانہ عامرہ: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۵۹۔ خزینۃ الاصفیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیج ناتھ الموسوم بہ ثمر ہند' لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء۔

۶۰۔ خلاصۃ الاثر فی اعیان القرن الحادی عشر (محمد امین بن فضل اللہ المحبی۔ مکتبہ خیاط' بیروت' لبنان۔

۶۱۔ خلاصۃ التواریخ: لالہ سجان رائے بٹالوی۔ بہ تصحیح ظفر احسن۔ مطبع جی اینڈ سنز' دہلی۔ ۱۹۱۸ء

۶۲۔ دربار اکبری: محمد حسین آزاد۔ دارالاشاعت پنجاب۔ مطبع رفاہ عام' لاہور۔ ۱۸۹۸ء

۶۳۔ دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی: ابن حسن' ترجمہ' عبدالغنی نیازی۔ مجلس ترقی ادب' لاہور۔ ۱۹۵۸ھ

۶۴۔ دہلی اور اس کے اطراف: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ انجمن ترقی اردو' دہلی۔ ۱۹۵۸ء

۶۵۔ ذخیرۃ الخوانین: شیخ فرید بھکری۔ مقدمہ و تصحیح ڈاکٹر سید معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی' کراچی۔

۶۶۔ ''الراعی'' (ہفت روزہ' لاہور) بابت ۱۹۴۳ء مضمون پروفیسر علم الدین سالک

۶۷۔ الرسالۃ الخاقانیہ: پروفیسر امین اللہ وثیر۔ اورینٹل کالج میگزین' لاہور۔ فروری ۱۹۶۵ء

۶۸۔ رقعات ابوالفضل: مطبع نول کشور، لکھنؤ۔

۶۹۔ رقعات عالم گیری: مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۲۴ء

۷۰۔ رودکوثر: ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۷۱۔ روضۃ الاولیا: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع اعجاز صفدری۔ حیدر آباد دکن۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء۔

۷۲۔ زبدۃ المقامات: خواجہ محمد ہاشم کشمی۔ مطبع نول کشور، کان پور۔ طبع اول۔ ۱۸۹۰ء

۷۳۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان: غلام علی آزاد بلگرامی۔ طبع بمبئی۔ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء۔

۷۴۔ سروآزاد: غلام علی آزاد بلگرامی۔ مطبع مفید عام، آگرہ۔ ۱۹۱۰ء

۷۵۔ سفینۃ الاولیا: داراشکوہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۸۴ء

۷۶۔ سوانح عبدالحکیم سیالکوٹی: محمد الدین فوق۔ برقی پریس، لاہور۔ ۱۹۲۴ء

۷۷۔ سیاحت ہند: حافظ عبدالرحمٰن امرتسری۔ مطبوعہ رفاہ عام پریس، لاہور۔ ۱۹۰۹ء

۷۸۔ سید احمد شہید: غلام رسول مہر۔ کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۴ء

۷۹۔ سیرت سید احمد شہید: ابوالحسن علی ندوی۔

۸۰۔ سیر الاولیا: محمد مبارک علوی معروف بہ امیر خرد کرمانی۔ مطبع محب ہند، دہلی۔ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء۔

۸۱۔ سیر المتاخرین: غلام حسین خان طباطبائی۔ نول کشور، لکھنؤ۔

۸۲۔ شذرات الذہب: ابوالفلاح عبدالحی بن العماد حنبلی۔ طبع قاہرہ، مصر۔ ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء۔

۸۳۔ صحیح بخاری: امام محمد بن اسماعیل۔ طبع کراچی۔

۸۴۔ طبقات اکبری: نظام الدین ہروی۔ طابع نول کشور۔ مطبع گرامی قدر اودھ اخبار، لکھنؤ۔ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء

۸۵۔ طرب الاماثل بتراجم الافاضل: مولانا ابوالحسنات عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبع یوسفی، لکھنؤ۔ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء

۸۶۔ عالم گیر نامہ: منشی محمد کاظم بن محمد امین۔ کالج پریس، کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء

۸۷۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی: مولانا محمد میاں۔ مطبوعہ دہلی۔

۸۸۔ عمل صالح (الموسوم بہ شاہ جہان) محمد صالح کمبو (جلد اول و دوم، طبع دوم ۱۹۶۷ء۔ جلد سوم، طبع دوم۔ ۱۹۷۲ء)

۸۹۔ عہد اسلامی کا ہندوستان: ریاست علی ندوی۔ ادارۃ المصنفین، پٹنہ۔ ۱۹۵۰ء

۹۰۔ عہد جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے فرامین واسناد: مطبوعہ ہند، ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء

۹۱۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری: جلد ۹، حافظ ابن حجر عسقلانی۔ طبع مصر۔

۹۲۔ فرحت الناظرین (شخصیات): محمد اسلم پسروری۔ ترجمہ وترتیب، محمد ایوب قادری، اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔ ۱۹۷۲ء

۹۳۔ فقہائے ہند جلد سوم۔ محمد اسحاق بھٹی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۷۶ء

۹۴۔ الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ: مولانا ابوالحسنات عبدالحی حنفی لکھنوی' مطبوعہ مصر' طبع اول۔ ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء۔

۹۵۔ قاموس الاعلام: شمس اللہ قادری۔ حیدر آباد دکن۔ ۱۹۳۵ء

۹۶۔ قاموس المشاہیر: جلد اول' دوم' سوم' نظام الدین حسین نظامی بدایونی۔ نظامی پریس' بدایوں۔ ۱۹۲۴ء۔ ۱۹۲۶ء

۹۷۔ قضاء الارب من ذکر علماء النحو والادب: ذوالفقار احمد۔ مطبع فیض منبع مفید عام' آگرہ۔ ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء

۹۸۔ کشف الظنون: جلد اول' ثانی' حاجی خلیفہ۔ مطبع بہیہ' استنبول۔ ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء

۹۹۔ گجرات کی تمدنی تاریخ: سید ابوظفر ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۹۶۲ء

۱۰۰۔ گلزار اولیا: مظفر حسین۔ مطبع سبحانی' حیدر آباد دکن۔ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء

۱۰۱۔ لطائف قدوسی: (ملفوظات شیخ عبدالقدوس گنگوہی) مرتب' شیخ رکن الدین گنگوہی۔ مطبع مجتبائی' دہلی۔ ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۴ء

۱۰۲۔ مآثر الامرا: جلد اول' دوم' سوم' صمصام الدولہ شاہ نواز خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' کلکتہ۔ ۱۸۸۸ء۔ ۱۸۹۰ء

۱۰۳۔ مآثر رحیمی: جلد اول' دوم' سوم' ملا عبدالباقی نہاوندی۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' کلکتہ۔ ۱۹۲۴ء' ۱۹۲۵ء' ۱۹۳۱ء

۱۰۴۔ مآثر عالم گیری: محمد ساقی الملقب بہ مستعد خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' کلکتہ

۱۰۵۔ مآثر الکرام: (دفتر اول) غلام علی آزاد بلگرامی۔ مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ' لاہور۔ ۱۹۷۱ء

۱۰۶۔ مرأت احمدی: مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر۔ مطبوعہ کلکتہ۔ ۱۹۲۷ء

۱۰۷۔ مرأت العالم: بختاور خاں (قلمی نسخہ) پنجاب یونیورسٹی لائبریری' لاہور۔

۱۰۸۔ المسوی شرح موطا: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ طبع دہلی۔

۱۰۹۔ مشاہیر کشمیر: منشی محمد الدین فوق۔ کریمی پریس۔ لاہور۔

۱۱۰۔ مشکوٰۃ المصابیح: ولی الدین۔ طبع کراچی۔

۱۱۱۔ ''معارف'' (ماہ نامہ) اعظم گڑھ۔ بابت ماہ جون ۱۹۴۷ء

۱۱۲۔ ''المعارف'' (ماہ نامہ) لاہور۔ بابت ماہ جون ۱۹۷۰ء

۱۱۳۔ معجم المؤلفین: عمر رضا کحالہ۔ مطبعۃ الترقی' دمشق۔ ۱۹۵۷ء

۱۱۴۔ مفتاح التواریخ: منشی وانشور۔ مطبع نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ھ

۱۱۵۔ منتخب التواریخ: جلد اول' دوم' سوم' ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء ___ نیز دیکھیے' مطبوعہ نول کشور' لکھنؤ۔ ۱۲۸۴ء

۱۱۶۔ منتخب اللباب: جلد اول' دوم' محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال' کلکتہ۔ ۱۸۶۹ء

۱۱۷۔ مؤرخین ہند: شمس اللہ قادری۔ تاریخ آفس۔ حیدر آباد دکن۔ ۱۹۳۳ء

۱۱۸۔ موضوعات الکبیر: ملا علی قاری حنفی ہروی۔ مطبع مجتبائی' دہلی۔ ۱۳۱۵ھ

۱۱۹۔ موطا: امام مالک۔ کتب خانہ دارالاشاعت' کراچی۔ ۱۹۷۱ء

۱۲۰۔ نجات الرشید: عبدالقادر بدایونی۔ مقدمہ و حواشی' ڈاکٹر سید معین الحق۔ ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب' لاہور۔ ۱۹۷۲ء

۱۲۱۔ نجوم السمائی تذکرۃ العلماء: مرزا محمد علی۔ مطبع جعفری لکھنؤ۔ چاپ عکسی آفسٹ' طبع قم۔ ۱۳۹۶ھ

۱۲۲۔ نزہۃ الخواطر: (جلد پنجم) سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ' حیدرآباد دکن۔ ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء

۱۲۳۔ نگارستان فارس: محمد حسین آزاد۔ آزاد بک ڈپو' لاہور۔

۱۲۴۔ النور السافر فی اخبار القرن العاشر: عبدالقادر بن عبداللہ العیدروس۔ المکتبۃ العربیۃ' بغداد۔ مطبعۃ الفرات' بغداد۔ ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء

۱۲۵۔ واقعات دارالحکومت دہلی: (حصہ اول) بشیر الدین احمد دہلوی۔ شمسی مشین پریس' آگرہ۔ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء

۱۲۶۔ ہدیۃ العارفین فی اسماء المؤلفین و آثار المصنفین: اسماعیل پاشا بغدادی مطبع بہیہ' استنبول ۱۹۵۱ء ۱۹۵۵ء

۱۲۷۔ ہفت اقلیم: جلد اول' دوم' سوم' امین احمد رازی۔ تصحیح و تعلیق' جواد فاضل۔ مطبوعہ تہران۔

۱۲۸۔ ہندوستان کے سلاطین' علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ دارالمصنفین' اعظم گڑھ۔ ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء

۱۲۹۔ یادایام: سید عبدالحی حسنی لکھنوی۔ مطبع انسٹی ٹیوٹ' علی گڑھ۔ ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء

۱۳۰۔ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی: محمد بن یحیٰی المدعو بہ محسن تیمی ثم بکسری۔ طبع ہند۔

يؤتي الحكمة من يشاء ومن يؤت الحكمة فقد أوتي خيرا كثيرا

# فقہائے ہند

محمد اسحاق بھٹی

دار النوادر